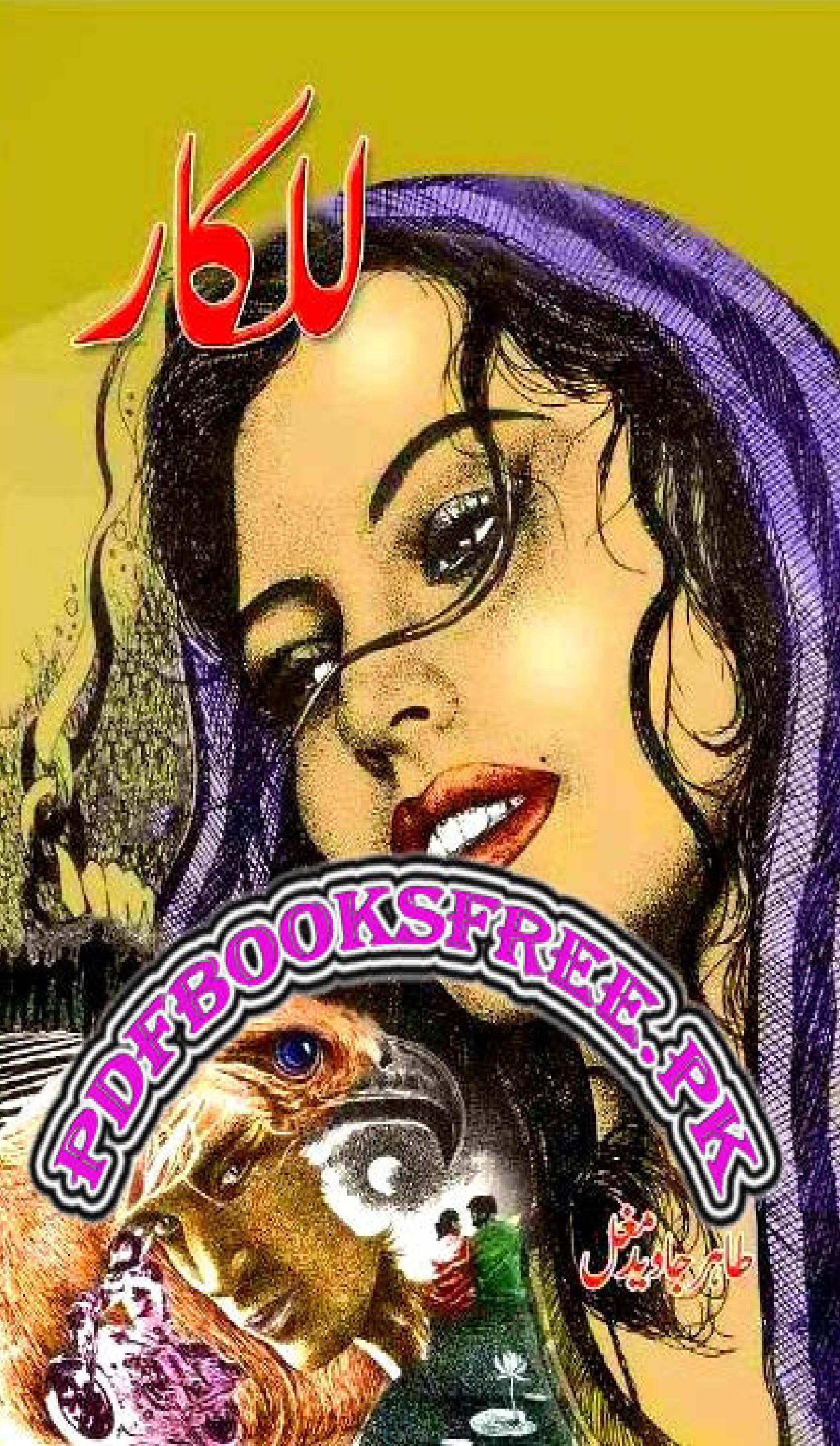

للکار
PDFBOOKSFREE.PK
طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

یہ ان دو دوستوں کی کہانی ہے جو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئے تھے۔ وہ اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف تھے۔ اور کسی حد تک ان کے مزاج بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے تھے۔ مگر ان دونوں میں ایک قدر مشترک ایسی تھی جس نے انہیں یک جان دو قالب بنا دیا۔

وہ موت کے متلاشی تھے۔ بس مرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے موت کے آگے نہیں پیچھے بھاگنا شروع کیا اور ان کے تیور دیکھ کر زندگی ان کو راستے دینے لگی۔ زندگی کا ہر رنگ ان کے سامنے آیا۔ عسرت، دکھ اور بدصورتی بھی۔ دولت، عشرت اور حسن و جمال بھی۔ وہ ہر راستے پر چلے، ہر منظر سے گزرے لیکن وہ اپنی بنیاد سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ ہر راستے پر چلے، ہر منظر سے گزرے، لیکن وہ اپنی بنیاد سے جدا نہیں ہوئے۔ اور بنیاد یہی تھی جہاں جس جگہ اور جب بھی موت ملے گی وہ اسے آگے بڑھ کر گلے لگائیں گے۔

ان کی اسی سوچ نے انہیں خطروں کا کھلاڑی بنا دیا۔ مصائب ان سے نظریں چرانے لگے۔ وہ دونوں دقیانوسیت اور جاہلیت کے ڈسے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس جاہلیت کو ہی اپنا اولین ہدف مانا۔ انہیں جہاں بھی کہنہ قدروں اور فرسودہ عقیدوں کی جھلک نظر آئی انہوں نے بے خوف للکار بلند کی اور ایک جنگ کا آغاز کر دیا۔

وہ جاہلیت کے خارزاروں میں روشن خیالی، جدت اور محبت کی علامت بن گئے۔ وہ اپنے سینوں میں گداز دل رکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں محبت کی شمعیں روشن تھیں اور محبت انسان کو ہی طاقت نہیں دیتی اُس کے آدرشوں کو بھی توانائیوں کی معراج پر لے جاتی ہے۔ یہ اسی معراج کی کہانی ہے۔ یہ انہی وحشی جذبوں کی رُوداد ہے جو سنگلاخ دیواروں میں دَر بناتے ہیں۔ امید ہے میرے دیگر سلسلوں کی طرح آپ اس سلسلے کو بھی پسند کریں گے۔

طاہر جاوید مغل

ثروت مجھ سے بات کرتے کرتے ایک دم خاموش ہوگئی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر سایہ سالہرا گیا تھا۔ میں نے اپنا رُخ پھیر کر اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور چونک کر رہ گیا۔ وہ چار لڑکے اسنیک بار میں داخل ہو رہے تھے۔ لڑکوں میں ان کا سرغنہ واجد عرف واجی بھی شامل تھا۔ وہی کم ظرف امیر زادوں والا حلیہ، لمبے چمکیلے بال، گلے میں سونے کا لاکٹ اور کھلے گریبان والی امپورٹڈ شرٹ۔ وہ بڑی مستی سے چلتا ہوا ہمارے پاس سے گزرا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک دراز قد لڑکا لوفر سے انڈین گانے کی دھن پر سیٹی بجا رہا تھا۔ اس کا حلیہ بھی واجی سے ملتا جلتا تھا۔

وہ چاروں ہم سے کچھ فاصلے پر ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ثروت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''چلو آؤ تابش! چلتے ہیں۔''

میں نے خود کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''نہیں...... اس طرح اُٹھنا ٹھیک نہیں۔ بس یہ جو دو گھونٹ چائے رہ گئی ہے، پی لو۔ پھر اُٹھتے ہیں۔''

ثروت کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اب اسے چائے میں کوئی دلچسپی رہی ہے اور نہ مجھ سے باتیں کرنے میں۔ اب یہاں جو بھی وقت گزرے گا، وہ سخت تکلیف میں رہے گی۔ میں نے کپ اُٹھا کر چائے کی چسکی لی تو مجھے لگا کہ ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اس لرزش کو ثروت کی نگاہ سے چھپانے کے لیے میں نے کپ پھر نیچے رکھ دیا۔

○......❖......○

''ثروت میری منگیتر تھی۔ وہ بی ایس سی کر رہی تھی۔ میں ایم ایس سی کے آخری سال میں تھا۔ ہم دونوں لاہور میں رہتے تھے اور رشتے دار بھی تھے۔ واجد نامی یہ لڑکا جو ابھی اپنی ٹولی کے ساتھ اسنیک بار میں داخل ہوا، پچھلے کئی ماہ سے ثروت کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اس

بس اسٹاپ کے گرد چکراتا رہتا جہاں سے ثروت کالج جانے کے لیے سوار ہوتی تھی۔ وہ ثروت کا محلے دار بھی تھا۔ شروع میں تو وہ اخلاق کے دائرے کے اندر ہی رہا، بس ایک دو بار اس نے ثروت کو اپنی ڈبل سائلنسر ہنڈا موٹر سائیکل پر لفٹ دینے کی کوشش کی مگر جب ایک روز اس نے مجھے اور ثروت کو مال روڈ کے شیزان ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تو وہ کچھ جارحانہ موڈ میں آ گیا۔ وہ اب ثروت کے کالج کے متواتر چکر بھی لگا رہا تھا اور شیزان ریسٹورنٹ میں بھی دو بار ہمارے پیچھے آیا۔

ہم نے شیزان میں ملنا چھوڑ دیا۔ پچھلی بار ہم انارکلی کے ایک اسنیک بار میں ملے تھے۔ تب تو خیریت گزری تھی لیکن آج پھر واجد اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ یہاں آ دھمکا تھا۔

ہم جیسے تیسے چائے ختم کر کے اُٹھنا چاہ رہے تھے۔ میں نے بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا تھا لیکن وہ ابھی کاؤنٹر پر مصروف تھا۔ واجد نے ہمیں سنانے والے انداز میں زور سے کہا۔ ''یار شکیل! چائے پینے کے لیے تو یہ کافی سستی جگہ ہے۔''

شکیل بولا۔ ''بھئی جیب میں جتنے پیسے ہوں، ویسی ہی جگہ ڈھونڈنی پڑتی ہے۔''

واجد نے کہا۔ ''اتنا سوہنا مکھڑا ایسی جگہ پر ہو تو لگتا ہے کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہوا ہے۔''

''یا یہ کہہ لو کہ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند۔'' دراز قد لڑکے نے لقمہ دیا۔ اس کا نام قادر تھا۔

واجد میز پر ہلکا ہلکا طبلہ بجانے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ گنگنا بھی رہا تھا۔ دل توڑنے والے دیکھ کے چل...... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں...... راہوں میں......

ثروت تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلو تابش!'' اس نے شولڈر بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ جی چاہتا تھا کہ ان خبیثوں کے منحوس چہرے نوچ لوں، حلیے بگاڑ دوں ان لوفروں کے۔ لیکن...... اس لیکن سے آگے کئی ایک سوالیہ نشان تھے؟

میں نے خود کو سنبھالا اور کاؤنٹر پر ہی ادائیگی کرتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ ثروت مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔

ہمارے عقب میں کورس کی شکل میں آواز لگائی گئی۔ ''واک آؤٹ...... واک آؤٹ۔''

مجھے اندیشہ تھا کہ شاید یہ لوگ ہمارے پیچھے باہر آئیں گے اور سڑک پر بھی بدتمیزی کریں گے لیکن فوری طور پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہم اسنیک بار کے عقب میں واقع پارکنگ میں

پہنچے۔ میں اپنی سوزوکی کار کی طرف بڑھا تو پتا چلا کہ اس کے عقب میں دو عدد دیو ہیکل ہنڈا موٹر سائیکلیں پارک ہیں۔ ایک بار پھر رگوں میں لہو سنسنا کر رہ گیا۔ یہ واجی وغیرہ کی ہی شرارت تھی۔ ابھی ہم پارکنگ والے سے بات ہی کر رہے تھے کہ واجی اور اس کے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔

پارک لاٹ والے لڑکے نے واجی سے کہا۔ ''سر جی! آپ کی موٹر سائیکل۔ انہوں نے اپنی گاڑی نکالنی ہے۔''

''اوہو ہو ہو۔'' واجی نے چونکنے کی اداکاری کی پھر شائستگی سے بولا۔ ''غلطی ہو گئی۔ میں سمجھا تھا کہ یہ کار دو تین گھنٹے یہاں رُکے گی۔ ابھی لو جی...... میں ہٹا لیتا ہوں موٹر سائیکل۔''

اس نے جیبیں ٹٹولیں مگر چابی نہیں ملی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے۔ وہ دراز قد قادر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کہاں گئی یار! چابی تیرے پاس تو نہیں ہے؟''

''میرے پاس تو میری چابی ہے اور بس میرے تالے میں لگتی ہے۔'' قادر معنی خیز لہجے میں بولا۔

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ کچھ چابیاں ایک سے زیادہ تالوں میں لگتی ہیں؟''

''کیوں نہیں یار! ہوتی ہیں ایسی بھی۔ یہ چابیاں رنگ برنگے تالوں میں لگتی رہتی ہیں۔ ان کو ہرجائی چابیاں کہتے ہیں۔''

واجد عرف واجی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیوں بھرا جی! تمہارے پاس ہے کوئی ایسی چابی؟''

''کک...... کیا مطلب؟'' میں نے خود کو بمشکل سنبھالا۔

شکیل مجھے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آپ کی شکل و صورت سے لگتا ہے کہ آپ کے پاس رنگ برنگے تالوں میں لگنے والی چابی ہے۔''

''یعنی ہرجائی چابی۔'' قادر نے لقمہ دیا۔

''تم تمیز سے بات کرو اور یہ موٹر سائیکل پیچھے ہٹاؤ۔'' ثروت سٹپٹا کر بولی۔

''چابی کے بغیر کیسے پیچھے ہٹا لوں مس صاحبہ؟'' شکیل نے کہا۔

میں نے بھنا کر موٹر سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے گھسیٹ کر پیچھے کرنا چاہا۔

''نو نو...... ڈونٹ ٹچ۔'' واجی نے خطرناک لہجے میں کہا۔

''تو پھر اسے پیچھے ہٹاؤ۔'' میری آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

”میں کہہ رہا ہوں ڈونٹ ٹچ اِٹ۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا اور اس کے ساتھ ہی مجھے دھکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے گیا۔

غصے اور گھبراہٹ کی ملی جلی کیفیت نے مجھے سرتاپا ہلا دیا۔ مجھے لگا کہ میرا دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بہتر ہوا کہ اس موقعے پر ثروت میرے آگے آ گئی۔ وہ چلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں تابش! ہمیں ان سے جھگڑا نہیں کرنا۔“ وہ مجھے دھکیلتی ہوئی چند قدم اور پیچھے لے گئی۔

میں سرتاپا لرز رہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، ایک بار تو اس خبیث واجی پر ٹوٹ پڑوں۔ دوسری طرف واجی بپھرا ہوا شیر نظر آ رہا تھا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ میری کوئی پیش چلنے دے گا۔ بہتر ہوا کہ شکیل اور قادر نے اس کا راستہ روک لیا۔ شکیل، واجی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ ”چھوڑو یار! سنگل پسلی بندہ ہے۔ ضائع شائع نہ ہو جائے۔“

پتا نہیں...... میرے منہ میں کیا آیا اور میں نے کیا کہا۔ بہرطور یہ کوئی متاثر کن الفاظ نہیں تھے۔ میں اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھال کر پیچھے ہٹ آیا۔ واجی کے دوستوں نے دونوں موٹر سائیکلیں پیچھے ہٹا دیں۔ واجی بدستور میری طرف خشمگیں نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لوگ موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر چلے گئے تو ہم بھی گاڑی میں آ بیٹھے۔

گھر آ کر میں دیر تک اپنے کمرے میں بند رہا۔ کمرے کے اندر ہی بے قراری سے ٹہلتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ میرے ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ میں تین بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ والدین کا لاڈ پیار مجھ سے بہت زیادہ تھا۔ والد محکمہ آثارِ قدیمہ میں آفیسر تھے لیکن چونکہ ایمان دار آفیسر تھے اس لیے مشکل سے ہی گزر بسر ہوتی تھی۔ کوئی دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا تو اندیشہ تھا کہ ہم معاشی دباؤ میں آ جائیں گے لیکن والد صاحب کی دور اندیشی نے ہمیں سنبھال لیا۔ انہوں نے اچھے وقت میں ایک بڑی سڑک کے کنارے دو کنال زمین لی تھی۔ کچھ زمین خالی چھوڑ دی تھی۔ باقی میں گھر تعمیر کیا تھا مگر اس طرح کہ اگر ہم اوپر کی منزل پر شفٹ ہو جاتے تو گراؤنڈ فلور پر دس بارہ دکانیں تعمیر کر کے کرائے پر چڑھائی جا سکتی تھیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس کے علاوہ والد صاحب کی بیمہ پالیسی نے بھی ہمیں فائدہ دیا۔

میں بچپن میں جسمانی لحاظ سے خاصا کمزور واقع ہوا تھا۔ تاہم لڑکپن تک پہنچتے پہنچتے جسم پر تھوڑی بہت بوٹی آ گئی۔ اس کے باوجود ہم عصر لڑکوں میں مجھے سنگل پسلی ہی سمجھا جاتا تھا۔ لڑائی بھڑائی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مگر لڑکپن اور جوانی میں بارہا ایسے مواقع

آئے جب میرے لیے لڑنا ضروری تھا۔ ایسے موقعوں پر اکثر میری ہمت جواب دے جاتی تھی۔ ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوتی تھی اور دل ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دھڑکنے لگتا۔ اپنی اس خامی پر قابو پانے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ آج کل پھر وہی صورتِ حال درپیش تھی۔ شومیِ قسمت ثروت کے محلے کا ہی یہ لڑکا اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کی ہمت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

اس دن کمرے میں بے قراری سے ٹہلتے ٹہلتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ دو تین ماہ کے لیے ثروت سے میل جول بالکل بند رکھوں گا اور ثروت سے بھی کہوں گا کہ وہ بس میں کالج جانے کے بجائے ناصر بھائی کے ساتھ موٹر سائیکل پر چلی جایا کرے۔

پچھلے دو چار سالوں میں مجھے جب بھی کہیں اپنی ناتوانی کے سبب ہزیمت اُٹھانا پڑی یا شرمندگی کا سامنا ہوا، میرے اندر ایک خواہش بڑی شدت سے پیدا ہوئی اور وہ یہ کہ میں خود کو جسمانی طور پر مضبوط کروں۔ کم از کم اتنا تو کر سکوں کہ اپنے جیسے کسی بندے کی زیادتی کا مناسب جواب دے سکوں۔ ان دنوں مارشل آرٹ کا کافی شور تھا، کراٹے کے کلب کھلے ہوئے تھے۔ میں بھی گاہے بگاہے اردو بازار کے قریب واقع ایک کلب میں جاتا رہا تھا اور ہاتھ پاؤں چلاتا رہا تھا۔ بہرحال میری اس مصروفیت میں مستقل مزاجی کی کمی تھی۔ عموماً دو چار ماہ تک کلب جانے کے بعد میری توجہ ہٹ جاتی تھی۔ دھیان کسی اور طرف چلا جاتا تھا۔ دھیان دوبارہ کلب کی طرف تب آتا تھا جب پھر کسی جگہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ جسمانی فٹنس علیحدہ چیز ہے جبکہ لڑائی بھڑائی والا مزاج رکھنا دیگر بات ہے۔

اسنیک بار والے واقعے کے بعد میں نے ایک بار پھر شدومد سے مارشل آرٹ کلب جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں ہمارا یہ کلب اردو بازار کے قریب سے تبدیل ہو کر انارکلی کی طرف چلا گیا تھا۔ مدثر عارف صاحب ہمارے استاد تھے۔ وہ بڑی محنت سے ہمیں داؤ پیچ سکھایا کرتے تھے۔ میں چھ سات ہفتے تک باقاعدگی سے گیا لیکن پھر انہی دنوں مجھے ٹائیفائڈ ہوا اور کلب جانے کا سلسلہ ایک بار پھر منقطع ہو گیا۔

میں جنوری کی وہ ٹھٹھری ہوئی سہ پہر کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں اپنی والدہ کے ساتھ لبرٹی مارکیٹ سے شاپنگ کر کے گھر واپس آیا تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اُٹھایا۔

دوسری طرف ثروت کی چھوٹی بہن نصرت تھی۔ اس نے اشک بار لہجے میں کہا۔ ”بھائی

جان! باجی کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ انہوں نے بارہ بجے آجانا تھا۔ اب تین بج گئے ہیں۔ وہ کالج میں بھی نہیں ہیں۔''

میں سرتاپا لرز گیا۔ ''تو کہاں گئی وہ؟''

''ابو اور ناصر بھائی پولیس اسٹیشن گئے ہیں۔ کسی نے انہیں خبر دی ہے کہ باجی کو شاید...... باجی کو شاید......'' وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

اسی دوران میں ثروت کی پھپھو نے ریسیور تھام لیا۔ انہوں نے بھی روتے ہوئے کہا۔

''تابش بیٹا! جلدی سے تھانے جاؤ۔ پتا چلا ہے کہ گھر کے پاس والی سڑک سے کچھ لوگوں نے ثروت کو زبردستی گاڑی میں ڈالا ہے اور لے گئے ہیں۔''

میری نگاہوں کے سامنے زمین آسمان گھومنے لگے۔ ریسیور پھینک کر میں تیزی سے گیراج کی طرف بڑھا۔ امی آوازیں ہی دیتی رہ گئیں۔ ''کیا ہوا تابش؟''

''آکر بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور لرزتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کرکے سڑک پر آگیا۔ میرا دھیان سیدھا واجی اور اس کے یاروں کی طرف جارہا تھا۔ حالانکہ چند دن پہلے بھی میں نے فون پر ثروت سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ آج کل واجی نظر نہیں آرہا۔ مجھے اس وقت بھی پوری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ شاید وہ مجھے پریشانی سے بچانا چاہتی ہے اور آج کے واقعے نے تو میرے بدترین اندیشوں کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا۔ میں سیدھا تھانے پہنچا۔ ثروت کے والد، خالو عثمان، ان کے دو محلے دار دوست اور ناصر بھائی تھانے میں ہی موجود تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے خالو عثمان اور تھانیدار میں تلخ کلامی ہوئی ہے۔ کشیدہ کشیدہ سے ماحول میں تھانیدار کچی رپورٹ لکھ رہا تھا۔

خالو عثمان بتارہے تھے۔ ''یہ دو تین بندے تھے۔ ان میں سے ایک شاید اسٹیشن ویگن کے اندر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے چہرے مفلر وغیرہ میں چھپا رکھے تھے۔ انہوں نے میری بچی کو گھسیٹ کر وین میں پھینکا ہے۔ یہ دیکھیں...... موقعے سے اس کی یہ دو کتابیں ملی ہیں۔''

خالو عثمان نے لرزتے ہاتھوں سے دو کتابیں تھانیدار کی میز پر رکھیں۔

بے شک یہ ثروت ہی کی کتابیں تھیں۔

تھانیدار نے کتابیں بھی اپنی تحویل میں لے لیں۔

''نمبر پلیٹ پڑھی ہے کسی نے؟'' تھانیدار نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... پر گاڑی کا رنگ اور میک وغیرہ دو تین بندوں نے دیکھا ہے۔''

تھانیدار کے پوچھنے پر خالو عثمان کے دوست وہاب صاحب نے تفصیل سے گاڑی کے

بارے میں بتایا۔

تھانیدار کی ہدایت پر ایک اے ایس آئی، وائرلیس سیٹ پر پٹرولنگ گاڑیوں سے رابطے میں مصروف ہوگیا۔ خالو عثمان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں انہیں ہارٹ اٹیک ہی نہ ہوجائے۔

میں نے ناصر بھائی کو ایک طرف لے جاکر کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ انہی لڑکوں کا کام ہے۔''

''کون لڑکے؟''

''وہی...... واجی، شکیل اور قادر وغیرہ۔ میں نے آپ کو ان کے بارے میں بتایا تھا۔''

''نہیں تابش!'' ناصر بھائی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ یہ ان کا کام ہے۔ جس وقت یہ معاملہ ہوا، واجی وغیرہ اپنے گھر کی چھت پر تھے۔ ویسے بھی لوگوں نے جن تین بندوں کے بارے میں بتایا ہے، وہ اپنے حلیے سے بڑی عمر کے لگتے تھے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ واجی وغیرہ نے کسی دوسرے سے یہ کام کروایا ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔ کرب کی شدت سے میری آواز ٹوٹ رہی تھی۔

''ابھی کیا کہا جاسکتا ہے؟ ویسے واجی کے والد سراج صاحب تو خود رپورٹ درج کرانے ابو کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ یہ جو دائیں طرف کریم کلر کی شلوار قمیص میں ہیں۔'' ناصر بھائی نے ایک صحت مند شخص کی طرف اشارہ کیا۔

پولیس والوں نے قاعدے کی کارروائی کرکے اور ہمیں تسلی تشفی دے کر واپس بھیج دیا۔ میں خالو وغیرہ کے ساتھ ہی ان کے گھر چلا گیا۔ گھر کا ماحول سخت افسردہ تھا۔ ثروت کی دادی مسلسل مصلے پر تھیں اور سجدے میں گری ہوئی تھیں۔ خالہ صفیہ کا بھی رو رو کر برا حال تھا۔ وہ کسی بھی امید افزا اطلاع کے لیے ٹیلی فون سے لگی بیٹھی تھیں۔ محلے کی دو تین عورتیں بھی موجود تھیں۔ میں نے خالہ صفیہ کو تسلی دی، وہ میرے گلے سے لگ کر سسکنے لگیں۔

پتا نہیں کیوں میرا دھیان بار بار واجی اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہی جارہا تھا۔ میں ان سے ملنا اور بات کرنا چاہتا تھا لیکن پھر یہ خیال بھی ذہن میں آتا تھا کہ کہیں بگڑا ہوا معاملہ اور نہ بگڑ جائے۔ صرف شک کی بنیاد پر واجی وغیرہ پر اتنا بڑا الزام نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

میں نے فون کرکے والدہ اور چچی کو بھی خالہ صفیہ کے گھر ہی بلالیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ان کے پاس رہیں اور دلاسہ دیں۔

وہ رات جس مشکل اور کرب میں گزری، میں ہی جانتا ہوں۔ میں گاڑی لے کر دیوانہ

وار سڑکوں، ہسپتالوں اور پولیس اسٹیشنوں پر گھومتا رہا۔ میرے کالج کے ایک دوست زبیر خان کے بھائی پولیس افسر تھے۔ زبیر خان سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ آ جاؤ۔ ابھی جا کر بھائی سے ملتے ہیں اور مشورہ کرتے ہیں۔

صبح کے پانچ بجے تھے۔ ابھی اندھیرا پوری طرح چھٹا نہیں تھا۔ میں خالہ کے گھر سے نکلا اور گاڑی پر زبیر کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی میں دو اندرونی سڑکوں سے نکل کر بڑی سڑک پر مڑنے ہی والا تھا کہ سامنے سے آنے والے ایک رکشے کی وجہ سے رفتار دھیمی کرنا پڑی۔ جگہ تھوڑی تھی اور میں چاہ رہا تھا کہ رکشہ آسانی سے گزر جائے۔ اچانک میری نگاہ رکشے کے اندر بیٹھی سواری پر پڑی اور میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ ثروت تھی۔ اس کے سر پر دوپٹہ تھا اور دوپٹے کے پلو نے دو تہائی چہرے کو نقاب کی طرح چھپایا ہوا تھا۔ میں نے ہی ثروت کو نہیں دیکھا، اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے گاڑی روک لی۔ رکشہ بھی رک گیا۔ میں دروازہ کھول کر جلدی سے ثروت کے پاس گیا۔ وہ رکشے سے اُتر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دہک رہے تھے۔ صبح کے ان اولین لمحوں میں یہ اندرونی سڑک تقریباً سنسان ہی تھی۔ ثروت میرے کندھے سے چمٹ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔

میں نے رکشے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اور ثروت کو لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

''ثروت! تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

ایک دو راہگیر تعجب سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ میری گاڑی کا رُخ بڑی سڑک کی طرف تھا۔ میں نے گاڑی کو اسی رُخ پر آگے بڑھایا اور تین چار منٹ ڈرائیو کرنے کے بعد ایک چلڈرن پارک کے عقب میں روک دیا۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ثروت آنکھیں بند کیے مسلسل سسک رہی تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ''ثروت! تم زندہ سلامت ہمارے سے بڑی اور کوئی بات نہیں۔ باقی سب کچھ بے معنی ہے۔ مجھے بس اتنا بتا دو، وہ کون لوگ تھے جو تمہیں لے کر گئے تھے۔''

وہ بدستور روتی رہی۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ کچھ نہ بتاؤ۔ اگر تمہارے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے تو خاموش رہو۔ میرے لیے یہ خوشی ہی کم نہیں ہے کہ میں تمہیں صحیح سالم اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ خالہ، خالو بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔ ایک ایک سیکنڈ ان پر بھاری گزر رہا ہے۔ چلو گھر

چلتے ہیں۔''

مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

''کیا بات ہے ثروت! جو کہنا ہے بلا جھجک کہو۔''

اس نے آنسو پونچھ لیے اور قدرے حوصلے میں نظر آنے لگی۔ آنسوؤں کے چند گھونٹ بھر کر وہ بولی۔ ''مجھے لے جانے والے واجی اور اس کے دوست تھے۔''

یہ انکشاف دھماکہ خیز تھا۔

''لیکن...... میرا مطلب ہے ثروت! وہ خود تو موقعے پر موجود نہیں تھے۔ ناصر بھائی نے بتایا ہے کہ وہ......'' میں ہکلا کر رہ گیا۔

''ہاں...... انہوں نے خود کچھ نہیں کیا۔ کسی سے کرایا ہے۔''

''مم...... مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ ثروت! شروع سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟''

اگلے پانچ دس منٹ میں ثروت نے اشک بار لہجے میں اور رُک رُک کر مجھے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

قریباً آٹھ دس روز پہلے ثروت کے بھائی ناصر کو کسی کام سے اسلام آباد جانا پڑا تھا۔ ان دنوں دو تین بار ثروت حسبِ سابق بس میں کالج گئی۔ ایک دن بس اسٹاپ پر واجی نے پھر ثروت سے بدتمیزی کی۔ اس نے دو تین شرمناک جملے کسے جس کے بعد ثروت بھی طیش میں آ گئی۔ اس نے اسے بُری طرح ڈانٹا، دھمکایا اور کہا کہ تم گندی نسل سے ہو۔

اس سے پہلے کہ لوگ اکٹھے ہو جاتے، واجی اپنی ڈبل سائلنسر موٹر سائیکل پر وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ بہتر تھا کہ ثروت اس واقعے کے بارے میں گھر والوں کو یا پھر مجھے بتا دیتی لیکن وہ یہ سب کچھ پی گئی۔ اس نے اُمید کی کہ شاید اس واقعے کے بعد واجی کو عقل آ جائے گی اور وہ اس معاملے کو مزید خراب نہیں کرے گا۔

مگر یہ سب کچھ ''خیالِ خام'' ثابت ہوا۔ کل صبح ثروت کو پھر بس میں کالج جانا پڑا۔ شاید واجی اور اس کے ساتھی کسی ایسے ہی موقعے کی تاک میں تھے۔ جب وہ دوپہر کے وقت کالج سے واپس آ رہی تھی، اچانک دو ہٹے کٹے افراد نے اسے گھسیٹ کر اسٹیشن وین میں ڈال لیا۔ اس کے منہ پر ایک بدبودار رومال رکھا گیا۔ ثروت کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بالکل بیگانہ ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو شام ہونے والی تھی۔ وہ ایک نامعلوم کمرے میں تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ نائیلون کی رسی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک فوم پڑا تھا اور کونے میں الماری رکھی تھی۔ ثروت کا سر بھاری ہو رہا تھا اور جی متلا رہا تھا۔ اس نے مدد کے لیے

پکارنا شروع کیا اور بند دروازے کو ٹھوکریں ماریں۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور واجی اندر آ گیا۔ اس نے ثروت کو دھکیل کر فوم پر پھینکا اور چاقو نکال کر اسے دھمکایا۔ اس کے ساتھ ہی بولا کہ وہ جتنا مرضی چلاّ لے، یہاں دور دور تک اس کی آواز سننے والا اور کوئی نہیں۔ ثروت کے ہاتھ رسّی کی سخت بندش سے نیلے ہو رہے تھے۔ واجی نے چاقو کی مدد سے رسّی کاٹ دی۔

ثروت نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے معافی مانگی۔ اس سے کہا کہ وہ اسے جانے دے۔ واجی نے جواب میں کہا کہ وہ ''گندی نسل'' کا ہے اور اس کا تھوڑا بہت ثبوت دیئے بغیر وہ اسے یہاں سے جانے نہیں دے گا۔

ثروت نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ بولا۔ ''میں بھی تو ایک سال سے تمہارے آگے پیچھے پھر رہا ہوں۔ تمہاری منت ترلا کر رہا ہوں لیکن تم ٹس سے مس نہیں ہوتی ہو۔ جس کے ساتھ گل چھرے اڑاتی ہو، اس میں کیا سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں جو ہم میں نہیں ہیں۔ باقی میں نے تمہیں یہاں رکھنا نہیں ہے۔ چھوڑ دینا ہے لیکن چھوڑنے سے پہلے تھوڑی سی سزا ضرور دینی ہے۔''

ان باتوں کے دوران میں ہی اچانک کہیں آس پاس پولیس گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ واجی کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور نکلتے ہوئے دروازے کو باہر سے لاک کر گیا۔ تاہم وہ ثروت کے ہاتھ دوبارہ نہیں باندھ سکا تھا۔ کسی ساتھ والے کمرے سے اس کی آواز آئی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ پھر وہ سارے افراتفری میں کہیں چلے گئے۔

ثروت مدد کے لیے زور زور سے چلاتی رہی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پولیس کی گاڑی اسے ڈھونڈے بغیر آگے نہ نکل جائے۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ثروت کی مدد کے لیے کوئی نہیں آیا۔ گاڑی غالباً آگے نکل چکی تھی۔ ثروت کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ لاہور میں ہے یا لاہور سے باہر......اور یہ کون سی جگہ ہے۔

جب دروازہ پیٹ پیٹ کر اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور چلا چلا کر گلا بیٹھ گیا تو اس کو یوں لگنے لگا کہ شاید ارد گرد کوئی موجود نہیں مگر اس کی چھٹی حِس کہہ رہی تھی کہ کوئی موجود ہے۔ بس دم سادھے بیٹھا ہے۔ شدید پریشانی اور ہراس کے باوجود ثروت اپنا دماغ استعمال کرنے لگی تھی۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس کمرے سے کیسے نکلا جا سکتا ہے۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی سے باہر آہنی گرل لگی تھی اور کسی اسٹور نما تاریک کمرے کی جھلک نظر آتی تھی۔ اٹیچ باتھ روم میں بھی ایک چھوٹی کھڑکی موجود تھی اور وہاں بھی مضبوط آہنی گرل لگی تھی۔

ثروت نے الماری کھولی۔ وہاں سے اسے چھوٹے دستے کی ایک ہتھوڑی مل گئی۔ وہ اس ہتھوڑی کے ساتھ کمرے کی کھڑکی کی گرل پر ضربیں لگانے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس آہنی گرل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تاہم اسے اُمید تھی کہ اگر کوئی باہر موجود ہوا تو اس حرکت کے بعد سامنے ضرور آئے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ ثروت نے ہمت کی اور دروازے کے بالکل پاس کھڑی ہو گئی۔ ایک شلوار قمیص والا شخص رائفل بدست اندر داخل ہوا۔ ثروت نے اندھا دھند اس کے سر کے پچھلے حصے پر ہتھوڑی کی ضرب لگائی۔ اس ایک ضرب نے ہی جواں سال شخص کو زمین بوس کر دیا۔ یہ کوئی پٹھان چوکیدار تھا۔ ثروت اس کی طرف دیکھے بغیر باہر بھاگی۔ یہ ایک فیکٹری تھی۔ تین چار نامکمل بسیں یہاں وہاں کھڑی تھیں۔ ثروت کاٹھ کباڑ کے درمیان بھاگتی گیٹ تک پہنچی اور باہر نکل آئی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ جی ٹی روڈ پر لاہور کے مضافات میں ہے۔ یہاں سے ایک خدا ترس کار والے نے اسے لفٹ دی اور راوی کے پل تک پہنچا دیا۔ وہاں سے رکشہ پکڑ کر وہ میرے پاس پہنچ گئی۔

میں نے ثروت کی یہ ساری رُوداد سنی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے، وہ اس نے من وعن مجھے بتا دیا ہے۔ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں مسلسل آنسو رواں رہے۔ جب غنڈوں نے اسے اسٹیشن وین میں ڈالا تو ثروت کے جسم پر کئی خراشیں آئی تھیں۔ اس کی پنڈلیوں سے ابھی تک خون رِس رہا تھا۔ اس کی یہ خونی خراشیں دیکھ کر میرا دل ہول گیا۔ میری نگاہوں میں واجد عرف واجی کا منحوس چہرہ گھومنے لگا۔ جی چاہا کہ میرے پاس پستول ہو اور میں اس کو گولیوں سے چھلنی کر دوں۔ شدید طیش کے عالم میں مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بدن لرزتا تھا اور سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹتے تھے۔ دماغ بہت کچھ کرنے کو چاہتا تھا مگر جسم ساتھ دینے سے انکار کر دیتا تھا۔

اس وقت بھی کچھ یہی عالم تھا۔ ہمیں گاڑی میں بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے واپس گھر کی طرف موڑ دی۔ دس منٹ بعد ہم گھر کے اندر تھے۔ ثروت کو دیکھ کر گھر میں تہلکہ مچ گیا۔ خالہ صفیہ نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا اور تشکر کے آنسوؤں سے بھگونے لگیں۔ باقی اہلِ خانہ بھی شدید حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں تھے۔ ثروت کو اندر کمرے میں پہنچایا گیا۔ اسے پانی وغیرہ پلایا گیا تا کہ وہ نارمل حالت میں آ سکے۔ کمرے میں ہجوم زیادہ ہو گیا تھا۔ خالو جان کے کہنے پر باقی افراد باہر نکل آئے۔ صرف خالہ صفیہ، نصرت، امی اور چچی وغیرہ وہاں رہ گئیں۔

ڈرائنگ روم میں جا کر میں نے خالو اور ناصر بھائی وغیرہ کو تفصیل بتائی کہ ثروت کے ساتھ کیا ہوا ہے اور وہ کس طرح شاہدرے کے قریب ایک فیکٹری سے بھاگ کر یہاں پہنچی ہے۔ یہ انکشاف سب کے لیے تکلیف دہ تھا کہ یہ اسی محلے کے رہنے والے واجی اور قادر وغیرہ کا کام ہے۔

ناصر بھائی ایک دم آگ بگولا نظر آنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں۔ اس بدمعاش کی طرف...... اسے لاش بنا کر ہی واپس آؤں گا۔''

وہ پستول لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ ہم سب نے انہیں بمشکل روکا۔ خالو جان نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ ہماری بچی صحیح سلامت واپس آ گئی، اب ہمیں قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر معاملے کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ ہم جو کریں گے قانون کے مطابق کریں گے۔ ہم ابھی تھوڑی دیر میں تھانے جاتے ہیں۔''

خالو جان نے ایک دو جگہ فون کیے۔ میں نے بھی اپنے دوست زبیر کو بلا لیا۔ ہم تھانے پہنچے اور متعلقہ تھانیدار اشرف ساہی کو تفصیل کے ساتھ ساری بات بتائی۔ تھانیدار یہ سب کچھ ثروت کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ ثروت کا بیان لینے کے لیے وہ اسی وقت ہمارے ساتھ گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''جناب! ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے۔ اسے سنبھلنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں۔ اس دوران میں آپ اپنی کارروائی شروع کریں۔''

''آپ کی یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ پر مجھے قانون قاعدے کے مطابق چلنا ہے۔ کارروائی مغویہ کے بیان کے بعد ہی شروع ہو گی۔''

مجبوراً ہمیں تھانیدار اشرف ساہی کو گھر لے جانا پڑا۔ میں اس کے پہنچنے سے دس پندرہ منٹ پہلے ہی گھر پہنچ گیا اور ثروت کو بیان دینے کے لیے تیار کیا۔

تھانیدار کے آنے کے بعد بھی میں، خالو جان اور ناصر بھائی کمرے میں موجود رہے۔ بات کرتے ہوئے ثروت کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ بہر حال اس نے وہ سب کچھ تھانیدار اشرف کے گوش گزار کر دیا جو دو اڑھائی گھنٹے پہلے مجھے بتایا تھا۔

تھانیدار اشرف ساہی نے پوچھا۔ ''آپ نے واجد عرف واجی کو خود دیکھا ہے مگر اس کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کس طرح کہہ سکتی ہیں؟''

''میں نے ان کی آوازیں سنی ہیں جی...... میں قادر اور ایک دوسرے لڑکے شکیل کی آواز اچھی طرح پہچانتی ہوں۔''

''تنگ تو آپ کو واجی کرتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی آوازیں آپ کیسے پہچانتی ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جناب! آپ وقت ضائع کرنے والے سوال کر رہے ہیں۔ وہ دونوں خبیث بھی واجی کے ساتھ ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ سب ایک ٹولی کی شکل میں تھے۔''

تھانیدار اشرف نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ''تو جب یہ لوگ ان کو تنگ کرتے تھے آپ آس پاس ہی ہوتے تھے؟''

میں ایک دم گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''ایک دو بار ایسا ہوا ہے کہ ہم ریسٹورنٹ میں اکٹھے چائے پینے گئے اور یہ لوگ آ دھمکے۔''

تھانیدار نے اپنے سوالات کا رُخ خوامخواہ میری اور ثروت کی طرف موڑ دیا۔ خالو عثمان اسے بمشکل واپس اصل موضوع پر لائے۔ بیان قلم بند کرنے کے فوراً بعد تھانیدار اشرف اپنے عملے کے ساتھ پیدل ہی واجی وغیرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک گلی چھوڑ کر یہ ایک دو منزلہ شاندار کوٹھی تھی۔ ہم نے ساتھ جانا چاہا مگر تھانیدار اشرف نے منع کر دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد پولیس کے اس چھاپے کا نتیجہ سامنے آ گیا اور یہ نتیجہ ہمارے خدشات کے عین مطابق تھا۔ گھر میں فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف تھانیدار اشرف ساہی خود تھا۔

اس نے خالو عثمان کو بلانے کا کہا۔ میں نے بتایا کہ وہ واش روم میں ہیں۔ تھانیدار اشرف نے کہا۔ ''چاروں لڑکے اپنے گھروں سے غائب ہیں۔ ہم انہیں ان کے دوسرے ٹھکانوں پر ڈھونڈ رہے ہیں۔ شام تک پوزیشن صاف ہو جائے گی۔''

''جو چوکیدار زخمی ہوا تھا، اس کا کچھ پتا نہیں چلا؟''

''ابھی تک نہیں۔ بہر حال ہم رابطے میں رہیں گے۔ جیسے ہی کوئی خبر ملی آپ لوگوں تک پہنچ جائے گی۔''

میں نے فون پر بات ختم کی ہی تھی کہ اندر سے خالہ صفیہ کی آواز آئی۔ وہ مجھے بلا رہی تھیں۔ میں اندر پہنچا۔ امی اور چچی کے علاوہ محلے کی ایک دو عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ خالہ صفیہ نے پوچھا۔ ''کس کا فون تھا؟''

''پولیس اسٹیشن سے تھا۔ انسپکٹر بتا رہا تھا کہ ہم لڑکوں کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔''

خالہ صفیہ نے اشک بار انداز میں کہا۔ ''تابش! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ پیسے والے بھی ہیں۔ ان سے دشمنی پڑ گئی تو جینا مشکل ہو جائے گا۔''

چچی کلثوم نے تنک کر کہا۔ ''ہائے ہائے...... کیسی بات کرتی ہو آپا! اب جس پر ظلم ہوا ہے وہ بولے بھی نہ۔ پھول سی بچی تھی ہماری۔''

''بچی تھی......'' کے لفظ چچی نے اس طرح ادا کیے کہ میرے دل پر گھونسہ سا لگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ایک محلے دار عورت بول پڑی۔ ''ایسے لوگوں پر تو کتے چھوڑ دینے چاہئیں۔ زندہ گاڑ دینا چاہیے۔ عورت کے پاس عزت آبرو کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ ہائے ظالموں کو ذرا ترس نہ آیا۔''

چچی نے بڑے تاسف سے ثروت کو سرتا پا دیکھا۔ ''بچی کو زخم زخم کر کے رکھ دیا ہے۔ بھلا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ ان بدمعاشوں کے منہ لگنا نہیں چاہتی تھی۔ اس جرم کی اتنی بڑی سزا؟ موت جوگوں نے ساری عمر کا رونا پلے باندھ دیا ہے۔''

ہمدردی کے اس انداز نے ثروت کو سر جھکا کر سسکنے پر مجبور کر دیا۔

ثروت کی چھوٹی بہن نصرت نے جھلا کر کہا۔ ''چچی! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ آپا صحیح سلامت گھر واپس آ گئی ہیں۔ اللہ نے ہم پر کرم کیا ہے۔''

''اللہ کے کرم سے تو انکار نہیں ہے بیٹی! پر اپنے دل کو کیسے تسلی دوں؟ اس کی اُجڑی پجڑی صورت دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔''

میرا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ میں نے دبے دبے طیش سے کہا۔ ''چچی! آپ سب لوگ کچھ دیر کے لیے باہر بیٹھ جائیں۔ اسے ذرا آرام کرنے دیں۔''

چچی نے مجھے گھورا۔ میں پاؤں پٹختا ہوا باہر آ گیا۔

ان عورتوں کی باتیں میرے سینے میں تیروں کی طرح لگی تھیں۔ خاص طور سے چچی کی باتیں۔ میں چچی کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ چچی شروع سے ہی میرے اس رشتے کے خلاف تھیں۔ وہ میرے لیے اپنی سگی بھتیجی کو لانا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے در پردہ کوششیں بھی کی تھیں۔ اب یہ معاملہ ختم ہو چکا تھا مگر وہ بغض ابھی تک چچی کے دل میں موجود تھا۔ اب انہیں یہ موقع ملا تھا تو وہ اپنے اندر کی عداوت کو چھپا نہیں پا رہی تھیں۔ بظاہر انہوں نے ہمدردی کے بول بولے تھے مگر ان بولوں کے پیچھے جو دشمنی تھی، وہ زہرِ قاتل کی تاثیر رکھتی تھی۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ امی جان بھی ثروت کی واپسی کے بعد سے کچھ چپ چپ ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک آدھ دن مزید یہاں رہیں گی اور ثروت کی دلجوئی کریں گی مگر وہ اگلے ہی روز طبیعت خراب ہونے کا کہہ کر گھر واپس چلی گئیں۔ کہنے

والوں نے درست کہا ہے کہ مارنے والوں کے ہاتھ پکڑے جا سکتے ہیں مگر بولنے والوں کی زبانیں نہیں۔ اگلے ایک دو روز میں مجھے صحیح معنوں میں اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اگر کسی لڑکی کے ساتھ ثروت جیسی صورتِ حال پیش آ جائے تو اس پر کیا بیتتی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ ثروت جیسے گئی ویسے ہی واپس آ گئی تھی مگر اردگرد کے لوگ یہ بات ماننے کے لیے دل سے تیار نہیں تھے۔

ثروت کے گھر میں اگلے روز میں نے پھر ایک عورت کو اس طرح کی بات کرتے سنا۔ یہ بھی کوئی محلے دار ہی تھی۔ شکل سے پڑھی لکھی لگتی تھی اور اپنی طرف سے اظہارِ ہمدردی کے لیے تشریف لائی تھی۔ اس نے رونی صورت بنا کر ثروت کو گلے سے لگایا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے کے بعد خالہ صفیہ سے بولی۔ ''میں تو کہتی ہوں بہن کہ ظلم سہہ کر چپ رہنا بھی گناہ ہے۔ آپ اس معاملے کی پوری پیروی کریں۔ بچی کا ڈاکٹری معائنہ کرایا ہے آپ نے؟''

نصرت نے سٹپٹا کر کہا۔ ''آنٹی! ہم کیوں کرائیں ڈاکٹری معائنہ۔ کیوں اپنی بے عزتی کا اشتہار دیواروں پر لگائیں؟ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اللہ نے بڑا کرم ہے ہمارے اوپر۔''

''ہاں بیٹی! یہ تو بڑا کرم ہے کہ یہ زندہ سلامت واپس آ گئی ہے مگر ان بدمعاشوں نے جو کیا ہے اس کی سزا تو انہیں ملنی چاہیے نا۔ لڑکی ایک رات گھر سے باہر رہ آئے تو اس بیچاری کے پلے کیا رہ جاتا ہے۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے، ڈیفنس میں ہماری برادری کی ایک لڑکی تھی۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ بیچاری یتیم تھی، پر اس کی ماں پوری ہمت کے ساتھ ڈٹ گئی۔ کہنے لگی کہ ہمارے ساتھ تو جو ہونا تھا ہو گیا، پر اب ان غنڈوں کو پھانسی تک ضرور پہنچائیں گے۔ پتا نہیں اور کتنوں کا بھلا ہو جائے گا اس سے۔ اب وہ دونوں غنڈے جیل میں ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو سیشن کورٹ سے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے۔''

اس عورت کی گفتگو کے دوران میں ہی نصرت، ثروت کو لے کر باہر نکل گئی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید جھلاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

دو روز بعد میں گھر گیا تو امی بجھی بجھی نظر آئیں۔

''کیا بات ہے امی! آپ چپ ہیں؟'' میں نے ناشتے کی میز پر پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس وہی...... ثروت کی طرف بار بار دھیان چلا جاتا ہے۔ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی لڑکی تھی۔''

''کوئی بات نہیں امی! پھر اسی طرح ہو جائے گی۔ ابھی تو شاک میں ہے نا۔''

"اسی طرح کہاں ہوا جاتا ہے تابش! جب اس طرح کی بات ہو جائے تو پوری زندگی پر اثر پڑتا ہے۔" امی نے طویل آہ بھر کر کہا۔

پھر وہ اُٹھیں اور الماری میں سے ایک دن پہلے کا اخبار نکالا۔ اخبار والے نے حسبِ روایت ثروت والی خبر کو خوب مرچ مسالا لگا کر بیان کیا تھا۔ ثروت کی ایک پرانی تصویر بھی موجود تھی جو نہ جانے کہاں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس تین کالمی خبر کی سرخیاں پڑھ کر ہی میری رگوں میں انگارے سے بھر گئے۔ خبر نویس نے خبر کو دلچسپ اور سنسنی خیز بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ خبر کے آخر میں پولیس ذرائع کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ مذکورہ فیکٹری کے ایک کمرے سے امپورٹڈ سگریٹ، انڈین شراب کی دو بوتلیں اور مووی کیمرہ وغیرہ بھی ملا ہے۔ ان شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ چاروں ملزمان مغویہ کی ویڈیو بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور ممکن ہے کہ یہ ویڈیو بنائی بھی گئی ہو۔ اس قسم کی اور بھی کئی باتیں خبر میں موجود تھیں۔

میں نے اخبار کو پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور ناشتہ کیے بغیر باہر نکل گیا۔ امی بھی میری کیفیت دیکھ کر گم صم کھڑی رہیں۔

آج تھانیدار اشرف نے خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ کو مشورے کے لیے تھانے بلایا تھا۔ میں بھی اپنے دوست زبیر خان کو لے کر پہنچ گیا۔ تھانیدار اشرف سے کسی اچھی خبر کی توقع نہیں تھی اور ایسا ہی ہوا۔ پتا چلا کہ چاروں ملزمان میں سے ابھی تک کسی کا کھوج نہیں ملا ہے۔ دو تین پولیس پارٹیاں مختلف علاقوں کی طرف روانہ کی گئی تھیں جو ناکام واپس آئی تھیں۔ آخر میں تھانیدار اشرف نے سگریٹ سلگاتے ہوئے خالو عثمان سے کہا۔ "عثمان صاحب! کل ایک ایم این اے صاحب کا فون آیا ہوا تھا۔ ایم این اے مشتاق گورایا صاحب کا نام تو سنا ہوگا آپ نے؟"

خالو عثمان نے اثبات میں سر ہلایا اور ان کا پریشان چہرہ کچھ مزید پریشان نظر آنے لگا۔

تھانیدار اشرف نے کہا۔ "ایم این اے صاحب کی خواہش ہے کہ یہ معاملہ مزید نہ بگڑے۔ وہ مانتے ہیں کہ لڑکوں سے ایک بڑا جرم ہوا ہے۔ اپنی بیوقوفی سے انہوں نے قانون کو پیچھے لگا لیا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بچی صحیح سلامت گھر واپس پہنچ گئی ہے۔ اس صورتِ حال میں اگر کوئی درمیانی راستہ نکال لیا جائے تو دونوں پارٹیوں کے لیے بہتر ہوگا۔"

ناصر بھائی نے چیخ کر کہا۔ "انسپکٹر صاحب! یہ کوئی زمین کے ٹکڑے کا جھگڑا نہیں جس میں دو پارٹیاں آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ یہ اغوا کا سنگین ترین جرم ہے۔ ایم این اے صاحب

اس کا درمیانی راستہ کیا نکالیں گے۔ کیا ہمیں کوئی معاوضہ دیں گے؟ خدا کا خوف کرنا چاہیے انہیں۔ ہماری جو بدنامی ہوئی ہے اور ہم جس اذیت میں ہیں، اس کا مداوا کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی تھوڑا بہت مداوا ہے تو یہی ہے کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو۔ واجی اور اس کے یاروں کو ان کے کیے کی پوری سزا ملے۔"

تھانیدار اشرف کا گندمی چہرہ ایک دم سرخ ہوا پھر وہ ذرا تحمل سے بولا۔ "دیکھو برخوردار! مجھے تمہارے دُکھ کا احساس ہے لیکن مصیبت کے وقت عقلمندی اور حوصلے سے کام نہ لیا جائے تو مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قانونی کارروائی تو ہو ہی رہی ہے، تم لوگ اپنے سامنے دوسرے راستے بھی کھلے رکھو۔ تمام راستے بند نہیں کرنے چاہئیں۔"

میں نے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! اس طرح تو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں لڑکے کہیں ایم این اے صاحب کے پاس ہی پناہ نہ لیے ہوئے ہوں۔"

"بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔" ناصر بھائی نے فوراً کہا۔ "اور لوگ اس طرح کرتے ہیں۔ ایسے میں ہم ایم این اے صاحب سے بات چیت کریں گے تو بیوقوف ہی کہلائیں گے نا۔"

تھانیدار اشرف کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہو گیا۔ وہ خالو عثمان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو عثمان صاحب! آپ کے یہ لڑکے ہر بات کو اُلٹا لے رہے ہیں۔ آپ ان کو سمجھائیں ورنہ معاملہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اس لیے یہ باتیں کہہ رہا ہوں۔ سیٹھ سراج کو پتا ہے کہ ان کے بچے سے جرم ہوا ہے، اس لیے ان کی نظر نیچی ہے لیکن جب ان کو اپنے بچے کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آئے گی تو ان کا رویہ بدل جائے گا۔ وہ مثال تو آپ نے بھی سنی ہوگی کہ بلی کو جب اپنے بھاگنے کا کوئی رستہ نظر نہ آئے تو وہ گھیرنے والے کی آنکھوں کی طرف آتی ہے۔ میں خدانخواستہ آپ کو ڈرا نہیں رہا ہوں، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس معاملے کے ہر پہلو پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر خالو عثمان نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر منع کر دیا۔ یہ بات عیاں ہوتی جا رہی تھی کہ تھانیدار اشرف سا ہی مخالف پارٹی کا اثر قبول کر رہا ہے۔ یہ اثر دباؤ کی شکل میں ہو سکتا تھا اور لالچ کی شکل میں بھی۔

گھر میں بھی عجیب تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ یہ چوتھے یا پانچویں روز کی بات ہے، امی جان نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میری چھوٹی بہن فرح کالج گئی ہوئی تھی۔ مجھ سے چھوٹا عاطف سویا ہوا تھا۔

امی جان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کہنے لگیں۔ "تابش بیٹا! پتا نہیں کیوں مجھے

لگتا ہے کہ ہم تیری خالہ صفیہ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ نبھا نہیں سکیں گے۔"

"آپ کس وعدے کی بات کر رہی ہیں؟"

امی نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ "دیکھو تابش! صفیہ رشتے میں میری بہن ہے مگر میں اسے سگی بہنوں کی طرح ہی سمجھتی ہوں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ثروت کو دلہن بنا کر اس گھر میں لاؤں۔"

میں نے لرز کر کہا۔ "تو اب کیا ہو گیا ہے امی! کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟ ثروت اس گھر میں دلہن بن کر آئے گی اور ضرور آئے گی؟"

امی نے نفی میں سر ہلایا۔ "تابش! تُو ابھی بچہ ہے، ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ دیکھ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد ہمیں بہت کچھ سوچنا پڑے گا اور ہم نے کون سا شامیانے لگا کر منگنی کی تھی۔ یا انگوٹھیاں پہنائی تھیں۔ بس ایک منہ زبانی بات ہی تھی نا۔"

"امی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے منہ میں شاید چچی جان کی زبان آ گئی ہے۔ کیا...... منہ زبانی بات کوئی بات نہیں ہوتی؟ زبان پر تو لوگ جانیں دے دیتے ہیں۔ آپ کو اس طرح ہرگز نہیں سوچنا چاہیے۔"

"میں سوچنے پر مجبور ہو رہی ہوں تابش! ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم یہ رشتہ چھوڑ دیں۔ اب تُو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ۔ تیری چھوٹی بہن ہے، بھائی ہے۔ ہم نے اگلے ایک دو سالوں میں ان کے رشتے بھی ڈھونڈنے ہیں۔ ہم نے ثروت کا رشتہ کر لیا تو ثروت کے ساتھ ہی بدنامی بھی ہمارے گھر کا راستہ دیکھ لے گی۔ پھر تیری بہن کے لیے یہاں کوئی رشتہ آئے گا اور نہ تیرے بھائی کو ڈھنگ کا رشتہ ملے گا۔"

"امی جان! خدا کے لیے...... خدا کے لیے یہ دقیانوسی باتیں نہ کریں۔ ثروت ویسی ہی ہے، جیسی دو ہفتے پہلے تھی۔ وہ پاک اور معصوم ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہیں ہوا ہے امی! اور اگر خدانخواستہ کچھ ہو بھی جاتا تو اس کو معصوم ہی رہنا تھا۔ میں اسے بیاہنے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ آپ پلیز ایسی باتیں نہ کریں، میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔"

اسی دوران میں ایک ہمسائی ہمارے گھر میں داخل ہو گئی۔ وہ بھی غالباً ثروت والے واقعے پر ہمدردی جتانے کے لیے آئی تھی۔ مجھے اور امی کو خاموش ہونا پڑا۔

میں چکرایا ہوا سا اپنے کمرے میں آ گیا اور بے جان سا ہو کر بیڈ پر گر گیا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ امی جان کے رویے میں جو تبدیلی تھی وہی تبدیلی میں چھوٹے بھائی عاطف میں بھی دیکھ رہا تھا۔ ہاں چھوٹی بہن فرح کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ ثروت

سے بڑا پیار کرتی تھی۔ بہرحال، اس سانحے کے بعد سے وہ بھی کچھ چپ چاپ ہو گئی تھی۔ باقی رہے چچا، چچی اور ان کے بچے...... سو وہ کبھی اس رشتے کے حق میں ہوئے ہی نہیں تھے۔

مجھے اندیشہ تھا کہ اس طرح کی باتیں کہیں ثروت کے کانوں تک پہنچ گئیں تو وہ بہت زیادہ اثر لے گی۔ میرا دل چاہا کہ میں ایک بار اکیلے میں اس سے ملوں اور اسے ہر طرح اپنی غیر مشروط اور غیر متزلزل محبت کا یقین دلاؤں۔ یہ یقین ہی تھا جو اسے دُکھ اور مایوسی کے بھنور سے اُبھرنے میں مدد دے سکتا تھا۔

میں ابھی ثروت کی طرف جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر بیل ہوئی۔ چھوٹے بھائی عاطف نے باہر جا کر دیکھا اور مجھے بتایا کہ کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔

میں باہر پہنچا تو سات آٹھ معزز صورتوں والے افراد باہر گلی میں کھڑے تھے۔ میں نے ان سے فرداً فرداً مصافحہ کیا۔ ایک سفید ریش، بھاری تن و توش والے شخص نے کہا۔

"میرا نام حاجی فیروز ہے۔ شاہ عالمی بازار میں سیٹھ سراج میرا ہمسایہ ہے۔ یہ باقی لوگ بھی بازار کے ہی ہیں۔ ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

طوعاً و کرہاً میں نے ان حضرات کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ویسے بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہ حضرات کس لیے تشریف لائے ہیں۔ جلد ہی مدعا حاجی فیروز کی زبان پر آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ "جو کچھ ہوا ہے، بہت بُرا ہوا ہے۔ ہم سب بہنوں، بیٹیوں والے ہیں۔ اس دُکھ کو بڑی اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک طرف سے اللہ کا شکر بھی ہے کہ بچی صحیح سلامت گھر واپس آ گئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "حاجی صاحب! یہ بات ہم پہلے بھی بہت دفعہ سن چکے ہیں۔ آپ نے جو کہنا ہے صاف صاف لفظوں میں کہیں لیکن اگر آپ یہ بات کہنے کے لیے آئے ہیں ہم سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے سے کسی طرح کی صلح صفائی کر لیں۔ تو یہ ایک نہ ہونے والی بات ہے۔ میں اس کے لیے آپ سے بہت بہت معذرت چاہتا ہوں۔"

حاجی فیروز نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "دیکھو بیٹا! تم عثمان صاحب کے ہونے والے داماد ہو۔ اس گھر میں تمہاری بات سنی بھی جاتی ہے۔ عثمان صاحب اور دیگر گھر والے تو اس وقت زیادہ صدمے میں ہیں لیکن تم انہیں اس معاملے کی اونچ نیچ سمجھا سکتے ہو۔ اس طرح کے کیس جب کورٹ کچہری تک پہنچتے ہیں تو پھر جگ ہنسائی اور پریشانی کے بہت سارے موقعے نکلتے ہیں۔ پریس کا تو سب کو پتا ہی ہے، وہ ایسے معاملوں کو کس طرح اُچھالتا ہے۔

پھر عدالت میں جرح کے دوران عورت سے جس طرح کے سوال پوچھے جاتے ہیں وہ بھی سب جانتے ہیں۔ہم یہ چاہتے ہیں کہ......"

"آپ اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی......لیکن کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ شرمندگی اور جگ ہنسائی سے بچنے کے لیے اس طرح کی ساری مظلوم لڑکیاں اپنی زبانوں کو تالے لگا لیں اور ظلم کرنے والے سینہ تان کر دندناتے پھریں اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے لیے نئے نئے شکار ڈھونڈتے رہیں؟"

حاجی فیروز کے ساتھ آنے والے ایک معزز شخص نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔"تابش بیٹا! جرم کی سنگین نوعیت سے تو کسی کو انکار نہیں لیکن سیٹھ سراج کا لڑکا عادی مجرم نہیں ہے۔وہ بس بُری سوسائٹی کا شکار ہوا ہے۔اگر اسے ایک بار سدھرنے کا موقع مل گیا تو وہ سدھر کر دکھا دے گا۔"

"سزا بھی تو سدھارنے کے لیے ہی ہوتی ہے چاچا جی!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"سزا تو بہت مل رہی ہے،اسے بھی اور اس کے گھر والوں کو بھی......لیکن جس سزا کی تم بات کر رہے ہو،وہ کسی کو سدھارتی نہیں ہے بیٹا جی! جیل میں سے اچھے بھلے لوگ پکے مجرم بن کر باہر نکلتے ہیں۔میں تو سمجھتا ہوں کہ تم لوگ بہت بڑی نیکی کرو گے اگر ان لڑکوں کے لیے دل میں کسی طرح کی نرمی پیدا کر لو گے۔"

میں نے کہا۔"آپ سب مجھ سے زیادہ بڑے اور سمجھدار ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کے لیے یہ موقع مناسب نہیں ہے۔ہمارے زخم ہرے ہیں۔آپ ان پر نمک نہ چھڑکیں تو بہتر ہے۔"

یہ بزرگ دس پندرہ منٹ تک مزید میرے پاس بیٹھے۔وہ مجھے اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ میں کم از کم ایک بار اپنے خالو عثمان اور سیٹھ سراج کی ملاقات کا اہتمام کر دوں۔بہر حال،میں کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو رخصت کرنے میں کامیاب رہا۔

شام کو مجھے پتا چلا کہ یہ "مصالحتی کمیٹی" خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ سے بھی ملی ہے۔تھوڑی محبت اور تھوڑے ڈراوے کے ساتھ انہوں نے خالو عثمان کو کیس کی پیروی سے ہٹانے کی کوشش کی ہے۔

یہ بڑی تلخ صورتِ حال تھی۔ایک گھرانے کو شدید ترین اذیت سے دوچار کرنے کے بعد اب اس کو دباؤ کا شکار بنایا جا رہا تھا۔میری رگوں میں خون کھول رہا تھا اور پورے جسم میں زہر بن کر پھیل جاتا تھا۔میں چاہتا تھا کہ ناانصافی کرنے والوں کی گردنوں تک اپنا ہاتھ

پہنچاؤں اور انہیں گھسیٹ کر چوراہوں میں لے آؤں لیکن ایسا کرنے کے لیے جو فطری ہمت اور توانائی درکار تھی،وہ میرے اندر نہیں تھی۔

اگلے روز صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ میں ثروت سے ملنے خالو کے گھر پہنچا۔مجھے معلوم تھا کہ خالو عثمان اور ناصر بھائی وغیرہ گھر میں نہیں ہوں گے۔خالہ صفیہ کی اجازت سے میں ثروت کے ساتھ چند باتیں کر لوں گا۔

گم صم خالہ سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں ثروت کے کمرے میں پہنچا تو وہ چادر اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔بیڈ پر سرہانے کی طرف اس کی ایک خوبصورت تصویر آویزاں تھی۔یہ گھر کے پھولوں بھرے لان کا منظر تھا۔وہ ہاف سلیو قمیص میں تھی اور واٹر پائپ کے ذریعے اپنے چھوٹے بھتیجے پر پانی پھینک رہی تھی۔پانی کی پھوار کے پیچھے وہ خود کسی جل پری کی طرح نظر آتی تھی۔ہوا سے اُڑتے بال،کلیوں جیسے دانت اور رخساروں پر ٹھہرے ہوئے پانی کے قطرے،جیسے گلاب پر شبنم کا بسیرا ہو۔کتنی شوخی اور خوشی سمٹ آئی تھی اس ایک لمحے میں اس کے اندر۔یہ میری پسندیدہ تصویر تھی اسی لیے ثروت نے اپنے بیڈروم میں لگائی تھی۔

"ثروت!" میں نے ہولے سے آواز دی۔

وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔اس نے چادر اپنے اوپر سے ہٹائی اور سوجی سوجی سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔اس کے چہرے پر تحیر نمودار ہوا اور وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔اس کے عقب میں پھولوں بھرے لان والی تصویر تھی۔کتنا فرق تھا ان دونوں مناظر میں۔ایک میں خوشی کا عروج،ایک میں مایوسی اور غم کی انتہا......وہ دنوں میں ہی مہینوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔"کیسی ہو ثروت؟"

وہ سسکی اور منہ پھیر کر بولی۔"اب کوئی کسر رہ گئی ہے۔جو تم نکالنے آئے ہو۔"

"کیوں......کیا ہوا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جو کچھ ہوا ہے،تمہیں بھی ضرور پتا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری مرضی بھی اس میں شامل ہو۔"

"قسم سے ثروت! مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔کچھ بھی پتا نہیں۔"

"کل تمہاری امی کا فون آیا تھا۔انہوں نے امی سے پتا نہیں کیا باتیں کی ہیں وہ کل شام سے رو رہی ہیں۔نہ کچھ کھایا پیا ہے،نہ کسی سے بات کرتی ہیں۔"

"لیکن پتا تو چلے ثروت! بات کیا ہوئی ہے؟"

''تم انجان بنو تو اور بات ہے۔ ورنہ تمہیں بھی اندازہ ہو گیا ہو گا؟''

ثروت نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اپنے گھٹنوں پر ماتھا ٹیکا اور چہرہ چھپا کر سسکیوں کے درمیان بولتی چلی گئی۔ ''میری طرف سے تم آزاد ہو تابش! میں تم پر کوئی روک نہیں لگاؤں گی۔ نہ گزرے دن یاد دلا کر تم سے کوئی شکوہ شکایت کروں گی۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تمہاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ بس مجھے معاف کر دو۔ میں بدنصیب ہوں۔ خود کو تمہارے لائق نہ رکھ سکی۔ اب جو سزا مجھے ملنی ہے، وہ میں اچھی طرح جان گئی ہوں اور یہ بھی جان گئی ہوں کہ منت سماجت سے یہ سزا معاف نہیں ہونی۔ اس لیے میں قبول کرتی ہوں، سب کچھ قبول کرتی ہوں۔'' وہ روتی چلی گئی۔

میرا دل کٹ کر سو ٹکڑے ہو گیا۔ میں ثروت کی حساس طبع کے بارے میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ثروت! تم کسی کی باتوں پر نہ جاؤ۔ شادی میری اور تمہاری ہونی ہے اور یہ ضرور ہو گی۔ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ امی جان کو بھی وہی کرنا ہو گا جو میں چاہوں گا۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔''

''میرے لیے کس کس سے لڑو گے؟ کس کس کی زبان بند کرو گے؟ میں تمہاری زندگی کو عذاب میں ڈالنا نہیں چاہتی تابش! تم وہی کرو جو تمہارے بڑے کہتے ہیں۔'' اس کا چہرہ بدستور گھٹنوں پر جھکا رہا۔

''ایسا نہیں ہو گا ثروت! اور نہ ہوتا ہے۔ ہاں...... یہ ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہونے میں تھوڑا سا وقت ضرور لگے گا۔ بس اس تھوڑے سے وقت کو ہم نے ہمت اور حوصلے سے گزارنا ہے تم دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میری طبیعت خراب ہے تابش! اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پلیز...... پلیز۔''

میری آنکھوں میں نمی تھی۔ میں اس کے ہاتھ کو تسلی بخش انداز میں تھپک کر باہر آ گیا۔ خالہ صفیہ اور نصرت وغیرہ میں سے کوئی میرے سامنے نہیں آیا اور نہ کوئی بات کی۔

میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آنے والا اس طرح کا واقعہ اس کی اور اس کے وارثوں کی زندگی میں اس طرح کا طوفان مچا سکتا ہے۔ میں بہت پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ امی کچن میں تھیں۔ میرا چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ ''کیا ہوا تابی؟'' انہوں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''یہ تو آپ بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟''

''میں سمجھی نہیں؟''

''آپ نے کل خالہ صفیہ کو فون کیا ہے۔ اس کے بعد سے ان کا رو رو کر بُرا حال ہے۔''

امی نے محبت سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور مجھے ایک طرف کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''تابش! مجھ سے قسم لے لو جو میں نے کوئی ایسی ویسی بات کہی ہو۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں ابھی آ نہیں سکتی کیونکہ فرح کے پیپر ہو رہے ہیں۔ اس لیے مصروف ہوں۔''

''آپ ذرا خود سوچیں امی! جس دن سے یہ واقعہ ہوا ہے آپ صرف ایک دفعہ خالہ کے گھر گئی ہیں۔ فون بھی آپ نے بس ایک آدھ بار ہی کیا ہو گا۔ اگر اب خالہ صفیہ نے آنے کا کہا تھا تو آپ چلی جاتیں مگر آپ نے مصروفیت والی بات کہہ دی اور میں سمجھتا ہوں امی کہ بات سے بھی زیادہ وہ لہجہ اہم ہوتا ہے جس میں بات کہی جاتی ہے۔ آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ......''

''تابش! کوئی بات نہیں ہوئی۔'' امی نے تیزی سے میرا جملہ کاٹا۔ ''بس صفیہ محسوس زیادہ کر لیتی ہے۔''

''اگر آپ کو پتا ہے کہ وہ زیادہ محسوس کرتی ہیں تو پھر آپ کو زیادہ احتیاط کرنی چاہیے تھی۔ ان کی ذہنی حالت آج کل جیسی ہو رہی ہے آپ کو بھی پتا ہے۔''

امی خاموشی سے سبزی بناتی رہیں۔ ان کے چہرے سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''امی! آپ جو بھی سوچتی ہوں لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ میری مرضی کا خیال رکھیں گی۔ بچپن سے لے کر آج تک میرے لیے ہر چھوٹی بڑی چیز آپ نے ہی پسند کی ہے۔ ثروت کو بھی آپ نے ہی پسند کیا تھا۔ یہ آپ ہی کا دکھایا ہوا راستہ ہے جس پر میں چل رہا ہوں۔''

میں اُٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے بیڈ پر اخبار پڑا تھا۔ اس میں پھر سیٹھ سراج کے مفرور صاحبزادے اور ثروت کے بارے میں ایک مختصر خبر موجود تھی۔ خبر کے آغاز میں ہی یہ خیال آرائی موجود تھی کہ متاثرہ لڑکی ''ث'' کی دوستی ماضی میں واجد عرف واجی سے بھی ہے۔ میرا جی چاہا کہ اس اخبار کو جلا دوں اور اس کے ساتھ ہی اس دفتر کو بھی جہاں سے یہ اخبار شائع ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ کچھ نام نہاد صحافی شرفاء کی پگڑیاں اُچھالنے کے لیے اتنے مستعد کیوں ہوتے ہیں؟ میں سوچنے لگا کہ اگر اس اخبار والے کی اپنی بیٹی یا بہن کے ساتھ

اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہوتا تو کیا پھر بھی وہ اسی طرح کی سرخیاں جماتا؟

میں نے اخبار پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ امی جان تو ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ یقیناً یہ چچی یا چچا کا کام ہی تھا جو اتنے اہتمام سے یہ اخبار میرے بیڈ پر رکھا گیا تھا۔

کمرہ بند کر کے میں بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ ثروت کی سُتی ہوئی صورت بار بار آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ چند ہی روز میں وہ کملایا ہوا پھول ہو گئی تھی۔ گزرے ہوئے دو سالوں کا ایک ایک لمحہ میرے تصور میں چمکنے لگا۔ پہلی دفعہ میں نے ثروت کو پورے دھیان سے شادی کی ایک تقریب میں ہی دیکھا تھا۔ اسی تقریب میں امی جان نے بھی اسے خاص نظروں سے دیکھا اور میرے لیے منتخب کر لیا۔ خالہ صفیہ اور پھر خالو عثمان وغیرہ سے بات ہوئی اور دونوں طرف سے ”ہاں“ ہو گئی۔ منگنی کی چھوٹی سی تقریب کا بھی ارادہ تھا مگر وہ بہ وجوہ ٹلتا رہا۔ دراصل دونوں گھرانے ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ اس قسم کے کسی تکلف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔

شُروع میں ہمارے درمیان جھجک تھی۔ پھر عید کے موقعے پر میں نے ثروت کو ایک خوبصورت سا عید کارڈ بھیجا۔ ثروت نے بھی فرح کے ذریعے مجھے کارڈ ارسال کیا۔

اس کے بعد کبھی کبھی فون پر ہماری مختصر بات ہونے لگی۔ ثروت عام کالج گرلز کی طرح ایکسٹرا شوخ نہیں تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک طرح کا وقار اور رکھ رکھاؤ تھا۔ اس کا یہی انداز مجھے زیادہ اچھا لگا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ دانائی اور سمجھ بوجھ رکھتی تھی۔ وہ خداداد ذہانت کی مالک تھی۔ انگلش اور اردو کی بے شمار شاعری اسے زبانی یاد تھی۔

دھیرے دھیرے فون پر ہماری گفتگو بے تکلف ہوتی گئی۔ پھر کبھی کبھی ہم گھر سے باہر بھی ملنے لگے۔ ہمارا ٹھکانا زیادہ تر شیزان ہوٹل یا شاہراہ قائداعظم کا ایک آئس کریم بار ہوتا تھا۔ ثروت ایک دھیمی لیکن مسلسل بارش کی طرح میری ذات میں سرایت کرتی چلی گئی۔ ہم نے سرما کی سنہری دوپہروں، بہار کی خوشبودار شاموں اور گرما کی چاندنی راتوں میں ایک ساتھ بہت سے خواب دیکھے۔ کبھی کبھی تو ہم مستقبل میں اس قدر کھو جاتے کہ اپنے گھر کا ڈیزائن اور اندرونی آرائش کی تفصیلات تک طے کرنے لگتے۔

یہ جیسے کل ہی کی آوازیں تھیں جو میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ہم ریسٹورنٹ کے پُرسکون ماحول میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ”مجھے ٹی وی لاؤنجز وغیرہ میں ذرا سا گہرا رنگ پسند ہے۔“

”اس معاملے میں میری پسند تھوڑی سی مختلف ہے۔ ٹی وی لاؤنج یا کامن روم میں مجھے

ایپل وائٹ بڑا اچھا لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہلکے سبز پردے ہوں اور فرنیچر میں بھی اس کلر کا ٹچ ہو۔“

”لیکن یار! یہ ہلکا رنگ گندا بڑی جلدی ہو جاتا ہے، خاص طور سے ٹی وی لاؤنج میں۔“

”تو بندہ ذرا احتیاط کر لے۔“ وہ چائے کی چسکی لے کر مسکرائی۔

”بندہ تو احتیاط کر لیتا ہے......اور کرے گا بھی......لیکن بچوں کا کیا کیا جائے۔ یہ تو چند ہفتوں بلکہ دنوں میں گلکاریاں کر دیتے ہیں۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر شفق کا رنگ لہرا گیا۔ اس نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”بچوں کو سکھایا جائے تو وہ سب کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ یہ بڑے ہی ہوتے ہیں جن کی عقل میں کوئی بات نہیں آتی۔“

”اگر بڑوں سے مراد میں ہوں، تو میں نے کون سی ایسی بے عقلی کی ہے؟“

”کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ ہر وقت تو ستاتے ہو۔“ وہ ہلکی سی شوخی سے بولی۔

میرے لہو میں میٹھا میٹھا درد جاگ اُٹھا۔ ”اچھا......کوئی ایک بے عقلی تو بتاؤ۔“ میں نے لطف لینے والے انداز میں کہا۔

”ایک بے عقلی تو جناب اب بھی فرما رہے ہیں۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ ریسٹورنٹ میں آہستہ بولا کرو۔“

”زیادہ آہستہ بولنے سے بھی لوگ شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا تو کام ہی شک کرنا ہے۔“

یہ اور اس طرح کی بہت سی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میں کمرے میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ پہلے والی ثروت کتنے عرصے میں واپس لوٹے گی اور لوٹے گی بھی یا نہیں......میری رگوں میں اندھیرا سا اُترنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہت حساس ہے۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اس کے اردگرد جو سرگوشیاں اُبھر رہی تھیں، وہ اسے مزید توڑ پھوڑ رہی تھیں۔

O......❖......O

واجی اور اس کے تینوں دوست ابھی تک لاپتا تھے۔ ان کا لاپتا ہونا بھی ہماری مایوسی میں اضافہ کر رہا تھا اور اس سے بھی بڑی مایوسی یہ تھی کہ مقامی پولیس کا رویہ حوصلہ شکن تھا۔ تھانیدار اشرف واضح طور پر ملزم پارٹی کی سائیڈ لے رہا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ کل خالو عثمان اپنے دوست وہاب صاحب کے ساتھ تھانیدار اشرف سے ملنے گئے تو اس کے اے ایس آئی نے

ان سے درشت لہجے میں بات کی اور ڈیڑھ گھنٹہ باہر بٹھائے رکھا۔ بعد میں بتایا کہ اشرف صاحب ایک ضروری میٹنگ میں چلے گئے ہیں۔

میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا اور اپنی ہی سوچوں سے نبرد آزما رہا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے معاشرے میں کمزور آدمی کو انصاف حاصل کرنے کے لیے برف اور آگ کے سات سمندروں میں سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟ وہ مظلوم و مضروب ہو کر بھی ڈرتا کیوں ہے؟ کیوں ہر دستک پر چونکتا ہے، کیوں ہر فون بیل پر اس کا دل ہولتا ہے؟ عدل کی زنجیر ہلانے سے پہلے اس کے ناتواں ہاتھ کیوں کانپ کانپ جاتے ہیں؟

اگلے روز میں ایک دفتر میں نوکری کے لیے انٹرویو دے کر واپس آ رہا تھا۔ گاڑی عاطف لے کر گیا ہوا تھا اس لیے میں پیدل ہی تھا۔ علامہ اقبال ٹاؤن کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا، ہوٹل ذیشان کے سامنے سے نکلا تو ایک شخص نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ ''سنو بھائی جان!''

میں نے بائیں طرف دیکھا، ہوٹل کی پارکنگ میں ایک چمچماتی ہنڈا گاڑی کے قریب اس کا ڈرائیور کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے میرے قریب آیا۔ ''صاحب بلا رہے ہیں۔'' اس نے اپنے عقب میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا اور چونک گیا۔ یہ سیٹھ سراج تھا۔ یہ سیاہ گاڑی بھی اسی کی تھی۔ سیٹھ سراج سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص میں تھا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا تاہم جسم کے مقابلے میں سر کافی چھوٹا تھا۔ گھنگریالے بالوں میں خوب تیل لگا کر رکھتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ شخص چٹا اَن پڑھ تھا۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور بتیسی دکھا کر بولا۔ ''تمہارا نام تابش ہے نا؟''

''جی فرمایئے۔'' میں نے کہا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ اچھا اتفاق ہے کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔'' وہ گلابی اردو میں بولا۔

''کہیے...... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''یہاں کھڑے کھڑے کیا خدمت ہو سکتی ہے، باؤ جی! تم سے ایک بہت ضروری گل کرنی تھی۔ اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو آؤ ذرا دو منٹ اندر بیٹھ جاتے ہیں۔''

''لیکن میں ذرا جلدی میں تھا۔ دراصل......''

''یار باؤ! یہ دراصل، لیکن، چنانچہ، اگر مگر سب بیکار کے لفظ ہیں۔ بس دو منٹ کی بات

ہے۔ چائے کا ایک کوپ پیتے ہیں۔ پھر تم چلے جانا۔''

اس نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر رکھ دیا۔ چاروناچار میں سیٹھ سراج کے ساتھ چلتا ہوا ہوٹل کے نیم گرم ڈائننگ ہال میں آ گیا۔ اس ہوٹل کی اندرونی سجاوٹ گاؤں کے انداز کی تھی۔ یہاں جدید کھانوں کے علاوہ دیہات کے سارے پکوان بھی ملتے تھے۔ ہم رنگین پایوں والی نواڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ''جی کہیں...... آپ کو کیا کہنا ہے؟''

میری سنی اَن سنی کرتے ہوئے سیٹھ سراج نے بیرے کو بلایا اور کہا۔ ''بس وہی روز والا...... لیکن ڈبل۔''

بیرا ادب سے جھک کر واپس چلا گیا۔ سیٹھ سراج اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے کئی بار چاہا کہ وہ کام کی بات کی طرف آ جائے مگر وہ ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ کھانا آ گیا۔ کھانا کیا تھا، سات آٹھ آدمیوں کی خوراک تھی۔ چھوٹے پائے، روسٹ مچھلی، ہانڈی گوشت، کنہ گوشت اور پتا نہیں کون کون سے گوشت۔ ساتھ میں نمکین لسی سے بھرا ہوا جگ اور تندوری پراٹھے وغیرہ۔

سیٹھ سراج کے بے حد اصرار پر میں نے چند لقمے لیے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اس بھینسے کا لنچ جلد ختم ہو اور میں اس سے جان چھڑا کر باہر نکل سکوں۔ کھانے کے بعد نیپکن سے ہاتھ اور ٹھوڑی وغیرہ صاف کرنے کے بعد سراج نے دو طویل ڈکاریں لیں اور اچانک بولا۔ ''یار باؤ! تم شکل سے سمجھدار لگتے ہو۔ تم ہی اس معاملے کا کچھ کرو۔ منڈوں سے غلطی ہو گئی ہے، پر ہر غلطی کی کوئی مافی تلافی بھی تو ہوتی ہے نا۔ کورٹ کچہری میں جائیں گے تو ساروں کی بدنامی ہو گی اور لڑکی کی زیادہ ہو گی۔ وہ جیسے عثمان صاحب کی دھی ہے، ویسے ہی میری بھی دھی ہے۔ ہم اس بات کو اور بڑھانا نہیں چاہندے۔''

''بات تو اب بڑھ چکی ہے سیٹھ جی! جو بدنامی اب ہو رہی ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ہونی ہے۔ باقی رہی معافی تلافی والی بات تو اس کا آپ لڑکی کے وارثوں سے پوچھیں۔''

''پر تم اس گھر کے ایک اہم بندے ہو یار باؤ! تم کرنا چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔ اپنے خالو صاحب کو بہت کچھ سمجھا سکتے ہو۔ بدلے میں تم جو کام مجھ سے لینا چاہو میں حاضر ہوں۔ اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے باؤ یار! وہ وڈے وڈیرے کہتے ہیں نا کہ ایک ہتھ دوسرے ہتھ کو دھوتا ہے۔''

میرا خون کھول اُٹھا لیکن میں بولا کچھ نہیں۔ سیٹھ سراج طاقت کے زعم میں مجھے اپنی را

پر لانا چاہ رہا تھا۔ اسی دوران میں سیٹھ کے ڈرائیور نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔

''تہاڈی کال اے جی۔''

ان دنوں موبائل فون کم لوگوں کے پاس تھے۔ سیٹھ سراج نے کال اٹینڈ کی۔ ڈرائیور اٹین شین حالت میں پاس ہی کھڑا رہا۔ سیٹھ سراج کچھ دیر تک کال سنتا رہا اور ''ہوں ہوں' کرتا رہا۔ آخر میں بولا۔ ''تم فکر نہ کرو ڈاکٹر صاحبہ! ہمارے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔''

فون بند کر کے اس نے ایک اور نمبر ملایا پھر بولا۔ ''ایم این اے صاحب سے بات کراؤ۔'' چند لمحے بعد ایم این اے مشتاق گورایا سے اس کی بات چیت شروع ہوئی۔ ''او جی کوئی سفارشی ٹٹو آ گیا ہے گورایا صاحب! ڈاکٹرنی کی نوکری پکی ہو گئی تھی۔ اب اسے پیچھے ہٹا کر اپنی کسی پھوپھی چاچی کو آگے لانا چاہندا اے۔ آپ نے یہ کام نہیں ہونے دینا ہے کسی بھی طرح...... ٹھیک ہے...... ہاں جی ٹھیک ہے...... بالکل ٹھیک ہے۔ میں خود جاؤں گا۔ سلاماں لیکم۔''

گفتگو ختم کرنے کے بعد اس نے آدھا گلاس لسی پی اور مونچھیں صاف کر کے بولا۔ ''یہ اپنے گورایا صاحب بڑے کام کے بندے ہیں۔ اپنے شہر کی ساری نہیں تو آدھی نوکریوں پر ضرور ان کا زور چل جاتا ہے۔'' پھر وہ ذرا چونک کر خاموش ہوا اور بولا۔ ''ہاں...... مجھے ایک دن عثمان صاحب سے پتا چلا تھا کہ تم بھی نوکری شوکری ڈھونڈ رہے ہو؟

میں خاموش رہا۔

وہ بولا۔ ''آج کل گورایا صاحب کا ہتھ بہت اگے تک جا رہا ہے۔ اگر تم کہو تو میں آج ہی تمہارے بارے میں ان سے گل کرتا ہوں۔''

''مجھے ایسی سیاسی نوکری نہیں چاہیے جی جو اگلے الیکشن کے بعد چھوڑنی پڑے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ کھانے کے لیے بہت شکریہ۔'' میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یار باؤ! تم بڑے روکھے بولتے ہو۔''

''بس میں ایسا ہی ہوں۔ دراصل......''

''پھر وہی دراصل...... تمہیں کہا ہے نا یہ دراصل...... لیکن...... اگر...... مگر بولنے والے بندے مجھے زہر لگتے ہیں۔ سیدھی سیدھی گل کرنی چاہیے۔''

''کیا سیدھی سیدھی گل کروں؟''

''تم اس معاملے میں کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟''

''جی نہیں۔''

''جی بھی...... اور نہیں بھی۔ تم دوغلی گل کر رہے ہو اور دوغلی گل کرنے والے بندے چنگے نہیں ہوتے۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا۔ اس کی تیل سے چپڑی ہوئی تنگ پیشانی کے نیچے اس کی آنکھوں میں دو چنگاریاں سی چمکیں۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، وہ اپنے ڈرائیور سے بولا۔ ''چلو فتح محمد۔'' بیرے کو لمبی ٹپ دیتا ہوا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں دوسرے دروازے سے بغلی سڑک پر آ گیا۔

سات آٹھ روز اسی طرح گزر گئے۔ صورتِ حال میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ جو دو افراد ثروت کو سڑک سے اُٹھانے والی کارروائی میں شریک تھے، ان کا پتا چل گیا۔ بادی النظر میں تو یہی پتا چلتا تھا کہ وہ کرائے کے غنڈے ہیں۔ انہیں اس کام کے لیے پندرہ ہزار روپے فی بندہ دیا گیا تھا۔ پانچ ہزار پیشگی، دس ہزار کام کے بعد ملا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ انعام وغیرہ بھی تھا۔ ان دونوں افراد کے ساتھ تیسرا بندہ واجی کا یار ''قادر لمبا'' خود تھا۔

اسٹیشن وین بھی واجی وغیرہ نے ہی فراہم کی تھی۔ ان دونوں افراد کی نشان دہی پر پولیس نے واجی کے چوتھے ساتھی ابدال کو پکڑ لیا۔ پولیس نے ابدال کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات روزہ ریمانڈ لیا تھا لیکن ابھی تک اس سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا یا شاید پولیس نے نیک نیتی سے پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ ابدال کا مؤقف تھا کہ وہ واجی وغیرہ کا دوست ضرور رہا ہے لیکن مذکورہ واردات میں اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔

ان سات آٹھ روز میں ثروت سے بھی میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ ہمارے اپنے گھر میں بھی صورتِ حال کچھ کشیدہ سی تھی۔ امی اور فرح میرے لیے پریشان رہتی تھیں۔ ایک روز صبح سویرے گھنٹی بجی۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ یہ فون ثروت کے گھر سے ہے اور وہاں سے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔

میرا اندیشہ درست نکلا۔ نصرت نے روتے ہوئے بتایا کہ ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ ہسپتال میں ہیں۔

یہ تشویشناک صورتِ حال تھی۔ خالو عثمان کو انجائنا کی ہلکی پھلکی تکلیف تو پہلے سے تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں انجیوگرافی کا مشورہ دیا ہوا تھا جسے وہ مسلسل نظر انداز کر رہے تھے۔

ہم بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے۔ اس وقت تک خالو عثمان اپنے خالق حقیقی سے مل چکے تھے۔ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں کہرام مچا ہوا تھا۔ خالہ صفیہ بے ہوش تھیں۔ نصرت، ثروت اور ان کی پھوپھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ دیگر عزیز بھی اشک بار کھڑے تھے۔

ثروت کی پھوپھی جان زینب نے مجھے دیکھا تو روتے ہوئے کہا۔ ''میرے بھائی کو بچی کا دُکھ لے گیا۔ اللہ غارت کرے ان بدمعاشوں کو انہوں نے میرے بھائی کی جان لے لی۔ ہم کہاں انصاف مانگیں۔ کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔''

خالو عثمان کی تجہیز و تکفین کے دوران میں سکتے کی سی کیفیت میں رہا۔ خالو عثمان کو فجر کے وقت دل کی تکلیف شروع ہوئی تھی۔ وہ پہلے تو ہسپتال جانے سے کتراتے رہے پھر جب درد بڑھ گیا تو انہیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں پندرہ بیس منٹ کے اندر وہ ختم ہو گئے۔ میں نے خالہ صفیہ اور ناصر بھائی وغیرہ سے بہت پوچھا کہ کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ہوئی تھی جس کا خالو نے اثر لیا ہو۔ انہیں کوئی ایسی بات معلوم نہیں تھی۔ مگر میرے دل میں نہ جانے کیوں کھٹکا سا تھا کہ ثروت کے حوالے سے ہی کوئی خاص بات ہوئی ہے جس کا دُکھ انہیں پہنچا ہے۔ میرا دھیان بار بار تھانیدار اشرف ساہی اور سیٹھ سراج وغیرہ کی طرف ہی جاتا تھا۔

○......❖......○

خالو عثمان کی وفات کے بعد خالہ صفیہ بھی بستر سے لگ گئیں۔ انہیں مسلسل بخار ہو رہا تھا۔ یہ بڑی پریشانی کے دن تھے۔ ناصر بھائی بینک میں ملازم تھے۔ اپنی ڈیوٹی میں سے وقت نکالنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ نصرت گھر کا کام کاج سنبھالتی تھی، ثروت خود بیمار ہونے کے باوجود ماں کی تیمارداری میں لگی رہتی تھی۔ خالو عثمان ایک پرائیویٹ سروس کرتے تھے۔ اس کے علاوہ چند سال پہلے تک وہ کیمیکلز کی فروخت کا کام بھی کرتے رہے تھے۔ ان کی تنخواہ آنی بند ہوئی تو گھر پر معاشی دباؤ بھی آ گیا۔ لیکن ان سارے مصائب سے بڑی وہ مصیبت تھی جو بدنامی کی صورت میں خالو مرحوم کے گھر پر مسلط ہو گئی تھی۔

ایک دن ناصر بھائی نے مجھ سے کہا۔ ''یار تابش! کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ یہ گھر چھوڑ دیں۔ کہیں اور مکان لے لیں۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہ مکان بیچ دیں؟''

''ہاں...... ایک گاہک بھی لگ رہا ہے۔ اچھے پیسے دے دے گا۔ میں اس جگہ سے کچھ الرجک سا ہو گیا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آتے جاتے سیٹھ سراج یا اس کے گھر کا کوئی اور فرد نظر آ جاتا ہے۔ ان لوگوں کو دیکھتا ہوں تو خون کھول جاتا ہے۔''

''سراج کی صورت تو مجھ سے بھی نہیں دیکھی جاتی۔ خالو کے جنازے پر آیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا، قبرستان میں ہی اسے پکڑلوں اور مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں۔ میں تو کہتا ہوں یہی بندہ خالو کی موت کا ذمے دار ہے۔ یہ مسلسل انہیں ذہنی اذیت پہنچا رہا تھا۔''

''اب کس کس پر الزام دھریں۔ ایک طرف وہ ایس ایچ او اشرف ہے۔ وہ صاف طور پر ملزم پارٹی کی سائیڈ لے رہا ہے۔ پھر وہ ایم این اے گورایا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تینوں لڑکوں کو پناہ بھی اسی نے دی ہوئی ہے۔ کسی دن میں گھوم گیا تو پستول لے کر نکل جاؤں گا اور ایک ایک کو شوٹ کر دوں گا۔''

میں ایک آہ بھر کر رہ گیا۔ شوٹ کرنے اور جان سے مارنے والی باتیں میں بھی کئی دفعہ سوچ چکا تھا لیکن ایسی سوچوں کو عملی جامہ پہنانا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور سے ہم جیسے لوگوں کے لیے۔ سوچ اور عمل کے درمیان بے شمار تاویلیں اور مصلحتیں آن کھڑی ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں ناصر بھائی اس معاملے میں مجھ سے بہتر تھے لیکن کوئی بڑا جھگڑا کھڑا کرنے یا کسی کو شوٹ کرنے کی حد تک وہ بھی نہیں جا سکتے تھے۔

ہم دونوں گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ ہم بھاگتے ہوئے صحن میں پہنچے منظر دل دوز تھا۔ خالہ صفیہ سیڑھیوں کے قریب بے سدھ پڑی تھیں۔ ان کا سر ثروت کی گود میں تھا۔ ثروت مسلسل چلا رہی تھی۔ ''امی جی! آنکھیں کھولیں...... امی جی۔''

خالہ صفیہ کے سر سے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور نچلا ہونٹ بری طرح پھٹ گیا تھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ وہ سیڑھیوں سے گری تھیں، قریب ہی صابن کی ٹکیہ اور چھوٹا تولیہ پڑا ہوا تھا۔

''انہیں ہسپتال لے جاؤ۔'' نصرت دل دوز آواز میں بولی۔

ہم نے خونچکاں خالہ صفیہ کو ہاتھوں میں اُٹھایا اور کسی نہ کسی طرح سوزوکی گاڑی تک پہنچایا، وہ گہری بے ہوشی میں تھیں۔ ثروت بھی والدہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ میں نے حتی الامکان تیزی سے گاڑی چلاتے ہوئے انہیں قریبی ہسپتال پہنچایا۔ راستے میں ثروت نے روتے ہوئے بتایا۔ ''نیچے کا ٹوائلٹ خالی نہیں تھا۔ وہ بخار کی حالت میں اوپر چلی گئیں اور واپس آتے ہوئے گر گئیں۔''

ثریا عظیم ہسپتال والوں نے کہا کہ ان کے سر پر چوٹ لگی ہے، انہیں فوراً جنرل ہسپتال لے جاؤ۔ وہاں ان کے سر کا سی ٹی اسکین وغیرہ ہو گا۔ ہم انہیں لے کر جنرل ہسپتال پہنچے۔

بہت بھاگ دوڑ کر کے سی ٹی اسکین ہوا۔ معلوم ہوا کہ دماغ میں خون کے دو لوتھڑے ہیں جو زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپریشن کی ضرورت ہے۔

اسی روز رات کو خالہ کا آپریشن ہو گیا لیکن وہ ہنوز بے ہوش تھیں۔ ثروت اور نصرت کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ ابھی باپ کی موت کا صدمہ تازہ تھا کہ یہ آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ خالہ صفیہ کی بے ہوشی طویل ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ہماری پریشانیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ آخر ایک صبح ڈاکٹر نے یہ منحوس خبر سنائی کہ وہ قومہ میں چلی گئی ہیں۔

وہ اپنے اردگرد کے تمام دُکھوں اور مسائل سے پیچھا چھڑا کر بے ہوشی کی اوٹ میں اوجھل ہو گئی تھیں۔ میں ان کا چہرہ دیکھتا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس عالم بے خبری میں بھی اپنی مصیبت زدہ بیٹی کے لیے دعاگو ہیں۔ ان کے لبوں کی خفیف لرزش کسی ایسی ہی دعا کی نشان دہی کرتی تھی۔

ہم بھی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان کی زندگی کے لیے، ان کی واپسی کے لیے......

ایک دن ناصر بھائی نے مجھے زبردستی گھر بھیجا تا کہ میں چند گھنٹے آرام کرلوں اور تازہ دم ہو جاؤں۔ شام کے وقت میں نے ناصر بھائی کو فون کیا اور پوچھا۔ ''میں کتنے بجے تک پہنچ جاؤں؟''

دوسری طرف سے چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ناصر بھائی پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

''وہ چلی گئیں تابش! وہ ہمیں چھوڑ گئیں۔''

میں پتھر کا بت بنا بیٹھا رہ گیا۔ تقریباً بارہ دن بے ہوش رہنے کے بعد وہ بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئی تھیں۔

ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ اس گھرانے پر دیکھتے ہی دیکھتے آفتیں ٹوٹ پڑی تھیں۔ کسی وقت تو میں خود کو بھی بُری طرح ملامت کرنے لگتا۔ میں سوچتا کہ شاید آفتوں کے اس سلسلے کا سبب میں ہی بنا ہوں۔ میں نے گھر سے باہر ثروت سے ملنا جلنا شروع کیا۔ میں اسے ریسٹورنٹ میں بلاتا رہا۔ اس میل جول کی وجہ سے واجی بھی شیر ہوا اور شدت سے ثروت کے پیچھے پڑ گیا۔

میں ایک بار پھر ثروت کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی جھیل سی آنکھوں کی چمک لوٹانا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے دُکھ بہت بڑے ہیں مگر میں دُکھوں کا یہ حصار توڑنا چاہتا تھا۔ دل کرتا تھا، میں اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار بنا دوں۔ وہ میرے سینے میں چہرہ چھپا کر آنکھیں بند کرلے۔ میں اس کی طرف بڑھنے والے ہر رنج والم کا رُخ

موڑ دوں۔

خالہ صفیہ کے چالیسویں کے موقعے پر قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ امی تو قرآن خوانی کے بعد جلدی ہی واپس چلی گئیں، میں وہیں موجود رہا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح ثروت سے بات کرنے کا کوئی موقع مل جائے۔ فون تو وہ اُٹھاتی ہی نہیں تھی۔ پچھلے ایک مہینے میں مَیں بیسیوں مرتبہ کوشش کر چکا تھا۔

وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کمرے میں گئی تو میں بھی کچھ دیر بعد اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ مصلے پر بیٹھی تھی اور سلام پھیر کر فارغ ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا سا چونک گئی۔ میں نے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ثروت! اگر میرا کوئی گناہ ہے تو مجھے بتا دو۔ میں ہر طرح کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''کسی کا کوئی گناہ نہیں۔ میں ہی بدنصیب ہوں۔ جو کچھ ہو رہا ہے میری وجہ سے ہو رہا ہے۔'' اس نے حسبِ سابق اپنا سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔

''ثروت پلیز خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرو۔ ناصر بھائی بہت پریشان ہیں۔ اگر تم لوگ خود کو نہیں سنبھالو گے تو وہ بھی بکھر جائیں گے۔''

''میرے بس میں کچھ نہیں۔ اپنی جان لینا حرام ہے، ورنہ شاید ایسا کر لیتی۔''

''مایوسی بھی تو حرام ہے...... کفر ہے۔''

''پلیز تابش! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ بھول جاؤ...... کہ کبھی کوئی ثروت تمہاری زندگی میں آئی تھی۔ اب ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے۔''

''لیکن ثروت......''

''پلیز...... خدا کے لیے...... خدا رسول کے لیے، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میری تکلیف کو اور مت بڑھاؤ۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میرا خیال دل سے نکال دو جیسے تمہاری امی کہتی ہیں اور بڑے کہتے ہیں ویسا کر لو۔'' وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ اسی دوران میں نصرت کی آواز سنائی دی۔ وہ ''آپی...... آپی'' پکارتے ہوئے اوپر آ رہی تھی۔ میں آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات میں دیر تک دیوانوں کی طرح لاہور کی سڑکوں پر پھرتا رہا۔ میرے اندر ایک جوالا مکھی تھا۔ ایک جلتا ہوا لاوا تھا جو ہر قابلِ نفرت شے کو اپنے ساتھ بہا لے جانا چاہتا تھا۔ مگر میری جسمانی طاقت اور میری فطرت اس جوالا مکھی کی تاب نہ لا سکتی تھی اور نہ اس سے پھیلنے والی تباہی کی۔ اس رات سڑکوں پر گھومتے گھومتے میں نے کئی بار سیٹھ سراج کو قتل کیا۔ کئی بار

ایم این اے گورایا کی جان لی اور کئی بار تھانیدار اشرف کو بدترین انجام سے دوچار کیا۔ میرے جیسے لوگ ایسے حالات کا شکار ہو کر یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ اپنے تصورات کا سہارا لے کر دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کبھی سراب سے بھی پیاس بجھا کرتی ہے؟ اس سے تو ناتوانیوں کا دُکھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

کسی وقت دل چاہتا کہ خود فراموشی کا سہارا لوں۔ خود کو شراب میں یا کسی اور نشے میں غرق کر لوں۔ مجھے پتا ہی نہیں چلے کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے یا پھر ویسے ہی کسی طرف نکل جاؤں۔ کچھ عرصے کے لیے اردگرد سے ناتہ توڑ لوں۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل...... بس اس طرح کی لاتعداد سوچیں تھیں جو دماغ کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔

اسی دوران میں چند روز بعد مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مناسب جاب مل گئی۔ جاب ملنے سے جہاں خوشی ہوئی وہاں ایک طرح سے دُکھ نے بھی دل کو چیر ڈالا۔ ثروت کو میری جاب کا بڑا چاؤ تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ جب تم پہلے دن جاب پر جاؤ گے تو ہم اس موقعے کو سیلیبریٹ کریں گے۔ ریسٹورنٹ میں ہائی ٹی لیں گے اور پھر دریائے راوی میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھیں گے۔

آج میری جاب کا پہلا دن تھا۔ مگر ریسٹورنٹ نہیں تھا، ہائی ٹی بھی نہیں تھی اور راوی میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر بھی نہیں تھا۔ سب کچھ ایک دھندلکے میں گم ہو گیا تھا۔

اس شام میں اکیلا ہی شیزان ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ وہی میز تھی جہاں ہم اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ دائیں طرف ایک گلدان رکھا تھا اور شفاف کھڑکی میں سے سڑک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ دل میں آس پیدا ہوئی۔ "دلِ خوش فہم" دور دراز کے امکانات کو ذہن میں لانے لگا۔ یقینی بات تھی کہ ناصر بھائی کے ذریعے ثروت کو بھی میری جاب کی خبر ہو چکی ہوگی۔ شاید اسے یہ بھی پتا ہو کہ آج میری ڈیوٹی کا پہلا دن تھا اور آج اس ریسٹورنٹ کی موسیقی بکھیرتی فضا میں...... ایک نیم تاریک گوشے میں ہم نے اکٹھے بیٹھنا تھا۔ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامنے تھے اور ایک ساتھ مسکرانا تھا۔

میں سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔ دیوانہ دل یہ سوچتا رہا۔ کیا پتا وہ آ جائے۔ اپنی گلابی پھولوں والی چادر کو سنبھالتی ہوئی، اپنے شولڈر بیگ کو بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے متوازن چال چلتی ہوئی۔ خزاں کے سارے رنگ ایک دم بہار کے رنگوں میں بدل جائیں۔

میری آنکھیں منتظر رہیں لیکن کوئی نہیں آیا۔ کسی کو آنا ہی نہیں تھا۔ جب فاصلے پیدا ہو

جائیں تو ایک گھر میں رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوتی۔ یہ تو پھر 60 لاکھ کی آبادی والا شہر تھا۔

میں نے اکیلے ہی چائے پی اور سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ مایوسیوں کی دھند مجھے ڈھانپتی رہی۔

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ "السلام علیکم" کسی نے دلکش آواز میں کہا۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا، سامنے آرسہ کھڑی تھی۔ میں حیران رہ گیا۔ آرسہ چچی سلطانہ کی وہی بھتیجی تھی جس کا رشتہ وہ ماضی میں مجھ سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ یہ لوگ پنڈی میں رہتے تھے۔ میں آرسہ کو یہاں دیکھنے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"تم کب آئیں یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"آج ہی۔ جناب تو صبح کے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ اس لیے خبر کیسے ہوتی۔ ابو امی بھی ساتھ آئے ہیں۔ ابو کی چھٹیاں ہیں۔ اب ایک دو ہفتے آپ کے پاس رہیں گے اور آپ کا ناک میں دم کریں گے۔" وہ چہکی۔

میرا واقعی ناک میں دم ہونے لگا۔ آرسہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ میں نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم یہاں کیسے پہنچیں؟"

"میں فرح کے ساتھ تھوڑی سی شاپنگ کے لیے نکلی تھی۔ اچانک ہماری نظر آپ کی گاڑی پر پڑ گئی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا کہ آپ یہاں بیٹھے ہوں گے۔" اس نے بڑے ناز سے اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"فرح کہاں ہے؟"

"وہ سامنے رکشہ میں بیٹھی ہے۔" اس نے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں فرح اور آرسہ کو لے کر واپس گھر جا رہا تھا۔

آرسہ خوبصورت تھی لیکن اس کی خوبصورتی سورج کی طرح تھی۔ چمکیلی، بھڑکیلی اور کبھی کبھی جلاتی ہوئی۔ اس کا رنگ غیر معمولی سفید تھا۔ آنکھیں براؤن، بال شہد رنگ اور جسم منہ زور۔ وہ بڑی تیزی سے بولتی تھی۔

اس کا موازنہ ثروت سے کیا جاتا تو ثروت کی خوبصورتی کو چاندنی سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ بے شک چاندنی، دھوپ سے کم روشن ہوتی ہے لیکن اس کا ایک اپنا حُسن اور دھیما پن ہوتا ہے۔ ایک پُر وقار ٹھہراؤ، ایک ٹھنڈک اور ایک جذب ہو جانے والی صلاحیت۔ اس لیے آرسہ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی اور اس کی یہ بے موقع آمد تو اور بھی بُری لگی۔

وہ پورے گھر میں دندنانے لگی۔ بلاوجہ میرے کمرے میں بھی آ جاتی تھی۔ خاص طور پر وہ آج کل والدہ کے اردگرد بہت گھوم رہی تھی۔ ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو میرا پورا کمرہ بڑی اچھی طرح سنورا سنبھالا ہوا تھا۔ آرسہ میرے ہی بیڈ پر اوندھی لیٹی انگلش میوزک پر ہولے ہولے پاؤں ہلا رہی تھی۔ اس نے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔

میری چاپ پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''یہ کیا ہے آرسہ؟'' میں نے ناگواری کا اظہار کیا۔

''یہ تمہارا کمرہ ہے ڈیئر! اور یہ میں ہوں۔'' وہ بستر پر نیم دراز ہو کر بولی۔

''مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا آرسہ۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تمہارا مطلب میرے لباس سے ہے؟''

''میرا مطلب تمہاری ہر چیز سے ہے۔''

اس کے چہرے پر رنگ سا لہرایا پھر وہ ڈھیٹ بن کر مسکرائی۔ ''پتا نہیں اس فقرے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

میں ٹپٹایا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ یونہی منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر باہر نکلا تو وہ جا چکی تھی۔

امی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''یہ تُو کیا بول رہا تھا آرسہ سے؟''

''وہ میرے کمرے میں کیوں آ جاتی ہے؟''

''میں نے ہی کہا تھا اسے کہ ذرا تیرا کمرہ دیکھ لے۔'' امی نے کہا۔

میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے امی کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

''امی! مجھے صاف صاف بتائیں آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟ کیوں باسی کڑی میں اُبال دے رہی ہیں؟ میں اتنا انجان نہیں ہوں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔''

''تابی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ وہ تو چند دن کے لیے یہاں آئی ہے پھر چلی جائے گی۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ اس کی طبیعت ذرا شوخ ہے۔ اگر اس نے......''

''مجھے ایسی شوخیاں نہیں چاہئیں امی!'' میں نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔ ''پلیز...... اسے کہہ دیں کہ میرے کمرے میں نہ آیا کرے۔ میں اس کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔''

''اچھا...... آہستہ بولو۔ کوئی سن لے گا۔ میں سمجھا دوں گی اسے لیکن آرسہ کے ابو امی کے پاس تو دو چار منٹ بیٹھ جایا کرو۔ وہ کیا کہیں گے کہ اچھے مہمان آئے ہیں۔''

''ان کے لیے چچی چچا کافی ہیں۔ میرے اپنے بہت سے مسئلے ہیں۔ کام کا بوجھ اتنا

زیادہ ہے کہ کئی دن سے خالہ صفیہ کے گھر بھی نہیں جا سکا۔ ان کا فون بھی نہیں ملتا ہے۔''

''فون تو میں نے بھی ایک دن کیا تھا۔ بس بیل ہوتی رہی۔''

''لیکن امی! کیا اگر فون نہیں ملے گا تو ہم ان کا اتا پتا ہی نہیں لیں گے؟ ہنستا بستا گھر تھا، ویران ہو گیا ہے۔ وہ تینوں بالکل بے سہارا ہو گئے ہیں۔ ہمیں تو ہر گھڑی ان کی خبر رکھنی چاہیے اور...... آپ...... کہہ رہی ہیں کہ ایک دن فون کیا تھا۔''

ایک دم امی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ چپ سی ہو گئیں۔ پھر بولیں۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ کل ان کی طرف جائیں گے۔ فرح کو بھی لے جائیں گے۔''

''صرف جانے سے کچھ نہیں ہوگا امی! پہلے ہم سب اپنا ذہن صاف کر لیں۔ یہ بات اچھی طرح اپنے دماغ میں بٹھا لیں کہ ہمیں ان حالات میں ان لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑنا۔ ان کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو نبھانا ہے۔ ثروت وہی ہے جو آج سے چند ماہ پہلے تھی اور اگر خدانخواستہ اس واقعے میں اس کے ساتھ کچھ ہو بھی جاتا تو میرے لیے......'' میری آواز بھرا گئی اور میں فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

امی نے کہا۔ ''اچھا تُو دل چھوٹا نہ کر۔ ہم کل چلیں گے ان کی طرف۔''

''لیکن مجھے اس طرح نہیں جانا جس طرح ہم پہلے جاتے رہے ہیں۔ ہم ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں مزید گھبرا کر کے آ جاتے ہیں۔ جو کچھ اس بیچاری کے ساتھ ہوا ہے، وہ خدانخواستہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ تو کیا ہم اسے دھتکار پھٹکار کر ایک طرف رکھ دیں گے؟ اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے؟'' میرے سینے میں تپش تھی۔ میں بولتا چلا گیا۔

اس روز میرے اور امی کے درمیان آدھ پون گھنٹہ بات ہوئی۔ پتا نہیں کہ میں انہیں کس حد تک قائل کر سکا مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ ثروت کے ہاں خوش دلی سے جانے اور ان سے رابطہ برقرار رکھنے پر آمادہ ہو گئیں۔

اگلے روز گھر سے نکلنے سے پہلے فرح نے پھر ثروت کے گھر فون کیا۔ حسبِ سابق بیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ ہم روانہ ہوئے۔ راستے سے ہم نے آئس کریم اور فروٹ وغیرہ لیا۔

ثروت کے گھر پہنچ کر دیر تک بیل دیتے رہے پھر گیٹ کھٹکھٹایا لیکن اندر سے کوئی برآمد نہیں ہوا۔ ساتھ والے پڑوسی نے دروازہ کھولا۔ مجھے پہچان کر علیک سلیک کی پھر بتایا کہ ناصر صاحب اور ان کی فیملی تو یہاں سے جا چکے ہیں۔

"کہاں......کب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تقریباً آٹھ دس دن ہو گئے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا؟ وہ تو کافی دن سے تیاری میں تھے۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"جرمنی......غالباً فرینکفرٹ میں۔"

میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ امی اور فرح بھی میرا منہ دیکھ رہی تھیں۔ سینے میں کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ پڑوسی نے کہا۔

"آپ آیئے نا...... ہماری طرف آ جایئے۔"

"نہیں شکریہ۔" میں نے کہا۔ "ان کا کوئی رابطہ نمبر وغیرہ؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ وہاں سے جا کر بھیج دیں گے لیکن ابھی تک تو نہیں آیا۔ آپ کونے والے پراپرٹی ڈیلر حاجی صاحب سے پوچھ لیجیے۔ شاید ان کا رابطہ ہوا ہو ناصر سے۔ کل ایک گاہک بھی آیا ہوا تھا حاجی صاحب کے پاس۔"

"کس چیز کا گاہک؟" میں نے پوچھا۔

"یہی ناصر صاحب کے گھر کا۔ وہ اس کی فروخت کے لیے حاجی صاحب ہی کو کہہ کر گئے ہیں۔"

"یعنی وہ مکان بھی بیچنا چاہ رہے ہیں؟" امی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں جی...... کچھ ایسا ہی سلسلہ لگ رہا ہے۔ شاید اب وہ جلدی واپس نہیں آئیں گے۔"

میں چکرا کر رہ گیا۔ میں نے پچھلے دنوں ایک دو بار ناصر بھائی کی زبانی یہ تو سنا تھا کہ وہ یہ گھر چھوڑنا چاہ رہے ہیں لیکن یہ وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہ ملک ہی چھوڑ جائیں گے اور وہ بھی اس طرح کہ کسی عزیز رشتے دار کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

ناصر بھائی سے چھوٹا حماس پچھلے تین چار سال سے جرمنی میں ہی مقیم تھا۔ وہ سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ ایک بار پہلے بھی ناصر بھائی سیر و تفریح کے لیے اس کے پاس جرمنی جا چکے تھے۔ والدہ کی وفات پر حماس جرمنی سے آیا تھا اور دس پندرہ روز رہ کر لوٹ گیا تھا۔ شاید انہی دنوں میں گھر کے اندر کوئی مشورہ وغیرہ ہوا تھا اور اب ناصر بھائی نے ثروت اور نصرت سمیت جرمنی کا رُخ کر لیا تھا۔

فرح نے پریشانی سے کہا۔ "مجھے تو یقین نہیں آ رہا بھائی! ایک دم...... بغیر کسی کو بتائے

ائے۔"

امی نے کہا۔ "یہ جو حاجی صاحب ہیں ان سے پوچھو۔ شاید کوئی اتا پتا دے گئے ں۔"

ہم نے حاجی صاحب سے پوچھا لیکن ان کے پاس بھی ابھی تک کوئی اطلاع نہیں تھی۔ م مایوسی کے عالم میں واپس ہوئے۔ گھر کے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچانک ری نظر گیٹ کے نچلے حصے کی درز میں گئی۔ اندر کی طرف ایک براؤن لفافہ سا پڑا ہوا تھا۔ ں نے گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گیٹ پر جا کر میں نے ہاتھ نیچے سے اندر گھسایا اور لفافہ نکال

گاڑی میں آ کر میں نے دیکھا، یہ کوئی عدالتی نوٹس تھا۔ ایڈریس میں مرحوم خالو عثمان کا م لکھا ہوا تھا۔ امی سے مشورے کے بعد میں نے لفافہ کھولا۔ یہ ایک سمن تھا...... تحریر سے پتہ لتا تھا کہ اس سے پہلے بھی دو نوٹس بھجوائے جا چکے ہیں جن کی تعمیل نہیں ہوئی ہے۔ سمن میں ی ایسے پلاٹ کا ذکر ملتا تھا جو خالو عثمان نے دکان کی تعمیر کے لیے حاصل کیا تھا لیکن عدازاں قانون شکنی کرتے ہوئے اسے فروخت کر دیا تھا۔ اب یہ معاملہ عدالت کے رُوبرو ھا۔

"پتا نہیں یہ کس پلاٹ کا ذکر ہے۔" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

امی نے تفصیل پوچھی۔ میں نے انہیں بتائی۔ امی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر جیسے انہیں یک دم کچھ یاد آیا۔ کہنے لگیں۔ "میرا خیال ہے کہ یہ...... وہ کیمیکل کی مارکیٹ والا پلاٹ ہو گا۔"

"کون سی مارکیٹ؟"

"دراصل یہ جھگڑا کوئی آٹھ دس سال پہلے شروع ہوا تھا۔ کیمیکل بیچنے والی دکانیں شہر ں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ گورنمنٹ نے کوئی سروے کیا تھا اور پھر ان سارے دکانداروں کو ام آبادی سے ہٹ کر ایک کھلی جگہ پر پلاٹ دیئے تھے۔"

"وہ کس لیے؟" فرح نے پوچھا۔

"تاکہ یہ خطرناک کام عام آبادیوں کے اندر نہ ہو بلکہ کسی کھلی جگہ پر کیا جائے۔ اس ام میں آگ وغیرہ لگنے کا خطرہ رہتا ہے نا۔" امی جان نے وضاحت کی۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے زیادہ تو پتا نہیں ایک بار یہ سنا تھا کہ عثمان کو بھی پلاٹ ملا تھا لیکن اس نے بعد میں

بیچ دیا۔ شاید یہ کوئی وہی چکر ہے۔''

ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ اس قسم کی بات میں نے بھی سنی تھی۔

وہیں پر کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ جب ہم سڑک کا موڑ مڑ رہے تھے تو میں نے سیٹھ سراج کی سیاہ چمکیلی گاڑی دیکھی۔ وہ اپنے گھر کی طرف مڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ پچھلی نشست پر اسی کی طرح کا ایک ہٹا کٹا شخص بیٹھا تھا۔ دونوں کسی بات پر کھل کر ہنس رہے تھے۔ سیٹھ نے مجھے نہیں دیکھا لیکن میں نے اسے دیکھ لیا۔ سینے میں ایک بار پھر وہی آتشیں لہر دوڑی جو میرے سراپا کو بے... رکھ دیتی تھی۔

گھر آ کر میں دیر تک اس دردناک صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ ناصر بھائی جس طرح پاکستان چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ کسی سے رابطہ ہی رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ انہوں نے میرے کانوں میں بھی اپنی ''ہجرت'' کی بھنک تک نہیں پڑنے دی تھی۔ شاید وہ یہاں سے اپنا ہر ناتا توڑنے کے خواہاں تھے۔

''کیا نہیں ایسا کرنا چاہیے تھا؟'' میں نے بہ زبان خاموشی خود سے کہا۔

اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل تھا۔ ناصر بھائی کو کلی طور پر غلط بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہاں جس طرح جگ ہنسائی ہوئی تھی اور میڈیا نے جس طرح اس واقعے کو اچھالا تھا اور اس کے بعد قانونی کارروائی میں جس طرح کی دل شکنی ہو رہی تھی، ناصر بھائی کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا۔

تو کیا اب میں کبھی ثروت کو اپنا نہیں سکوں گا۔ اسے دیکھ نہیں سکوں گا؟ یہ سوال تیر کی طرح میرے سینے میں لگا اور نڈھال کر گیا۔

میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس وقت میری نظر اس براؤن لفافے پر پڑی جو میں ناصر بھائی کے گھر سے لے کر آیا تھا۔ میں نے لفافہ اُٹھا لیا اور سوچنے لگا کہ کیا جو پریشانیاں خالو عثمان کی بے وقت موت کا باعث بنیں، ان میں یہ پریشانی بھی شامل تھی؟

پتا نہیں کیوں مجھے شک گزرنے لگا کہ اس پریشانی کا کچھ نہ کچھ تعلق ثروت والے واقعے سے بھی تھا۔ میں نے ممن کی تحریر کئی بار پڑھی اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ سارا کیا معاملہ ہے۔

اگلے روز میں ابو جان کے دوست وکیل سلیم جہانگیر صاحب سے ملا۔ انہوں نے میری پوری بات سننے کے بعد مجھے ایل ڈی اے کے ایک افسر صدیقی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ صدیقی کافی باخبر بندہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''گورنمنٹ نے کیمیکل کا کام کرنے والوں کو

علیحدہ پلاٹ الاٹ کیے تھے تاکہ وہ آبادیوں میں اپنا کام ختم کر دیں۔ ان لوگوں نے پلاٹ تو لے لیے مگر اپنی پرانی جگہوں پر کام بھی کرتے رہے۔ بعد ازاں کچھ لوگوں نے کیمیکل مارکیٹ کے وہ پلاٹ فروخت کر دیئے۔ ان میں یہ آپ کے خالو عثمان صاحب بھی شامل تھے۔''

''تو کیا ان پر کوئی کیس وغیرہ بن گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں...... کئی افراد پر کیس بنے۔ آپ کے خالو اور دو دیگر دکانداروں نے ایک مشترکہ وکیل کے ذریعے اپنا دفاع کیا۔ یہ معاملہ دب گیا اور پھر سرد خانے میں چلا گیا۔ مگر کچھ دن پہلے ایک صحافی صاحب نے اس معاملے کو پھر تازہ کر دیا۔ آپ کے خالو اور ان کے دونوں ساتھیوں کے خلاف انکوائری پھر شروع ہو گئی۔ میرے خیال میں یہ کام کسی نے بدنیتی اور دشمنی کی وجہ سے کیا ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ صحافی کسی کے کہنے پر حرکت میں آیا تھا؟''

''میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔ آپ کل تشریف لائیں تو میں اس بارے میں آپ کو مزید تفصیل بتا سکوں گا۔''

اگلے روز میں صدیقی سے ملنے اس کے دفتر پہنچا۔ اس نے حسبِ وعدہ اس معاملے کی پوری تفصیل اکٹھی کر لی تھی۔ میرے بدترین خدشے حقیقت میں بدل گئے۔ اس سارے کام کے پیچھے ایم این اے گورایا کے ایک پی اے کا ہاتھ تھا۔ شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ایم این اے گورایا کا تعلق سیٹھ سراج سے ثابت تھا اور سیٹھ سراج جس قسم کا شخص تھا، وہ میں دیکھ ہی چکا تھا۔ ذیشان ہوٹل میں اس نے مجھے جو زبردستی لنچ کرایا تھا، وہ مجھے ابھی تک یاد تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکنے والی دو چنگاریاں بھی مجھے بھولی نہیں تھیں۔ وہ مجھ سے بڑے لطف اور دوستانہ لہجے میں بات کرتا رہا تھا لیکن یہ چنگاریاں اس لب و لہجہ سے بالکل جدا تھیں۔ یہ چنگاریاں اپنے پیچھے ایک الاؤ کا پتا دیتی تھیں۔

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ نرم ڈپلومیسی میں ناکام ہونے کے بعد یہ لوگ خالو عثمان پر کسی ذریعے سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ آج اس دباؤ کا پتا چلا تھا اور یقیناً یہی دباؤ تھا جس نے آناً فاناً خالو عثمان کی زندگی چھینی تھی۔ نہ صرف ان کی زندگی بلکہ خالہ صفیہ کی بھی اور یہی نہیں بلکہ ایک ہنستے بستے گھر کو تالا بھی لگا دیا تھا۔ اس گھر میں رہنے والے اَن گنت پریشانیوں کے ریلے میں بہہ کر تتر بتر ہو گئے تھے۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس پلاٹ والی اچانک پریشانی کے بارے میں خالو عثمان نے گھر والوں کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ ان کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

انہوں نے خود ہی سارا بوجھ اپنی جان پر لیا تھا اور اپنی حرکتِ قلب بند کر لی تھی۔

صدیقی کے انکشافات کے بعد میرے دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔ مجھے اپنے آ سے اور اپنی ناتوانیوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ میں کیوں کچھ کر نہیں سکتا؟ جن لوگوں ۔ زیادتی کی ہے وہ میرے سامنے ہیں لیکن ان کے گریبانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے ہاتھ کانپ کر نیچے کیوں گر جاتے ہیں؟

یہ بہت سنگین موقع تو ضرور تھا لیکن "پہلا" نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بہت دفعہ ایسا ہو تھا۔ مجھ سے ناانصافی ہوئی تھی لیکن میں قرار واقعی مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ مجھے بچپن کی د چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی یاد تھیں جن کا نتیجہ اکثر میری شرمندگی اور پسپائی کی صورت میں ہ نکلا کرتا تھا۔ محلے کا ایک یونس ظفر نامی لڑکا اور اس کی ٹولی ابھی تک مجھے بھولی نہیں تھی۔ یہ لوگ گاہے بگاہے مجھ سے لڑائی مول لیتے تھے اور میری زندگی اجیرن کیے رہتے تھے۔ پھر سکول کے زمانے کے وہ چھوٹے بڑے واقعات جب عموماً مجھے اپنی فطری کم ہمتی کی وجہ سے ہ ندامت اور ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کالج کے دور میں مجھے اپنے وہ شریر پڑوسی بھی یا تھے جو کرائے دار کے طور پر آئے تھے اور انہوں نے دو ڈھائی سال تک ہمارا اور خاص طو سے میرا جینا حرام کیے رکھا تھا۔ بے شک لڑائی دنگا قابلِ تعریف بات نہیں ہے لیکن ایک عام شخص کی زندگی میں کئی موقعے ایسے آتے ہیں جب اس کی ساری ذہانت، سوجھ بوجھ اور فراست ایک طرف دھری رہ جاتی ہے۔ اس وقت اسے کسی تندخو کے ہاتھوں بے عزت ہونا پڑتا ہے یا پھر نگاہیں جھکا کر اور عرقِ ندامت میں ڈوب کر پسپا ہونا پڑتا ہے۔

میں نے اس سے پہلے جو مارشل آرٹ اور کراٹے کلب وغیرہ کا ذکر کیا تھا، اس کے پیچھے بھی میری یہی ناتوانیاں، محرومیاں اور ہزیمتیں وغیرہ عمل کرتی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ میں جسمانی طور پر مضبوط ہو جاؤں گا تو میرے لیے نزاعی معاملات سے نمٹنا آسان ہو جائے گا اور موقع پڑنے پر میں کسی کے "پنجۂ ستم" کو مروڑ بھی سکوں گا۔ لیکن اب دھیرے دھیرے یہ بات میری سمجھ میں آئی تھی کہ مارشل آرٹ وغیرہ کی سرگرمیاں کسی لڑاکے کو تو مزید لڑاکا بنا سکتی ہیں لیکن کوئی ایسا شخص جس کی فطرت میں مار دھاڑ اور مارا ماری نہیں ہے، مارشل آرٹ کی اعلیٰ سندیں حاصل کر کے بھی ٹکراؤ اور مار کٹائی کی صورتِ حال سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

تازہ ترین مثال میرے سامنے تھی۔ موجودہ انکشافات کے بعد میرا دل چاہتا تھا کہ میں دندناتا ہوا سیٹھ سراج کے پلازہ پر پہنچ جاؤں۔ کچھ اور نہ بھی کروں تو کم از کم اسے گریبان سے ضرور پکڑوں، اسے جھنجھوڑوں اور پوچھوں کہ اس نے ظلم کے اوپر ظلم کیوں کیا؟ بیٹی کے اغوا

کے زخم نہیں بھرے تھے کہ اس نے باپ کی بھی موت کی سزا سنا دی۔

لیکن یہ کرنے کے لیے اور اس کے بعد کے دوسرے اقدام کرنے کے لیے جس ہمت اور سختی کی ضرورت تھی، وہ میرے اندر نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ میں سوچتا تھا اور اپنے ہی پسینے میں ڈوبنے لگتا تھا۔

اگلے روز میرے اندر کے طیش نے شدید ابال کی صورت اختیار کی اور میں سیٹھ سے بات کرنے کے لیے اس کے پلازے پر پہنچ گیا۔ میں اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا، نہ ہی کسی طرح کی مار کٹائی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میں اس سے اتنا ضرور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے خالو عثمان کے زخموں کا مداوا کرنے کے بجائے ان کی جان کیوں لے لی؟ اس بات میں اب شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی کہ پلاٹ والا معاملہ صرف سیٹھ سراج کی وجہ سے ری اوپن ہوا ہے۔ بے شک اس پلاٹ والے معاملے میں چند سال پہلے خالو عثمان سے غلطی ہوئی تھی اور ایسی غلطی بہت سے دوسرے لوگوں سے بھی ہوئی تھی۔ اس قسم کی غلطیاں تقریباً ہر شخص کی زندگی میں موجود ہوتی ہیں لیکن جو سزا خالو عثمان کو ملی تھی، وہ اس کے ہرگز حق دار نہیں تھے۔ میں نے اپنی گاڑی سیٹھ کے "سراج پلازہ" سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی اور سوچنے لگا کہ اس سے کس طرح بات کروں اور بات کو کہاں تک محدود رکھوں کہ ہاتھا پائی تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

بے شک میں لڑنے کے لیے نہیں جا رہا تھا لیکن ایسے معاملات میں تلخ کلامی اور ہاتھا پائی کے درمیان بس ایک موہوم سی لکیر ہی ہوتی ہے۔ سیٹھ کے لیے میرے اندر جو طیش تھا، وہ میری جسمانی برداشت سے بہت بڑھ کر تھا۔ میں گاڑی کے اندر ہی اپنا لائحہ عمل مرتب کرتا رہا۔ جوں جوں میں سوچتا گیا، میرے طیش پر میرا اندرونی خوف غالب آتا گیا۔ بات بہت بڑھ گئی تو کیا ہوگا؟ تھانے کچہری تک چلی گئی تو کیا ہوگا؟ کیا میں سیٹھ کے رُوبرو ٹھیک سے بات کر پاؤں گا؟ کیا میرے اعصاب جواب تو نہیں دینے لگیں گے؟

میں جوں جوں سوچتا گیا، میری پیشانی پسینے سے تر ہوتی گئی۔ سینے میں دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹانگوں میں لرزش نمودار ہو چکی ہے اور اگر میں چل کر سیٹھ کی دکان کی طرف گیا تو لڑکھڑاتا ہوا جاؤں گا۔

یہ عجیب کیفیت تھی اور یہ ہمیشہ سے میرے ساتھ تھی۔ "کیا بات ہے یار! کیا یہیں پر رات گزارنے کا ارادہ ہے؟" کھڑکی میں سے آواز آئی اور میں چونک گیا۔

ایک درمیانی عمر کا شخص غصے اور طنز کی ملی جلی کیفیت سے گاڑی کی کھڑکی میں جھکا ہوا تھا

اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ''بھائی جی! کہاں پہنچے ہوئے ہو۔ گاڑی آگے کرو۔''

تب مجھے احساس ہوا کہ عقب میں ہارن سنائی دے رہے ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میری گاڑی ذرا ترچھی کھڑی تھی اور عقب میں دو تین گاڑیاں راستہ ملنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''سس...... سوری جی۔'' میں نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا اور گاڑی آگے کر لی۔

جب میرے اعصاب جواب دینے لگتے تھے تو مجھے خود پتا چل جاتا تھا اور میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں مجھے یقین ہو گیا کہ اپنے تمام تر اندرونی طیش کے باوجود میں سیٹھ کا سامنا نہیں کر سکوں گا۔ اپنے ہی پسینے میں ڈوبا ہوا میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں نے بڑی تیز رفتاری سے گاڑی چلائی۔ کئی جگہ ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ میرا مر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ سخت کرب اور مایوسی کے عالم میں اپنی بند مٹھی پارک کے پتھریلے بنچ سے ٹکراتا رہا اور ہاتھ کی کھال چھیل لی۔ انگلیوں سے خون ٹپکنے لگا۔

تب ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھا اور آندھی طوفان کی طرح انارکلی پہنچ گیا۔ وہیں مارشل آرٹ کے کلب میں۔ دل و دماغ بڑی جذباتی بلکہ ہیجانی کیفیت میں تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ اپنی ساری کم ہمتی اور ناتوانیوں کو اپنے اندر سے اُکھاڑ کر پھینک دوں۔ کچھ ایسا کروں کہ خود ختم ہو جاؤں یا پھر اپنی بے بسی کو ختم کر دوں۔ میں سوچنے لگا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنے آپ کو مارشل آرٹ میں فنا کر دوں؟ اتنی محنت کروں، اتنی اذیت جھیلوں کہ بس پتھرا جاؤں۔ پھر اس پتھر کو درد کا احساس رہے نہ کسی ہزیمت کا اندیشہ۔

میں گاڑی میں تھا اور جیسے فیصلے کی سولی پر لٹک رہا تھا۔ ان دنوں مجھے کلب چھوڑے ہوئے پھر تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ اب پھر کلب کا دروازہ میرے سامنے تھا اور میں اس کے اندر جانے کا تہیہ کر رہا تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹے تک یہ شدید جذباتی کیفیت جاری رہی پھر میں نے اپنے ہی خیال کو رد کرنا شروع کر دیا۔ ذہن نے معروضی انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے بھی تو کتنے موقعے آئے تھے جب میں نے پوری تن دہی اور مستقل مزاجی کے ساتھ مارشل آرٹ سے ناتہ جوڑنے کا تہیہ کیا تھا۔ بڑے بڑے ارادے باندھے تھے لیکن ہوا کیا تھا؟ ہر بار جب کچھ وقت گزر گیا تھا، ذہن میں ہزیمت، طیش اور پسپائی وغیرہ کے اثرات مدھم پڑے تھے۔

سارے ارادے اپنی طاقت کھونے لگے تھے اور آخر ختم ہو گئے تھے۔

''تو کیا اس بار بھی یہی ہو گا؟''

ذہن سے جواب آیا۔ ہاں...... اس بار بھی یہی ہو گا۔ تم وقتی طور پر فرار حاصل کر لو گے لیکن باقی کے سارے معاملات جوں کے توں رہیں گے۔ کچھ بھی نہیں بدلے گا۔ میں نے اس انداز میں سوچنا شروع کیا تو مارشل آرٹ والی سوچ مجھے بچکانا لگنے لگی۔ تو پھر کیا کروں؟ میں نے بہ زبان خاموشی خود سے پوچھا۔

○....❖....○

کوئی ایک گھنٹے بعد میں والد صاحب کے دوست ایڈووکیٹ سلیم جہانگیر کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ کاغذات کا پلندا بھی تھا۔ سلیم جہانگیر کے ساتھ میری تفصیلی بات ہوئی۔ میں نے اس معاملے کے سارے قانونی پہلوؤں پر ڈسکس کیا۔ میں نے جہانگیر صاحب سے پوچھا کہ اگر ہم اس کیس کی تفتیش تبدیل کرانا چاہیں یا پھر واجی کے باپ پر کسی طرح کا مقدمہ کرنا چاہیں تو اس کے لیے کیا کرنا ہو گا؟

ایڈووکیٹ جہانگیر صاحب نے جو طریقہ کار بتایا، وہ خاصا حوصلہ طلب تھا۔ اس میں وقت اور پیسہ دونوں کی وافر ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ جوابی کارروائی کے اندیشے بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کی توقع تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ سیٹھ جیسا بندہ اپنے اوپر ہونے والے اٹیک کے بعد خاموش بیٹھا رہے گا۔

ایڈووکیٹ سلیم جہانگیر صاحب سے ملنے کے بعد جب میں گھر واپس پہنچا تو خود کو پہلے سے زیادہ نڈھال اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ سیٹھ جیسے بندے کے خلاف قانونی چکروں میں پڑنا اور پھر ڈٹے رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ خاص طور سے اس صورت حال میں کہ مقدمے کے اصل مدعی بھی اب پاکستان میں نہیں تھے۔

رات کو کھانے کی میز پر سب ہی موجود تھے۔ آرسہ بھی آئی ہوئی تھی۔ ویسے تو وہ چچا چچی کی مہمان تھی لیکن کسی وقت فرح کے کہنے پر اوپر سے نیچے آ جاتی تھی۔ میرے ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر امی بُری طرح چونکیں۔ ''یہ کیا ہوا تابش؟''

''کچھ نہیں امی! دفتر میں شیشہ لگ گیا تھا۔''

امی نے بیتابی سے ہاتھ دیکھا۔ ''لیکن ہاتھ تو سوجا ہوا ہے تمہارا؟''

''لگتا ہے کچھ چھپایا جا رہا ہے ہم سے۔'' آرسہ نے حسب عادت شوخ انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے گھور کر بیزار لہجے میں کہا۔

وہ مجھے نظر انداز کر کے امی سے بولی۔ ''آنٹی! لگتا ہے کہ تابش نے کہیں لڑائی شڑائی کی ہے۔ ان کی آنکھیں بھی دیکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

''واقعی کہیں لڑائی ہوئی ہے؟'' امی کی بے قراری بڑھ گئی۔ ''کہیں چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟''

''اوہو...... آپ پریشان نہ ہوں آنٹی! یہ مار کھا کر نہیں آئے، مار کر آئے ہیں۔ میرا تجربہ کہہ رہا ہے کہ انہوں نے مارا ہے کسی کو۔ جو مار کھا کر آتا ہے اس کی آنکھ یا ناک وغیرہ پر چوٹ لگتی ہے۔ جو مارتا ہے اس کے ہاتھ کے باہر کی طرف...... اب دیکھیں ذرا انہیں چوٹ کہاں لگی ہوئی ہے۔''

''تم بتاتے کیوں نہیں؟'' امی نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

آرسہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ ''یہ میرے سامنے کچھ نہیں بتائیں گے اور ان کو غصہ بھی کافی آ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ اُٹھ کر چلے جائیں، میں ہی چلی جاتی ہوں۔''

وہ فرح کو بائے کہتے ہوئے مڑی۔ وہ گھر میں بھی جینز پہنتی تھی۔ تراشیدہ بال شانوں پر لہراتے رہتے تھے۔

''امی! آپ اس کو کیوں بلاتی ہیں یہاں؟'' میں نے تڑخ کر کہا۔

''میں نے بلایا تھا بھائی! غلطی ہو گئی، چلو معاف کر دو۔ ویسے بھی یہ لوگ منگل تک چلے جائیں گے۔'' فرح نے ایسی مسکینی سے کہا کہ میرا پارا کافی حد تک نیچے آ گیا۔

امی کی سوالیہ نظریں بدستور مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں اپنی چوٹ کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب رہا۔

یہ گہری مایوسی اور کرب کی گھڑیاں تھیں۔ میں رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ گھر کی چھت، راہداریوں اور بالکونیوں میں پھرتا رہا۔ سیٹھ کا تنومند چہرہ بار بار نگاہوں کے سامنے آتا۔ اس کا تیل میں چپڑا ہوا سر، چھوٹی چھوٹی اجڈ آنکھیں اور آنکھوں میں دبی ہوئی دو چنگاریاں۔

اگلے روز میں اس امید پر ناصر بھائی کے سابقہ مکان پر گیا کہ شاید پراپرٹی ڈیلر حاجی صاحب کے پاس ناصر بھائی کی کوئی خبر ہو۔ ثروت کی دہلیز کے سامنے سے گزرا تو ایک عجیب سی اُداسی نے مجھے گھیر لیا۔ خالی مکانوں کو باہر سے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں کوئی مکین نہیں ہے اور...... در و دیوار ویرانیوں کے جالے ہیں۔ چھت اور بالکونیوں کی ویرانی دیکھ کر میرا دل ہولنے لگا۔ کبھی کوئی یہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا۔ چلمنوں کے پیچھے چھپتا تھا اور پھر ظاہر ہوتا تھا۔ اس کی چوڑیوں کی چھن چھن، اس کی ہنسی، اس کی سرگوشیاں،

سب کچھ ان در و بام میں جذب تھا۔ مجھے لگا کہ یہ مکان بھی اپنے اچانک روٹھ جانے والے مکینوں کو میری طرح بے پناہ شدت سے یاد کر رہا ہے۔

میں حاجی صاحب کے پاس پہنچا۔ ان کے پاس چند لوگ بیٹھے تھے۔ وہ چلے گئے تو میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔ ''ناصر بھائی کی کوئی خیر خبر آئی ہے۔''

''پرسوں ناصر کا فون آیا تھا۔'' حاجی صاحب نے اپنی عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''بتا رہا تھا کہ وہ فرینکفرٹ کے پاس کسی قصبے میں ہے۔ اس کا بھائی بھی آج کل وہیں کسی فرم میں کام کر رہا ہے۔ اپنے گھر کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ایک دو گاہک تو لگے ہیں لیکن ابھی پورے پیسے نہیں لگا رہے ہیں۔''

''اور کیا کہہ رہے تھے؟''

''بس کہہ رہا تھا کہ پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہاں کوئی چھوٹا فلیٹ خریدا ہے اس نے۔ اس کے پیسے دینے ہیں۔ اس کے علاوہ شاید اپنی بہن کی شادی وغیرہ بھی کر رہا ہے۔''

''شادی؟'' میرے سر پر جیسے ہزاروں وزنی بم پھٹ گیا۔

''ہاں...... ہاں...... وہاں کوئی پاکستانی فیملی ہے۔ بتا رہا تھا بڑے اچھے لوگ ہیں۔ کراچی کے رہنے والے ہیں۔'' وہ اپنی روانی میں بولتے چلے گئے۔

میں نے خود کو بمشکل سنبھالا اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ان کی دو بہنیں ہیں نا...... کس کی بات کر رہے تھے؟''

''ابھی تو بڑی کی بات ہی کر رہے تھے لیکن...... بتا رہے تھے کہ بڑے محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرا رشتہ بھی ان کی طرف ہی ہو جائے۔ بڑے خوش تھے۔'' حاجی صاحب نے کہا۔ پھر طویل سانس لے کر بولے۔ ''چلو اللہ نے کرم کیا ہے ان پر۔ یہاں تو ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ سب کے سامنے ہی ہے۔ نیک معصوم بچی کی خبریں اخباروں میں چھپ گئیں۔ مصیبتوں نے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ دو چار مہینوں میں گھرانا اُجڑ کر رہ گیا۔ اللہ پاک ہر ایک کو ایسی آفتوں سے بچائے۔''

حاجی صاحب بول رہے تھے اور ان کی آواز میرے کانوں تک جیسے کہیں بہت دور سے پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ یہ ملک اب بھلے مانسوں کے رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ کسی کی پگڑی محفوظ نہیں۔ اللہ معاف کرے جس کسی کا ہسپتال یا تھانے کچہریوں سے واسطہ پڑتا ہے، اسے دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔''

وہ بول رہے تھے اور قرب و جوار میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا کہ میں کب اپنی جگہ سے اُٹھا اور کب گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے اور ثروت کے درمیان فاصلہ پیدا ہوا پھر اس نے پاکستان چھوڑا اور اب ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے ہی نکل رہی تھی۔ یہ کس جرم کی سزا تھی جو مجھے مل رہی تھی۔ میں نے تو اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ اسے اپنانے کے لیے میں ایک ایک دن گن کر گزار رہا تھا۔ اگر اچانک ایک ناگہانی واقعہ پیش آیا تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو اس کی خاطر پوری دنیا سے لڑنے کے لیے تیار تھا۔

پھر اس نے اتنی جلدی ہتھیار کیوں ڈال دیئے؟ کیوں اتنی سرعت کے ساتھ مجھ سے ہر ناتہ توڑ دیا...... مجھے ایک موقع بھی نہیں دیا۔ سزائے موت دینے سے پہلے مجھ سے آخری ملاقات بھی نہیں کی؟ اور ناصر بھائی...... اور دیگر لوگ...... وہ سب بھی پتھر ہو گئے؟

اگلے چوبیس گھنٹے میری زندگی کے مشکل ترین گھنٹے تھے۔ میں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب ڈوب گیا۔ امی میری حالت دیکھ کر سخت پریشان تھیں۔ وہ بار بار پوچھتی رہیں لیکن میں نے کچھ نہیں بتایا۔

میری طبیعت کچھ سنبھلی تو تیسرے دن میں پھر حاجی صاحب کے پاس گیا۔ حاجی صاحب کو یہ تو پتا نہیں تھا کہ میں عثمان صاحب کی بیٹی کا منگیتر رہا ہوں۔ ہاں وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ناصر سے میری رشتے داری اور دوستی ہے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ حاجی صاحب کے پاس ناصر بھائی کا کوئی رابطہ نمبر آیا ہے یا نہیں؟

حاجی صاحب نے کہا۔ ''میں نے بہت پوچھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ کہتا تھا کہ میں خود ہی رابطہ کروں گا۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ اب یہاں سے ہر تعلق توڑ لینا چاہتا ہے۔ بس یہ مکان فروخت کرنے والی مجبوری ہے اس کے ساتھ ورنہ شاید وہ کبھی اپنی آواز بھی نہ سناتا۔''

''آپ کے فون پر ان کا نمبر نہیں آتا؟''

''نہیں...... بس انگریزی کا کوئی لفظ لکھا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کسی کال سینٹر سے فون کرتا ہے۔''

''میں ان سے بس ایک بار بات کرنا چاہتا ہوں۔ حاجی صاحب! کوئی ایسا طریقہ ہو سکتا ہے؟''

''میں اس سے بہت پوچھتا رہا ہوں کہ کب فون کرو گے۔ اس نے اس بارے میں بھی

کچھ نہیں بتایا اور میں تمہیں ایک بات اور بتا دوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ تمہاری یا کسی اور عزیز رشتے دار کی آواز سن کر فون بند نہیں کرے گا۔ وہ تو مجھ سے یہاں تک یقین دہانی لیتا ہے کہ میں اس کی ''کالوں'' کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔''

''اگر مکان بک گیا تو پھر آپ کیا کریں گے؟''

حاجی صاحب ذرا دیر کے لیے چپ رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ مجھے بتانا چاہیے یا نہیں پھر بولے۔ ''اللہ بخشے عثمان مجھ پر بہت بھروسہ کرتا تھا۔ ناصر بھی کرتا ہے۔ وہ مجھے مختار نامہ عام دے گیا ہے۔ میں اس کی جگہ پر کاغذ سائن کر سکتا ہوں۔ باقی رہی رقم کی بات تو وہ بینک کے ذریعے چلی جائے گی۔ وہ کوئی اکاؤنٹ نمبر بتائے گا۔ میں یہاں سے پے آرڈر بنوا دوں گا۔ یا پھر جیسے بھی وہ کہے گا۔''

اس روز حاجی صاحب کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ بات چیت ہوتی رہی۔ حاجی صاحب جہاندیدہ شخص تھے۔ وہ جلد ہی اس بات کی تہہ تک پہنچ گئے کہ میرے ساتھ عثمان صاحب کی بڑی بیٹی کی نسبت ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ اس صورتِ حال پر کچھ افسردہ بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مجھے کچھ سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کی۔ انہوں نے وہی کچھ کہا جو بزرگ ایسے موقعوں پر کہا کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی تقدیر کے دھارے میں بہنا پڑتا ہے۔ بندے کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں ڈھال لے۔

حاجی صاحب کے ساتھ گفتگو میں مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ثروت کی شادی غالباً ستمبر اکتوبر میں ہونی ہے۔

جو کچھ ہو رہا تھا بہت جلدی ہو رہا تھا۔ جیسے ایک تیز آندھی تھی جو ہر آس...... اُمید کو اُڑائے لیے چلی جا رہی تھی۔

دو دن میں...... میں بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ یوں لگتا کہ اندوہ کی شدت سے اب اس طرح بکھروں گا کہ کبھی جڑ ہی نہیں سکوں گا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ لوگ نشہ کیوں کرتے ہیں؟ کیوں خود فراموشی میں غرق ہو جاتے ہیں؟ اب ان سوالوں کا جواب مل رہا تھا۔ میں جو کبھی کسی نشے کے قریب نہیں گیا تھا، نشے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، کچھ ایسی شے ہو جو میرے احساس کی چھری کو کند کر کے مجھے دُکھ کے کچوکوں سے بچا لے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے سگریٹ کو ہاتھ لگایا اور ایک ہی رات میں کئی پیکٹ پھونک ڈالے۔ کچھ سکون بخش گولیاں بھی میرے پاس موجود تھیں۔ وہ میں نے اکٹھی

ہی تین چار کھالیں۔ بہت دیر تک بے قرار پھرتا رہا پھر رات آخری پہر نیند آ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو دس گیارہ بج رہے تھے۔ لگتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ عاطف تو یقیناً کالج گیا ہوا تھا۔ امی اور فرح شاید بازار چلی گئی تھیں۔ میرا سر بھاری تھا اور حواس پر ابھی تک غنودگی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور آرسہ کی شکل نظر آئی۔ اس نے پتلون اور آدھے بازو کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ پیاز کے چھلکے کی طرح ہلکی پھلکی تھی اور ان پہناووں میں سے تھی جو جسم کو چھپانے کے بجائے نمایاں کرنے کا کام دیتے ہیں۔

میں نے اسے دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ وہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ''آپ جناب کی آنکھ آخر کھل ہی گئی۔''

''کیا بات ہے؟'' میں نے بے رُخی سے کہا۔

''آپ کی امی جان آپ کو ساتھ لے جانا چاہتی تھیں لیکن پھر وہ اکیلی ہی چلی گئیں۔ فرح بھی ساتھ گئی ہے اور پھوپھی پھوپھا بھی۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''فوتیدگی ہو گئی ہے۔ شیخوپورہ میں آپ کی کوئی خالہ تھیں شاید۔ رشیداں نام تھا۔ کافی عرصے سے بیمار تھیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کن کا ذکر کر رہی ہے۔ انہیں امی بڑی آپا کہتی تھیں۔ وہ رشتے میں امی کی چچازاد تھیں۔ ''تو اب گھر میں کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس میں اور ممی! وہ بھی اوپر اے سی لگا کر اور لمبی تان کر سوئی ہوئی ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک میرے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد گویا ہوئی۔ ''آنٹی جاتے جاتے کہہ گئی تھیں، تابش سویا ہوا ہے جب جاگے تو اسے بتا دینا۔''

''اطلاع کا شکریہ۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''لیکن وہ کچھ اور بھی کہہ گئی تھیں۔ آپ کے کپڑے وہ استری کر گئی ہیں۔ اگر آپ کو ناشتہ واشتہ کرنا ہو تو میں تیار کر دیتی ہوں۔''

''نہیں...... میری طبیعت خراب ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔ میں اس بات پر کڑھ رہا تھا کہ امی میرے نہ چاہنے کے باوجود اس آفت کو میرے سر پر مسلط کر دیتی تھیں۔

''اوہو...... کیا ہوا طبیعت کو؟'' وہ مزید اندر آتے ہوئے بولی۔

''سر میں درد ہے اور اب تم جاؤ پلیز۔'' میں نے سخت جھلاہٹ سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی واش روم کی طرف بڑھا۔

اچانک مجھے چکر سا آیا اور میں لڑکھڑا گیا۔ ایک کرسی سے ٹکرایا اور جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''اوہ گاڈ! کیا ہوا تابش؟'' آرسہ کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے صوفے پر بیٹھ کر مجھے شانوں سے تھام لیا۔

''کچھ نہیں...... ذرا چکر سا آ گیا تھا۔'' میں نے مدھم سی آواز میں کہا۔

''ڈاکٹر کو بلاؤں؟''

''نہیں...... نہیں...... ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' میں صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا۔

وہ میرا سر دبانے لگی۔ میں نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں پھر اس سے کہا کہ وہ جائے۔

''آپ آرام سے لیٹے رہو۔'' اس نے رعب سے کہا اور میرا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

ایک دم میرے جسم میں برقی لہر سی دوڑ گئی۔ میں سکتہ زدہ سا لیٹا رہا۔ حواس پر چھائی ہوئی غنودگی ایک سفید دھند کی طرح میرے اردگرد پھیلی ہوئی تھی۔ آرسہ کے جوان جسم کی قربت نے جیسے ایک دم میرے دل و دماغ پر شب خون مارا۔ مجھے لگا کہ میں اندر سے ٹوٹ رہا ہوں، بکھر رہا ہوں۔ شاید مایوسی اور دُکھ کے بے پناہ بوجھ نے مجھے مسمار کرنا شروع کر دیا تھا۔

میری خاموشی نے آرسہ کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے میرا سر مزید اچھی طرح اپنے زانو پر لے لیا۔ وہ آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ میرے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ اس نے میری قمیص کے بٹن کھول دیئے اور میرے سینے کو بھی اپنے ہاتھ کے آتشیں لمس سے آشنا کیا۔ اس کی سانس میری سانسوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے کسمسا کر اپنا ہاتھ اس کے عریاں بازو پر رکھ دیا۔ ذہن پر چھائی ہوئی دھند گہری ہونے لگی۔ مرد اور عورت کی درمیانی کشش ایک آفاقی سچائی ہے۔ اس کشش کے سبب مرد و زن کی قربت اپنا راستہ خود تلاش کر لیتی ہے۔

تین چار منٹ بعد یہ صورتِ حال تھی کہ ہم دونوں صوفے کے قریب دبیز قالین پر ساتھ ساتھ لیٹے تھے۔ آرسہ نے مجھے بانہوں میں لیا ہوا تھا اور میرے ہونٹ اس کے تپتے چہرے پر بھٹک رہے تھے۔ ایک بار تکلف کے پردے اُٹھے اور جھجک کم ہوئی [illegible] بکھرنے لگا۔

میں نے ''جوابی کارروائی'' کرتے ہوئے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ اسے بے طرح جھنجھوڑا اور بے ترتیب کر کے رکھ دیا۔ یہ محبت نہیں تھی۔ یہ مایوسی تھی۔ بدترین فرسٹریشن تھی۔ جب بندہ بکھرتا ہے تو اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پستی میں گرنے لگتا ہے۔

میری اندھا دھند پیش قدمی دیکھ کر آرسہ سنبھلی اور مجھے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔ ''کوئی آ نہ جائے۔''

میں جیسے چونک کر رہ گیا، اس کے ساتھ ہی بہت خفت بھی محسوس ہوئی۔ وہ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر چلی گئی۔

ان لوگوں کو منگل کے روز واپس چلے جانا تھا مگر پھر ان کے قیام میں ایک ہفتے کا اضافہ ہوگیا۔ اب پتا نہیں کہ یہ اضافہ آرسہ کی خواہش پر ہوا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔ بہر حال، چچی نے یہی بتایا کہ یہ لوگ اب اگلے سوموار کو واپس جائیں گے۔ میں مسلسل سگریٹ پھونک رہا تھا اور سکون بخش گولیاں بھی کھا رہا تھا۔ پہلے دن والے واقعے کے بعد آرسہ اکثر موقع دیکھ کر میرے کمرے میں چلی آتی تھی اور تھوڑی سی ''دھینگا مستی'' کر کے لوٹ جاتی تھی۔ زیادہ تر اسے دوپہر کو موقع ملتا تھا، جب فرح اور عاطف کالج میں ہوتے تھے اور امی سبزی وغیرہ لینے مارکیٹ جاتی تھیں۔

وہ میری ٹوٹ پھوٹ سے فائدہ اُٹھا رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک آ جاتی تھی۔ اس دن بھی وہ والدہ کے بازار جانے کے بعد میرے کمرے میں آ گئی۔ میرے ذہن میں گولیوں کا غبار سا بھرا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں بھاری ہو رہے تھے اور ہر طرح کے تفکرات دور کہیں کسی اوٹ میں چلے گئے تھے۔ وہ بڑے اشتعال انگیز لباس میں تھی۔ اب دس گیارہ بج چکے تھے لیکن اس نے ابھی تک ایک ہلکی سی میکسی پہنی ہوئی تھی۔ وسیع گریبان دعوتِ نظارہ دیتا تھا۔

میں بیڈ پر نیم دراز سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس نے میری بڑھی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا پھر سگریٹ میرے ہونٹوں سے نکالتے ہوئے بولی۔ ''اچھے بچے سگریٹ نہیں پیتے۔''

''اچھے بچے کیا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھے بچے اپنی امی سے بات کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ وہ ساری پچھلی باتیں بھول بھال کر اب شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ میرے اوپر لد سی گئی۔

''لیکن اگر اچھے بچے شادی کرنا ہی نہ چاہیں تو؟''

''تو پھر ان [illegible] پاس نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اس میں خطرے ہوتے ہیں۔'' وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔

میں خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''تو میں جاؤں؟''

''اس کا مطلب ہے آج تم جانے کے لیے آئی ہو؟''

''میں تو نہیں جا رہی...... آپ جناب مجھے بھیج رہے ہیں۔'' وہ ادا سے بولی۔

''میں کہاں بھیج رہا ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی...... اسی وقت تم سے شادی کر

گزروں۔'' میں نے مخمور لہجے میں کہا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

تین چار منٹ ہم ایک دوسرے میں اُلجھے رہے۔ وہ ایک ماہر ''فنکار'' کی طرح آہستہ آہستہ میری پیاس بڑھاتی تھی اور پھر ایک دم سراب بن کر اوجھل ہو جاتی تھی۔ اس کے قرب میں ایک آگ سی تھی۔ اس آگ میں جلتے ہوئے نہ جانے کیوں مجھے بار بار ثروت کی قربت یاد آ جاتی تھی۔ ثروت کے لمس میں وہی چاندنی کی سی ٹھنڈک تھی جو دھیرے دھیرے دل پر اثر کرتی ہے اور روح میں اُتر جاتی ہے۔ وہ بے شک دھوپ جتنی روشن نہیں ہوتی مگر اس کا حُسن جدا تاثر رکھتا ہے۔ ثروت کے ساتھ تنہائی میں گزارے ہوئے وقت کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے میری زندگی کا سرمایہ تھے۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ میں مزید ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ میں نے دفتر میں چھٹی کی درخواست بھیج دی تھی۔ اب پتا نہیں وہ منظور ہوئی تھی یا نہیں۔ میں سارا دن گھر میں پڑا اینٹھتا رہتا۔ اپنے لباس اور حلیے کی طرف سے بھی بالکل بے پروا ہو گیا تھا۔ کسی وقت فریج کھول کر کھانا شروع کر دیتا۔ گلے تک خوراک ٹھونس لیتا یا پھر کمرہ بند کر کے سی ڈی پلیئر پر اُلٹی سیدھی فلمیں دیکھتا رہتا۔ امی بہت پریشان تھیں۔ ایک روز ان کے اصرار پر میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہاں جرمنی میں عنقریب ثروت کی شادی ہونے والی ہے۔

یہ خبر سننے کے بعد امی مجھ سے نظر نہیں ملا سکی تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اس میں ان کے رویے کا بھی عمل دخل ہے۔ وہ خود سے پشیمان دکھائی دیتی تھیں اور اندر سے بہت دُکھی بھی تھیں لیکن اب تو جو کچھ بھی تھا، کمان سے تیر نکل چکا تھا۔

ایک شام مجھے آرسہ کے قرب کی شدید طلب محسوس ہوئی۔ عاطف کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ امی اور فرح بازار گئی ہوئی تھیں۔ اگر اس وقت وہ آ جاتی تو کچھ وقت خود فراموشی میں گزارا جا سکتا تھا۔ درحقیقت ان دنوں میں ہوش و حواس سے بہت دور تھا اور اخلاقی حالت پست تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں آرسہ کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل پر گیا۔ چچا چچی کی رہائش اس بالائی پورشن میں ہی تھی۔ سیڑھیوں کے درمیان ایک گیلری سی تھی۔ جب میں اس گیلری کے قریب سے گزرا تو اندر سے آرسہ کے باتیں کرنے کی مدھم آواز آئی۔ وہ کسی سے موبائل پر مصروف گفتگو تھی۔ میں وہیں سیڑھیوں کی نیم تاریکی میں کھڑا ہو گیا اور کھڑکی سے کان لگا کر سننے لگا۔

وہ پنڈی میں اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں شوخی اور تمسخر تھا۔ وہ رازدارانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''جو کچھ ہوا ہے، پچھلے دس پندرہ دن میں ہوا ہے۔ یار! وہ کہتے

ہیں نا کہ جو شاخ جھکتی نہیں، وہ کڑچ کر کے ٹوٹ جاتی ہے۔''

کچھ دیر تک آرسہ دبی آواز میں ہنستی رہی پھر بولی۔''ہاں...... ہاں...... یار! پہلے تو یوں گردن اکڑا کر پاس سے گزرتا تھا جیسے شہزادہ چارلس سے بھی آگے کی شے ہو۔ پر اب ایک دم سیدھا ہو گیا ہے۔ دو دو گھنٹے کمرے میں میرا ویٹ کرتا ہے۔ جاتی ہوں تو پالتو بکرے کی طرح گردن جھکا کر سر میری گود میں رکھ دیتا ہے۔ ایک دم سرنڈر کر رہا ہے۔ ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... ابھی اور سیدھا کروں گی اسے۔ دو چار دن اور ہوں یہاں ایک دم PET بنا کر جاؤں گی۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ آرسہ سنتی رہی پھر جواب میں بولی۔''یار! تمہیں تو پتا ہی ہے۔ یاشر تو خود بھی فلرٹ کرتا رہا ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ قریباً دو مہینے سے تو ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے اس سے۔ اب تو سنا ہے کہ وہ بھی تیرے کاؤبوائے جمشید کی طرح انگلینڈ جا رہا ہے۔''

کچھ دیر تک آرسہ دبی دبی آواز میں ہنستی رہی۔ پھر شاید بیلنس ختم ہو گیا یا بیٹری جواب دے گئی۔ وہ ''ہیلو فریال...... ہیلو فریال......'' کہہ کر خاموش ہو گئی۔

میں جلدی سے سیڑھیاں اُتر کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ آرسہ کے الفاظ زہریلے تیروں کی طرح کانوں کو زخمی کر رہے تھے۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اپنی دوست سے میرا ہی ذکرِ خیر کر رہی تھی۔ مجھے کبھی بھی یہ خوش فہمی نہیں ہوئی تھی کہ آرسہ میرے ساتھ شروع ہونے والے ''ہیجانی تعلق'' میں مخلص ہے۔ لیکن اب اپنے کانوں سے اس کی باتیں اور اس کا لب و لہجہ سن کر سینے میں آگ سی بھڑک گئی۔

جی چاہا کہ وہ میرے سامنے ہو تو میں اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دوں۔ ان دنوں میں جس شدید ہیجان اور اخلاقی گراوٹ کے دور سے گزر رہا تھا۔ میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس رات میں نے معمول سے زیادہ ٹیبلٹس لیں اور معمول سے زیادہ سگریٹ پھونکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شراب وغیرہ تک میری پہنچ نہیں تھی، نہ ہی کوئی اس طرح کا دوست تھا ورنہ ہو سکتا ہے کہ ان دنوں یہ ''خانہ خراب'' بھی میرے منہ کو لگ جاتی۔

اگلے روز دوپہر کو آرسہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس کا انداز ہمیشہ کی طرح بے باک تھا۔ وہ حسبِ معمول مجھے اپنے لمس سے آشنا کرتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ مجھ پر زور دیتی رہی کہ میں اپنے گھر والوں سے بات کروں۔ وہ بھی اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کرے گی اور یوں ''محبت میں ترسے ہوئے دل'' ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔ میں خاموشی

سے اس کی منافقانہ باتیں سنتا رہا اور دل ہی دل میں کھولتا رہا۔

میرے ساتھ تنہائی میں اس کی حرکات و سکنات نہایت گھاگ لڑکیوں جیسی ہوتی تھیں۔ اس سے پہلے نہ جانے وہ کہاں کہاں منہ مار چکی تھی۔ کسی وقت تو میری چھٹی حس پکار پکار کر کہنے لگتی تھی کہ وہ ایک آبرو باختہ لڑکی ہے۔

اگلے روز وہ پھر آئی۔ جوں جوں اس کے جانے کا دن قریب آ رہا تھا، وہ واشگاف ہوتی جا رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ مجھ سے شادی کے بارے میں کوئی پختہ عہد و پیمان لے لے۔ میں بھی اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے لگا۔ آج والدہ کو بازار سے مہینے بھر کی شاپنگ کرنا تھی، ہمارے پاس ٹائم بھی زیادہ تھا۔ ہم نے قربت کے سفر میں کئی مرحلے تیزی سے طے کیے۔ وہ مجھے ایک ایک سیڑھی چڑھنے کا موقع دیتی تھی اور ہر سیڑھی پر اپنی قدر و قیمت میں اضافے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس نہایت جذباتی و سنگین ملاقات میں ایک موقع ایسا آیا کہ وہ میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی حیثیت اختیار کرنے پر نیم آمادہ ہو گئی۔ ایسی کتاب جس کو میں جہاں سے اور جتنا چاہے پڑھ سکتا تھا لیکن اسی دوران میں بازار سے امی کا فون آ گیا کہ سامان زیادہ ہے۔ میں گاڑی لے کر آ جاؤں اور انہیں لے جاؤں۔ یہ بڑا ''بے موقع'' فون تھا۔ سارا ٹیمپو دھرا رہ گیا۔ ہمارے درمیان طے ہوا کہ ہم کل گیارہ بجے کے فوراً بعد پھر ملیں گے۔

انسان کے اپنے ارادے ہوتے ہیں اور قدرت کے اپنے...... اور ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ عجیب سی صورتِ حال رہی۔ رات تک تو مجھے اگلے دن کی ملاقات کا شدید انتظار رہا۔ جسم میں سنسناہٹ جاگتی رہی اور سفلی خیالات دل و دماغ کو اتھل پتھل کرتے رہے لیکن صبح جب میں سو کر اُٹھا تو اندرونی کیفیت کچھ بدلی بدلی محسوس ہوئی۔ اس تبدیلی کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ علی الصبح میری نگاہ کیلنڈر پر پڑی۔ آج ثروت کی سالگرہ کا دن تھا۔ اس دن کی نسبت سے ایک دم مجھے بہت کچھ یاد آیا اس کے ساتھ ہی ثروت کی پچھلی سالگرہ کا دن نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ہم اس روز دریائے راوی پر گئے تھے۔ عاطف، فرح اور ثروت کی چھوٹی بہن نصرت بھی ہمارے ساتھ تھی۔ یہ چاندنی رات تھی۔ ہم نے پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ دور تک کشتی چلائی تھی۔ پھر ایک ریتلے کنارے پر ٹھہر گئے تھے۔ باقی لوگ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے تھے، ہم اِن کی اٹھکیلیوں سے ذرا دور دریا کے کنارے بیٹھ گئے تھے۔ دریا کے پس منظر میں چاند کے اُبھرنے کا منظر دلآویز تھا۔ ثروت نے ٹیپ ریکارڈر پر اپنا پسندیدہ گیت لگا دیا تھا۔

مجھے دل سے، نہ بھلانا...... چاہے روکے یہ زمانہ
تیرے بن میرا جیون کچھ نہیں ...... کچھ نہیں

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ بڑی نرمی سے میرے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا تھا۔ اس کے لمبے خوشبودار بال گیلی ہوا سے اُڑ رہے تھے اور میرے چہرے کو چھو رہے تھے اس ماحول میں اس گیت نے جو اثر کیا وہ بیان سے باہر تھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے، میری ہی طرح آج کے دن کو یاد کر رہی ہے۔ نم ریت، دریا کی لہریں اور اُبھرتے ہوئے چاند کی کرنیں اس کے تصور میں بھی چمک رہی ہیں اور شاید وہ گیت آج بھی اس کی زبان پر ہے۔ مجھے دل سے نہ بھلانا...... چاہے روکے یہ زمانہ۔

پُرحرارت سفلی جذبات کی جگہ میرے دل میں عجیب سا حزن آمیز گداز اُترنے لگا۔ آرسہ کی چمکیلی بھوری آنکھوں کی جگہ ثروت کی سیاہ جھیل آنکھیں، نگاہوں میں گھومنے لگیں۔ ان آنکھوں کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ مجھے لگا میں بھٹک رہا ہوں۔

''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا آرسہ سے نہیں ملنا چاہیے؟''

لیکن آرسہ سے نہ ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔ سفلی جذبات کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے اور جب پانی اتنا قریب ہو تو پیاس کا صحرا زیادہ دیر تک برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں جیسے ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ امی نے مجھے بیرونی دروازے کے قریب دیکھا اور گھبرا کر پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو تابی؟''

''ذرا کام ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''ناشتہ نہیں کرو گے...... اور...... ذرا اپنا حلیہ تو دیکھو کیا باہر جانے والا حال ہے تمہارا؟''

''بس جو حال ہے، یہ آپ لوگوں نے ہی کیا ہوا ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا اور باہر نکل آیا۔

بازار میں کچھ آگے جانے کے بعد میں نے ایک جنرل اسٹور سے جوس لیا اور اس جوس کے ساتھ سکون بخش (Sedative) میڈیسن کی تین چار گولیاں نگل لیں۔ جنرل اسٹور کے ہی ایک آئینے میں مَیں نے اپنی صورت دیکھی۔ امی ٹھیک کہتی تھیں۔ واقعی میرا حلیہ بدترین تھا۔ آنکھیں سرخ، شیو بڑھی ہوئی، بال اُلجھے ہوئے اور لباس شکن شکن۔

میں گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر دور ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ پارک پہلے کافی

وسیع تھا لیکن اب بے شمار دوسرے پارکوں کی طرح اسے بھی ایک طرف سے قبضہ گروپ کے عفریت نے نگلنا شروع کر دیا تھا۔ میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس طوفان کی لہروں میں سے اپنے دل کی کشتی کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا جس نے مجھے چاروں سے گھیر لیا تھا۔

گھڑی کی سوئی آہستہ آہستہ گیارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق آرسہ نے گیارہ بجے مجھ سے ملنے آنا تھا۔ اس ملاقات کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا اور وہ بھی سمجھتی تھی۔ شاید وہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مجھے اپنا اس قدر عادی بنا لینا چاہتی تھی کہ میں اس کی گرفت سے نکل ہی نہ سکوں۔ لیکن یہاں سوال یہ تھا کہ کیا میں اس سے یہ رنگین سنگین ملاقات کر سکتا ہوں؟ یہ ایک جان لیوا کشمکش تھی۔ نفسانی لذت کی منزل بالکل سامنے تھی لیکن ''محبت'' ایک گہری دھند میں گھری ہوئی تھی اور بہت دور دراز کی چیز نظر آتی تھی۔

میں ایک دوراہے پر تھا اور اپنی ہی حدت سے پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ گھڑی کی متحرک سوئی گیارہ کے ہندسے پر پہنچ گئی مگر میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ سکون آور گولیوں کے اثر سے ہاتھ پاؤں بھاری ہو رہے تھے، ایک عجیب خود فراموشی کی سی کیفیت تھی۔ اچانک میں چونکا۔ پارک کے آخری سرے پر جہاں ایک پلازہ کے لیے کھدائی وغیرہ کا کام ہو رہا تھا، مجھے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اُٹھا۔ یہ چوڑے تھوبڑے اور تنگ پیشانی والا ہٹا کٹا شخص سیٹھ سراج تھا۔

سیٹھ کے ساتھ دو بندے اور تھے۔ وہ بھی سفید کڑکڑاتی شلواروں قمیصوں میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نقشے تھے۔ کسی بات پر وہ تینوں گونج دار آوازوں میں ہنسے اور ایک شخص نے سیٹھ کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

سیٹھ کو خود سے چند گز کے فاصلے پر دیکھنے کے بعد میرے دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ مجھے زبردستی کا لنچ اور آنکھوں میں دبی ہوئی دو چنگاریاں یاد آئیں۔ پھر وہ سب کچھ یاد آیا جو ''ایل ڈی اے'' کے صدیقی نے بتایا تھا اور اس کے بعد خالو عثمان کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ نگاہوں میں گھوما۔ چھوی چھوٹی نیم سفید ڈاڑھی، بالکل زرد رنگت اور نیم وا آنکھیں۔ وہ جیسے حیران تھے کہ ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے انہیں موت کے سفر پر کیوں روانہ ہونا پڑا۔ عام حالات میں شاید میں پہلے ہی کی طرح اپنے اندر ہی اندر اُبل کر رہ جاتا لیکن فی الوقت کیفیت کچھ اور تھی۔ دل و دماغ پہلے ہی طوفان کی آماج گاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹرنکولائزر کا اثر بھی تھا۔ ایک دم میں طیش کے عالم میں اُٹھا اور سیٹھ سراج کی طرف بڑھا۔ میرا پورا جسم خشک

پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوا۔ سیٹھ کے سامنے جاتے ہی میرے اندر کی آگ شعلہ بن کر بھڑکی اور میں نے ایک زناٹے کا تھپڑ سیٹھ کے چوڑے چکلے منہ پر جڑ دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ سیٹھ ذرا سا لڑکھڑایا پھر مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں حیرت اور غصے سے پھیل گئیں۔

''اوئے......اوئے۔'' اس نے عجیب بے ڈھنگے انداز میں کہا۔

جب تک میں دوبارہ اس پر جھپٹتا وہ سنبھل چکا تھا۔ اپنے گریبان کی طرف بڑھنے والے میرے ہاتھوں کو اس نے پکڑا اور پیچھے کی طرف جھٹک دیا۔

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے۔ میں تیری جان لے لوں۔ میں تجھے برباد کر دوں گا۔ تُو نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میں تیری زندگی کو آگ لگا دوں گا۔'' میں پھر پوری شدت سے سیٹھ کی طرف بڑھا۔

تب تک سیٹھ کے ساتھی بھی حیرت کے شدید جھٹکے سے سنبھل چکے تھے۔ ایک شخص نے میرے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ رسید کیا۔ دوسرے نے مجھے عقب سے دبوچ لیا۔ میں نے خود کو چھڑانا چاہا مگر سامنے سے پڑنے والے سیٹھ کے زوردار ہاتھ نے مجھے چکرا ڈالا۔ سیٹھ بھیانک آواز میں دھاڑا۔ ''ہتھ اُٹھاتا ہے حرامزادے...... تجھے گولیوں سے چھاننی کر دوں گا۔ چھیکو چھیک کر دوں گا تیرے پورے ٹبر (خاندان) کو۔''

وہ دیوانہ وار مجھ پر جھپٹ پڑا۔ کھدائی کی نگرانی کرنے والے کارندے بھی دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے چمٹ گئے۔ اس وقت مارشل آرٹ کی ساری تکنیکیں بے کار محسوس ہوئیں۔ میں نے اندھادھند ہاتھ پاؤں چلائے لیکن کوئی پیش نہیں گئی۔ مجھے زمین پر گرا لیا گیا اور بُری طرح مارا جانے لگا۔ مجھے بس یہی لگ رہا تھا کہ میں ہوا میں اُڑ اُڑ کر گر رہا ہوں۔ میری ہڈیاں چیخ رہی ہیں اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی روشنیاں جل بجھ رہی ہیں۔

چند ہی لمحوں میں میری قمیص تار تار ہو گئی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میری پتلون میں سے جھٹکے کے ساتھ بیلٹ کھینچ لی گئی ہے اور مجھے اس سے پیٹا جانے لگا ہے۔ لوہے کا وزنی بکل میرے جسم کو لہولہان کرنے لگا۔ مجھ پر ٹھوکریں بھی برسائی جا رہی تھیں۔ میں گھاس پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ جلد ہی میرے ہونٹوں سے بے ساختہ آہ و بکا بلند ہونے لگی۔ مجھے شاید مجھے اسی جگہ قتل کر دیا جائے گا۔

اپنے اردگرد مجھے بے شمار لوگ دکھائی دے رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو آگے بڑھ کر مجھے چھڑا سکتا۔ ان میں سے بہت سے لوگ مجھے بچپن سے جانتے بھی ہوں

گے لیکن ان میں سے کوئی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے سر پر پاؤں رکھ کر میرے چہرے کو گراؤنڈ کے کیچڑ میں لتھڑ دیا گیا۔ پھر مجھے ایک ٹانگ سے پکڑ کر بے دردی سے گھسیٹا گیا۔

سیٹھ کے ایک ساتھی کی غضبناک آواز میرے کانوں میں پہنچی۔ ''تھانے پہنچاؤ اس کتے کو۔''

ایک دوسری آواز نے کہا۔ ''تھانے بھی پہنچا لیں گے۔ پہلے دو چار ہڈیاں برابر کر لیں۔''

ایک کارندہ لمبے دستے کی کسّی لے کر میری طرف بڑھا۔ غالباً وہ اُلٹی کسّی کی ضربیں لگا کر میری ٹانگوں کو بے کار کرنا چاہتا تھا۔

میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، قریبی مسجد کے امام صاحب نے آگے بڑھ کر اسے روکا اور ملتجی لہجے میں کہا۔ ''جانے دو سیٹھ جی! بہت ہو گئی ہے اس کے ساتھ۔ اب باقی کسر تھانے جا کر پوری ہو جائے گی۔''

ایک اور دبی دبی آواز آئی۔ ''جانے دو جی...... بیوہ ماں کا پتر ہے۔ وہ تو مر جائے گی یہ سب دیکھ کر...... گندی اولاد ماں پیو کو بھی ذلیل کرتی ہے۔''

''ذلیل کرنا چاہیے ایسے ماں پیو کو...... بلکہ اولاد سے بڑھ کر ذلیل کرنا چاہیے۔ دوسروں کو سبق تو ملے۔'' سیٹھ کا ایک اور پالتو دھاڑا۔ ''حرامزادہ! راہ چلتوں کو بدمعاشی دکھاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر میرے جسم پر ہتھوڑے جیسی ضربیں لگنی شروع ہو گئیں۔ اردگرد کی ہر شے میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ آوازیں دور افتادہ بھنبھناہٹ کی صورت کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ایک گاڑی قریب آئی اور مجھے سخت زمین پر گھسیٹ کر گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ یہ ایک اسٹیشن وین تھی۔ امام صاحب غالباً ابھی تک منت سماجت کر رہے تھے کہ مجھے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے۔

بہرحال، گاڑی مجھے لے کر روانہ ہو گئی۔ سر سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھر چکا تھا۔ میں کسی جانور کی طرح دو نشستوں کے درمیان خلا میں ٹھنسا ہوا تھا۔

سیٹھ کے ایک ملازم کی آواز آئی۔ غالباً وہ سیٹھ کو مشورہ دے رہا تھا۔ ''گورایا صاحب کے گودام میں لے جاؤ جی اسے۔ آٹھ دس گھنٹے کے لیے اُلٹا لٹکاتے ہیں۔ ساری بدمعاشی ناک کے رستے باہر آ جائے گی۔''

جواب میں بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ شاید وہ لوگ کچھ مشورہ کر رہے تھے۔ مشورہ طویل

ہوا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میری جان بخشی کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔ اسٹیشن وین ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔ ان لوگوں نے مجھے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ میری چوٹوں اور زخموں کا معائنہ کیا۔ میری ٹھوڑی سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ سیٹھ کا ایک ملازم گیا اور قریبی دکان سے بینڈ ایج کا سامان لے کر آ گیا۔ بیلٹ کا بکل لگنے سے ٹھوڑی کے نیچے شاید کوئی رگ کٹ گئی تھی۔ اس زخم سے خون کا بہاؤ بند کیا گیا۔ سر پر بھی پٹی وغیرہ باندھی گئی۔ اس مرہم پٹی کے ساتھ ساتھ مجھے گالیوں سے بھی نوازا جا رہا تھا۔

میں اب قدرے ہوش میں آ گیا تھا۔ سیٹھ نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھ سے میرا گریبان دبوچا اور پھنکارا۔ ”تجھے معافی دے رہے ہیں کاکا۔ اگر پھر ایسی حرکت کرے گا تو لاش کسی گٹر شٹر سے ملے گی اور ابھی پوری معافی بھی نہیں دے رہے ہیں۔ سمجھ تھوڑا سا وقفہ دے رہے ہیں۔“

مجھے گھسیٹ کر اُٹھایا گیا اور گاڑی سے باہر پھینک دیا گیا۔ یہ بازار سے ذرا ہٹ کر چند خالی پلاٹ تھے۔ اسٹیشن وین کا دروازہ بند کرنے سے پہلے سیٹھ نے پھر کہا۔ ”اگر پلس کے پاس جانے کا شوق ہے تو وہ بھی پورا کر لے۔ پر چنگا یہی ہے کہ مزید چھتر کھانے کا انتظام نہ کر۔“

پھر اسٹیشن وین کا سفید دروازہ سلائیڈ کر کے بند ہوا اور وین تیزی سے چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ایک دو راہگیر مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جب پتلون میں سے جھٹکے کے ساتھ میری بیلٹ نکالی گئی تھی تو پتلون کا ہک بھی ٹوٹ گیا تھا۔ اب پتلون میری کمر سے نیچے کھسک چکی تھی۔ انڈرویئر کے سبب میں برہنگی سے بچا رہا تھا۔ قمیص تو تار تار ہوگئی تھی لیکن بنیان ابھی جسم پر موجود تھی۔ ایک شخص نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ ”کیا بات ہے بھائی صاحب! کوئی جھگڑا وغیرہ ہوگیا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

ایک رکشہ والا اور ایک موٹر سائیکل سوار بھی میرے قریب رُک گئے۔ میں اب اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور پینٹ کو ایک طرف سے اُڑس لیا تھا۔ لوگ اشاروں کنایوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے؟

میں انہیں نظر انداز کرتا ہوا ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔ حواس پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں اپنے قرب و جوار پر مطلق دھیان نہیں دے رہا تھا۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جانے کے بعد مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ چپل میرے پاؤں سے نکل چکی ہے اور میں ننگے پاؤں

ہوں۔ لوگ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن میں چلتا رہا۔ جسم پر کئی چوٹیں تھیں لیکن پتا نہیں کیوں تکلیف کا احساس زیادہ نہیں تھا۔ شاید اس احساس پر ذلت اور شرمندگی کا احساس غالب آ گیا تھا۔ چلتے چلتے میں نے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ ایک جیب میں ڈیڑھ سو روپے موجود تھے۔ بازار کے آخری سرے پر مجھے ایک شوز اسٹور نظر آیا۔ یہاں سے میں نے ہوائی چپل خریدی۔ اپنی چوٹوں کے بارے میں مَیں نے دکاندار کے سوالوں کے گول مول جواب دیئے اور خود کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

یہ مغل پورہ کا علاقہ تھا۔ سامنے ریلوے لائن نظر آ رہی تھی۔ ریلوے لائن کو دیکھ کر خیال گزرا کہ لوگ اس پر لیٹ کر خودکشی بھی تو کر لیا کرتے ہیں تو کیوں نہ میں بھی آج یہاں کسی بھاری بھرکم ٹرین کے سامنے لیٹ کر اپنی زندگی کو موت کے اندھیروں میں ڈبو دوں۔ بے شک موت ایک خوفناک چیز ہے لیکن کچھ دیر پہلے کی ذلت اور رسوائی جھیلنے کے بعد مجھے موت ایک عام سی چیز لگی تھی۔ ایک گہری تاریکی جو ہر قسم کے احساسات سے پیچھا چھڑا دے گی اور میں کسی ان دیکھے فاصلے پر چلا جاؤں گا۔

کچھ ہی فاصلے پر پولیس اسٹیشن کا سائن بورڈ دیکھ کر میں چند لمحے کے لیے رُک گیا۔ خیالات کا دھارا دوسری طرف مڑ گیا۔ کیا میں پولیس اسٹیشن چلا جاؤں؟ وہاں فریاد کروں اور انصاف مانگوں؟ لیکن کیا وہاں انصاف مل جائے گا؟ انصاف کو مجھ تک اور ثروت تک اور خالو عثمان تک پہنچنے دیا جائے گا؟ یہ سوال ذہن میں آتے ہی موٹی گردن اور چوڑے تھوبڑے والا سیٹھ سراج اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ میرے پردۂ تصور پر اُبھر آیا اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اسی طرح کے گرانڈیل اور کڑکڑاتی شلواروں قمیصوں والے لوگ تھے۔ ان سب نے جیسے بہ یک زبان کہا۔ ”جتنا تڑپو پھڑکو گے کاکا...... اتنا ہی پھنستے جاؤ گے۔ پولیس کے پاس جانا ہے تو جاؤ۔ تمہیں پتا چل جائے گا، وہاں کیا بھاؤ بکتی ہے۔ ابھی تو صرف تمہاری مٹی پلید ہوئی ہے پھر بات تمہارے گھر تک پہنچے گی۔ تمہاری عورتوں کو بھی تھانے کچہری میں گھسیٹا جا سکتا ہے۔“

تھانے کا سائن بورڈ میری نگاہوں کے سامنے دھندلا گیا۔ میں نے ریلوے لائن پار کی اور دوسری طرف آ گیا۔ ایک طرف خستہ حال سا کرکٹ گراؤنڈ تھا۔ اس میں بیٹھنے کے لیے سیمنٹ کی سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ میں ان سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ میرے گھر تک یقیناً یہ خبر پہنچ چکی ہوگی۔ میرے گھر والوں نے اور محلے والوں نے اس واقعے کو کس طرح لیا ہوگا؟ تماشبین ٹائپ لوگوں نے اس خبر کو کیا کیا مرچ مسالے لگائے ہوں گے؟

ایک بار پھر دنیا کے دُکھوں سے چھٹکارا پا جانے کا خیال ذہن میں زور پکڑنے لگا۔ وہ جس کے ساتھ جینے کے ارادے تھے، وہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔ نوکری بھی آج کل میں چھوٹنے والی تھی۔ بدترین ذلتوں نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ تو پھر زندہ رہ کر کیا کرنا تھا۔ بس......ایک پُرسکون سا اندھیرا ہو جس میں ڈوب جاؤں اور ہمیشہ کے لیے ہر فکر سے آزاد ہو جاؤں۔

میں ریلوے لائن کو دیکھتا رہا۔ اپنی ہی سرکٹی لاش میرے تصور میں آئی۔ تڑپتی اور پھڑکتی ہوئی۔ ہچکولوں کے ساتھ خون اُگلتی ہوئی۔ کیا میں اس طرح خونچکاں ہو کر مرسکوں گا؟ پھر میرا دھیان دوسرے ذرائع کی طرف جانے لگا۔ میں بے انتہا سنجیدگی سے کسی ایسے طریقے کے بارے میں سوچنے لگا جو مجھے آسانی کے ساتھ اس دائمی اور پُرسکون اندھیرے میں پہنچا دے۔

کیا بہت ساری گولیاں پھانک کر لیٹ جاؤں اور کسی اور دنیا میں پہنچ جاؤں؟

یہ خیال بہتر محسوس ہوا۔ ابھی جیب میں کچھ روپے موجود تھے۔ میں اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا پھر ریلوے لائن کی طرف بڑھا۔ ریلوے لائن کراس کر کے ایک بار پھر بازار میں داخل ہو گیا۔ کچھ فاصلے پر دوائیوں کی ایک دکان نظر آئی۔ صاف ستھری دکان تھی۔ باہر گارڈ کھڑا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ میں نے ٹرنکولائزر مانگا۔ سیل مین نے مجھے سرتاپا دیکھا پھر مالک دکان کی طرف دیکھا۔ مالک دکان بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''نہیں ہے بھئی۔''

میں چند لمحے تذبذب میں رہا۔ پھر گندم میں رکھنے والی گولیوں کے بارے میں پوچھا۔

اس مرتبہ دکاندار کے چہرے پر واضح طور پر جھنجلاہٹ اور غصہ نظر آیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر درشت لہجے میں کہا۔ ''نہیں......ہم نہیں رکھتے گولیاں۔''

مجھے لگا کہ میں نے کچھ اور پوچھا تو وہ مجھے دھکیل کر باہر نکالنے کی کوشش کرے گا۔ یقیناً میرا ابتر حلیہ ہر کسی کو چونکا رہا تھا۔

میں واپسی کے لیے مڑا۔ اس وقت میں نے اپنے عقب میں ایک شخص کو دیکھا۔ مجھے لگا کہ میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے کرکٹ گراؤنڈ کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں پر بھی دیکھا تھا۔ ایک بار شاید ہم دونوں کی نظر بھی ملی تھی۔

میں باہر نکلا تو وہ شخص بھی میرے پیچھے آیا۔ میں کسی اور دکان کی تلاش میں لنگڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دو تین منٹ بعد میں نے دیکھا تو وہ بدستور میرے پیچھے تھا۔ اب شبے کی گنجائش کم ہی تھی۔ وہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ میں نے سوچا۔

پھر ایک دم میں نے سارے خیال ذہن سے جھٹک دیئے۔ میں کیوں اردگرد کے بارے میں سوچوں؟ جب میں ویسے ہی سب کچھ چھوڑ رہا ہوں، ہر شے سے دور جا رہا ہوں تو پھر کیوں اپنا دماغ کھپاؤں؟ اس وقت میرے ذہن میں بس ایک ہی بات تھی۔ میں جلد از جلد اس پُرسکون اندھیرے کی پناہ میں چلا جاؤں جو مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ میرا مرکزِ نگاہ وہ ''اندھیرا'' ہی تھا۔ باقی کی ہر شے نگاہوں میں دھندلائی ہوئی تھی۔ ہر منظر زرد زرد اور دور افتادہ نظر آتا تھا۔ آوازیں بھنبھناہٹ کی صورت میں تھیں۔ میرے اردگرد چلتے ہنستے مسکراتے اور باتیں کرتے لوگ جیسے کسی اور دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔

اچانک ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ میرے پاس کھڑا تھا۔ وہ قریباً میرا ہم عمر ہی تھا۔ عمر تئیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ چہرہ روشن آنکھیں چمکیلی اور شانے کافی چوڑے تھے۔ اس کے لبوں پر ایک ایسی الوہی مسکراہٹ تھی جو نظر نہیں آتی تھی، بس محسوس کی جا سکتی تھی۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے تنک کر پوچھا۔

''تم سے کچھ کہنا ہے۔'' وہ ہموار دلکش آواز میں بولا۔

''کہو۔''

''یہاں نہیں......تم تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ آؤ۔''

''میں کہیں نہیں جا سکتا۔'' میرا لہجہ مزید خشک ہو گیا۔

''میرا اندازہ تھا کہ تم یہی کچھ کہو گے۔ تم بہت پریشان لگ رہے ہو۔ بلکہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس نے مجھے ایک بار پھر سرتاپا دیکھا اور گہری سانس لے کر فقرہ مکمل کیا۔ ''بلکہ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

''مطلب بھی بتا دوں گا اگر تم میرے ساتھ چلو تو اور میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں کسی بھی کام سے روکوں گا نہیں اور نہ ہی تمہارا زیادہ وقت لوں گا۔ بس ایک آدھ گھنٹہ۔''

پتا نہیں کہ اس بندے کے لب و لہجے میں کیا بات تھی کہ میں اس سے پیچھا نہیں چھڑا پا رہا تھا۔ کوئی مقناطیسی کشش تھی جو مجھے دور نہیں ہٹنے دے رہی تھی۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ جلدی سے بولا۔ ''یار! ایک آدھ گھنٹہ کوئی زیادہ وقت تو نہیں ہوتا۔ اس کے بعد تم ہر کام کے لیے آزاد ہو گے۔ بلکہ تمہارے کسی بھی ارادے کو پورا کرنے میں مَیں تمہاری مدد بھی کروں گا۔''

میں چند لمحے شدید تذبذب میں رہا۔ وہ بڑی متاثر کن نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس

نے صاف ستھری پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سفید جوگرز تھے۔ وہ زندگی، اُمنگ اور ترنگ سے بھرپور نظر آتا تھا۔

اس میں کسی کو قائل کرنے کی صلاحیت تھی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''تم یہیں کسی چائے خانے میں بیٹھ کر بات کر سکتے ہو؟''

''نہیں...... اس بات کے لیے ذرا پُرسکون ماحول کی ضرورت ہے۔ اگر تم کہو گے تو میں واپس تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تم سے۔''

''کہاں جانا ہوگا؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کمال بے تکلفی سے میرا بازو پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رکشے والے کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ ''او بھائی رکشہ۔''

رکشہ والا رُک گیا۔ وہ مجھے لے کر رکشہ میں بیٹھ گیا۔ ''مینار پاکستان چلو۔'' اس نے کہا۔

اب دوپہر ہونے والی تھی، ہم ٹریفک کے اژدھام سے گزرتے، دھواں پھانکتے اور ہچکولے کھاتے تقریباً پون گھنٹے میں مینار پاکستان پہنچ گئے۔ راستے میں ہم تقریباً خاموش ہی رہے تھے۔ مینار پاکستان کو دیکھ کر وہ میری طرف جھکا اور مسکراتے ہوئے لہجے میں دبی آواز کے ساتھ بولا۔ ''ویسے خودکشی کرنے کے لیے یہ بھی اچھی جگہ ہے۔ یار لوگوں نے کافی فائدہ اُٹھایا ہے اس سے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بیزاری سے منہ پھیر لیا اور رکشہ سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ غالباً اپنے فقرے پر خود ہی مسکراتا رہا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی عجیب تھی۔ وہ نظر کو اپنے اندر جذب کر لیتی تھی۔

اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ میری ذہنی کیفیت سے آگاہ ہے اور میرے خطرناک ارادے سے بھی کلی طور پر بے خبر نہیں ہے۔ میرا یہ اندازہ درست تھا کہ جب میں نے میڈیکل اسٹور میں جا کر بے ڈھنگے طریقے سے گولیاں وغیرہ مانگی تھیں، وہ میرے بالکل قریب موجود تھا اور میری بات سن رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ خستہ حال کرکٹ گراؤنڈ میں بھی میری حرکات وسکنات ملاحظہ کر چکا تھا۔ کہیں یہ کوئی خفیہ پولیس والا تو نہیں؟ میں نے سوچا۔ مجھے معلوم تھا کہ خودکشی یا اقدام خودکشی جرم ہے اور قابلِ دست اندازی پولیس ہے۔ کہیں یہ بندہ مجھے تھانے وغیرہ تو نہیں لے جا رہا تھا۔

اسی دوران میں اس کی شیریں آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ ایک بار پھر میری طرف جھکا اور مدھم لہجے میں بولا۔ ''لگتا ہے میری بات تمہیں بُری لگی ہے۔ معاف کر دو یار!

میں تو ایک جنرل بات کر رہا تھا۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''جا نہیں رہے، پہنچ گئے ہیں۔ وہ سامنے بجلی کا ٹرانسفارمر دیکھ رہے ہو، وہیں رُکنا ہے۔''

تب اس نے یہی بات رکشے والے کو بھی بتا دی۔ رکشہ سے اُتر کر اس نے کرایہ دیا۔ ساتھ میں بیس روپے ٹپ بھی دے دی۔ رکشہ والا اسلام کر کے رخصت ہوا۔ ہم راوی روڈ کے ایک بارونق علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں رہائشی مکانات تھے اور اِکا دُکا دکانیں بھی تھیں۔ یہاں میرے اس ساتھی کو کئی لوگ پہچانتے تھے۔ دو چار لڑکوں نے اسے ''ہیرو بھائی'' کہہ کر سلام کیا۔ دو تین دکانداروں سے بھی اس کی علیک سلیک ہوئی۔ لگتا تھا کہ وہ یہاں خاصا ہردلعزیز ہے۔ لوگ میرے حلیے کو بھی تعجب سے دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ پھر ایک تھڑے پر بیٹھے ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ''ہیرو پتر! تیری ماسی یاد کر رہی تھی تجھے۔ ایک چکر گھر کا لگا آنا۔''

''ہاں چاچا! آؤں گا۔ میں زیتون کا تیل لایا ہوں ان کے لیے۔ ان کے گھٹنوں کو بڑا فائدہ دے گا۔''

چاچے کے قریب بیٹھے ایک نیم بہرے شخص نے کہا۔ ''خاتون کا تیل؟ یہ خاتون کا تیل کیا ہوتا ہے؟''

''خاتون کا نہیں زیتون کا تیل وڈے بھا جی۔'' میرے ساتھی نے وضاحت کی۔

چاچے نے مسکراتے ہوئے اپنے نیم بہرے دوست کو چھیڑا۔ ''دو خاتونوں کا تیل تو تم نکال چکے ہو۔ وہ دونوں بیچاری قبرستان میں ہیں۔ اب بھی تمہیں خاتون ہی سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔ کچھ خدا کا خوف کر نذیرے۔''

میرا ساتھی مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ نے ایک بار پھر اپنے اردگرد چمکیلی شعاعیں سی بکھیر دیں۔ وہ نیم بہرے نذیرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''وڈے بھا جی کو خدا کا خوف ہے چاچا! اسی لیے تو وہ تیسری شادی کی بات کرتے ہیں۔ ورنہ لوگ آج کل کیا کیا گل نہیں کھلا رہے۔'' پھر اس نے نذیرے کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''وڈے بھا! آپ فکر نہ کریں۔ اگلے ہفتے آپ کو میو ہسپتال لے کر جاؤں گا۔ وہاں ایک ڈاکٹر اپنا بڑا پکا واقف ہے۔ اس سے آپ کے دونوں کانوں کی اوور ہالنگ کراتے ہیں۔''

نذیرے کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ ''میں کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ تجھ سے یہ

بات کہوں گا، اب تم نے خود کہہ دیا ہے۔ اللہ تجھے حیاتی دے۔ تُو بڑا خیال رکھتا ہے ہم سب کا۔"

"لو وڈے بھا! اب آپ نے بیگانوں جیسی باتیں شروع کر دیں۔ بس میں چلا۔" میرے ساتھی نے کہا اور میرا بازو تھام کر آگے بڑھ گیا۔

چھت پر کھڑے ایک لڑکے نے زور سے کہا۔ "ہیرو بھائی! کیچ۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ایک سیب اس کی طرف اُچھال دیا۔ اس نے سیب کیچ کیا اور اسے کچر کچر کھاتا ہوا ایک کوٹھی نما گھر کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ جیب سے چابی نکال کر اس نے دروازہ کھولا۔ گیراج میں ایک عجیب وضع کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ وہ مجھے برآمدے سے گزار کر اندر لے آیا۔ یہاں چاروں طرف بے ترتیبی تھی جسے دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس گھر میں عورت کا گزر نہیں ہے۔ بہرحال، گھر میں ساری سہولتیں موجود تھیں۔ یہ قریباً دس مرلے کا گھر تھا اور اچھا بنا ہوا تھا۔ اگر یہاں سلیقہ اور ترتیب ہوتی تو یہ خوبصورت نظر آتا۔ اسی دوران میں پڑوس کی طرف سے آواز آئی۔ کسی شخص نے دیوار کے اوپر سے "ہیرو بھائی" کہہ کر پکارا۔

وہ "جی زاہد بھائی" کہتا ہوا بغلی راہداری میں چلا گیا۔

پڑوسی نے پوچھا۔ "یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"اپنا دوست ہے زاہد بھائی! سمجھیں بچپن کا دوست۔"

"اسے ہوا کیا ہے؟ کافی چوٹیں لگی ہوئی ہیں۔"

"دراصل ابھی کچھ دیر پہلے ہی لاہور اسٹیشن پر ٹرین سے اُترا ہے۔ اسٹیشن کی سیڑھیوں سے پھسل کر گر گیا ہے۔ شکر ہے خدا کا کہ کوئی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی۔" ہیرو نے بڑی روانی سے کہا۔

"ڈاکٹر کو دکھایا ہے۔"

"ہاں...... ہاں...... بینڈ ایج وغیرہ کروائی ہے۔"

کچھ دیر بعد ہیرو پھر میرے سامنے تھا، چہرے پر وہی مقناطیسی مسکراہٹ لیے۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں...... اب بتاؤ۔ کیا کہنا ہے تم نے۔"

"نہیں...... اس طرح نہیں۔ پہلے تمہیں اپنا حلیہ ٹھیک کرنا ہوگا۔ کپڑے بدلنے ہوں گے اور کچھ کھانا پینا ہوگا۔ میں تمہاری صورت دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ تم نے ابھی تک ناشتہ بھی

نہیں کیا ہے۔"

"دیکھو مجھے ناشتے وغیرہ کی بالکل ضرورت نہیں تم

"اچھا...... چلو ٹھیک ہے لیکن ذرا اپنا حلیہ درست کر لو۔ دیکھو یہ تمہاری بنیان بھی اب خون سے داغی ہونے لگی ہے۔"

میں اسے روکتا ہی رہ گیا مگر وہ صابن تولیا لے کر آ گیا۔ اس نے اصرار کے ساتھ میرا منہ دھلوایا۔ میری ٹھوڑی کی تازہ بینڈ ایج اپنے ہاتھ سے کی اور میرے ایک زخمی پاؤں پر بھی پٹی باندھی۔ پھر وہ میرے لیے اپنا ایک استری شدہ جوڑا لے آیا۔ پتلون کے اندر بیلٹ وغیرہ بھی موجود تھی۔ میرے انکار کی پروا کیے بغیر اس نے مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔ میں نے باتھ روم میں کپڑے بدلے۔ کپڑے بدلتے ہوئے جسم کے مختلف حصوں سے ٹیسیں اُٹھیں۔ چوٹیں ٹھنڈی ہو چکی تھیں اور جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ میں باہر آیا تو وہ میز پر کھانے پینے کی اشیاء سجائے بیٹھا تھا۔ پیزے کے ٹکڑے، چکن رول، گولڈ ٹی اور اورنج جوس وغیرہ۔ اس نے بہت اصرار کیا مگر اس بار میں نے اس کی نہیں مانی۔ میں اس قابل ہی نہیں تھا کہ منہ میں لقمہ رکھ سکتا۔ مجھے لگتا تھا کہ اُلٹی ہو جائے گی۔

"ہاں...... اب بتاؤ۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" میں نے بے حد رکھائی سے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟" اس نے اُلٹا سوال کیا۔

میں نے خاموشی سے دانت پیسے اور گہری سانس لے کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم بس میرا اور اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے پاس کوئی کام کی بات ہے اور نہ تم کرو گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب سیدھا سادہ ہے۔ تم نے مجھے میڈیکل اسٹور میں دیکھا ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ میں گولیاں وغیرہ کھا کر ہسپتال پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اب تم خدائی فوج دار بن کر میرے سر پر مسلط ہو گئے ہو اور مجھے ایک لمبا چوڑا لیکچر پلانے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"لیکچر؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں لیکچر...... تم پہلے مجھ سے میری پریشانیوں کا حال پوچھو گے پھر دُکھی چہرہ بنا کر میرے بدترین حالات پر افسوس کرو گے۔ اس کے بعد تم عبدالستار ایدھی بننے کی کوشش کرو گے۔ مجھے زندگی کی قدر و قیمت بتاؤ گے، جینے کے فائدے گنواؤ گے، موت کے نقصانات سے آگاہ کرو گے۔ پھر تم میرے اندر حوصلہ اور زندگی کی اُمنگ ترنگ پیدا کرنے کا جتن کرو گے اور میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں، تمہاری یہ ساری بیوقوفانہ کوششیں ناکام ہوں گی۔ ان سے

کچھ ہونے والا نہیں ہے اور نہ ہی مجھے ان کی ضرورت ہے۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اپنے بارے میں کسی طرح کا کوئی خطرناک ارادہ نہیں رکھتے ہو؟''

''میں نہیں رکھتا ہوں اور اگر...... رکھوں بھی تو تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟ یہ میری زندگی ہے۔ میں اس کے ساتھ جو چاہے کر سکتا ہوں۔ تم یہ اپنی فلمی سچویشن اپنے پاس رکھو۔ میں کسی بھی طرح کی تقریر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میرے لہجے میں بیزاری بڑھتی جارہی تھی۔

وہ مسکرایا۔ ''اگر تم تقریر سننے کے موڈ میں نہیں ہو تو میں بھی تقریر کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں اور میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میرا شروع سے ایسا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں تمہیں کسی بھی ارادے سے روکنے والا نہیں ہوں اور بالفرض محال تم خودکشی کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہو تو میں تمہیں کیوں روکوں گا اس سے؟ میرے بھائی! میں تو خود مرنے کی حد تک بیزار ہوں اس زندگی سے اور سچ پوچھو تو میں خود...... خودکشی کا کوئی مناسب سا طریقہ ڈھونڈ رہا ہوں۔''

میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدستور مقناطیسی روشنی تھی۔ یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ وہ سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے۔

''ہاں...... ہاں مائی ڈیئر! میری ہنسی اور میری باتوں پر نہ جاؤ۔ یقین کرو، میں بھی تمہاری ہی کشتی کا سوار ہوں۔ بس اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ میری سوچ کا انداز تم سے ذرا مختلف ہے۔ میں مرنا تو چاہتا ہوں لیکن اپنی موت کی ذمے داری خود لینا نہیں چاہتا۔ میں مرنے کے لیے حالات کا سہارا لے رہا ہوں۔ ہاں...... ہاں حالات کا اور حالات تمہیں پتا ہی ہے، بڑے ہرجائی ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ مرنے نکلو تو ساتھ نہیں دیتے، جینے نکلو تو ساتھ نہیں دیتے۔ بس حالات کی وجہ سے مجھے فوت ہونے میں تھوڑی دیر ہو رہی ہے لیکن ناکام ہونے والا میں بھی نہیں ہوں۔''

''اگر تم خود کو اچھا مسخرہ سمجھتے ہو تو یہ بھی تمہاری بیوقوفی ہے۔'' میں نے کہا۔

''یار! تم تو پھر ناراض ہو گئے اور دیکھو، کتنے مزے کی بات ہے میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا اور نہ اپنا بتایا ہے۔ چلو پہلے میں ہی اپنا بتا دیتا ہوں۔ میرا پورا نام عمران دانش ہے۔ یار لوگ پیار سے ''ہیرو'' کہتے ہیں لیکن میں خود کو ہیرو ویرو بالکل نہیں سمجھتا ہوں۔ ہیرو کا مطلب ہوتا ہے بہادر اور جو بندہ اپنی زندگی کو ہی نہ جیت سکے، وہ بہادر کیا ہوا...... اور تمہارا

نام؟'' اس نے میری طرف اُنگلی اُٹھائی۔

''تابش......'' میں نے بیزاری سے کہا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔

اس نے پھرتی سے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ ''نہیں...... نہیں یار جی! ایسا نہیں چلے گا۔ جس بات کے لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں، وہ تو تمہیں سننا ہی پڑے گی۔''

''تو سناؤ۔''

اس نے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔ ٹھوڑی میں ایک گڑھا تھا جو اس کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا۔ اس نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ تھوڑا سا غور کیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بڑا اچھا ہوا کہ آج ہفتہ ہے۔ میں تم سے کچھ زیادہ نہیں مانگوں گا۔ صرف دس بارہ گھنٹے۔ رات ڈیڑھ دو بجے کے بعد تم جہاں چاہو جا سکو گے۔''

''پہلے تم نے کہا کہ میں صرف بات کرنا چاہتا ہوں۔ اب تم دس بارہ گھنٹے کی بات کر رہے ہو۔'' میں نے قدرے ڈھیلے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی مرضی کے خلاف بات کرنا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ اس کی نگاہ قائل کر لینے والی تھی۔

''بس...... میرے یار! جو کہہ دیا، وہ کہہ دیا۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہوں گا۔ رات دو بجے کے بعد تم اپنے راستے پر میں اپنے راستے پر۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر وہ تیزی سے چلتا چلا گیا۔ ''چلو...... چلو...... میرا ٹائم شروع ہو چکا ہے اور میں اپنے ٹائم میں گھاٹا کھانے والا نہیں ہوں۔ چلو ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔''

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس تھوڑی دور۔ تمہیں ایک دو ضروری چیزیں دکھانی ہیں۔''

''میں کچھ بھی دیکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' میری بیزاری برقرار تھی۔

''یہ دیکھو یار! میں تمہارے ساتھ ہاتھ جوڑتا دیتا ہوں۔ اب تم نے یہ وقت دیا ہے تو بس دے دو۔ کوئی سوال نہ پوچھو اور نہ کوئی اعتراض کرو۔ اگر کہتے ہو تو میں تمہارے پاؤں بھی پکڑ لیتا ہوں۔''

وہ میرے پاؤں کی طرف جھکا۔ میں نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔ وہ بہت چرب زبان تھا۔ ابھی میں نے اقرار نہیں کیا تھا کہ میں دس بارہ گھنٹے اس کے ساتھ رہوں گا لیکن وہ خود ہی یہ بات طے کر چکا تھا اور اب اس کے ''حوالے'' دے رہا تھا۔ میں غم کے شدید ترین

نرغے میں تھا۔ بدن سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں لیکن اس کے باوجود میں تذبذب محسوس کر رہا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس شخص کا ساتھ مجھے بُرا نہیں لگ رہا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ کوئی عجیب سی کشش تھی اس میں جو مجھے اپنے ساتھ باندھ رہی تھی۔

میں نے سوچا چلو یہاں سے تو نکلا جائے پھر دیکھیں گے کیا کرنا ہے؟ وہ مجھے کھینچتا ہوا گیراج کی طرف لے آیا۔ اسی دوران میں اس کی نظر میری قینچی چپل پر پڑ گئی۔ ''اوہو ہو ہو...... یہ کیا؟ اوپر انگلینڈ نیچے ایتھوپیا۔'' وہ جلدی سے واپس گیا اور میرے لیے ایک پالش شدہ پشاوری چپل لے آیا۔ یہ براؤن چپل پینٹ شرٹ کے ساتھ بچ گئی۔

اول جلول موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے میں اسے دو تین منٹ لگ گئے لیکن جب وہ ایک بار اسٹارٹ ہوئی تو پورے محلے کو پتا چل گیا کہ کچھ اسٹارٹ ہوا ہے۔ وہ موٹر سائیکل کو باہر لایا، دروازے کو تالا لگایا اور مجھے اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

موٹر سائیکل کے عقب نما گول آئینے میں مجھے اپنا سوجا سوجا چہرہ نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی ڈھائی تین گھنٹے پہلے کی وہ بے مثال توہین بھی یاد آ گئی جو مجھے بڑی سنجیدگی کے ساتھ زندگی سے دور اور موت سے قریب لے آئی تھی۔ میرے اردگرد کے حالات اتنے گمبھیر ہو گئے تھے کہ مجھ جیسے کم ہمت شخص کو بھی مرنا آسان لگ رہا تھا۔ میں سیٹھ سراج کو بھرے بازار میں تھپڑ مار چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ معاملہ اب اتنی آسانی سے نہیں رُکے گا۔

وہ مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر بازار سے باہر نکلا۔ اس کا ایک ہاتھ ہینڈل پر تھا، دوسرے سے علیک سلیک کرتا جا رہا تھا۔ جلد ہی ہم لوگ شاہراہ قائداعظم پر تھے۔ اب سہ پہر کا وقت تھا۔ سڑکوں پر رش بڑھ گیا تھا۔ عمران کی موٹر سائیکل دیکھتے ہی دیکھتے ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بڑی تیزی سے مختلف سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ بریکیں لگا رہا تھا، کٹ مار رہا تھا اور پھر ایک دم موٹر سائیکل کو کمان سے نکلا ہوا تیر بنا دیتا تھا۔ اس کی رفتار کو تیز یا خطرناک کہنا کوئی کافی نہیں تھا۔ وہ بہت خوفناک رفتار سے چل رہا تھا۔ اس نے بیلٹ پہن رکھا تھا نہ میں نے۔ جب شاہراہ قائداعظم پر اس نے ایک نہایت تیز رفتار کار کے سامنے سے یوں موٹر سائیکل گزاری کہ کار کا بمپر موٹر سائیکل سے ٹکرانے میں انچوں کا فاصلہ رہ گیا تو میں چپ نہ رہ سکا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' میں نے جھلاہٹ سے کہا۔

''کیا ہوا؟'' وہ بھولپن سے بولا۔

''کہیں مار دو گے۔''

''تو کیا ہوا؟'' اس نے کہا۔

میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا اور ٹھٹک گیا۔ بولنے کے لیے جو منہ کھولا تھا پھر بند کر لیا۔ ''تو کیا ہوا؟'' اس نے یہی کہا تھا۔ واقعی اگر موٹر سائیکل کسی گاڑی وغیرہ سے ٹکرا جاتی تو کیا ہوتا؟ کم از کم یہ سوال میرے لیے تو ہرگز موزوں نہیں تھا۔

اگلے ایک آدھ گھنٹے میں اس نے لاہور کی مختلف سڑکوں پر اتنی رفتار سے موٹر سائیکل دوڑائی کہ ہر گھڑی یہی لگا کہ شاید آخری وقت آ گیا ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل پُرسکون تھا۔ جیسے یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہ ہو۔ ایک دو جگہ ٹریفک کے سپاہیوں کو دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا۔ جواب میں انہوں نے بھی اُلجھی اُلجھی سی مسکراہٹ اس کی طرف اُچھالی۔

اس نے شور مچاتی موٹر سائیکل لکشمی چوک کے قریب نگینہ سینما میں گھسا دی۔ یہاں شو شروع ہونے والا تھا۔ عام طور پر یہاں انگلش فلم لگتی تھی مگر اب ایک نوے کی دہائی کی پنجابی فلم لگی ہوئی تھی۔ ''یہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر وہی سوال۔'' اس نے مقناطیسی مسکراہٹ میری طرف اُچھالی۔ ''تمہیں کہا ہے نا یار تابش! میرے ٹائم کے اندر مجھ سے سوال نہ کرنا۔''

میں منہ بنا کر رہ گیا۔ دماغ پر ابھی تک سکون آور گولیوں کا غبار تھا۔ مجھے نہ اپنی سمجھ آ رہی تھی نہ اس شخص کی۔ یہ دیکھ کر میری حیرت میں اضافہ ہوا کہ اس نے وہ سستا سا ٹکٹ لیا جسے عرف عام میں ''ون ایٹ'' کہا جاتا ہے۔ ٹکٹ کے بعد اس نے تلی ہوئی دال (مرغ دال) کی دو پڑیاں اور گنڈیریاں لیں۔ پھر مجھے لے کر ہال کی طرف بڑھا۔ میں مسلسل خاموش تھا۔ وہ رُک گیا۔ ''اوہو...... لگتا ہے پھر ناراض ہو گئے ہو۔ اچھا بابا! معافی دے دو۔'' اس نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''تم یہ مسخرہ پن ختم نہیں کر سکتے۔ آخر تم مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔''

''تو پھر یہ کیا ہے...... پھٹیچر سینما؟''

''دراصل بڑے دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ کسی نہایت فضول قسم کے سینما میں، نہایت فضول سیٹوں پر بیٹھ کر، نہایت ہی بور قسم کی فلم دیکھی جائے اور پرانی یادوں کو تازہ کیا جائے۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو...... پروگرام تبدیل کر دیتے ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ میں کچھ بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اِدھر اُدھر گھومنے کے بجائے کسی چار دیواری میں بیٹھنا اور اپنے بے پناہ دُکھ میں ڈوبنا مجھے بہتر محسوس ہوا۔

میں ذرا چپ ہوا تو وہ مجھے بازو سے پکڑ کر سینما ہال کی طرف بڑھ گیا۔ درحقیقت وہ

اپنے مخاطب کو زیادہ سوچنے اور ردِعمل ظاہر کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ سینما ہال میں گنڈیریاں لے جانا منع ہوتا ہے لیکن وہ بڑی آسانی سے گیٹ کیپر کی نگاہیں بچا کر لے گیا۔

کہتے ہیں کہ سینما ہال کا اندھیرا فلم بین کو کچھ دیر کے لیے باہر کی دنیا سے اور دنیا کے دُکھوں سے کاٹ دیتا ہے بورترین فلم بھی ہو تو کچھ نہ کچھ تو اثر ہوتا ہی ہے۔

میں نے سکون آور دوا کی تین گولیاں سینما ہال میں ہی چبا کر نگل لیں اور اپنی آتشیں سوچوں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند گھنٹوں میں حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے۔ آج صبح میں اس فیصلے کی سولی پر لٹک رہا تھا کہ مجھے آربہ سے ملاقات کرنی چاہیے یا نہیں اور اب میں اس فیصلے کی سولی پر تھا کہ مجھے زندہ رہنا ہے یا مر جانا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید سینما ہال میں انٹرویل کے دوران یا فلم کے دوران میں عمران مجھ سے بات چیت کرے گا اور میرے حالات کو کریدنے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

فلم ختم ہوئی۔ عمران نے مجھے ایک بار پھر اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بٹھایا۔ تب میں نے پہلی بار دھیان سے موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ نمبر پلیٹ کے نیچے سیاہ پینٹ سے مُردے کی کھوپڑی بنی ہوئی تھی اور اس کے نیچے لکھا تھا...... کنگ آف اسپیڈ۔

کنگ آف اسپیڈ نے موٹر سائیکل کو ایک بار پھر ہوا میں اُڑانا شروع کیا۔ میں نے ایک بات محسوس کی۔ وہ بے انتہا تیز تو ضرور چلاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے حد مشاق بھی تھا۔ گاڑیوں کے درمیان سے ہوا کی طرح بائیک کو نکال کر لے جاتا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم مغل پورہ پہنچ گئے۔ یہاں شالامار باغ کے قریب ایک بڑا سرکس لگا ہوا تھا۔ اس معروف سرکس کمپنی کے اشتہارات اکثر اخبار اور ٹی وی پر دیکھے جاتے تھے۔ عمران نے موٹر سائیکل سرکس میں گھسا دی۔ یہاں بھی اس کے بہت سے لوگ جاننے والے تھے۔ وہ اسے ہیرو بھائی اور عمران بھائی کہہ کر سلام کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مجھے بھی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ چمکیلے لباس میں ملبوس ایک اسمارٹ بازی گر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے عمران سے پوچھا۔ ''بھائی صاحب کون ہیں اور کیا ہوا انہیں؟''

''پرانے یار بیلی ہیں۔ آج سویرے لاہور اسٹیشن کی نامعقول سیڑھیوں سے گر گئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہڈی وغیرہ بچ گئی ہے۔''

وہ مجھے سیدھا سرکس کے اس حصے میں لے گیا جہاں سرکس کے فنکار شو سے پہلے مختلف

تیاریوں میں مصروف تھے۔ کوئی آہنی کڑے اُچھال رہا تھا، کوئی گیندوں سے کھیل رہا تھا۔ ایک کوتاہ قد جوکر کندھے پر بندر کا بچہ بٹھائے ایک پہیے والی سائیکل چلا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر انکشاف ہوا کہ یہ عمران نامی عجوبہ جو پانچ گھنٹے سے مجھے اپنے ساتھ اُڑائے پھر رہا ہے، دراصل اس سرکس میں کام کرتا ہے۔ وہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا تھا۔ اب یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ موٹر سائیکل کو چلانے کے بجائے ''اڑاتا'' کیوں تھا۔ اس نے شاید پورے لاہور شہر کو موت کا کنواں سمجھ رکھا تھا۔ وہ یہاں سرکس میں بھی ہر دلعزیز تھا۔ سرکس کی چلبلی لڑکیاں اس سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی میں یہ لڑکیاں اصل سے زیادہ جاذب نظر محسوس ہوتی تھیں۔ میں اپنا دھیان بٹانے کی بہت کوشش کر رہا تھا لیکن جس طرح کالے بادلوں میں رہ رہ کر برق تڑپتی ہے یہ خیال بار بار ذہن میں آتا تھا کہ اس وقت میرے گھر کا منظر کیا ہو گا۔ والدہ اور بہن بھائی کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔

عمران نے اسسٹنٹ منیجر سے کہہ کر میرے سامنے فروٹ اور مشروبات وغیرہ کا انبار لگوایا۔ پھر کپڑے بدلنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ یہاں سے کھسکنے کے لیے یہ موقع مناسب ہے لیکن اسی دوران میں ایک لڑکی میرے قریب بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً جمناسٹر تھی۔ سرکس کی عام لڑکیوں کے برعکس اس نے زیادہ بھاری میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ نہایت چست لباس میں اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران اس لڑکی کو میری نگراں بنا کر چھوڑ گیا ہے۔ وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کے سوال پوچھنے لگی۔ اس نے میری چوٹوں کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ لڑکی کا نام شاہین تھا۔

اسی اثناء میں عمران ایک چمکیلا کاسٹیوم پہن کر واپس آ گیا۔ اس لباس میں اس کا کسرتی جسم جھلک دکھاتا تھا۔ شاہین نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ وہ بے باکی سے اس کی طرف جھکا اور سرگوشی میں بولا۔ ''ایسی نظروں سے مت دیکھا کرو جان من! کسی دن موٹر سائیکل سمیت سر کے بل گروں گا۔''

''تمہاری طرف تو دیکھنا بھی گناہ ہے۔'' وہ ہنسی۔

''اور یہ گناہ تم روز ہی کرتی ہو۔ وہ بھی عین اس وقت جب میری انٹری ہونے والی ہوتی ہے۔ کیوں اپنے ہونے والے بچوں پر ظلم کرتی ہو؟ فار گاڈ سیک! نہ کیا کرو ایسا۔''

عمران کے فقرے پر شاہین کا رنگ شہابی ہوا۔ وہ پہلے بے طرح شرمائی پھر کولڈ ڈرنک کی خالی بوتل پکڑ کر بولی۔ ''میں سر توڑ دوں گی تمہارا۔''

''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے۔ دل کے بعد اب سر کی باری ہی تو آنی ہے۔'' شاید وہ کچھ

اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں اس کی نظر ٹیبل کیلنڈر پر پڑ گئی۔ اس نے غور سے دیکھ کر تسلی کی اور بولا۔ ''آج ہفتہ ہی ہے نا...... چلو یہ بھی ٹھیک ہوا۔''

یہ ''ہفتے'' والا فقرہ اس نے پچھلے پانچ چھ گھنٹوں میں کم از کم چار دفعہ کہا تھا اور ہر بار اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آئی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا۔

سرکس کا پنڈال اور موت کا کنواں ایک دوسرے سے قریباً پچاس قدم کے فاصلے پر واقع تھے۔ دونوں جگہوں سے تماشائیوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ گاہے بگاہے میوزک کی آواز بھی اُبھرتی تھی۔ ''میرا نیا کاسٹیوم تیار ہے؟'' عمران نے اسسٹنٹ منیجر عباس سے پوچھا۔

''ہاں عمران بھائی! ایک دم ریڈی۔ سرکس میں آپ کی انٹری ساڑھے نو بجے کے قریب ہے۔''

اسسٹنٹ منیجر اور عمران کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ عمران موت کے کنویں کے علاوہ سرکس کے جھولوں پر بھی کام کرتا ہے۔ اس کے جسم میں ایک اچھے جمناسٹر کی خصوصیات موجود تھیں اور نظر بھی آتی تھیں۔

ہم جس جگہ بیٹھے تھے، یہ ایک بڑا شامیانہ تھا۔ اس شامیانے ہی کے ایک حصے کو لکڑی کے پارٹیشن سے دفتر کی شکل دے دی گئی تھی۔ شامیانے میں مختلف فنکار وارم اپ ہونے میں مصروف تھے۔ موت کے کنویں کی طرف سے گاہے بگاہے تالیوں کی آواز بھی اُبھرنے لگی جس سے اندازہ ہوا کہ وہاں چھوٹا موٹا تماشہ شروع ہو چکا ہے۔ دو ملازم لڑکے عمران کی موٹر سائیکل چیک کرنے میں مصروف تھے۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور اپنے مخصوص مسکراتے لہجے میں بولا۔ ''بیٹھو گے میرے ساتھ؟''

''نہیں......'' میں نے رکھائی سے جواب دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''چلو تماشہ تو دیکھو گے نا؟'' اس نے کہا پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک ہٹے کٹے شخص سے بولا۔ ''سینڈو...... تابش کو اندر لے جاؤ۔''

صفاچٹ سر والے سینڈو نے میری طرف دیکھا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ آؤ جی میرے ساتھ، اپنے ہیرو بھائی کے کمالات دیکھو۔

شامیانے کے ایک جانب راستہ سا تھا۔ اس راستے کی دیواریں قناتوں سے بنی ہوئی تھیں۔ موت کے کنویں میں کرتب دکھانے والوں کو اسی راستے سے گزر کر کنویں میں داخل ہونا تھا۔ میں سینڈو کے ساتھ اندر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن چار و ناچار چلا گیا۔ اوپر سے موت

کے کنویں میں کئی بار جھانکا تھا لیکن آج میں کنویں کے اندر تھا۔ یہاں عین درمیان میں لوہے کی تین چار کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ہی چھوٹا سا ڈیک تھا جس سے اُبھرنے والی موسیقی تین بڑے اسپیکروں کے ذریعے کنویں میں اور کنویں سے باہر گونج رہی تھی۔ کنویں کے بالائی کنارے پر ڈھائی سو تماشائیوں کے نہایت مشتاق چہرے نظر آ رہے تھے۔ کنویں کے اندر دو لڑکیاں اور دو ہیجڑے بھی موجود تھے۔ انہوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے اور چہروں پر سرخی پاؤڈر تھوپا ہوا تھا۔ یہ سب اُلٹا سیدھا ڈانس کر رہے تھے۔ ڈیک پر گانا بج رہا تھا۔ سن وے بلوری اکھ والیا۔

مجھے لگا کہ کنویں کے اندر میں خود بھی ایک تماشا ہوں اور اَن گنت بلوری آنکھیں مجھے بھی گھور رہی ہیں۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر اتفاقاً ان تماشائیوں میں سے کوئی میرا شناسا بھی ہو تو مجھے اس حال میں اس کنویں کے اندر دیکھ کر کیا محسوس کرے گا۔ شاید وہ سمجھے کہ میں نے بھی موت کے کنویں میں کام کرنا شروع کر دیا ہے اور میرے جسم پر جو چوٹیں نظر آ رہی ہیں، وہ اسی ''کام'' کے سلسلے میں لگی ہیں۔ ایک بار پھر جی میں آئی کہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے کھسک جاؤں لیکن عمران نے میرا پکا انتظام کر کے ہی مجھے اندر بھیجا تھا۔ لڑکی شاہین کی طرح سینڈو بھی میرا میزبان تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ نگران بھی تھا۔

لڑکیوں اور ہیجڑوں کو گانے کی دھن پر بیہودہ ڈانس کا اچھا رسپانس ملنے لگا۔ اوپر سے نوٹ پھینکے جانے لگے۔ اسی دوران میں عمران کی عجیب الخلقت موٹر سائیکل انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ اس کی آواز نے قرب و جوار کی ہر خوبصورت و بدصورت آواز کو ڈھانپ لیا۔ تماشائیوں نے ابھی موٹر سائیکل کو دیکھا نہیں تھا مگر ان کے اندر جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ موسیقی بند ہو گئی اور ڈانسرز نے کنواں خالی کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد عمران کنویں میں داخل ہوا۔ لوگوں نے پُرجوش تالیاں بجائیں۔ اس نے ہاتھ لہرا کر جواب دیا پھر اس نے رفتار تیز کی اور اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

اگلے پانچ چھ منٹ میرے لیے بے حد تحیر خیز تھے۔ خاص طور سے آخری دو منٹ۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ موت کے کنویں کا تماشہ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا بلکہ کنویں میں کاریں بھی چلتی دیکھی تھیں مگر عمران نے جو آئٹم پیش کیے وہ حیران کن تھے۔ پوری Swing میں چلتی ہوئی موٹر سائیکل پر اوندھا لیٹنا، اُلٹا بیٹھنا، گھٹنوں کے بل بیٹھنا، ایک گھٹنا ٹیک کر دونوں ہاتھ فضا میں پھیلا دینا۔ ہر گھڑی یہی لگا کہ وہ احمقانہ جوش کا مظاہرہ کر رہا ہے اور ابھی کسی حادثے کا شکار ہو کر نیچے گر جائے گا۔ اس کا گرنا اس کے لیے

ہی نہیں، کنویں کے اندر موجود تین چار افراد کے لیے بھی خطرناک ثابت ہوسکتا تھا جن میں مَیں بھی شامل تھا۔ موٹر سائیکلوں کے زور سے، لکڑی کا بنا ہوا پورا کنواں بُری طرح ہل رہا تھا۔

شو کے آخری حصے میں ایک اور موٹر سائیکل سوار بھی عمران کے ساتھ شامل ہو گیا۔ دونوں سواروں نے اپنے پیچھے دو لڑکیاں بھی بٹھائیں۔ ان میں عمران کے پیچھے وہی ہلکی بھوری آنکھوں والی شاہین بیٹھی۔ بہرحال، تماشے کے اس آخری حصے میں بھی عمران کو ہی مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ تماشائیوں نے اس کی ہر خطرناک ادا پر دل کھول کر تالیاں بجائیں۔ آخر میں وہ چند سیکنڈ کے لیے میرے پاس رُکا۔ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف جھک کر بولا۔ ''آ جاؤ یار! دو منٹ کے لیے تم بھی اس رائڈ کا مزہ لے لو۔ سچ کہتا ہوں، نشہ ہو جائے گا۔''

''سوری......'' میں نے حتی الامکان اپنے چہرے کو سخت رکھا۔

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی مقناطیسی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر ہولے سے بولا۔ ''جو ڈرتا ہے تو مرتا ہے، جو مرنا ہے تو پھر ڈرنا کیا؟''

''تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں؟'' میں اُٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے ایک دم اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔ ''ارے......نہیں بیٹھو بیٹھو۔ ایک تو تم غصے میں ایک دم آ جاتے ہو۔ اچھا......اب کچھ نہیں کہوں گا تمہاری مرضی کے خلاف۔ اب ایک آخری آئٹم ہے، اس کے بعد چلتے ہیں اور اگر......''

اسے بات کرتے کرتے اچانک رُکنا پڑا کیونکہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی اور ہولے سے بولا۔ ''ہاں جی......عمران اسپیکنگ۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جو اس نے دھیان سے سنا پھر جواب میں بولا۔ ''پر ملک صاحب! ایس ایچ او سے تو ہمیشہ آپ ہی بات کرتے ہیں۔ ہمارا کام تو اندر کے معاملے سنبھالنا ہوتا ہے۔ جی ہاں......جی ہاں......آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن پچھلی بار ہی تو بات ہوئی تھی۔ دوسرے ہفتے میں پیسے بھی بڑھائے تھے آپ نے۔''

جواب میں پھر کچھ کہا گیا جو عمران نے دھیان سے سنا اور آخر میں بولا۔ ''تو پھر کیا کیا جائے۔ ٹکٹ بڑھا دیا جائے؟ نہیں......نہیں......یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' بات کرتے کرتے وہ موٹر سائیکل سے اُترا اور کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ پھر فون کان سے لگائے لگائے وہ کنویں سے نکلا۔ وہ غالباً منیجر یا اسسٹنٹ منیجر کی طرف گیا تھا۔

اس نامعلوم فون کال کے بعد میں نے پہلی بار عمران کے چہرے پر تھوڑی سی سنجیدگی

دیکھی تھی۔ میرے قریب کھڑا سینڈو اور دیگر افراد بھی قدرے سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ میری چھٹی حس کہنے لگی کہ یہاں کچھ چھپایا جا رہا ہے۔ اس تماشے کے ساتھ ساتھ یہاں کوئی زبردست قسم کا گھپلا ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔ کوئی ایسا کام جسے کرنے سے پہلے یہاں کے اہم افراد تناؤ کی کیفیت میں ہیں۔ کیا یہ کوئی خطرناک کام ہے؟ کیا کوئی سنگین قسم کی قانون شکنی ہونے والی ہے؟ یا پھر......

میرے ذہن میں ایک بار پھر یہ بات آئی کہ میں یہاں سے نکل جاؤں۔ میں کوئی ان کا قیدی نہیں تھا۔ میں اب تک صرف عمران کے اصرار کی وجہ سے یہاں رُکا ہوا تھا۔ سینڈو اور دیگر افراد آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ مجھے کھسکنے کا موقع مل سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا لیکن اسی وقت عمران پھر مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ بھی عجیب چیز تھی۔

وہ اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور بے خوفی تھی۔ تب وہ ایک بار پھر کنویں کے اندر موٹر سائیکل دوڑانے لگا۔ موٹر سائیکل کا شور بے پناہ تھا۔ عمران نے پوری رفتار سے چلتی موٹر سائیکل پر چند اور نہایت خطرناک کرتب دکھائے۔ ہر گھڑی یہی لگ رہا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ اعتماد کا شکار ہے اور اپنا کوئی نقصان کر بیٹھے گا۔ دیکھنے والوں کے سانس سینے میں اٹکے ہوئے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ تالیاں بھی پیٹ رہے تھے۔

آخر عمران کا تماشہ ختم ہوا اور وہ زبردست تالیوں کے شور میں نیچے آ گیا۔ اس کی موٹر سائیکل ملازمین نے سنبھال لی اور وہ تماشائیوں کی طرف ہاتھ لہراتا ہوا، موت کے کنویں سے باہر نکل گیا۔ میں بھی بے کنے سینڈو کے ساتھ واپس شامیانے میں آ گیا۔

''کیسا لگا میرا تماشہ؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت اچھا۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

میں رات دو بجے تک اس شخص کے ساتھ رہنے کا وعدہ کر چکا تھا مگر اب یہ وعدہ نبھانا مجھے مشکل نظر آ رہا تھا۔ ایک تو میری جسمانی چوٹیں مجھے مسلسل تکلیف دے رہی تھیں، دوسرے میری ذہنی تکلیف جسمانی تکلیف سے کہیں بڑھ کر تھی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہیں کوئی خاموش جگہ ہو...... گہری، تاریک اور بالکل تنہا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤں اور ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر اپنی زندگی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کر لوں۔ فیصلہ کر لوں کہ مجھے زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ اگر مرنا ہے تو کس طریقے سے ...... اور اگر زندہ رہنا ہے تو پھر کس طرف کا رُخ کرنا ہے۔ یہ بات تو میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ میں پھر اپنے گھر کی طرف لوٹوں گا۔ ان سب لوگوں کا سامنا کروں گا جو میری بے مثال ذلت و

رسوائی کے شاہد تھے یا اس بارے میں جانتے تھے۔

عمران اپنے معمول کے کام بھی کر رہا تھا اور سائے کی طرح میرے ساتھ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کاسٹیوم بدلا اور کچھ ہی دیر بعد مجھے ایک بار پھر سینڈو اور شاہین کے حوالے کر کے اپنی دوسری ''انٹری'' کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کی یہ ''انٹری'' سرکس میں تھی۔ پنڈال کے اندر کافی تعداد میں تماشائی موجود تھے۔ کچھ پورشن تو کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ویک اینڈ کی شام تھی۔

اس مرتبہ عمران نے جھولوں پر اپنے کمالات دکھائے۔ اس کے ساتھ پانچ چھ مزید بازی گر بھی شامل تھے۔ ان میں تین لڑکیاں تھیں۔ یہاں بھی عمران کا رول اہم رہا۔ اسے اور ایک دوسرے بازی گر سلیمان عرف شہزادے کو خوب داد ملی۔ یہ نہایت پُرخطر آئٹم تھے۔ بہرحال، جان کے تحفظ کے لیے جھولوں کے نیچے جال وغیرہ موجود تھے۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ شو ختم ہو گیا۔ تماشائی جوق در جوق پنڈال سے نکلنے لگے۔ شو میں حصہ لینے والے انسان اور جانور بھی سبکدوش ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔ سرکس کے ارد گرد موجود فالتو روشنیاں بجھائی جانے لگیں لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ ابھی ''کھیل'' مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ ابھی یہاں کچھ باقی ہے اور جو باقی ہے، وہ اس سارے کھیل سے زیادہ اہم ہے۔ عمران، شہزادے اور اس کے دیگر ساتھیوں نے اسپیشل شامیانے میں پُرتکلف کھانا کھایا اور باداموں والی سبز چائے پی۔ عمران کے بے پناہ اصرار کے باوجود میں نے ایک لقمہ نہیں لیا۔ لے ہی نہیں سکا۔ میرے خون کا سینے میں تو کچھ اور طرح کی جنگ جاری تھی۔

ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ اکا دکا گاڑیاں آ کر سرکس کی پارکنگ میں رکنے لگیں۔ یہ سب شاندار گاڑیاں تھیں۔ ہنڈا، ٹویوٹا اور پجارو وغیرہ۔ دوسری طرف اسسٹنٹ منیجر عباس اور انتظامیہ کے دیگر افراد سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور خاص انتظامات میں مشغول تھے۔ عمران نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''شاباش یار! اب تمہیں ایک خاص تماشہ دکھاتے ہیں۔ ویسے تو اس تماشے کا ٹکٹ قریباً پندرہ بیس گنا ہے لیکن تمہارے لیے تو یہ پہلے کی طرح مفت ہے۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی مزے کرو گے یار!'' اس نے میرا کندھا تھپکا۔

شاید وہ اور بھی کچھ کہتا لیکن میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے بات بدل گیا۔ ''بس اب زیادہ دیر نہیں یار! پانچ دس منٹ کا انتظار رہ گیا ہے۔''

دس منٹ بعد ہم ایک بار پھر پنڈال میں تھے۔ اس بار پنڈال تقریباً خالی تھا۔ صرف اسپیشل کلاس میں جہاں قالین بچھے تھے اور صوفے وغیرہ رکھے تھے، تقریباً چالیس عدد تماشائی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی تعداد پچاس ساٹھ تک پہنچ گئی۔ ان میں سے زیادہ تر نوجوان امیر زادے نظر آتے تھے جو ٹولیوں کی صورت میں آئے تھے۔ کچھ بڑی عمر کے لوگ بھی تھے جو اپنے لباس اور چہروں سے بے فکرے ٹائپ کے دولت مند لگتے تھے۔ میں اسپیشل کلاس کی تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ سینڈو میری دائیں جانب اور شاہین بائیں جانب تھی۔ پھر میں نے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ جھولوں کے نیچے سے دونوں حفاظتی جال ہٹا لیے گئے۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے شاہین سے پوچھا۔

”آپ دیکھتے رہیں۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

بازی گر رسی کی طویل سیڑھی کے ذریعے قریباً پچاس فٹ اوپر جھولوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان میں عمران اور شہزادہ سب سے آگے تھے۔ اس مرتبہ بازی گر لڑکیوں کے لباس بھی زیادہ ”بولڈ“ تھے۔ ان کی پوری ٹانگیں عریاں تھیں اور بالائی جسم پر بھی مختصر ترین لباس تھا۔ ہیجان خیز میوزک نے ماحول کو گرمانا شروع کر دیا۔ پنڈال کے اندر عجیب سی سنسنی محسوس ہونے لگی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس سرکس میں چوری چھپے غیر قانونی شو چلایا جا رہا تھا۔ ایک ایسا تماشہ جس میں زندگی کا کوئی تحفظ نہیں تھا اور بلندی پر مظاہرہ کرنے والے بازی گر ہر گھڑی موت کے نشانے پر تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ شاید یہی سنسنی اور ہیجان تھا جس کی خاطر کچھ لوگ بھاری معاوضہ دے کر تماشہ دیکھنے کے لیے یہاں موجود تھے۔

تماشہ شروع ہوا تو پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ سوئی بھی گرے گی تو آواز آئے گی۔ بازی گروں کے چہروں پر بھی سخت تناؤ کی کیفیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جھولا چھوڑ کر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے اور دوسرا جھولا پکڑتے ہوئے، ذرا سی بھی غلطی ہوئی تو اس کا مطلب ہوگا، بلندی سے زمین پر گرنا اور موت کے قریب تر چلے جانا۔ میں نے دیکھا کہ بازی گروں میں کسی کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ موجود تھی تو وہ عمران تھا۔ وہ نہ صرف بڑے سکون سے اپنے آئٹم پیش کر رہا تھا بلکہ ساتھیوں کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔ جب بازی گر کوئی اسٹیپ مکمل کر لیتے تو تماشائیوں کا سکتہ ٹوٹتا، وہ شور مچاتے اور تالیاں پیٹتے۔ ایک خطرناک فارمیشن مکمل کرتے ہوئے عمران کے ساتھی شہزادے کی ”ٹائمنگ“ ذرا سی غلط ہوئی۔ ہوا میں دو قلابازیاں کھا کر اس نے عمران کی ٹانگیں پکڑنا تھیں جو خود بھی جھول رہا تھا۔

شہزادے کے دونوں ہاتھ عمران کی ٹانگوں پر نہیں پڑ سکے۔ ایک ہاتھ پھسل گیا۔ بہر حال دوسرے ہاتھ کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ خود کو گرنے سے بچانے میں کامیاب رہا۔ اس دو سیکنڈ کی ہلچل نے تماشائیوں کو پنجوں پر کھڑا کر دیا۔ ان کے ہونٹوں سے بے ساختہ ”اوہ“ کی مشترکہ آواز نکلی۔

یہ کھیل تقریباً تیس منٹ کا تھا۔ میری دھڑکنیں زیروزبر ہوتی رہیں اور ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔ ہر لحظہ یہی لگا کہ ابھی کوئی خوفناک حادثہ پیش آ جائے گا اور ہم سب خود سے چند میٹر کے فاصلے پر ایک شخص کو مرتے ہوئے دیکھیں گے۔ یہ واقعی زبردست تھا۔

خدا خدا کر کے نہایت سنسنی خیز تماشہ ختم ہوا اور تالیوں کی گونج میں بازی گر رسی کی سیڑھی سے نیچے اُترنے لگے۔ مگر ابھی یہ کھیل مکمل طور پر ختم نہیں ہوا تھا، بس اس کا ایک مرحلہ اختتام پذیر ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سرکس کے جوکر ٹائپ ملازمین پنڈال کے وسط میں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اپنی اُلٹی سیدھی حرکتوں سے تماشائی حضرات کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیریں۔ تب وہ چند کرسیاں اُٹھا لائے اور انہیں ترتیب سے ایک اسٹیج پر رکھنے لگے۔ کرسیوں کے سامنے ایک میز رکھی گئی اور میز پر لکڑی کا ایک منقش باکس۔

سب سے پہلے شہزادہ اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نے جھک کر حاضرین کو سلام کیا اور پھر متانت سے چلتا ہوا درمیان والی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس نے لکڑی کا باکس کھولا اور اس میں سے ایک سیاہ کولٹ ریوالور نکال لیا۔ باکس میں سے کچھ گولیاں نکال کر اس نے میز پر سجائیں۔ یہ اسٹیج پنڈال کے درمیان نہیں تھا بلکہ حاضرین کے بالکل سامنے تھا۔ بمشکل دس بارہ میٹر کا فاصلہ ہوگا۔ سلیمان عرف شہزادے نے ریوالور کے چیمبر میں ایک عدد گولی ڈالی اور چرخی کو تیزی سے گھما دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں ایک اور طرح کا کھیل شروع ہو چکا ہے۔ تماشائیوں میں موجود چند امیر زادے کچھ شرطیں لگا رہے تھے۔ ان شرطوں کا بھاؤ پہلے اوپر نیچے ہوتا رہا پھر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اب یہ ایک کے مقابلے میں چھ تھا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے اپنے پہلو میں بیٹھی شاہین سے پوچھا۔

وہ تو کچھ نہیں بولی تاہم دوسری طرف بیٹھے سینڈو نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

”یہ پہلی شرط ہے جی۔ ایک کے مقابلے میں چھ۔ شہزادہ صاحب اس ریوالور کی نال اپنے جسم پر رکھ کر گولی چلائیں گے۔ گولی نہ چلی تو شرط لگانے والوں کو پچاس ہزار روپیہ دینا ہوگا۔ اس میں سے پچیس ہزار شہزادہ صاحب کو ملیں گے۔ گولی چل گئی تو شرط لگانے والے دوجے بندوں کو تین لاکھ دینا ہوگا۔“

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ بڑی خطرناک صورتِ حال تھی۔ اس قسم کے کھیلوں کے بارے میں مَیں نے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا لیکن آج میں اپنی آنکھوں کے سامنے ایک جیتا جاگتا منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک جیتا جاگتا شخص تھا جو مجھ سے قریباً دس میٹر کی دوری پر اپنے ہاتھ میں ریوالور لیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا تناؤ میں اتنی دور سے بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔

جب شرط پوری طرح بدل گئی تو شہزادے نے ایک بار پھر ریوالور کی چرخی گھمائی اور اس کی نال اپنے پیٹ پر پہلو کی طرف رکھ لی۔ ایک ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر نال کے مقام اور رخ کو چیک کیا۔ اس کے بعد شہزادے نے آنکھیں بند کیں اور اطمینان سے ٹریگر دبا دیا۔

''ٹرچ'' کی آواز اُبھری اور تماشائیوں میں سے کچھ افراد اُٹھ کر تالیاں پیٹنے لگے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے گولی نہ چلنے پر شرط لگائی تھی۔ سلیمان عرف شہزادہ بھی ایک طویل سانس لے کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تماشائیوں کی طرف دیکھ کر کورنش بجایا۔ تب وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب شرط کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس میں ریوالور کے چیمبر میں دو گولیاں ڈالی گئیں۔

ایک بار پھر شرط باندھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پندرہ بیس نوجوانوں کی دو ٹولیاں تھیں جو آگے بڑھ بڑھ کر بول رہی تھیں۔ ان کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ نئے نہیں ہیں، پہلے بھی اس پُرخطر کھیل کو انجوائے کرتے رہے ہیں۔ اس مرتبہ شرط کا ریٹ سوا ایک اور تین کا تھا۔ جو شرطیں لگی تھی، ان کے مطابق گولی نہ چلنے کی صورت میں قریباً ایک لاکھ ادا کیے جاتے تھے اور چلنے کی صورت میں دو لاکھ چالیس ہزار۔ گولی نہ چلتی تو پھر لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے شہزادے کو مل جانے تھے۔ شہزادے نے دونوں گولیاں حاضرین کو دکھانے کے بعد چرخی کے خانوں میں آمنے سامنے ڈالی تھیں اور چرخی کو اچھی طرح گھما دیا تھا۔ سنسنی ایک بار پھر عروج پر پہنچ گئی۔ دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگیں۔ آخری عمل کرنے سے پہلے شہزادے نے حاضرین کی فرمائش پر اپنی قمیص اور بنیان اُتار دی۔ اس کا کسرتی جسم ٹیوب لائٹس کی روشنی میں دمکنے لگا۔ تاہم مجھے اس کے پہلو میں ایک گول سیاہ داغ بھی نظر آیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ اس کھیل کے دوران میں ایک بار پہلے گولی کا شکار ہو چکا ہے۔ حاضرین کی طرف بغور دیکھنے کے بعد شہزادے نے ریوالور کی نال کو اپنے پہلو میں مقررہ مقام پر رکھ دیا۔

''اگر اس کو گولی لگ گئی تو کیا ہوگا؟'' میں نے سرسراتی آواز میں سینڈو سے پوچھا۔

''یہاں ایک ڈاکٹر موجود ہے جی...... اور دوا دارو کا سامان بھی۔'' سینڈو نے سرگوشی کی۔

''گولی لگ گئی تو دوا دارو سے کیا ہوگا؟''

سینڈو کے بجائے شاہین بولی۔ ''یہاں اس کو فرسٹ ایڈ دیں گے۔ پھر گاڑی پر قریب کے ہسپتال لے جائیں گے۔ سارا انتظام پہلے سے موجود ہوتا ہے۔''

پنڈال میں ایک بار پھر گہری خاموشی تھی۔ شہزادے نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور پھر آنکھیں بند کر کے دبا دیا۔ ایک بار پھر ٹرچ کی آواز اُبھری اور تالیوں کے شور سے پنڈال گونج گیا۔

ٹریگر دبنے کے فوراً بعد ہی کیش وغیرہ کا تبادلہ کر لیا گیا۔ سلیمان عرف شہزادے کے حصے کی رقم فوراً ہی اس کو دے دی گئی۔

سرکس کا اسسٹنٹ منیجر عباس اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور حاضرین کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے اناؤنسمنٹ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''ہمیشہ کی طرح آپ معزز حضرات میں سے بھی کوئی اگر اس کھیل میں حصہ لینا چاہے تو وہ یہاں آ سکتا ہے۔ کھیل کے اصول آپ سب جانتے ہی ہیں۔''

تماشائیوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ قریباً ایک منٹ کی اضطرابی کیفیت کے بعد لمبے بالوں والا ایک نوجوان اسٹیج پر آ گیا۔ اس کے چہرے پر زخموں کے ایک دو پرانے نشان اس کی گرم مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ اس نے جینز اور سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے لباس اور شکل وصورت سے عیاں تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ وہ اطمینان سے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی حرکات وسکنات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی اس کھیل میں حصہ لے چکا ہے۔ یقیناً یہ سب کچھ تھرل اور ڈرامے کے لیے تھا ورنہ ایسے نوجوانوں کو پیسے کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔

اس لڑکے نے بھی اپنے لیے دو گولی والا کھیل چنا۔ دو تین منٹ کے اندر ایک بار پھر شرط باندھنے والا عمل ہوا۔ اس مرتبہ بھی ریٹ تقریباً وہی تھا۔ جواریوں نے اپنی اپنی رقوم اسسٹنٹ منیجر عباس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیں۔ لمبے بالوں والے نوجوان نے چرخی گھما کر ریوالور کی نال قاعدے کے مطابق اپنے پہلو پر رکھی اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکے سے گولی چلی۔ حاضرین چلا اُٹھے۔ لمبے بالوں والے نوجوان کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا اور وہ اندھے منہ سامنے میز پر گرا۔ اس کی کراہ دور تک سنائی دی تھی۔ ملازمین جو پہلے سے تیار تھے دوڑ کر زخمی تک پہنچے۔ اسے اسٹریچر پر لٹایا اور اسٹریچر اُٹھا کر ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ زخمی، تکلیف کی شدت سے بل کھا رہا تھا۔ اس کے پہلو سے نکلنے والا خون اسٹیج پر ایک لکیر کی صورت میں دکھائی دینے لگا۔ سب حاضرین اپنی جگہوں سے کھڑے ہو گئے تھے۔

تاہم یہ سارا اضطراب صرف تین چار منٹ کے اندر ختم ہوگیا۔ اسٹیج پر خون کے دھبے تیزی سے صاف کر دیئے گئے۔ کچھ دیر بعد یوں لگنے لگا جیسے یہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب میں نے دیکھا کہ عمران خود اسٹیج پر نمودار ہوا ہے۔ وہ ابھی تک بازی گری والے کاسٹیوم میں تھا اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ وہ میز کے پیچھے اسی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا جہاں سے تین چار منٹ پہلے خونچکاں نوجوان کو اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا گیا تھا۔ کتنی جلدی ہوا تھا وہ سب کچھ۔ صرف آٹھ دس منٹ پہلے وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تالیاں بجا رہا تھا اور ہلا گلا کر رہا تھا اور اب کوئی گاڑی اسے تیز رفتاری کے ساتھ ہسپتال کی طرف لے جا رہی تھی۔ جس کرسی سے وہ اُٹھ کر گیا تھا، وہاں اب مسکراتے چہرے والا عمران بیٹھا تھا۔

ایک بار پھر شرطیں باندھنے کا عمل شروع ہوا۔ اب اس عمل میں پہلے سے زیادہ سنسنی خیزی اور جوش پایا جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اس اِضافی جوش کی وجہ معلوم ہو گئی۔ سینڈو کے ذریعے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ عمران بھائی ''تین چھ کا کھیل'' کھیلیں گے۔ تین چھ کے کھیل سے مراد یہ تھی کہ تین خانے خالی، تین خانوں میں گولیاں، میں نے عمران کے مسکراتے چہرے کو دیکھا اور مجھے لگا کہ میں اسے مزید مسکراتے نہیں دیکھ سکوں گا۔ یہ بیوقوفی کی حد تک دلیری کا مظاہرہ تھا۔ کچھ دیر پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بھی موت کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے لیکن اس کی تلاش کا انداز ذرا مختلف ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی موت کا الزام اپنے سر لینے کا خواہشمند بھی نہیں ہے۔ اس نے یہ الفاظ غیر سنجیدگی سے کہے تھے۔ تاہم اب اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اتنے غیر سنجیدہ بھی نہیں تھے۔ حساب بالکل صاف تھا۔ عمران کے بچنے کا امکان پچاس فیصد اور گولی لگنے کا امکان بھی پچاس فیصد تھا۔ حاضرین آگے بڑھ بڑھ کر شرطیں لگا رہے تھے۔ ہر چہرہ سنسنی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری نظر عمران کی نظر سے ملی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ بتاؤ مزہ آ رہا ہے یا نہیں؟

اس کی دلی کیفیت کے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اس کا چہرہ حسبِ معمول مسکرا رہا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ریوالور ہاتھ میں لیے اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک مجھے شک تھا کہ شاید اس کھیل میں کوئی گھپلا وغیرہ کیا گیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ریوالور میں نقلی گولیاں ہوں یا کھلاڑی نے اپنے لباس کے نیچے کوئی جیکٹ وغیرہ پہن رکھی ہو۔ مگر یہ دونوں شکوک ابھی تھوڑی دیر پہلے غلط ثابت ہو گئے تھے۔ یہاں پر اصلی گولی چلی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے سلیمان عرف شہزادے نے اپنے کھیل میں اپنی قمیص بھی اُتار کر دکھا دی

تھی۔

شہزادے سے تو لوگوں نے قمیص اُتارنے کی فرمائش کی تھی مگر عمران نے بغیر فرمائش کے اپنا بالائی لباس اُتار دیا۔ اس کا نہایت مضبوط اور سڈول جسم دعوتِ نظارہ دینے لگا۔ شرطیں باندھنے کی گرما گرمی میں قریباً دس منٹ صرف ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے عباس کے سامنے رکھی ٹیبل پر کرنسی نوٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا۔ یہ ساڑھے تین اور ڈھائی کا ریٹ تھا۔ گولی چلنے کی صورت میں قریباً سات لاکھ روپے ادا کیے جانے تھے جس میں سے اندازاً تین لاکھ روپے عمران کی جیب میں جانے تھے۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں پانچ لاکھ مخالف گروپ کو ادا کیے جانے تھے۔

قریباً تین لاکھ روپے کی خاطر عمران زندگی اور موت کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ اپنی جان کو اپنے ہاتھ سے داؤ پر لگا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ کچھ اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح لوگ رقوم حاصل کرنے کے لیے اپنے جسمانی اعضاء گردے وغیرہ سرجنوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن ان معاملوں میں صرف ضرورت پیشِ نظر ہوتی ہے، یہاں تفریح اور سنسنی خیزی کا عمل دخل بھی تھا۔

مجھے لگا کہ میری ہتھیلیاں پسینے میں تر ہو گئی ہیں۔ دل کی دھڑکن بہت تیز ہو چکی تھی۔ ریفری نما شخص نے آگے بڑھ کر معائنہ کیا کہ عمران نے ریوالور کی نال اپنے پہلو میں درست مقام پر رکھی ہے یا نہیں۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلا کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ پنڈال میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔ عمران نے انگلی ٹریگر پر رکھی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پنڈال میں موجود ہر فرد پتھر کی طرح ساکت تھا۔ ریوالور کے تین خانوں میں گولیاں تھیں اور تین خانے خالی تھے۔ اب ''بیرل'' کے سامنے کون سا خانہ تھا، یہ آنے والے لمحوں میں معلوم ہونا تھا۔ ایک زوردار دھماکا یا ٹرچ کی آواز۔

اور پھر عمران نے ٹریگر دبایا۔ بہت سے لوگ اُٹھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ ریوالور سے گولی نہیں چلی تھی۔ کئی افراد اسٹیج پر چڑھ گئے۔ انہوں نے عمران کو گلے لگایا اور اپنے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ شرط ہارنے والے افراد بھی کچھ زیادہ مایوس نہیں تھے۔ ان کے لیے بھی شاید پیسے سے زیادہ سنسنی اور تحیر کا عنصر اہم تھا۔ عمران نے پستول کو چوم کر ہوا میں اُچھالا اور ایک ملازم نے اسے دبوچ لیا۔ عمران کے حق میں داؤ لگانے والے اب شدید تناؤ کے بعد خوشی میں مست دکھائی دیتے تھے۔

یہ ہلا گلا ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ اس دوران میں سینڈو سے میری

تھوڑی بہت بات بھی ہوئی۔ اس گفتگو سے صرف اتنا پتا چلا کہ یہ تماشہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ویک اینڈ پر اس سرکس میں ہوتا ہے۔ میرے کئی سوالوں کے جواب سینڈو اور شاہین گول کر گئے۔ عمران اسٹیج سے اُتر چکا تھا تاہم تماشہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اسسٹنٹ منیجر عباس ایک بار پھر اسٹیج پر آیا اور بولا۔ ''آخر میں حسبِ دستور، میں ایک بار پھر دعوت دیتا ہوں کہ اگر معزز حاضرین میں سے کوئی اس کھیل میں حصہ لینا چاہے تو اسٹیج پر آ سکتا ہے۔ جوانمردی اور دلیری کا یہ کھیل ہم سب کے لیے ہے اور ہم اپنی ذمے داری پر اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے حاضرین کی طرف دیکھا۔ تماشہ سب کرنا چاہتے تھے لیکن ''تماشہ'' بننے کے لیے جو غیر معمولی ہمت درکار تھی، وہ کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

عباس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جی حضرات! آپ سب کے لیے موقع موجود ہے۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ ہمارے ہردلعزیز ساتھی ہیرو بھائی نے تین چھ کا کھیل کامیابی سے کھیلا ہے۔ پچھلے سے پچھلے ماہ بھی آپ نے دیکھا کہ وہ یہ کھیل کامیابی سے کھیل گئے۔ اگر ''تین چھ'' کھیلا جا سکتا ہے تو ایک چھ اور دو چھ کیوں نہیں کھیلا جا سکتا۔''

عباس کی اس تقریر کے نتیجے میں ایک اور نوجوان اسٹیج کی طرف بڑھا لیکن پھر ایک دوسرا شخص جو غالباً اس کا بڑا بھائی یا چچا وغیرہ تھا، اسے کھینچ کر واپس لے گیا۔

اسی دوران میں عمران میرے ساتھ والی نشست پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اب اس نے چمکیلا کاسٹیوم اُتار دیا تھا اور اسی لباس میں تھا جس میں یہاں سرکس پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا گلاس تھا جس میں یقیناً بیئر تھی۔ اس کے لیے شاہین نے اپنی جگہ خالی کر دی تھی۔ تین چھ کے کھیل کی وجہ سے شاہین کا رنگ ابھی تک زرد تھا اور پیشانی پر ہلکا سا پسینہ نظر آ رہا تھا۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے عمران کو دیکھ رہی تھی۔ عمران اس کی طرف دیکھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یار تابش! یہ جو گرل فرینڈز اور بیویاں ہوتی ہیں نا۔ یہی بندے کو اوپر لے جاتی ہیں اور نیچے بھی گراتی ہیں۔ اب تم ذرا سوچو اگر اپنے سکندرِ اعظم کی بیوی اس کی طرف ایسے دیکھتی جس طرح یہ میری طرف دیکھ رہی ہے تو کیا وہ آدھی دنیا فتح کر سکتا تھا؟ وہ تو مقدونیہ سے بھی باہر نہ نکل پاتا۔ کیوں...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا اور وہ اپنا جارج میلوری...... جس نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

شاہین نے مسکرا کر بات کاٹی۔ ''اس سے یہی ثابت ہوتا ہے نا کہ سکندرِ اعظم اور جارج میلوری کی بیویوں کو انہیں روکنا چاہیے تھا۔ سکندرِ اعظم صرف 33 سال کی عمر میں مر گیا تھا اور میرے خیال میں ایورسٹ جارج نے سر نہیں کی تھی بلکہ سر کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش

میں 38 سال کی عمر میں اس کی جان چلی گئی۔ ہم نے تو کورس کی کتابوں میں یہی پڑھا ہے۔''

''بس تم ہر بات سے اپنے مطلب کی بات ثابت کر لیا کرو۔ اس طرح تو میں بھی تمہاری بات سے ایک بات ثابت کر سکتا ہوں۔''

''وہ کیا؟''

''تم نے خود کو کم از کم میری بیوی یا گرل فرینڈ تو مان لیا۔'' وہ بتیسی نکال کر مسکرایا۔

''تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ اپنے تراشیدہ بال جھلاتی ہوئی پچھلی نشستوں پر جا بیٹھی۔

عمران اپنے خاص انداز میں میری طرف جھکا اور میرا کندھا دبا کر بولا۔ ''یار! یہ ساری لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں پر نہیں جانا چاہیے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن سارے لڑکے اور نوجوان ایک جیسے نہیں ہوتے جیسے مابدولت۔ یعنی میں...... میں تمہیں بڑے پتے کی باتیں بتا سکتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ اسٹیج پر رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک ٹرائی تم بھی کرو۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''دیکھو...... گندم کی گولیوں سے تو ہنڈرڈ پرسنٹ اوپر کا ٹکٹ کٹ جاتا ہے۔ اس کھیل میں تو بہت سا چانس ہے۔'' اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میری بیزاری کچھ اور بڑھ گئی۔

''چلو...... زیادہ نہیں تو ''ایک چھ'' کھیل لو۔ قسم سے مزہ آ جائے گا۔ جیب علیحدہ گرم ہو گی۔ تھوڑی سی ہمت کرو یار۔'' اس نے پھر میرا کندھا دبایا۔

میں اسے کوئی سخت سا جواب دینے جا رہا تھا مگر اچانک میرے اندر پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ مجھے آج صبح پیش آنے والے سارے اذیت ناک واقعات یاد آئے اور مجھے لگا کہ میرے لیے عمران کی بات ماننا کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ ایک خانے میں گولی...... پانچ خانے خالی۔ گولی چلنے کا امکان بہت کم تھا اور اگر چل بھی جاتی تو کیا ہوتا؟ اس ساری ناقابلِ برداشت صورتِ حال سے نجات مل جاتی۔ ساری نارسائیاں، مجبوریاں اور بے چارگیاں میرے ساتھ ہی ایک پُرسکون اندھیرے میں چھپ جاتیں۔ ایک پُرسکون اندھیرا جو زندگی کی سرحد سے آخری سرے پر مجھے آواز دے رہا تھا۔ ایک دم مجھے لگا کہ یہ کھیل کھیلنا میرے لیے

کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے میری ہمت بندھائی۔ مجھے اپنے جسم میں عجیب سی توانائی بھرتی محسوس ہوئی۔ سیٹھ سراج، اس کے کارندوں اور اس کے بیٹے واجی کے مکروہ چہرے میری نگاہوں میں گھومے اور میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میرے اس فیصلے پر تھوڑی دیر کے لیے عمران بھی حیران ہوا۔ وہ مجھے آمادہ تو کر رہا تھا لیکن حقیقت میں شاید اسے بھی یقین نہیں تھا کہ میں آمادہ ہو جاؤں گا۔ حاضرین میں سے کئی ایک مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد میں ایک عجیب سی کیفیت کے زیر اثر، اسٹیج پر موجود تھا۔ روشنی براہِ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھی اور تماشائی نیم تاریکی میں نظر آتے تھے۔ ایک عدد اسپاٹ لائٹ عین میز کے اوپر تھی جہاں سیاہ پستول اور اس کی گولیاں رکھی تھیں۔ سینما ہال کے اندر میں نے جو سکون بخش گولیاں چبائی تھیں، ان کا اثر ابھی تک حواس پر موجود تھا۔ میں ہاتھ پاؤں میں ہلکا سا بھاری پن محسوس کر رہا تھا۔

شرطیں باندھنے کا عمل ایک بار پھر شروع ہوا۔ عباس کے سامنے رکھی میز پر کرنسی نوٹ حرکت کرنے لگے۔ شرط کا ریٹ سب سے پہلی شرط والا یعنی ایک چھ ہی رہا مگر رقم تھوڑی سی بڑھ گئی۔ یعنی گولی نہ چلنے کی صورت میں ساٹھ ہزار کی ادائیگی ہونی تھی جس میں سے تیس ہزار سیدھے میری جیب میں آنے تھے۔ گولی چلنے کی صورت میں مخالف پارٹی نے تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے دوسری پارٹی کو ادا کرنے تھے۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی تاہم حواس پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ میں خود کو اذیت دینے کے لیے تیار تھا، چاہے یہ اذیت مجھے موت کے منہ میں ہی کیوں نہ لے جاتی۔ ایک چھوٹا سا کاغذ لایا گیا جس پر کچھ لکھا تھا اور مجھے دستخط کرنے تھے، تاہم عمران آڑے آیا اور اس نے کاغذ لانے والے کو اپنی ضمانت دے کر واپس بھیج دیا۔

میرا منہ بالکل خشک ہو چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زبان تالو سے چپک رہی ہے۔ ایک لمحے کے لیے دل میں آیا کہ واپس چلا جاؤں مگر جہاں تک پہنچ گیا تھا وہاں سے واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ میں نے میز پر رکھی ایک گولی اُٹھائی اور اسے سب کے سامنے ریوالور کے چیمبر میں رکھ دیا۔ ریوالور کو بند کر کے میں نے اس کی چرخی کو تین چار بار زور سے گھمایا اور پھر اسے پیٹ کی دائیں سائیڈ پر رکھ دیا۔ ریفری نے آگے آ کر بیرل کی پوزیشن درست کی اور چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تماشہ دیکھنا اور بات ہوتی ہے، تماشہ بننا اور بات۔ بے شک چیمبر میں

صرف ایک گولی تھی، تاہم مجھے یہی لگ رہا تھا کہ یہ گولی ''بیمر'' کے سامنے آئے گی اور ایک دھماکے سے میرے پیٹ میں چلی جائے گی۔ میں اس اذیت کو تصور میں لانے کی کوشش کر رہا تھا جو گولی کے پیٹ میں گھسنے سے مجھے محسوس ہونے والی تھی۔

ایک بار پھر میں نے سیٹھ سراج کا منحوس چہرہ اپنی نگاہوں کے سامنے کیا اور ہیجانی انداز میں ٹریگر دبا دیا۔ ''ٹرچ'' کی فرحت بخش آواز کانوں سے ٹکرائی اور مجھے قرب و جوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ شرط جیتنے والے لوگ خوشی سے جھومنے لگے۔ ان میں سے دو چار کے بازوؤں میں کال گرل ٹائپ لڑکیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں ان کے ساتھ نہیں آئی تھیں بلکہ یہیں سے فراہم کی گئی تھیں۔ جیت کی خوشی میں ایک لڑکے نے اپنی ساتھی لڑکی کو آغوش میں بھینچ کر چٹا چٹ کئی بوسے لیے اور آوازے بلند کرنے لگا۔ اس کے ساتھی نے ڈانس شروع کر دیا اور پھر ڈانس کرتے کرتے اسٹیج پر آ کر مجھے تھپکی دی۔

قریباً دو منٹ کے اندر ہی پورے 30 ہزار روپے کے کرارے نوٹ میری جیب میں پہنچ گئے۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میری پیٹھ تھپکی۔ ''ویل ڈن جگر! دیکھو تم ایک دم کماؤ پوت بن گئے ہو۔''

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک بار پھر میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''بس...... یا اور کھیلو گے؟''

اس کے پوچھنے کا انداز بالکل رسمی تھا۔ یقیناً وہ جانتا تھا کہ میں اور نہیں کھیلوں گا۔ اسی لیے میں نے جو جواب اسے دیا، اس نے عمران کو ششدر کر دیا۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم چاہتے ہو تو اور کھیل لیتا ہوں۔''

''کیا...... ارے کیا کہہ رہے ہو؟''

''وہی جو تم سن رہے ہو۔'' میں نے بدستور مدھم لہجے میں کہا۔ ''اگر تم چاہتے ہو تو میں ایک بار ''دو گولی'' کے ساتھ کھیل لیتا ہوں۔''

''زبردست...... خوش کر دیا جانِ جگر۔'' عمران کا رنگ سرخ ہو گیا۔

اسسٹنٹ منیجر عباس بھی وہاں پہنچ گیا۔ عمران اور عباس کے درمیان چند سرگوشیاں ہوئیں اور پھر اناؤنسمنٹ ہوئی کہ میں ایک بار ''دو چھ'' کا کھیل کھیلوں گا۔

میرے دل و دماغ میں ایک دھند سی بھر گئی تھی۔ پہلی کامیابی نے میرے حوصلے کو ایک دم زبردست بڑھاوا دے دیا تھا۔ اس حوصلے کو میرے اندر کا غم و غصہ بھی مہمیز کر رہا تھا۔

ایک بار پھر شرطوں کا عمل شروع ہوا۔ ساتھ ساتھ بیئر کے چند گلاس بھی گردش کر رہے

تھے۔ سگریٹوں کا دھواں اور الکحل کی بُو میرے نتھنوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے ریوالور کھول کر اس میں ایک اور گولی ڈالی۔ کھیل کے ضابطے کے مطابق یہ گولی دو خانے خالی چھوڑ کر ڈالی گئی۔ یعنی دونوں گولیاں آمنے سامنے تھیں۔ چیمبر کو بند کر کے میں نے لرزتے ہاتھوں سے چرخی کو تین چار بار گھمایا اور تیار ہو گیا۔ اس مرتبہ شرط کی رقم ایک لاکھ پچاس ہزار تک پہنچی تھی۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں مجھے اس میں سے قریباً 75 ہزار روپے ملنے تھے۔ مجھے رقم کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ میرا اصل مسئلہ میرے اندر کا شدید اضطراب اور انتشار تھا جس سے میں کسی صورت پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میری ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا تھا اور منہ ایک بار پھر خشک لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ دل کی رفتار بے حد تیز تھی۔ ریفری نما شخص کی ہدایت پر میں نے ریوالور کی نال کو پیٹ کی مقررہ جگہ پر رکھا اور انگلی ٹریگر پر جما دی۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔

یہی وقت تھا جب اسسٹنٹ منیجر عباس مجھے غور سے دیکھتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا۔ اس نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔ ''حضرات! ہم یہاں حسبِ دستور کھیل میں تھوڑی سی مزید دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ تابش صاحب! چرخی کو گھما چکے ہیں، اب یہ دوبارہ نہیں گھما سکتے۔ کوئی بھی نہیں گھما سکتا۔ اس شرط میں سے تھوڑی دیر کے لیے باقی سب لوگ نکل جائیں گے۔ صرف کھلاڑی تابش اور عمر حیات صاحب رہ جائیں گے۔ عمر حیات صاحب ریوالور دیکھنے کے بعد تابش کو رضاکارانہ طور پر کچھ رقم آفر کریں گے۔ اس رقم کے بدلے تابش کو کھیل یہیں چھوڑنا ہوگا۔ اگر وہ کھیل نہیں چھوڑنا چاہے گا تو پھر پہلے والی شرط بحال ہو جائے گی۔ تو آیئے جناب عمر حیات صاحب۔''

چالیس بیالیس سالہ ایک تنومند شخص اسٹیج پر چڑھ آیا۔ وہ کوئی خوشحال فیکٹری اونر ہی لگتا تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور واسکٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ عباس نے ریوالور میرے ہاتھ سے لیا اور بغیر دیکھے عمر حیات کی طرف بڑھا دیا۔ عمر حیات نے چشمہ لگا کر ریوالور کی چرخی کو چھیڑے بغیر اس کا معائنہ کیا اور عباس کو واپس دے دیا۔ عباس نے اسے میرے پیٹ سے لگایا اور دستہ مجھے تھما دیا۔

عمر حیات کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس صورتِ حال میں انجوائے کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ چہرے پر سرخی بھی تھی جو سنسنی کا نتیجہ تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''برخوردار! تم نئے آئے ہو اور کافی گھبرائے ہوئے بھی ہو۔ تمہاری جان بچانا میرا فرض ہے اور مجھے ہمیشہ یہ کام کر کے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ پیسے میری اپنی جیب سے جاتے

ہیں۔ تو بیٹا جی! میں نے دیکھ لیا ہے۔ ریوالور کی نیت تمہارے بارے میں ایک دم خراب ہے۔ بہتر ہے کہ تم یہ کھیل یہیں پر چھوڑ دو۔ جیتنے کی صورت میں تمہیں 75 ہزار روپے ملنا تھے۔ میں تمہیں اپنی جیب سے دس ہزار روپے آفر کرتا ہوں۔''

میں سمجھ گیا کہ اس طرح میرے اعصاب کو ٹیسٹ کیا جا رہا ہے۔ بے شک عمر حیات نے ریوالور کو دیکھا تھا اور ریوالور کی سائیڈ سے چرخی کو بغور دیکھا جائے تو گولیوں کی پوزیشن کا اندازہ ہو جاتا ہے مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ شخص سچ کہہ رہا ہے۔ یہ سب کچھ صرف ''تھرل'' بڑھانے کے لیے کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں...... میں کھیلنا چاہتا ہوں۔''

''پندرہ ہزار۔'' عمر حیات نے رضاکارانہ آفر کی۔

''نہیں......''

''دیکھو برخوردار! لالچ اچھی چیز نہیں۔ میرا خیال تو یہی ہے کہ میری بات مان کر تم فائدے میں رہو گے۔ جنہوں نے تمہارے حق میں شرط لگائی ہے وہ بھی تمہیں دعا دیں گے۔''

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بھی ہلا دیا۔

''تمہاری قیمتی جان بچانے کے لیے بیس ہزار۔'' عمر حیات نے بولی دینے والے انداز میں رقم بڑھائی۔ میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''مان جاؤ بچے! مان جاؤ۔ یہ کام تمہیں مہنگا پڑنے والا ہے۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

جن لوگوں نے میرے حق میں شرط لگا رکھی تھی وہ کورس کی شکل میں مجھے مشورہ دینے لگے۔ ''نہیں......نہیں۔''

عمر حیات مزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''اچھا...... تمہاری خوبصورت جوانی کی خاطر پانچ ہزار روپے مزید۔ پچیس ہزار روپے کم رقم نہیں ہے۔ ایک زبردست ڈنر...... ایک ولایتی بوتل اور ایک گرما گرم لڑکی۔ سب کچھ آ جائے گا اس میں۔''

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ میری زندگی بچانے میں جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ...... لیکن میں اپنی قسمت آزمانا چاہ رہا ہوں۔ پیسوں کی کمی بیشی میرے لیے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔''

درحقیقت میرا دل گھبرانا شروع ہو گیا تھا۔ اس شخص کا آنا اور اس کا سنسنی بڑھانے کا

انداز مجھے بالکل پسند نہیں آرہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''ٹھیک ہے بھئی اگر تم اپنی زندگی سے کھیلنا ہی چاہتے ہو اور تم نے ارادہ ہی کر رکھا ہے تو میں تمہیں کیسے روک سکتا ہوں۔ بہر حال، اس مصیبت سے بچانے کے لیے میں تمہیں ایک آخری آفر کر دیتا ہوں اور کھیل کے قاعدے کے مطابق میں اس سے زیادہ آفر کر بھی نہیں سکتا۔ پورے چالیس ہزار روپے۔ اگر تم چاہو تو چالیس ہزار لے کر یہ کھیل یہیں پر چھوڑ سکتے ہو۔ دونوں طُرف کے لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ خبر نہیں کہ وہ سچ رہا تھا یا جھوٹ؟ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اگر وہ سچا نہیں تھا تو پورے یقین کے ساتھ اسے جھوٹا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ میں نے مدد طلب نظروں سے عمران کو دیکھا۔ ان لمحوں میں وہ بھی ذرا تذبذب میں نظر آیا۔ یہ تذبذب تحیر اور تھرل تقریباً ہر چہرے پر نظر آرہا تھا اور شاید یہی کیفیات تھیں جن کے حصول کے لیے یہ منچلے جواری اس سرکس کے ایسے پرائیویٹ شوز میں شرکت کرتے تھے۔

ایکا ایکی مجھے اپنے اندر کی ہیجان خیز توانائی کم ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے لگا کہ ریوالور کے دستے پر میری گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ میں اچانک جیسے ایک دوراہے پر آ گیا۔ یہ شخص بھی شاید یہی چاہتا تھا کہ میں دوراہے پر آ جاؤں۔ میرا تذبذب تماشائیوں کو لطف دے رہا تھا۔ تب میری نظر ایک بار پھر عمران پر پڑی۔ جونہی ہماری نظریں چار ہوئیں، عمران نے سر کے اشارے سے مجھے کھیل چھوڑنے کا عندیہ دیا۔ پتا نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن جو کچھ بھی تھا، اس کا یہ اشارہ میرے لیے مددگار ثابت ہوا۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے ریوالور میز پر رکھ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کئی لوگوں کو کھیل چھوڑنے پر افسوس ہوا۔ کئی ایک نے تالیاں بجائیں۔ عمران نے اسٹیج پر آ کر میرا کندھا تھپکا۔ عمر حیات نے اسی وقت چالیس ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر مجھے دیا جو میں نے عمران کو تھما دیا۔ عمر حیات نے اناؤنسمنٹ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''پیارے ساتھیو! اب ہم دیکھتے ہیں کہ برخوردار نے گھاٹے کا سودا کیا ہے یا فائدے کا؟ اسے 35 ہزار روپے مزید ملنے تھے یا 38 بور کی گولی ملنی تھی۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور اُٹھایا اور اسے اسٹیج کے سامنے کی کچی زمین کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ''ٹرچ'' کی آواز کے بجائے ایک دھماکہ ہوا اور گولی زمین میں پیوست ہوگئی۔ میں اندر سے لرز کر رہ گیا۔ کچھ افراد نے تالیاں بجا کر اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ کچھ سکتہ

بند جواری افسردہ نظر آئے۔ عمران نے ایک بار پھر جوش سے میری پیٹھ تھپکی۔ اسسٹنٹ منیجر عباس نے ایک بار پھر اعلان کیا کہ حاضرین میں سے کوئی اور اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہے؟ لگتا تھا کہ اب کوئی نہیں اُٹھے گا۔ ویسے بھی گھڑی کی سوئیاں رات ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ عباس نے یہ محفل برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''کیسا لگا یہ سب کچھ؟'' عمران نے پوچھا۔

''میں اس پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے ذہن میں ایک سوال تو ضرور اُبھر رہا ہوگا۔ فلموں وغیرہ میں جب ہم یہ ریوالور والا کھیل دیکھتے ہیں تو اس میں ریوالور کنپٹی پر رکھا جاتا ہے۔ یہاں پیٹ پر رکھا جاتا ہے، آخری پسلی سے قریباً ایک انچ نیچے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اس طرح ہم نے اس کھیل کو تھوڑا سا کم خطرناک کیا ہے۔ گولی چلنے کے بعد بندے کے بچنے کا امکان موجود رہتا ہے۔ پچھلے چھ مہینے میں صرف تین بندوں کی جان گئی ہے۔ دس پندرہ ایسے ہیں جو گولی چلنے کے باوجود بچ گئے۔ اپنا یہ سلیمان عرف شہزادہ بھی ان میں شامل ہے۔ اسے پانچ مہینے پہلے گولی لگی تھی۔ اب یہ بھلا چنگا ہے اور سرکس میں اپنے سارے آئٹمز پورے کر رہا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ تین بندوں کی جان چلی جانا معمولی بات ہے۔''

''موت تو ہر جگہ موجود رہتی ہے یار! راہ چلتے ہوئے ٹھوکر لگنے سے بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ہر جگہ لوگ مر رہے ہیں۔ دہشت گردی سے، ٹریفک حادثوں سے، لڑائی جھگڑوں سے، بیماریوں سے اور...... خودکشیوں سے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

اسی دوران میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ کچھ دیر تک ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتا رہا پھر فون بند کر دیا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

''لو...... آج لاہور شہر میں جو ڈیڑھ دو سو بندہ مختلف طریقوں سے مرنا تھا، ان میں ایک کی کمی واقع ہوگئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ لڑکا جو یہاں گولی سے زخمی ہوا تھا، اب خطرے سے باہر ہے۔ امید ہے کہ وہ ایک آدھ دن میں زندگی کی طرف لوٹ آئے گا۔''

''اور اگر وہ نہ لوٹتا تو پھر؟ اس کا خون کس کے سر ہوتا؟''

''اگر مجھے یا تمہیں گولی لگ جاتی تو ہمارا خون کس کے سر پر ہوتا؟ ہمارے اپنے سر پر

ہی ہوتا۔ آج صبح یا کل کے اخبار میں چھوٹی سی خبر آتی کہ عمران ہیرو نام کا ایک لڑکا جو فلاں سرکس میں موٹر سائیکل کے کمالات دکھاتا تھا، اپنے ریوالور کی صفائی کرتے ہوئے گولی چلنے سے شدید زخمی ہوا اور فلاں پرائیویٹ ہسپتال میں ٹائیں ٹائیں فش ہو گیا۔ بس حادثاتی موت...... نہ کوئی ایف آئی آر، نہ مدعی، نہ ملزم......''

''اگر ان تماشائیوں میں سے کوئی مخبری کر دے تو؟ یا ان تماشائیوں میں ہی کوئی اخباری رپورٹر وغیرہ موجود ہو؟''

''تو بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں سے بہت سے لوگوں کو منتھلیاں وغیرہ جاتی ہیں یار! اوپر تک سلسلہ ملا ہوتا ہے۔ اب جو جو رقمیں ہم نے جیتی ہیں یا کمائی ہیں، ان میں سے 20 فیصد ہمیں یہاں دینا ہوگا۔ اسپیشل شو کے اسپیشل ٹکٹ سے اکٹھی ہونے والی رقم علیحدہ ہے۔ میری جیب میں اس وقت تین لاکھ روپے آئے ہیں پنڈال چھوڑنے سے پہلے ساٹھ ہزار روپے مجھے یہاں جمع کرانے ہیں۔ اسی طرح تمہارے پاس ستر ہزار روپے آئے ہیں۔ اس میں سے چالیس ہزار کا چیک ہے۔ چیک کا حساب بعد میں ہو جائے گا، تیس ہزار میں سے چھ ہزار روپے تم ابھی یہاں جمع کرا دو گے۔ یہ سب کچھ سسٹم کے ساتھ چلتا ہے۔''

کچھ دیر بعد ہم پھر موٹر سائیکل پر سوار تھے اور کھلی سنسان سڑک پر جا رہے تھے۔ میں جب اس سرکس میں آیا تھا تو میری جیب میں صرف آٹھ دس روپے تھے۔ اب میری جیب میں تقریباً چوبیس ہزار کے کرنسی نوٹ تھے۔ اس کے علاوہ چالیس ہزار روپے کا اوپن چیک تھا۔ میرے دل و دماغ کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابھی قریباً ایک گھنٹہ پہلے میں اپنی مرضی کے ساتھ ایک نہایت خطرناک مرحلے سے گزرا ہوں۔ میں نے ایک ریوالور کے ذریعے اپنے جسم پر دو بار گولی چلانے کی کوشش کی ہے۔

عمران نے موٹر سائیکل کو پھر ہوائی جہاز بنا دیا تھا۔ اب تو لاہور کی سڑکیں بھی بالکل خالی تھیں۔ رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ ہر دم مچلتا اور شور مچاتا شہر تاریکی کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ تیز ہوا میری جسمانی چوٹوں کو تکلیف دے رہی تھی مگر پتا نہیں کہ کیا بات تھی، جسمانی اذیت مجھے زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ذہنی اذیت کو کم کرنے کے لیے میں نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے سکون بخش دوا کی دو گلابی ٹکیاں مزید نگل لیں اور آنکھیں بند کر لیں۔

''ہاں میرے یار! اب کیا پروگرام ہے؟ میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کے مطابق اب تم آزاد ہو۔ اگر جانا چاہو تو جہاں جی چاہے اُتر جاؤ لیکن اگر ابھی میرے ساتھ رہنا چاہو تو بسر و چشم۔ میرا گھر اور میرا دل تمہارے لیے حاضر ہیں۔''

ذرا دیر کے لیے تو دل چاہا کہ اسے رُکنے کے لیے کہوں اور یہیں گڑھی شاہو کے آس پاس کہیں اُتر جاؤں لیکن پھر ذہن میں آیا کہ اتنی رات گئے، ایسی حالت میں کہاں جاؤں گا، کیا کروں گا؟ میں خاموش رہا۔ وہ چہکا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی ہے۔ زبردست...... بڑا اچھا فیصلہ ہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم آج رات کے لیے تو ضرور رُکو۔ کل اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔ بندے نے جتنا بڑا فیصلہ کرنا ہو اس کے لیے اتنا ہی زیادہ وقت بھی استعمال کرنا چاہیے۔''

راوی روڈ کی طرف جاتے جاتے اس نے ایک دم موٹر سائیکل ریلوے اسٹیشن کی طرف گھما دی۔ ''اِدھر کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تھوڑا سا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں سمجھا کہ وہ ٹوائلٹ وغیرہ کی بات کر رہا ہے لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ اس نے اسٹیشن کے پاس اپنی موٹر سائیکل ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان کے سامنے روکی۔ دو تین بار کال بیل بجائی پھر لوہے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص پاجامہ کُرتہ پہنے باہر نکلا۔ عمران کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکیں۔ میں آٹھ دس قدم دور کھڑا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص نے مدھم لہجے میں کچھ کہا۔ جواب میں عمران نے اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ یہ یقیناً کچھ کرنسی نوٹ تھے۔ ادھیڑ عمر شخص کو نوٹ دکھائے بغیر عمران نے اس کے کُرتے کی جیب میں ڈال دیئے۔ ادھیڑ عمر شخص حیران تھا اور بے حد خوش بھی۔ وہ عمران سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرا رہے تھے۔ عمران نے اسے بولنے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور اسے خدا حافظ کہہ کر دوبارہ موٹر سائیکل پر آ بیٹھا۔ موٹر سائیکل ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ قریباً دو کلومیٹر آگے آنے کے بعد عمران نے ایک اور حرکت کی۔ وہ ایک شاپنگ مارکیٹ کے سامنے رُکا۔ مارکیٹ کے برآمدوں میں بہت سے مزدور ٹائپ لوگ میلے کچیلے کمبل اور چادریں وغیرہ اوڑھے سو رہے تھے۔ تاہم یہاں دس پندرہ افراد ایسے بھی تھے جو ایک کونے میں الاؤ روشن کیے بیٹھے تھے۔ یہ مزدور پیشہ لوگ جیسے یہاں عمران ہی کے انتظار میں تھے۔ جونہی عمران کی عجیب الخلقت موٹر سائیکل کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی، وہ جوش کے عالم میں اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ عمران نے موٹر سائیکل ان کے بیچوں بیچ جا روکی۔ ''سلام ہیرو بھائی...... سلام بھائی جان! سلام جی۔'' بہت سی ملی جلی آوازیں اُبھریں۔

عمران نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالا۔ یہ پانچ سو والے نوٹ تھے۔ وہ بڑی تیزی سے ایک ایک نوٹ ہر شخص کے ہاتھ میں تھماتا چلا گیا۔ شور سن کر کچھ سوئے

ہوئے افراد بھی جاگ گئے اور بھاگتے ہوئے موقعے پر پہنچ گئے۔ دو تین منٹ کے اندر عمران نے پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں تیرہ چودہ ہزار روپے تقسیم کر دیئے اور پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رُخ سیدھا گھر کی طرف تھا۔

''سلطانہ ڈاکو کا نام سنا ہوا ہے تم نے؟'' اس نے موٹر سائیکل چلاتے چلاتے بلند آواز میں پوچھا۔

''کیوں...... کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''سلطانہ ڈاکو میرے پڑدادا کے چچیرے بھائی کی بہن کا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میرے پڑنانا کی بہن کا دیور بھی لگتا تھا۔ سلطانہ ڈاکو امیروں سے مال لوٹ کر غریبوں میں بانٹتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی اس سے ملتا جلتا کام کرتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ امیروں پر پستول تان کر ان کو لوٹتا تھا، میں خود پر پستول تان کر ان کو لوٹتا ہوں۔ بلکہ آج تو تم نے بھی اس سے ملتا جلتا کام کیا ہے۔ بھئی واہ...... میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ تم ''دو چھ'' کھیلنے کی ہامی بھر لو گے۔ جینا اسی کا نام ہے میری جان! آگے بڑھ کر جیو...... سانس تو سب ہی لیتے ہیں مگر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سانس لینے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔''

وہ بے پَر کی اُڑا رہا تھا اور اس سے زیادہ رفتار کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل اُڑ رہی تھی۔ جلد ہی ہم راوی روڈ کی گنجان آبادی میں داخل ہوئے۔ رات کے اس پہر بازار سنسان پڑا تھا۔ ایک چوکیدار اور دو تین آوارہ کتوں کے سوا کوئی متنفس دکھائی نہیں دیا۔ عمران نے حسبِ سابق چابی لگا کر گھر کا دروازہ کھولا اور میرے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ بہر حال، اس نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ اپنی شور مچاتی موٹر سائیکل کو بازار میں ہی بند کر دیا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اڑوس پڑوس والے اس شور کو شورِ محشر سمجھتے ہوئے کلمہ پڑھ کر بیدار ہو جائیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم نیم گرم کمرے میں کمبل اوڑھے اپنے اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ میں جاگ رہا تھا اور میرے ساتھ عمران بھی جاگ رہا تھا۔ یقیناً وہ میرے بارے میں اور میرے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے وہ مجھ پر کسی طرح کا دباؤ ڈالنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے جیسے یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ بس ہم کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ رات آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ بیدار ہوا تو دن چڑھ آیا تھا۔ گھر سے باہر مخصوص شور سنائی دے رہا تھا۔ اس چار دیواری سے باہر زندگی ہر طرف رواں دواں تھی۔

نتھنوں سے کھانے کی خوشبو ٹکرائی۔ دیکھا تو سامنے میز پر ایک بھرپور ناشتہ چنا ہوا تھا۔ ڈبل روٹی، مکھن، فرائی انڈے، حلوہ پوری، چنے اور دودھ وغیرہ۔ عمران میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اسی نے میرے شانے کو ہلا جلا کر مجھے جگایا تھا۔ میں اُٹھا تو بے ساختہ کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ کل جو کچھ میرے ساتھ اور میرے جسم کے ساتھ ہوا تھا، وہ اپنی موجودگی کا پورا پورا احساس دلا رہا تھا۔ ایک ٹانگ تو چوٹ کے سبب بالکل اکڑ گئی تھی۔ میں کل بھی سارا دن لنگڑاتا رہا تھا مگر آج یہ لنگڑاہٹ ضرورت سے زیادہ تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے والے گہرے کٹ سے بھی خون رسا ہوا تھا۔ یہاں میری اپنی ہی بیلٹ کا آہنی بکل لگا تھا۔ اس بیلٹ نے میرے جسم پر کئی اور جگہ بھی گہرے نشان چھوڑے تھے۔ کل کے سارے واقعات ایک دم ذہن میں آئے اور سینے میں گاڑھا سیاہ دھواں بھر گیا۔ امی کیا سوچ رہی ہوں گی؟ عاطف میری تلاش میں کہاں مارا مارا پھر رہا ہوگا؟ فرح کا تو رو رو کر بُرا حال ہو گیا ہوگا۔ ان سب کا درد و کرب میرے تصور میں آیا اور دل خون کے آنسو رونے لگا۔

عمران کے بے حد اصرار پر میں نے منہ ہاتھ دھو کر چند لقمے زہر مار کیے اور تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے مہربان لہجے میں پوچھا۔

''میرا ایک کام کر دو۔'' میرا لہجہ کھویا کھویا تھا۔

''بس ایک کام؟ یار! تم ایک ہزار کام کہو تو میں ابھی کرنے کو تیار ہوں۔ تم کچھ بولو تو سہی۔''

''میں تمہیں ایک نمبر دیتا ہوں۔ یہ میرے گھر کا نمبر ہے۔ اس پر ایک فون کر دو۔ وہاں سے جو بھی بولے، اسے میرے بارے میں بتا دو کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور ایک دو دن میں ان سے رابطہ کروں گا۔ وہ پریشان نہ ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں بتانا، بس یہ اطلاع دے کر فون بند کر دینا۔''

''لیکن یار! یہ کام تم خود کر لو تو زیادہ اچھا نہیں؟''

''اس کا مطلب ہے کہ تم کرنا نہیں چاہتے؟''

''ارے...... تابی یار! ایک تو تم ناراض نٹافٹ ہو جاتے ہو۔ لو میں کر دیتا ہوں فون۔''

اس نے فوراً موبائل نکالا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے گھر کا نمبر بتایا۔ وہ کال ملانے لگا تو میں نے اسے روک دیا۔ ''نہیں...... یہاں نہیں...... دوسرے کمرے میں جا کر کر لو لیکن ان سے کوئی اور سوال جواب نہیں کرنا۔ جو کچھ پوچھنا ہے۔ مجھ سے پوچھ لینا۔''

"واقعی؟" اس نے حیرت آمیز خوشی سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بات کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں میرا حوصلہ ایک دم اتنا ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے گھر والوں کا سامنا کرنا یا ان سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ عمران میرے سامنے ان کو کال کرے۔

دو تین منٹ بعد عمران واپس آیا۔ اس کے چہرے پر دُکھ کا تاثر تھا۔ "کس نے بات کی؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری والدہ تھیں۔ بس روئے جا رہی تھیں۔ خدا رسول کا واسطہ دے رہی تھیں کہ میں تم سے بات کرا دوں۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کتنی ہی دیر میں نے کوئی بات کی نہ عمران نے۔ آخر اس نے انگلیاں چلا کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور بولا۔ "لگتا ہے کہ بہت دُکھی کر کے آئے ہو اپنے گھر والوں کو۔ تم شکل سے تو ایسے نہیں لگتے۔ کیا کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو گیا تھا؟"

اس کی آواز میں ہمدردی اور محبت کا ایسا رچاؤ تھا کہ میری آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "غم بانٹنے سے ہلکا ہوتا ہے۔ اگر مجھے کسی قابل سمجھتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

میں نے پچھلے چوبیس گھنٹے میں عمران سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ شخص مجھے اپنے بہت قریب لگ رہا تھا۔ کوئی خاص بات تھی اس شخص میں۔ ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں نے خود کو اس بات پر آمادہ پایا کہ اسے اپنے حالات کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دوں۔

جب یہ موضوع شروع ہوا تو پھر باتیں کھلتی چلی گئیں۔ درمیان میں وہ مجھ سے سوالات بھی کرتا رہا۔ اس کا انداز اتنا اخلاص بھرا تھا کہ میں جو گوشے اس سے چھپانا چاہتا تھا وہ بھی چھپا نہیں پا رہا تھا۔ قریباً دو گھنٹے کی گفتگو کے بعد عمران میرے بیشتر حالات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی اور ثروت کی محبت کے بارے میں بتایا۔ واجی اور اس کے غنڈا صفت یاروں کے بارے میں بتایا اور پھر ان حالات کے بارے میں بتایا جن کا شکار ہو کر ثروت اس کے بھائی اور بہن کو آناً فاناً بیرون ملک جانا پڑ گیا تھا۔

عمران میری ان جسمانی چوٹوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جو چوبیس گھنٹے پہلے

میرے جسم پر آئی تھیں اور اس واقعے کے بارے میں جس نے مجھے مرنے کی حد تک مایوس کر دیا تھا۔ میں نے اسے اس بارے میں بھی بتا دیا۔ اپنے گھر کے قریب واقع پارک میں اچانک سیٹھ سراج سے میری مڈبھیڑ، میرا سیٹھ سراج کو طمانچہ رسید کرنا اور سیٹھ سراج کے کارندوں کا مجھے مار مار کر نیم جان کر دینا۔ میں نے سبھی کچھ عمران کے گوش گزار کر دیا۔ وہ سنتا رہا اور اس کے چہرے پر عجیب سی سختی نمودار ہوتی رہی۔

میری روداد ختم ہوئی تو وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا ذہن بڑی برق رفتاری سے کچھ سوچ رہا ہے۔ آخر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

"یہ سراج جیسے لوگ ہی ہیں جنہوں نے زندگی کو سزا بنا رکھا ہے۔ یہ عام بندے کو جینے دیتے ہیں نہ مرنے دیتے ہیں۔ ان کے سامنے سر جھکاؤ تو یہ جھکے ہوئے سر کو اور جھکاتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناک زمین پر رگڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اگر ان سے ٹکر لو تو پھر یہ اپنی طاقت استعمال کرتے ہیں۔ ٹکر لینے والے کو دوسروں کے لیے عبرتناک مثال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر اوچھا ہتھکنڈا، ہر وحشی حربہ بروئے کار لاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اس کی گہری نظریں بدستور میرے چہرے پر رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ اچانک بولا۔ "کیا چاہتے ہو؟ ایک بار مزہ چکھا دیا جائے اس سیٹھ کو؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دیا جا سکتا ہے لیکن اینٹ کا جواب کم از کم اینٹ سے تو ہم دے ہی سکتے ہیں۔ میرے پاس ایک دو بندے ایسے ہیں جو زہریلے مچھر کی طرح سیٹھ کی ناک میں گھس کر اس کا جینا حرام کر سکتے ہیں۔"

"نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بڑا خبیث بندہ ہے۔ ہر حد تک جا سکتا ہے اور میری ماں ہے، بہن بھائی ہیں۔ میں ان کے لیے خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"اس کی بھی ماں ہو گی۔ ماں نہیں ہو گی گھر والے تو ہوں گے۔ بیوی بچے، بہن بھائی، کیا وہ اکیلا ہی دنیا میں ٹپکا ہوا ہے؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے اپنی ٹھوڑی کی گیلی پٹی اُتارتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ نہ چاہ رہے ہو۔ جو کچھ سیٹھ نے تمہارے اور ثروت وغیرہ

کے ساتھ کیا ہے، اس کے بعد تو سیون ایم ایم کی تین چار گولیاں اس کے کھوپڑے میں ٹھونک دی جائیں تو یہ بھی کم ہوگا۔ اگر یہ نہیں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ سزا تو اسے ملنی ہی چاہیے۔ تم نہ بھی دو گے تو میں ضرور دوں گا۔“

”کیا مطلب؟“

”سیٹھ کی تھوڑی سی دھلائی تھوڑی سی کھینچا کھینچی اور چھینٹا چھینٹی۔ لیکن گھبراؤ مت تم اس میں ملوث نہیں ہو گے۔ تم بس کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر تماشہ دیکھنا۔ اس سے تمہیں تھوڑا سا سکون ملے گا اور مجھے بھی۔“

”تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔“

”نہیں...... میں تو صاف اور سیدھی بات کر رہا ہوں۔ سیٹھ نے جو کچھ کیا اس کی سزا تو کافی سنگین ہونی چاہیے لیکن چلو شروع میں چھوٹا سا ٹریلر ہی سہی۔ میرا جی چاہ رہا ہے جانِ من! سیٹھ کی اس جگہ درگت بنائی ہو جہاں اس نے تم سے مارا ماری کی ہے۔ وہی لوگ اس کا تماشہ بھی دیکھیں جنہوں نے تمہارا تماشہ دیکھا تھا۔“

”اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس سے کیا ہوگا؟“

”بس میرا کلیجہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے گا اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بالکل علیحدہ معاملہ ہوگا۔ اس کو تمہارے معاملے سے بالکل بھی نتھی نہیں کیا جا سکے گا۔ سمجھو کہ ہم راہ چلتے سیٹھ سے جھگڑا مول لیں گے اور آناً فاناً اس کی درگت بنا دیں گے۔ تم دیکھنا، بڑی کلاسیکل سچویشن بنے گی۔“

”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”تمہیں کس سے دلچسپی ہے؟ بتاؤ...... کس سے دلچسپی ہے؟ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جسے انسان مضبوط ارادے کے ساتھ کرنا چاہے اور وہ نہ ہو سکے۔ اگر پہاڑ اپنی جگہ سے ہلائے جا سکتے ہیں، دریاؤں کے رُخ موڑے جا سکتے ہیں اور چاند پر قدم رکھا جا سکتا ہے تو اور کون سا کام مشکل ہوگا؟ اگر ثروت بی بی کی یاد تمہارے دل کو زخمی کر رہی ہے تو اس کا علاج بھی ممکن ہے۔ اسے بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ نہ صرف ڈھونڈا جا سکتا ہے بلکہ اس سے قبول ہے، قبول ہے بھی کرایا جا سکتا ہے۔ دیکھو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ سارے کام ممکن ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ پہلے تم اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی مایوسی کی دھند صاف کرو۔ زندگی کرکٹ کے کھیل کی طرح ہے پیارے! باؤلنگ کتنی بھی سخت ہو، پچ کتنی بھی خراب ہو لیکن وکٹ پر کھڑے رہنا بہرحال، آؤٹ ہونے سے بہتر ہوتا ہے۔ بندہ وکٹ پر کھڑا رہے تو خوشیوں کا تھوڑا تھوڑا

اسکور خود ہی بننا شروع ہو جاتا ہے۔ بڑی بڑی ہٹیں نہ بھی لگ سکیں تو کہیں بائی کا اسکور ہو گیا تو کہیں نو بال یا وائیڈ بال کا رن مل گیا اور کچھ نہیں تو وکٹ کیپر نے ہی محبت کا ثبوت دیا اور بال چھوڑ کر پیچھے سے چوکا کرا دیا اور اگر......“

”یار! میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”لیکن فی الحال میں ذرا تنہائی چاہ رہا ہوں۔ کچھ دیر اکیلے میں سوچنا چاہ رہا ہوں۔“

”مگر اکیلے بندے کے ساتھ تو شیطان ہوتا ہے اور تمہارا شیطان تو ہے بھی ذرا خطرناک قسم کا۔ گندم میں رکھنے والی گولیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔“

”نہیں...... میں اس طرح نہیں سوچوں گا۔“ میں نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”لیکن یار میرے...... سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پنجابی میں نہیں کہتے کہ سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ سوچنے کے بجائے کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرتے ہیں، وہی دنیا بدلتے ہیں اور اپنے حالات بھی۔“

وہ لسوڑے کی لیس کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ مسلسل باتیں کر رہا تھا اور واقعی میرے ذہن کو مایوسی اور پریشانی کی طرف جانے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے جیسے خود ہی طے کر لیا تھا کہ میں نے کم از کم دو تین دن مزید تو یہاں ضرور رہنا ہے۔ اس حوالے سے اس نے اپنے پڑوسی زاہد بھائی کو بھی بتا دیا تھا اور اسے میری خیر خیرت سے بھی آگاہ کیا تھا۔ زاہد کو یہی پتا تھا کہ میں کل ریلوے اسٹیشن کی نامعقول سیڑھیوں سے پھسل کر گرا ہوں جس کی وجہ سے مجھے چوٹیں آئی ہیں۔ عمران کی طرح اس کے پڑوسی زاہد نے بھی اسٹیشن کی سیڑھیوں اور سیڑھیاں بنانے والوں کو بے نقط سنائی تھیں۔ بلکہ ریلوے کا محکمہ، ریلوے منسٹر، موجودہ حکومت اور اس سے آگے امریکہ تک بھی شدید مذمت کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

میری ٹانگ میں رات بھر شدید درد ہوتا رہا۔ اگلے روز کچھ افاقہ ہو گیا۔ بہرحال، سہ پہر کے وقت عمران نے بہ اصرار مجھے ایک مہران گاڑی میں سوار کیا اور ڈاکٹر کو دکھانے لے چلا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا کوئی دوست آرتھوپیڈک ڈاکٹر ہے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ چوٹ ایسی شدید ہے کہ ہڈی کے ڈاکٹر سے معائنہ کرایا جائے مگر عمران بضد رہا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے بہانے سے باہر لے کر آیا تھا۔ بازار سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر اس کی سب سے ہیلو ہائے ہوئی۔ ایک تھڑے پر بیٹھے ہوئے چاچے نذیر کے قریب گاڑی روک کر عمران نے پوچھا۔ ”ہاں چاچا! ختم ہوگئی چائے کہ ہے؟“

بہرے نذیر نے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”گائے؟ گائے کا دودھ آج کل کہاں ملتا۔

علیحدہ سے؟''

''گائے نہیں۔ چائے...... چائے۔'' عمران نے زور سے کہا۔ ''چائے ختم ہو گئی کہ ہے؟'' اس دفعہ نذیر نے جواب دیا کہ ختم ہو گئی۔ عمران نے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا خشک چائے کا بڑا ڈبہ اُٹھا کر چاچے نذیر کو تھما دیا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ دعائیں دینے لگا۔ گاڑی برق رفتاری سے بازار سے نکل کر بڑی سڑک پر آ گئی۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے۔ بغور دیکھنے پر ہی باہر سے کچھ نظر آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔ اگر کوئی شناسا اندر جھانکنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر؟

اس وقت میری بے چینی بڑھ گئی جب میں نے دیکھا کہ عمران کا رُخ میرے علاقے کی طرف ہے۔ ''یہ کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''تمہیں...... تمہارے گھر والوں سے ملانے نہیں لے جا رہا ہوں یار! مجھے پتا ہے کہ تمہیں اختلاجِ قلب ہو جائے گا۔ ہمارا راستہ ہی یہ ہے۔''

دو تین منٹ بعد میری بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اس پارک کے قریب پہنچ رہا تھا جہاں دو دن پہلے میری زندگی کا اندوہناک ترین واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے کار کے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''گاڑی روکو۔'' میرا لہجہ غصیلا تھا۔

وہ گاڑی روکتے روکتے بھی قریباً نصف فرلانگ آگے چلا گیا۔ یہاں سے وہ منحوس پارک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں دو دن پہلے سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں سے میری خوفناک مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ وہ زیرِ تعمیر عمارت بھی نظر آ رہی تھی۔ جس کی تعمیر غالباً سیٹھ سراج خود کرا رہا تھا۔ یہ عمارت ایک طرح سے پارک کی زمین پر ہی بنائی جا رہی تھی۔ ''یہ تم کیا ڈرامہ کر رہے ہو؟'' میں نے ہراساں ہو کر پوچھا۔

''ڈرامہ نہیں یار! چھوٹا سا چٹکلا ہے۔''

میں نے اپنی پی کیپ کو چہرے پر کچھ اور بھی جھکا لیا اور نیچے کھسک کر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ میرے گھر سے ایک کلومیٹر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ میرا کوئی شناسا مجھے یہاں دیکھ لیتا۔ میں نے دل ہی دل میں عمران کو صلواتیں سنائیں۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ وہ یہاں کوئی گڑبڑ کرنے والا ہے۔ ''کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''ہمارے ارادے تو کچھ نہیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے، بس تھوڑا سا تماشہ دیکھیں گے۔''

''کیسا تماشہ؟ کیا تم...... سیٹھ سراج کے ساتھ کچھ کرنے لگے ہو؟'' میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔

''سیٹھ سراج کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے یار! وہ کوئی چھیل چھبیلی لڑکی تو نہیں ہے اور اگر کچھ تھوڑا بہت ہونا بھی ہے تو وہ ہمیں نہیں کرنا۔ ہمارا کوئی تعلق نہیں اس معاملے سے۔''

''تم ایک دم حماقت کی باتیں کرتے ہو۔ میں یہاں رُکنا نہیں چاہتا۔'' میرے لہجے میں شدید جھلاہٹ تھی۔

''تو اُتر کر چلے جاؤ۔'' وہ مسکرایا۔

وہ جانتا تھا کہ میں یہاں جانے پہچانے لوگوں کے درمیان گاڑی سے اُترنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں نے ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھا مگر دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں کر سکا۔

ہماری اس گفتگو کے درمیان میں ہی میں نے عمران کو ذرا چونکتے دیکھا۔ ہماری گاڑی کے پاس سے ایک سوزوکی پک اپ (ہائی روف) گزری مجھے شک ہوا کہ اس میں سیٹھ سراج تھا۔ ویسے تو وہ اپنی سیاہ چمکیلی ہنڈا میں سفر کرتا تھا تاہم اس کے علاوہ بھی وہ ایک دو گاڑیاں استعمال کرتا تھا۔ سفید پک اپ کے پیچھے ہی پیچھے ایک نیلی اسٹیشن ویگن تھی۔ پک اپ کا رُخ پارک کی طرف تھا۔ غالباً سیٹھ سراج شام سے پہلے زیرِ تعمیر عمارت کا کام دیکھنے جا رہا تھا۔ ابھی وہ پارک سے دور ہی تھا کہ زوردار آواز آئی۔ پک اپ نے ہلکی سی بریک لگائی تھی۔ عقب میں آتی ہوئی نیلی اسٹیشن ویگن کے ڈرائیور نے دھاکے سے گاڑی پک اپ میں ٹھونک دی تھی۔

ایک دم بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ دور سے ہی نظر آ رہا تھا کہ نئے ماڈل کی سوزوکی کا پچھلا حصہ پچک کر رہ گیا ہے اور پھر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ سوزوکی ہائی روف میں سیٹھ سراج ہی تھا۔ وہ اپنے چوڑے چکلے جسم کو ہچکولے دیتا ہوا سوزوکی کے اگلے بائیں دروازے سے برآمد ہوا۔ نیلی اسٹیشن ویگن میں سے بھی دو تین نوجوان نکل آئے۔ تنازعہ شروع ہو گیا۔ میرا جسم سنسنا رہا تھا۔ عمران نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا تھا۔ جائے حادثہ پر شروع ہونے والا تنازعہ ایک دم ہی لڑائی میں بدل گیا۔ اسٹیشن ویگن میں سے برآمد ہونے والے چار پانچ نوجوان جو یقیناً عمران کے ساتھی ہی تھے، سیٹھ سراج اور اس کے دو کارندوں پر پل پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ایک سرخ سپید پٹھان نما شخص کا زوردار جھانپڑ کھا کر سیٹھ سراج پشت کے بل پختہ سڑک پر گرا۔ اس کے ایک کارندے نے شاید پک اپ کے اندر سے کوئی

ہتھیار وغیرہ نکالنے کی کوشش کی لیکن ایک دوسرے نوجوان نے اسے کمر سے پکڑا اور بے پناہ شدت سے گھما کر ایک الیکٹرک پول سے دے مارا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پٹھان اور اس کا ایک ساتھی سیٹھ سے چمٹ گئے۔ انہوں نے اسے دوبارہ سڑک پر گرایا اور چند سیکنڈ میں روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس کے دونوں ہٹے کٹے کارندے بھی اسٹیشن وین سے نکلنے والے نوجوانوں کے ہاتھوں بُری طرح پٹ رہے تھے۔ یہ سین ذرا قریب سے دیکھنے کے لیے عمران گاڑی سے اُترا اور بھاگتا ہوا موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ چھڑانے والوں میں شامل ہو گیا۔ تاہم میں نے صاف دیکھا کہ وہ بظاہر تو سیٹھ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اصل میں اپنے ساتھیوں کو مارا ماری کا مزید موقع دے رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن وین والے نوجوان واپس گاڑی میں بیٹھے اور آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دیکھنے والوں کو یہی لگا تھا کہ شاید وہ گاڑی کو سائیڈ پر لگانے لگے ہیں مگر وہ چند سیکنڈ میں اُڑن چھو ہو گئے۔ جب تک زیرِ تعمیر عمارت میں کام کرنے والوں کو اس ''درگت'' کی پوری طرح خبر ہوتی اور وہ دوڑتے ہوئے اپنے آقائے نامدار کی مدد کو پہنچتے، وہاں کچھ نہیں تھا۔ سیٹھ سراج کو سہارا دے کر تباہ حال سوزوکی میں بٹھایا جا رہا تھا۔ اس کا گریبان لہولہان تھا۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر بلند آواز میں گالیاں بک رہا تھا مگر جن کے لیے یہ گالیاں تھیں، وہ کب کے اس کا تھوبڑا خون آلود کر کے ہوا ہو چکے تھے۔ سیٹھ کے ایک کارندے نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مترادف ایک دو ہوائی فائر بھی کیے۔ موٹر سائیکل پر سوار دو ٹریفک پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے مگر اب ان کا آنا بے سود تھا۔

اسی دوران میں عمران دوڑتا ہوا واپس کار میں آ گیا۔ ''بڑا خراب زمانہ آ گیا ہے۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''ذرا سی بات پر لوگ ایک دوسرے کا سر پھاڑنے لگتے ہیں۔ چچ...... چچ۔''

اس نے گیئر لگا کر کار آگے بڑھائی۔ ہم جائے حادثہ کے پاس سے گزرے۔ وہاں ہجوم کی وجہ سے رفتار خاصی کم تھی۔ میں نے اپنا چہرہ پی کیپ اور ہاتھ کی اوٹ میں چھپایا ہوا تھا۔ میری نظر سیٹھ سراج کی پھٹی ہوئی قمیص اور لہولہان ٹھوڑی پر پڑی۔ سینے میں نفرت آمیز خوشی کی ایک چھوٹی سی لہر دوڑ گئی۔ سیٹھ کے جرم کے مقابلے میں یہ سزا بہت چھوٹی تھی لیکن سزا تو تھی۔ وہ بھنائے ہوئے انداز میں کسی کو موبائل فون سے کال کر رہا تھا۔

سوزوکی پک اپ کا ''پیچھا'' تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف سے چادر اندر گھس گئی تھی۔ سوزوکی میں تین چار بوریاں لدی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں پھٹ گئی تھیں اور بوریوں کے اندر سے چاول وغیرہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ کار وہاں سے آگے بڑھ گئی تو میں نے

اطمینان کی سانس لی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ''اسٹیشن وین کا نمبر نوٹ کر لیا گیا تو پھر؟''

''ہمیں کیا؟ اسٹیشن وین والے جانیں اور سوزوکی والے۔'' وہ بے پروائی سے بولا مگر میرے چہرے پر غصے کا تاثر دیکھ کر فوراً بولا۔ ''اصل میں تم نے غور نہیں کیا۔ اسٹیشن وین کی نمبر پلیٹ کیچڑ کے چھینٹوں سے بالکل چھپی ہوئی تھی۔ اسے پڑھے جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا گیا تھا۔''

''یعنی یہ سب کچھ پوری پلاننگ کے ساتھ ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔

''پلاننگ کے بغیر تو پاکستان میں بس حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ باقی ہر شے کے لیے تھوڑی بہت پلاننگ تو کرنی پڑتی ہے۔''

ہم ایک ڈیڑھ کلومیٹر آگے گئے تھے کہ عمران کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ سے ڈرائیو کرتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا کوئی ساتھی تھا۔ ''ونڈر فل...... سب ٹھیک رہا۔ ایک دم فائیو اسٹار...... دو تین دن تو ٹکور چلے گی۔'' دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جو عمران نے دھیان سے سنا پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں...... یہ چیز تو میں نے بھی نوٹ کی ہے۔ میں تم سے بات کرنے ہی والا تھا۔ ہاں...... بالکل...... دونوں بوریاں اسی طرح تھیں۔ بڑی نظر ہے بھئی تمہاری بھی۔ بے شک...... بے شک...... مجھے بھی کوئی چکر لگتا ہے۔ ٹھیک ہے اوکے۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے اس کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں نظر آئیں۔ میں کچھ دیر تو چپ رہا پھر میں نے پوچھا۔ ''بوریوں کی کیا بات کر رہے تھے؟''

''کچھ شک سا پڑا ہے مجھے اور اقبال کو۔'' اس نے اپنے ساتھی کا نام لیا۔

''کیسا شک؟''

''پک اپ میں جو دو بوریاں پھٹی تھیں، ان میں ایک عجیب چیز سامنے آئی ہے۔ بوریوں میں اوپر چاول تھے اور نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی۔ چاولوں کی تہ مشکل سے دو تین انچ ہو گی۔ گندم میں مٹی کی ملاوٹ تو سنی تھی لیکن چاولوں میں مٹی اور وہ بھی ننانوے فیصد؟''

عمران نے کندھے اُچکائے۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ مٹی نہ ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''دیکھنے میں تو مٹی ہی لگتی تھی یار! ہاں...... یہ ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور ہو۔ ویسے یہ سیٹھ سراج جس طرح کا بندہ ہے اس سے کسی بھی قسم کی بُری توقع کی جا سکتی ہے۔ واقعی ہو سکتا ہے کہ مٹی کے اندر کچھ اور چھپایا گیا ہو۔ کوئی اسلحہ وغیرہ یا پھر ہیروئن شروئن۔ میرا

تو دل چاہ رہا ہے کہ سیٹھ کی تھوڑی سی ''سی آئی ڈی'' کی جائے۔ میرے خیال میں تو ایسے بندے کو کسی مصیبت میں گرفتار کرانا بھی عین ثواب ہے۔''

میں خاموش رہا۔ سیٹھ سراج کو زدوکوب کیے جانے کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ مجھے ہرگز یقین نہیں تھا کہ میں سیٹھ سراج کو اتنی جلدی اپنی ہی طرح کسی کے ہاتھوں سے پٹتے ہوئے دیکھوں گا۔ اس کی گاڑی کا بھی اچھا خاصا نقصان ہوا تھا اور نقصان کے ساتھ وہ پھٹی ہوئی بوریاں۔ سوچنے کی بات تھی کہ وہ یہ بوریاں کہاں لے کر جا رہا تھا جن میں اوپر تھوڑے سے چاول اور نیچے مٹی بھری ہوئی تھی۔ دو بوریوں میں یہ صورتِ حال تھی تو یقیناً باقی بوریوں میں بھی یہی کچھ ہوگا۔

میں جلد ہی عمران کے ساتھ اس کے گھر واپس پہنچ گیا۔ وہ اپنے اس مشن کی کامیابی پر کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا تھا کہ سیٹھ نے اتنے بجے وہاں پہنچنا ہے؟''

''پتا تھا یار! اس کے لیے ہوم ورک کیا تھا باقاعدہ۔''

''اور اگر عمارت میں کام کرنے والی لیبر موقعے پر پہنچ جاتی تو کیا ہوتا؟''

''ہماری اسٹیشن وین میں تین چار بندے اور بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک دو تین بندوں پر بھاری ہے۔ اس کے بعد میں خود بھی تو تھا۔ تمہارا یہ یار تمہاری دعا سے پانچ چھ بندوں کو تو بآسانی آگے لگا سکتا ہے۔ بھئی، ایسے ہی تو ہیرو کا خطاب نہیں ملا ہوا ہے۔'' اس نے بازو کو موڑ کر قمیص کے اندر سے ہی اپنا مسل دکھایا۔

مجھے اس بات کی تسلی دی کہ سیٹھ کی ٹھکائی والے معاملے کو کوئی شخص بھی میرے والے معاملے سے نتھی نہیں کر سکے گا۔ ایکسیڈنٹ والا کام بڑی چابک دستی اور پلاننگ سے کیا گیا تھا اور یہ سارا واقعہ بالکل حادثاتی لگتا تھا۔

گھر والوں کی پریشانی کا خیال مجھے ہلکان کر رہا تھا۔ ان سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا مگر انہیں فون کرنے کی ہمت مجھ میں ہرگز نہیں تھی۔ خاص طور سے والدہ کا سامنا تو میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ عزیزوں، رشتے داروں کا خیال آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ چچی کی مہربانی سے پوری فیملی میں نہ صرف میری گمشدگی کی اطلاع پھیل چکی ہوگی بلکہ پارک میں میری جو عزت افزائی ہوئی تھی، وہ بھی راز نہیں رہی ہوگی۔ پھر شعلہ بدن آرسہ کا خیال ذہن میں آیا اور سینے میں نفرت کی ایک بلند لہر محسوس ہوئی۔ یہ آرسہ کی نحوست ہی تھی جو مجھے گھر سے نکال کر پارک میں لائی اور وہاں سیٹھ سراج سے میرا آمنا سامنا

ہو گیا۔

میں جب یہ سارے واقعات سوچتا تو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ دم گھٹتا محسوس ہوتا اور میں ایک بار پھر خودکشی کے بارے میں سوچنے لگتا۔ بہرحال حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا اور حقیقت یہی تھی کہ اب میرے اس خیال میں وہ پہلے دن کی سی شدت نہیں رہی تھی۔ اس تبدیلی میں اہم کردار عمران ہی کا تھا۔ وہ کسی لمحے بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔ یا تو باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتا رہتا یا اپنا کوئی دلچسپ قصہ لے کر بیٹھ جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ماہرِ نفسیات کی طرح اپنی انگلیوں سے میرے ذہن کی سطح کو ٹٹولتا ہے اور اسے ہموار کرتا رہتا ہے۔ اس نے ابھی تک اپنے بارے میں مجھے کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ صرف اتنا پتا چلا تھا کہ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے اور وہ پچھلے کئی سالوں سے لاہور میں مقیم ہے۔ اسے سرکس کی نوکری کرتے بھی قریباً اتنا ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ اپنے اس سرکس کے ساتھ وہ اکثر پنجاب کے مختلف اضلاع میں سفر کرتا رہتا تھا۔

سرِشام اس نے ایک بار پھر مجھے اپنی مہران کار میں بٹھایا اور سرکس پہنچ گیا۔ آج اس کے ساتھ میں تیسری مرتبہ سرکس آیا تھا۔ پہلے دن کے بعد یہاں کوئی ''اسپیشل شو'' نہیں ہوا تھا۔ اس بارے میں مَیں نے عمران سے کچھ تفصیل معلوم کی تھی۔ ایسے شوز ہر مہینے کے پہلے ہفتے کی رات ہوتے تھے۔ عمران نے یہ بتا کر حیران کیا کہ ان اسپیشل شوز کے علاوہ اس سرکس میں کبھی کبھی چار چھ مہینے بعد اسپیشل ترین شو بھی ہوتا ہے۔ اس میں بازی گری کے کچھ انتہائی خطرناک اور خاص الخاص تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریوالور والا کھیل بھی ہوتا ہے۔ اس شو میں کھیل کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ کھلاڑی ریوالور کو پیٹ یا جسم کے کسی اور حصے پر رکھنے کے بجائے، سیدھا کنپٹی پر رکھ کر چلاتے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ترین کھیل بس ایک دو کھلاڑی ہی کھیل پاتے ہیں۔ عمران نے مجھے یہ بتایا کر مزید حیران کیا کہ وہ خود بھی ایک بار ریوالور کنپٹی پر رکھ کر ''دو چھ'' کا کھیل کھیل چکا ہے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات تھی۔ اس میں اسے ایک باری میں پورے آٹھ لاکھ روپے ملے تھے۔ اس رقم سے اس نے یہ مہران کار خریدی تھی اور اپنے گھر کو ڈیکوریٹ کیا تھا۔

جب ہم سرکس میں پہنچے تو موت کے کنویں میں زوروشور سے میوزک بج رہا تھا اور ہلکا پھلکا تماشہ شروع ہو چکا تھا۔

ایک گندمی رنگت والا دراز قد شخص عمران کے قریب آیا اور اس کے کان میں کھسر پھسر کی۔ عمران ''ہوں...... ہاں'' میں جواب دیتا رہا۔ پھر وہ رسٹ واچ دیکھتا ہوا میری طرف آیا

اور بولا۔ ''آج ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہے۔ میں بس کنویں والا آئٹم کروں گا، اس کے بعد ہم یہاں سے نکلیں گے۔''

''کہاں جانا ہے؟''

''تمہاری دل لگی کا کچھ سامان ہے یار! تمہارا دل لگا رہے گا تو اُلٹی پلٹی باتیں نہیں سوچو گے۔''

''میں پوچھ رہا ہوں، جانا کہاں ہے؟''

''زیادہ دور نہیں۔ بس ساہیوال کے آس پاس۔ ڈھائی تین گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک خاص بندے سے ملانا ہے تمہیں۔''

وہ ڈھائی تین گھنٹے کی بات یوں کر رہا تھا جیسے ڈھائی تین منٹ کی بات کر رہا ہو۔ ایک دم میرا دھیان پھر سیٹھ سراج کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس بوریوں والے معاملے کی طرف۔ کہیں یہ وہی چکر تو نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں پوچھا لیکن وہ گول مول بات کر گیا۔ رات نو بجے کے قریب موت کے کنویں میں اپنا آئٹم ختم کرتے ہی وہ میرے ساتھ کار میں آ بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ وہ کار یا موٹر سائیکل چلاتا نہیں تھا بلکہ اُڑاتا تھا اور اُڑاتا بھی بہت ہائی اسپیڈ سے تھا۔ اتنی ہی اسپیڈ کے ساتھ وہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ ''فائیو اسٹار'' اور ''بھوتنی کا'' کے الفاظ وہ تکیہ کلام کے طور پر استعمال کرتا تھا اور خود بھی اپنے ان الفاظ سے محظوظ ہوتا تھا۔ کرکٹ سے اسے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ کافی عرصہ کرکٹ کھیلتا بھی رہا تھا۔ اس کی اکثر باتوں میں کرکٹ کے حوالے ملتے تھے۔ بہرحال اس نے ابھی تک مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ اس کے اردگرد کے لوگ بھی اس کے ماضی کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتے ہیں۔ اس تھوڑے سے اسرار کے باوجود وہ سب کا دوست تھا اور ہردلعزیز تھا۔

لاہور سے ساہیوال تک کی سڑک اچھی حالت میں تھی۔ قریباً تین گھنٹے میں ہی ہم ساہیوال پہنچ گئے۔ اس وقت تک رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ہم نے وہاں سے روسٹ چکن اور روغنی نان لیے اور گاڑی کے اندر ہی بیٹھ کر کھائے۔ ساہیوال کا بھرا پُرا شہر رات کے اس پہر قدرے سنسان نظر آ رہا تھا۔ سڑکوں پر ہر طرف کیلے کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔ ان چھلکوں کو دیکھ کر دو باتوں کا پتا چلتا تھا۔ ایک تو یہ کہ ساہیوال کے علاقے میں کیلے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہاں کے لوگ چھلکے پھینکنے کے سلسلے میں تھوڑے بے پروا بھی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ صحت مند اور خوش باش لوگوں کا شہر لگتا تھا۔ رات کے اس پہر بھی چائے

خانوں اور چھوٹے موٹے ہوٹلوں پر لوگ موجود تھے اور کیبل پر اسٹیج ڈرامے دیکھ رہے تھے۔

میں ساہیوال پہلی بار دیکھ رہا تھا، تاہم ہماری منزل ساہیوال سے ذرا آگے ہڑپہ کا پُرانا شہر تھا۔

میں نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یار! ایک تو تم ہر وقت بندے کو تجسس میں رکھتے ہو۔ بتا کیوں نہیں دیتے کہ ہم اتنی رات گئے ہڑپہ میں کس ذات شریف سے ملنے جا رہے ہیں؟''

''یار! اگر ہم کسی مشہور فلمی ایکٹر یا کھلاڑی وغیرہ سے ملنے جا رہے ہوتے تو میں بتا دیتا کہ فلاں بندہ ہے۔ جب تم اس بندے کو جانتے ہی نہیں تو میرے بتانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ بہرحال اتنا جان لو کہ بڑا دلچسپ بندہ ہے اور اس سے مل کر تمہیں خوشی ہوگی۔''

''مجھے اب بھی شک ہے کہ یہ سیٹھ سراج والا چکر ہے۔''

''شک کے معاملے میں تم بالکل کسی بیوی کی طرح ہو۔'' اس نے مرغی کی ٹانگ پر دانت آزماتے ہوئے کہا۔

ہماری گاڑی ایک بار پھر روانہ ہوگئی۔ گاڑی کا ڈیک زور شور سے بج رہا تھا۔ نغمہ گونج رہا تھا۔ ''ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے، مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے......''

میرے خیالات دور دور تک بھٹکنے لگے۔ میں اپنے ذہن کو اردگرد کے مناظر کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساہیوال سے ہڑپہ جانے والی سڑک بھی شاندار تھی۔ گاڑی بآسانی 125 کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

''بڑی فائیو اسٹار سڑک بنا دی ہے یار انہوں نے۔'' عمران نے کہا۔

مگر اسی دوران میں ایک فائیو اسٹار کھڈا بھی آ گیا اور عمران نے گاڑی کو بمشکل کنٹرول کیا۔ ہڑپہ تک کا سفر قریباً 30 کلومیٹر تھا جو عمران نے پچیس منٹ میں طے کر لیا۔ جلد ہی ہم ایک دو ذیلی سڑکوں پر مڑے اور ہڑپہ کے قدیم شہر میں پہنچ گئے۔ یہ ویسا ہی قصبہ نما شہر تھا جیسا پنجاب کے عام علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ گلیاں، بازار اور چوراہے سو رہے تھے۔ ٹھنڈ نے ہر شے کو جامد کر رکھا تھا اور کھلی جگہوں پر ہلکی ہلکی دھند تھی۔ عمران نے موبائل پر اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کر کے اپنی منزل کی درست لوکیشن پوچھی اور پھر گاڑی ایک مکان کے سامنے روک دی۔

جلد ہی ہم ایک نیم گرم کمرے میں پکے کوئلوں کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے سامنے چائے اور دیگر لوازمات رکھے تھے۔ میزبان واقعی دلچسپ شخص تھا۔ وہ سانولی رنگت کا تھا اور غیر معمولی حد تک فربہ تھا۔ اس کا پیٹ اس کے آگے جیسے ایک بہت بڑے مٹکے کی صورت میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہنستا تھا تو اس کا پیٹ بھی اُچھل اُچھل کر ساتھ دیتا تھا۔ میزبان کی عمر پینتیس سال کے قریب ہوگی۔ اس کا نام امتیاز تھا اور وہ پانچ مرلے کے اس گھر

میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہڑپہ کا پرانا شہری تھا اور یہاں اس کی دو بکریاں تھیں۔ اپنی گفتگو سے وہ کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

امتیاز نے سب سے پہلے میری چوٹوں کے بارے میں پوچھا۔

عمران نے وہی جواب دیا جو وہ اس سے پہلے سوڈیڑھ سو افراد کو دے چکا تھا۔ ''یہ میرا پرانا سجن تابش ہے بھئی...... مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا، لاہور ریلوے اسٹیشن کی لعنتی سیڑھیوں سے گر گیا۔ شکر ہے کہ ہڈیاں وغیرہ بچ گئی ہیں۔''

عمران کا ایک ساتھی یہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہی وہ ''اقبال'' تھا جس سے موبائل فون پر دو دن پہلے عمران کی بات ہوئی تھی۔ یہ بھی مضبوط ہاتھ پیر کا چوبیس پچیس سالہ شخص تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی عمران نے اسی سے فون پر بات کی تھی۔ اسے یہاں عمران نے ہی کسی کام سے بھیجا ہوا تھا۔ اتفاقاً یہاں اقبال کا یہ دوست امتیاز بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہم سب یہاں امتیاز کے نیم گرم گھر میں موجود تھے۔ دو تین منٹ کی رسمی باتوں کے بعد عمران، اقبال اور امتیاز میں رمزیہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ گفتگو میرے لیے کافی حد تک ناقابلِ فہم تھی۔

عمران نے اپنے ساتھی اقبال سے پوچھا۔ ''اب کہاں ہے وہ؟''

''گھر کے اندر ہی ہے۔'' اقبال نے دبے دبے جوش سے جواب دیا۔ ''گاڑی باہر گلی میں کھڑی ہے۔''

''کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟'' عمران نے پوچھا۔

میرا اندازہ تو وہی ہے جو امتیاز بھائی کا ہے۔ بلکہ یہ تو پکی بات کر رہے ہیں کہ اس میں عورت کا چکر ہے۔ زلیخا نام ہے اس کا۔ خاوند بیمار رہتا ہے بلکہ چارپائی سے لگا ہوا ہے۔ گل چھرے اُڑا رہی ہے۔ سنا ہے کہ ایک دو اور یارانے بھی ہیں۔''

''خاوند کیا کرتا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

اقبال کے بجائے ہمارے میزبان امتیاز نے جواب دیا۔ ''بس جی! جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ کمال کرتے ہیں۔ یہ چھیدا بھی کمال کرتا ہے۔ پہلے چاولوں کا کام کیا کرتا تھا، اب تو جو کچھ بھی کرتی ہے اس کی بیوی زلیخا ہی کرتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ہنسا۔ اس کا پیٹ پورا جسم بلکہ وہ چارپائی بھی ہنسنے لگی جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کی خوش مزاجی اور ہنسنے کی عادت کا اندازہ اس کے چہرے کی لکیروں سے بھی ہوتا تھا۔

عمران، اقبال اور امتیاز کے درمیان ہونے والی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے میزبان کے محلے میں رہنے والی ایک جواں سال عورت زلیخا کا چال چلن ٹھیک نہیں۔ اس کے

گھر کسی مرد کا آنا جانا ہے اور وہ مرد اب بھی زلیخا کے یہاں موجود ہے۔ اس کی گاڑی اب بھی زلیخا کے گھر کے باہر کھڑی تھی۔ باتوں کے دوران میں جب مجھے اس گاڑی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ ایک سوزوکی ڈبا ہے تو ایک دم ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ میرا شک ایکا ایکی یقین میں بدلنے لگا۔ شاید یہ وہی سوزوکی ڈبا تھا جو دو تین دن پہلے سرِراہ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا تھا اور جس میں سے سیٹھ سراج نے نکل کر زبردست خواری کا سامنا کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں ہڑپہ میں بھی یہ ڈبا سیٹھ سراج کو ہی لے کر آیا تھا۔

عمران بغور میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے بھانپ لیا کہ میں کس رُخ پر سوچ رہا ہوں۔ اس کی معاملہ فہمی حیران کن تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے تابی! تمہارے اس سیٹھ سراج کے ستارے اور سیارے وغیرہ گردش میں آ گئے ہیں۔ دیکھو اب وہ اس دن کی فائیو اسٹار ذلالت کے بعد مزید بے عزت ہونے کے لیے یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ ایک ایسی عورت کے گھر میں گھسا ہوا ہے جو کچھ زیادہ نیک نام نہیں ہے۔'' پھر وہ میزبان امتیاز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیا یہ عورت کچھ زیادہ خوبصورت ہے۔''

''زیادہ کیا جی! کم خوبصورت بھی نہیں ہے۔ بس سمجھیں کہ رعایتی نمبروں سے پاس ہے لیکن عورت، عورت ہی ہوتی ہے جی۔ جب بندے کی ''مت'' مارنے پر آ جائے تو پھر ''مت'' کے پاس مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اب ہماری مثال ہی لیں۔ میرے جیسے ہینڈسم نوجوان کے لیے لڑکیوں کی بھلا کوئی کمی تھی لیکن جب دل آیا تو کس پر آ گیا۔''

چق کی دوسری طرف سے فربہ اندام امتیاز کی خوبرو بیوی نے شوخی سے کہا۔ ''آہو بھائی جی! ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ شادی سے پہلے بارہ بارہ من کی دو تین دھوبنیں ان کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں، پر ان کی قسمت میرے ساتھ پھوٹ گئی۔''

''شادی سے پہلے میں اتنا موٹا نہیں تھا جی! اگر کچھ تھا بھی تو اس میں خوبصورتی تھی۔ اس بھلی لوک نے میری مارکیٹ ویلیو ڈاؤن کرنے کے لیے مجھے پراٹھے کھلا کھلا کر اتنا موٹا کیا ہے۔ اب بھگتے خود ہی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

چق کے آر پار میاں بیوی کی نوک جھونک کچھ دیر مزید چلتی رہی پھر امتیاز کی بیوی روتے بچے کو چپ کرانے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تخلیہ ہوا تو عمران نے دھیمے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم سے معافی چاہتا ہوں یار! اگر اس وقت تمہیں بتا دیتا کہ ہم سراج کے لیے یہاں آ رہے ہیں تو تم شاید آنے سے انکار کر دیتے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ہم سراج کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی ہمیں ایسا کرنا

ہے۔بس یہ دیکھنا ہے کہ یہ بندہ دراصل ہے کس چکر میں۔اگر یہ کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہے تو پھر بھی ہمیں اس سے کچھ نہیں کہنا۔زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ پولیس کو انفارم کر دیں گے اور وہ بھی سامنے آئے بغیر۔"

میں سٹپٹایا ہوا تھا۔بہرحال میں نے عمران سے کچھ کہا نہیں۔ویسے بھی دیگر لوگوں کے سامنے تلخ کلامی کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

عمران نے میزبان امتیاز سے سوال جواب شروع کر دیئے۔"امتیاز بھائی! تم نے بتایا ہے کہ یہ بندہ سراج جسے تم یہاں خواجہ کے نام سے جانتے ہو، ہفتے میں کم از کم دو تین بار ضرور آتا ہے؟"

"بالکل......اور خاص طور سے ہفتے کی شام کو تو ضرور آتا ہے۔"

"ہر دفعہ سوزوکی ہائی روف پر آتا ہے۔"

"میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے۔"

"یہاں کے لوگ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں یا تم بتاؤ کہ تم کیا جانتے ہو؟"

امتیاز نے اپنے بے کراں پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔"مجھے تو یہی معلوم ہے کہ یہ بندہ لاہور کے قریب رائے ونڈ میں کوئی اسٹور چلاتا ہے جہاں تھوک میں آٹا، دالیں اور چاول وغیرہ ملتے ہیں۔یہاں بظاہر زلیخا کے خاوند سے اور اصل میں خود زلیخا سے اس کی یاری دوستی ہے۔یہ یہاں سے آج کل چاول وغیرہ بھی لے کر جا رہا ہے۔شاید اپنے اسٹور پر فروخت کرتا ہے یا پھر کہیں اور بھی دیتا ہے۔"

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔"اور اگر میں یہ کہوں کہ جسے تم خواجہ کہہ رہے ہو، یہ لاہور کا سیٹھ سراج الدین ہے اور یہ رائے ونڈ میں کوئی چھوٹا موٹا اسٹور نہیں چلاتا بلکہ لاہور میں ایک بڑے پلازے کا مالک ہے اور ایک دوسرا پلازہ تعمیر کروا رہا ہے تو؟"

امتیاز بھاڑ جیسا منہ کھول کر حیرت سے عمران کی طرف دیکھنے لگا۔"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے کہا۔

"بالکل ایسے ہی ہے۔"عمران کا ساتھی اقبال بولا۔

"تم نے امتیاز بھائی کو ابھی وہ بوریوں والی بات تو نہیں بتائی؟" عمران نے اقبال سے دریافت کیا۔اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔عمران نے اپنی جیکٹ درست کرتے ہوئے خود کو کچھ اور بھی انگیٹھی کے قریب سمیٹا اور رازداری کے لہجے میں بولا۔"امتیاز بھائی! تمہاری یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ سراج کا اس زلیخا نام کی عورت سے کوئی ٹانکا ہے لیکن ہمیں

لگ رہا ہے کہ بات اس سے کچھ زیادہ بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس بندے کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور سے یہاں پہنچے ہیں۔"

امتیاز نے حیرت اور تجسس سے عمران کی طرف دیکھا۔پھر اقبال کو دیکھنے لگا۔"آپ کو کس قسم کا شک ہے؟" امتیاز نے پوچھا۔

"ہمیں لگ رہا ہے کہ یہ سیٹھ سراج یہاں کوئی گڑبڑ گوٹالا کر رہا ہے۔صرف زلیخا ہی نہیں ہے جس کی خاطر یہ بندہ خواجہ کے روپ میں یہاں پہنچتا ہے اور راتیں گزارتا ہے۔اس شک کی ایک بڑی معقول وجہ یہ ہے جو کچھ ہی دن پہلے ہمارے سامنے آئی ہے۔بلکہ دو تین دن پہلے سامنے آئی ہے۔"

"یارو! تم نے تو مجھے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔" امتیاز موٹے نے ایک بار پھر اپنی بے مثال توند کو سہلایا اور سوالیہ نظروں سے عمران کا چہرہ تکنے لگا۔

عمران نے کہا۔"پہلے مجھے یہ بتاؤ امتیاز بھائی کہ جس جگہ ہم بیٹھے ہوئے ہیں یہ جگہ ہڑپہ شہر میں آتی ہے یا اس کے مضافات میں؟"

"یہ مضافات میں ہی آتی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سرکاری زمین ہے۔اس پر لوگوں نے اپنے گھر بنا رکھے ہیں۔اب یہاں کے مکینوں کے ساتھ گورنمنٹ کا تنازعہ چل رہا ہے۔یہ زمین ہڑپہ کے کھنڈرات سے بہت قریب ہے اور گورنمنٹ اسے واپس لینا چاہتی ہے لیکن گورنمنٹ جو معاوضہ دے رہی ہے، وہ یہاں رہنے والوں کو قبول نہیں ہے۔عدالتی چکر بھی چل رہا ہے۔"

"گورنمنٹ کو اس جگہ میں کیا دلچسپی ہے؟"

"بہت زیادہ دلچسپی ہے جی! اور ہونی بھی چاہیے۔شاید آپ کو پتا نہ ہو کہ پرانے کھنڈرات نکالنے کے لیے ہڑپہ کے جتنے بڑے حصے میں کھدائی ہوئی ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ابھی تقریباً تقریباً ستر اسّی فیصد علاقہ ایسا ہے جس پر کھدائی وغیرہ شروع ہی نہیں کی گئی۔ماہر لوگوں کا خیال ہے کہ اس سارے علاقے کے نیچے بھی کھنڈر شنڈر موجود ہیں۔"

"تو پھر کھدائی کیوں نہیں کی جاتی؟" میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا پتا تو صاحب لوگوں کو ہو گا بھائی صاحب! کہا یہ جاتا ہے کہ صحیح طریقے سے کھدائی کرنے کے لیے بہت زیادہ پیسے اور ٹائم کی ضرورت ہے۔پھر شاید صاحب لوگ یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ اگر ان زمینوں کے نیچے سے واقعی کھنڈر وغیرہ نکل آئے تو ان کی حفاظت کا کیا انتظام ہو گا۔پہلے جو کھنڈر نکلے ہیں ان کی حالت بھی روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔

بارشیں پڑتی ہیں، آندھیاں آجاتی ہیں۔ ہر طرح کے موسم اثر ڈالتے ہیں۔ محکمے کے لوگ اور باہر سے آنے والے صاحب لوگ ان کھنڈرات کی حفاظت کے لیے کام شام تو کرتے رہتے ہیں پھر بھی کچھ نہ کچھ تو نقصان ہوتا ہی ہے۔ شاید یہ لوگ سوچتے ہوں کہ جو کچھ ہزاروں سال سے زمین میں دبا ہوا ہے، وہ ابھی دبا ہی رہے تو بہتر ہے۔''

عمران نے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ یہ کچی پکی آبادیاں ایسی سرکاری زمین کے اوپر ہیں جن کی کھدائی وغیرہ ہونی ہے۔ آج نہیں تو کل...... اور کل نہیں تو دس پندرہ سال بعد؟''

امتیاز نے اثبات میں سر ہلایا۔ عمران نے کہا۔''اچھا...... ایک بات بتاؤ امتیاز بھائی! یہاں آبادی میں لوگ غیر قانونی طور پر تو کھدائی وغیرہ نہیں کرتے؟''

''نہیں جی! محکمہ اس بارے میں بڑا چوکس ہے اور سختی بھی کرتا ہے۔ محکمے کے چوکیدار اکثر علاقے میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور ارد گرد کی سن گن رکھتے ہیں لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''کبھی کبھار کوئی ایسا واقعہ ہو بھی جاتا ہے۔ کسی بنیاد یا قبر وغیرہ کی کھدائی کرتے ہوئے یا کسی کھیت شیت میں سے کوئی پرانی شے مل بھی جاتی ہے۔ کسی پرانے برتن کا ٹکڑا یا کسی مورتی کا کوئی حصہ وغیرہ؟''

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ نگاہوں کے سامنے سوزوکی ڈبے کے ایکسیڈنٹ کا منظر آ گیا۔ عمران نے بتایا تھا کہ سوزوکی ڈبے کے اندر موجود بوریوں میں چاولوں کے بجائے مٹی بھری ہوئی تھی۔ تو کیا اس مٹی میں کچھ چھپایا گیا تھا...... یا پھر......

ابھی میری سوچ کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ عمران نے یہی بات امتیاز سے کہہ دی۔ اس نے کہا۔''امتیاز بھائی! دو تین دن پہلے سراج کی سوزوکی کے ساتھ ہماری اسٹیشن وین کی جو ٹکر ہوئی تھی، اس کے بارے میں تو اقبال نے آپ کو بتایا ہی ہے۔ جس وقت ٹکر ہوئی، سراج کی سوزوکی میں چار بڑی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو بوریاں ٹکر کی وجہ سے پھٹ گئیں۔ ان پھٹی ہوئی بوریوں میں جو کچھ تھا، اس نے ہم دونوں کو تھوڑا سا حیرت میں ڈال دیا۔ ان بوریوں کے اوپر تو چاولوں کی دو ڈھائی انچ موٹی تہ تھی لیکن نیچے ساری مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس بات کا پتا میرے علاوہ اقبال کو بھی چلا۔ ہم دونوں شک میں پڑ گئے۔ اس شک کی وجہ سے ہی میں نے اقبال کو سراج کے پیچھے لگایا اور وہ یہاں ہڑپہ تک آ پہنچا۔''

بوری میں چاولوں کے نیچے مٹی والی بات سننے کے بعد امتیاز کا بھاری بھرکم چہرہ متغیر ہو گیا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس نے اس بات میں زبردست دلچسپی محسوس کی ہے۔ اس نے

اوپر تلے کئی سوال عمران اور اقبال سے پوچھے اور پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کا کھڑا ہونا ایسے ہی تھا جیسے کسی لیٹے یا بیٹھے ہوئے ہاتھی کا کھڑا ہونا۔ وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا۔''مجھے پہلے ہی اس خواجے کے معاملے میں شک وشبہ لگ رہا تھا۔ اب یہ جو آپ نے بوریوں میں مٹی والی بات بتائی ہے، اس نے میرا شک بڑا پکا کر دیا ہے۔''

وہ لکڑی کی الماری میں سے اپنا موبائل فون اُٹھا لایا۔''یہ کیا کر رہے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''سعید کو فون کر رہا ہوں۔''

''یہ سعید کون ہے؟''

''یہاں ہیڈ چوکیدار ہے۔ میرا سالا بھی ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ اگر یہاں کوئی گڑبڑ ہو تو وہ اسے پکڑے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا گڑبڑ ہو رہی ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''جو کچھ آپ نے بتایا ہے اسے سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہاں زلیخا اور چھیدے کے گھر میں ناجائز طور پر کھدائی ہو رہی ہے۔ دراصل یہاں اگر کوئی چوری چھپے کھدائی کرتا ہے تو اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہوتا ہے کہ کھودی ہوئی مٹی کو چھپائے کہاں؟ پچھلے سال بھی یہاں ایک اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔ وہ ایک عیسائی فیملی تھی۔ انہوں نے گھر کے ایک کمرے میں کھدائی شروع کی اور وہاں سے نکلنے والی مٹی رات کے اندھیرے میں پاس کے چھپڑ میں پھینکنے لگے۔ ایک رات چوکیداروں نے انہیں دیکھ لیا اور وہ پکڑے گئے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ بھی کوئی ایسا ہی چکر ہے۔''

''جو لوگ پکڑے گئے تھے، ان سے کچھ برآمد بھی ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک دو مہریں برآمد ہوئی تھیں۔ باقی چیزیں وہ لوگ آگے نکال چکے تھے۔''

''پھر بہتر ہے کہ تم ابھی فون نہ کرو۔'' عمران نے مشورہ دیا۔

''کیا مطلب؟'' امتیاز نے پوچھا۔

''جلد بازی میں کام بگڑ جائے گا۔ پہلے ہم دیکھیں گے کہ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں اور ان کے ساتھ اور کون سے کھلاڑی شامل ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بس ایک دو لوگوں کا کام ہو اور ہو سکتا ہے کہ اس میں زیادہ لوگ شامل ہوں۔''

اس سلسلے میں ان تینوں کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی پھر عمران نے ایک دلیرانہ بلکہ حیران کن فیصلہ کیا۔ کم از کم میرے لیے تو یہ حیران کن ہی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اور

اقبال ابھی دیوار پھاند کر زلیخا اور چھیدے کے گھر میں داخل ہوں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک خطرناک کام تھا۔ اس کے نتیجے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر تک اس بارے میں مزید تبادلہ خیال ہوا۔ اس میں مَیں نے بھی تھوڑا بہت حصہ لیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ کام کل پر چھوڑ دیا جائے۔ امتیاز کو معلوم تھا کہ سراج بس آج کی رات یہاں ٹھہرے گا اور کل زلیخا کے گھر میں زلیخا اور اس کے بیمار خاوند کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ زلیخا کا ایک بھانجا ہوگا، اس کا کوئی ایسا خاص مسئلہ نہیں تھا۔

ہم نے رات کا باقی حصہ امتیاز کے گھر میں ہی گزارا۔ امتیاز کی بیوی نے ہمارے لیے دو نئے لحاف نکال دیئے تھے۔ ہم سوئے تو صبح دس گیارہ بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھلی۔ دھوپ پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ امتیاز کے دونوں بچے صحن میں کھیل کود کر رہے تھے۔ باپ کی طرح وہ بھی خوب خوب فربہ تھے اور ہاتھی کے چھوٹے چھوٹے گول مٹول بچوں کی طرح تھے۔

کچھ دیر بعد ایک گرما گرم دیہاتی ناشتے نے ہمارا استقبال کیا۔ دیسی گھی کے بھاری بھر کم پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ، سوجی کا باداموں والا حلوہ اور دودھ پتی چائے۔ ساتھ میں ریڈیو پر پنجابی گانے نشر ہو رہے تھے۔ امتیاز اور اس کی بیوی میں دلچسپ نوک جھونک بھی جاری تھی۔ عمران بھی گاہے بگاہے اپنی قہقہہ بار باتوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ رہا تھا۔ اس ماحول میں مجھے اپنی ذاتی تلخیاں کسی حد تک بھولی ہوئی تھیں۔ ویسے بھی میں سکون بخش گولیاں باقاعدگی سے لے رہا تھا۔ ان کے سبب دماغ پر ایک غفلت آمیز دھند چھائی رہتی تھی اور اپنے بے پناہ غم کی دھار مجھے ہلکی محسوس ہوتی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر عمران نے سب سے پہلے موبائل فون پر اپنے سرکس کے اسسٹنٹ منیجر عباس سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں لاہور سے باہر ہے اس لیے آج شو میں حصہ نہیں لے سکے گا۔ اس اطلاع کے بعد وہ کچھ ''ایزی'' نظر آنے لگا۔ اقبال، امتیاز اور عمران میں ایک بار پھر یہاں کی پُراسرار صورتِ حال کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔

امتیاز نے بتایا کہ محکمہ آثارِ قدیمہ کا دفتر یہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ موجودہ افسر خاصا ایماندار اور سخت گیر ہے۔ وہ کسی قسم کی بے قاعدگی برداشت نہیں کرتا۔ اس کی وجہ سے نوادرات کے متلاشی خوف زدہ رہتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو اگر ٹیلوں سے کبھی کبھار کوئی چیز مل جاتی ہے تو وہ خود جا کر دفتر میں جمع کرا دیتے ہیں۔

دوپہر کے وقت اقبال باہر کا جائزہ لینے کے لیے چلا گیا۔ دو تین بجے کے قریب واپس آیا۔ اس نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ''لو جناب! سراج واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔ گاڑی کو کپڑا وغیرہ مار رہا ہے۔''

''اب بھی کوئی بوری وغیرہ ہے گاڑی میں؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہاں جی...... پانچ بوریاں ہیں۔ میں نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے خود دیکھی ہیں۔''

اسی دوران میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی دور افتادہ آواز آئی۔ اندازہ ہوا کہ سراج روانہ ہو رہا ہے۔ دو تین منٹ بعد سراج کا سوزوکی ڈبا گلی میں سے گزرا۔ عمران کی طرح میں نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ سیٹھ کا ساتھی ڈرائیونگ کر رہا تھا اور سیٹھ ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا میں نے اسے صاف پہچانا۔ تاہم بوریاں وغیرہ نظر نہیں آئیں۔ اندازہ ہوا کہ بوریاں رکھنے کے لیے ڈبے کی پچھلی نشستیں نکال دی گئی ہیں۔ گاڑی کے پچھلے حصے کے ڈینٹ وغیرہ نکلوائے جا چکے تھے، تاہم ابھی اس کی کافی مرمت ہونا باقی تھی۔ سیٹھ کا چہرہ دیکھتے ہی مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ میں کافی دیر بالکل گم صم رہا۔

وہ رات خاصی سنسنی خیز رہی۔ عمران کی کئی صلاحیتیں کھل کر میرے سامنے آئیں۔ اس کی غیر معمولی بے خوفی تو مجھ پر پہلے ہی ثابت ہو چکی تھی۔ اب اندازہ ہوا کہ وہ کسی بھی خطرناک کام میں فوری طور پر کود پڑنے اور وقت کے مطابق نہایت تیزی سے فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یقیناً اس کے دوست بھی اس کے مزاج کے مطابق ہی تھے۔

رات قریباً گیارہ بجے کے لگ بھگ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ عمران گاڑی میں ایک پسٹل بھی رکھ کر لایا ہے۔ وہ پسٹل، باہر کھڑی گاڑی میں سے نکال کر اندر لے آیا اور اسے اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ آٹھ دس اضافی گولیاں بھی اس نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔ اس کے بعد وہ اور اقبال، زلیخا کے گھر میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان دونوں نے اپنے چہرے کپڑے کے ڈھانوں میں اس طرح چھپا لیے کہ آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمران نے اپنے جسم کے گرد ایک گرم چادر بھی لپیٹ لی۔ میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ میرے روکنے سے یہ لوگ رکنے والے نہیں ہیں۔ وہ تھرل اور غیر معمولی سنسنی کے متلاشی تھے اور یہ ان کے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ عمران میرا کندھا تھپتھپا کر بولا۔

''پریشان نہ ہونا جگر! یہ پستول کسی کو زخمی کرنے یا مارنے کے لیے نہیں ہے۔ بس اپنی

حفاظت کے لیے ہے۔''

میں نے بجھے لہجے میں کہا۔ ''پستول تو پستول ہی ہوتا ہے۔ بہرحال ایک بات ذہن میں رکھنا، میں یہاں ہونے والے کسی بھی معاملے کے لیے ذمے دار نہیں ہوں۔ تم مجھے کچھ بھی بتائے بغیر یہاں لائے ہو اور اب ان اُلٹے سیدھے کاموں میں پڑ گئے ہو۔ مجھے اس میں خطرے کی بُو آ رہی ہے۔''

وہ مسکراتی آواز میں بولا۔ ''رات کا وقت ہے۔ اسٹامپ پیپر مل نہیں سکتا، ورنہ میں ابھی تمہیں اقرار نامہ لکھ کر دے دیتا کہ تم ہر مسئلے سے بری الذمہ ہو۔''

''ایک اسٹامپ پیپر سے نہیں، دو سے کام چلے گا۔ تم مجھے کیوں بھول رہے ہو؟'' امتیاز نے کہا اور پھر ہنسنے لگا۔ جب وہ ہنستا تھا تو اس کا پورا جسم ہنستا تھا اور توند کے اندر تو تہلکہ سا مچ جاتا تھا۔ واقعی ہم اس کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اگر یہاں کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تو وہ بھی لپیٹ میں آ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اور اقبال گھر سے باہر نکل کر تاریکی کا حصہ بن گئے۔ دیہات اور قصبات کی یخ بستہ راتوں میں سردی سے بچنے کے لیے اکثر لوگ اپنے چہرے گرم مفلروں اور ڈھاٹوں وغیرہ میں چھپا لیتے ہیں۔ اس چیز کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد میں بے چینی کا شکار رہا۔ امتیاز بھی کسی حد تک مضطرب تھا۔ تاہم وہ اپنا دل، مونگ پھلی اور ریڈیو سے بہلا رہا تھا۔ اس کی بیوی بچے دو گھنٹے پہلے ہی سو چکے تھے۔ چار دیواری سے باہر سرد ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ کھڑکی میں سے دور ہڑپہ کے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ ان پر مدھم چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ قریباً ایک گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی تو میرا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ امتیاز ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اُٹھا اور دروازہ کھولا۔ آنے والا عمران ہی تھا۔

وہ تیزی سے اندر آیا۔ اس نے منڈا سا کھولا۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ لگتا تھا کہ بڑے موڈ میں ہے۔ آتے ساتھ ہی اس نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ تمہیں تماشا دکھاؤں۔ بڑے مزے کا سین ہے۔ ایک دم فائیو اسٹار۔''

''نہیں...... مجھے نہیں جانا۔ جو دیکھنا ہے تم خود ہی دیکھو۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''اوہو یار! کیا عورت بنے بیٹھے ہو۔ وہاں کوئی ڈر والی بات نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو میں تمہیں بلانے ہی نہ آتا۔ چلو اُٹھو۔ حیران رہ جاؤ گے تم۔''

''میں پہلے ہی بہت حیران ہوں۔ تم امتیاز بھائی کو لے جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

میں نے بے دلی سے کہا۔

اس نے میری ایک نہ سنی اور کھینچ کر مجھے اُٹھا دیا۔ کسی وقت وہ بالکل ایک تیز سیلابی ریلے کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر ایک ایسا محبت بھرا بہاؤ پیدا ہوتا تھا جس کے سامنے رُکے رہنا ممکن ہی نہیں رہتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد میں عمران کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح جسم کے مختلف حصوں پر لگی۔ عمران نے ایک بڑا مفلر مجھے بھی اس طرح لپیٹ دیا تھا کہ چہرے کا بس ایک چوتھائی حصہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ گلی میں گہری تاریکی تھی۔ آخری راتوں کا چاند کسی بدلی میں چھپا ہوا تھا۔ آوارہ کتوں کی لپیٹ سے بچتے ہم قریباً نصف فرلانگ چلے اور ایک گھر میں داخل ہو گئے۔ یہی چھیدے اور زلیخا کا گھر تھا۔ چھوٹا سا صحن تھا جس میں اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ آگے ایک برآمدہ تھا جس پر سردی سے بچنے کے لیے چقیں ڈال دی گئی تھیں۔ غسل خانے کے ساتھ ایک چھوٹا سا اسٹور نما کمرہ تھا۔ جس میں بکری بندھی ہوئی تھی۔ ہم برآمدے میں داخل ہوئے پھر ایک کمرے کا آہنی دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

اندر بلب کی زرد روشنی تھی۔ اس روشنی میں نظر آنے والے منظر نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میں کوئی ایسی صورتِ حال دیکھوں گا۔ چھبیس ستائیس سال کی ایک صحت مند عورت چارپائی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ دو آسن کی رسّی نے اسے کافی مضبوطی کے ساتھ چارپائی سے جکڑا ہوا تھا۔ عورت کے جسم پر عنابی رنگ کے شنیل کا نیا لباس تھا۔ کانوں میں سونے کے جھمکے چمک رہے تھے۔ وہ گدرائے ہوئے جسم کی تھی اور رنگ سفید تھا۔ یہ سفید رنگ ہی تھا جس کی وجہ سے اس کے ایک گال پر نیلگوں نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ نشان طمانچے کے لگتے تھے۔ اقبال پسٹل ہاتھ میں لیے اس کے سرہانے کھڑا تھا۔

دوسری چارپائی پر تیس پینتیس سال کا ایک کمزور شخص نظر آ رہا تھا۔ اس کے بال بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے اور شکل سے ہی نظر آتا تھا کہ وہ عرصے سے بیمار ہے۔ یقیناً یہی چھیدا تھا۔ اسے باندھا نہیں گیا تھا، وہ اتنا سہما ہوا تھا کہ اسے باندھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

عمران نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھنا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے آگے جھک کر بڑی محبت سے عورت کے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ''پتا نہیں تُو نیک ہے یا نہیں لیکن شکل سے بد بھی نہیں لگتی۔ میں تجھ سے کسی طرح کی تلخی کرنا نہیں چاہتا۔ میں پھر تجھ سے کہتا ہوں کہ کوئی بھی بات چھپا مت۔ اس سے تیرا ہی نقصان ہونا ہے۔''

"میں سچ کہتی ہوں۔ میں کچھ نہیں چھپا رہی۔ مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ تُو سب کچھ نہیں بتا رہی۔ بیچ بیچ میں سے چھپا رہی ہے اور جو کچھ چھپا رہی ہے وہی زیادہ ضروری ہے۔"

"میں تمھیں کیسے یقین دلاؤں؟ میں کبھی لاہور نہیں گئی۔ نہ ہی اس نے کبھی مجھے لاہور کے بارے میں بتایا ہے وہ یہی کہتا تھا کہ رائے ونڈ میں اس کی تھوک کی دکان ہے جہاں آلے دوالے کے دکاندار آٹا، چاول وغیرہ لے کر جاتے ہیں۔"

"تیرا بھانجا آج کہاں ہے؟ سنا ہے وہ تیرے ساتھ ہی یہاں رہتا ہے؟"

"وہ آج اپنے پنڈ گیا ہے۔ دو تین دن تک آئے گا۔"

"کیا اس کے دماغ میں بھی کبھی یہ نہیں آیا کہ خواجہ (سراج) جھوٹ بول سکتا ہے۔ یا اس نے سوچا ہو کہ رائے ونڈ جا کر اس کا پتا کرنا چاہیے؟"

"نہیں...... وہ اتنے جوگا نہیں ہے۔ وہ تو بس وہی کرتا رہا ہے جو خواجہ اسے کہتا رہا۔"

"اور تم بھی وہی کرتی رہی ہو بلکہ وہی...... وہی کرتی رہی ہو۔" عمران نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

زلیخا کے چہرے پر شرمندگی جھلکی۔ اس کا ہڈیوں کا ڈھانچا خاوند بھی دوسری طرف دیکھنے لگا۔

اقبال نے کہا۔ "ابھی تُو نے بتایا ہے کہ پچھلے چار مہینوں میں تُو نے سراج سے چالیس پچاس ہزار روپیہ لیا ہے۔ تیری الماری میں سے یہ ساڑھے تین ہزار نکلا ہے۔ باقی کہاں ہیں؟"

"باقی وہ کل لے گیا ہے نکال کر۔ بائیس ہزار روپیہ تھا۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "دو چوڑیاں بھی تھیں سونے کی...... وہ بھی کھینچ کر لے گیا ہے۔ یہ دیکھو، مرن جوگے نے میری باہیں چھیل دی ہیں۔" اس نے اپنی سرخ کلائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

عمران نے غور سے اس کی کلائیاں دیکھیں اور اثبات میں سر ہلایا۔

اس دوران میں زلیخا کا شوہر چھیدا کمزور آواز میں بولا۔ "ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ خواجے نے جو کچھ کیا ہے، زبردستی کیا ہے۔ اس نے ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ کہتا تھا کہ اگر کسی کو پتا چلا تو سب کو ہتھکڑیاں لگیں گی۔"

عمران بولا۔ "یہ جو پچاس ہزار روپیہ تیری بیوی نے اس سے لیا ہے، یہ بھی اس نے زبردستی دیا تھا؟ اور یہ سونے کے جھمکے...... یہ چوڑیاں...... اور یہ شنیل کا کامدار جوڑا؟ یہ سب

زبردستی تھا؟ تیری بیوی کی کوئی مرضی نہیں تھی اس میں؟"

چھیدا جواب میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ بس بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اقبال بولا۔ "تم دونوں اس میں برابر کے شریک ہو اور جو کچھ ہوگا، وہ تم سب کے ساتھ ہوگا۔"

عمران نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ والے دروازے کے سامنے لے آیا۔ یہ دوسرے کمرے کا دروازہ تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو میں چکرا کر رہ گیا۔ کمرے میں فرش کی جگہ ایک بڑا کنواں تھا۔ بلب کی میلی سی زرد روشنی اس کنویں کی گہرائی تک پہنچتے پہنچتے بہت مدھم ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں کمرے کے اندر دو قدم بھی رکھتا تو اس کنویں نما گڑھے میں گر جاتا۔

"او خدایا...... یہ کیا ہے؟"

"اسی لیے تو کہا تھا جگر! کہ سین دیکھو گے تو مزہ آ جائے گا۔"

میں نے آگے بڑھ کر نظر دوڑائی۔ اس تقریباً آٹھ فٹ قطر کے کنویں کے اندر بانس کی ایک طویل سیڑھی لگی تھی۔ کنواں پچیس فٹ سے زیادہ گہرا تھا۔ ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ کنویں کے اندر دائیں اور بائیں طرف دو اور گڑھے بھی نظر آ رہے تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ یہ کنویں کی دیوار میں دو چھوٹی سرنگیں سی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے عمران؟" میں نے تحیر میں ڈوب کر پوچھا۔

"سمجھو کہ یہ بھی موت کا کنواں ہے لیکن اس کی دیواریں کچی ہیں اس لیے ان میں موٹر سائیکل نہیں چل سکتی۔ یا شاید سیٹھ سراج کے پاس کوئی ایسی موٹر سائیکل ہو جو اس میں چل سکتی ہو۔"

"تو یہ سب سیٹھ سراج نے کیا ہے؟"

"تو اور کیا میں نے کیا ہے؟ وہ خبیث پچھلے تین چار مہینے سے صرف زلیخا کے لیے یہاں نہیں آ رہا، یہ کنواں بھی کھود رہا تھا مگر اندازہ یہی ہوا ہے کہ اس کے لالچ کی موٹر سائیکل ہڑپہ کے اس کچے کنویں میں چل نہیں سکی۔ یعنی اسے یہاں سے کچھ ملا نہیں۔ اسی لیے تو وہ بھنایا ہوا یہاں سے رخصت ہو گیا ہے اور جاتے جاتے اپنی زلیخا سے نقدی شقدی بھی چھین کر لے گیا ہے۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔

"تمھیں اطمینان سے سب کچھ بتاتا ہوں۔ پہلے اس کنویں کی سیر تو کر لو۔ نیچے اُترو گے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں...... میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"اچھا...... تو یہ ٹارچ پکڑو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

میں نے ٹارچ پکڑ لی اور اس کا رُخ کنویں نما گڑھے میں کر دیا۔ وہ سیڑھی اُتر کر نیچے چلا گیا۔ تہ میں لمبے دستے والے دو کھرپے اور کُراہیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ کنویں کے اندر سے ہی آواز دے کر بولا۔ "یہ دیکھو...... یہ لوگ کسّی کے بجائے ان لمبے کھرپوں سے کھدائی کرتے رہے ہیں۔ مقصد یہی تھا کہ کسّی سے کھدائی کریں گے تو آواز پیدا ہوگی۔"

دائیں بائیں نظر آنے والے دونوں خلا اُفقی رُخ پر زیادہ گہرے نہیں تھے۔ یہ مشکل سے دس دس فٹ آگے گئے ہوں گے۔ ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ کارآمد چیزوں کی تلاش میں کھدائی کرتے ہوئے دائیں بائیں بھی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ دیر بعد عمران سیڑھی کے سہارے باہر نکل آیا۔ اس کے جوتے نم تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کنویں کی تہ میں تھوڑا بہت کیچڑ تھا۔

"یہ تو بڑا عجیب چکر لگ رہا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"عجیب اور دلچسپ۔" عمران بھی دھیمی آواز میں بولا۔ "یہ بڑی غلط کار عورت ثابت ہوئی ہے۔" اس کا اشارہ زلیخا کی طرف تھا۔

"کیا کرتی رہی ہے؟"

"وہ سب کچھ جو ہم سوچ رہے تھے۔ یہ یہاں سراج کے ساتھ دادِ عیش بھی دیتی رہی ہے اور ساتھ ساتھ یہ کھدائی والا کام بھی ہوتا رہا ہے۔ اس کے شوہر چھیدے کو بھی سب پتا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ان لوگوں نے یہاں اسی کمرے میں کھدائی کیوں کی ہے؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ ساری باتیں ابھی تھوڑی دیر میں سامنے آ جائیں گی تم دیکھتے رہو۔"

"کیا تم نے زلیخا کے ساتھ مار پیٹ کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ بس یہ ذرا اودھم مچا رہی تھی اس لیے اسے چارپائی سے باندھنا پڑا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اقبال نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا۔ بہرحال اب یہ کافی حد تک شانت ہو چکی ہے۔"

"لیکن اس کے منہ پر تو نیل سے پڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے کہ انگلیوں کے نشان ہیں اور اس کا ہونٹ بھی ایک طرف سے زخمی ہے۔"

"یہ مہربانی ہم نے نہیں، اس کے یار سراج نے کی ہے۔ کل ان لوگوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔ سیٹھ سراج اور اس کا ساتھی شاید اب یہاں نہیں آئیں گے۔ وہ جاتے جاتے یہاں سے بیس بائیس ہزار روپیہ لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ زلیخا کا کچھ زیور بھی۔ کم از کم زلیخا تو یہی کہہ رہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کھدائی کے کام میں ان لوگوں کو مایوسی کے سوا کوئی خاص چیز نہیں ملی اور یہی وجہ ہے کہ یہاں جھگڑا وغیرہ بھی ہوا ہے۔"

ہم دونوں واپس پہلے والے کمرے میں آ گئے۔ یہاں صورتِ حال جوں کی توں تھی۔ زلیخا ٹسوے بہا رہی تھی۔ عمران نے ایک بار پھر اس سے سوال جواب شروع کیے۔ "سراج سے تمہاری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟" عمران نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ جس کمرے میں کھدائی ہوئی ہے، وہاں سے فرش بیٹھ گیا تھا۔ یہ پچھلی بارشوں کے بعد ہوا تھا۔ ہم نے دوبارہ فرش ڈالنے کے لیے پہلا فرش توڑا۔ ایک طرف چھوٹا سا گڑھا بن گیا تھا۔ اس گڑھے سے ہمیں ایک پرانا بھانڈا (برتن) ملا۔ یہ مٹی کی گڑوی جیسا تھا اور تین ٹوٹوں میں تھا۔ ہم نے اسے سیمنٹ سے جوڑا۔ میرے بھانجے جہانے نے یہ برتن عاشق مسیح کو دیا۔ عاشق مسیح کبھی کبھار ایسی چیزیں لے لیتا ہے۔ اس نے اس برتن کے جہانے کو ڈھائی ہزار روپے دیئے۔ جہانا ڈھائی ہزار روپے لے کر ہی بڑا خوش تھا۔ پر ہمیں پتا تھا کہ یہ برتن ڈھائی ہزار سے کہیں زیادہ رقم کا ہوگا۔ عاشق مسیح ایسی چیزیں لاہور لے جاتا ہے اور زیادہ پیسوں میں بیچ دیتا ہے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ یہ چیزیں خواجے کو دیتا ہے جسے تم لوگ سراج بتا رہے ہو۔"

"اس کا اصلی نام سراج ہی ہے۔ تم آگے بتاؤ۔" عمران نے کہا۔

"عاشق مسیح جب سراج کے پاس برتن لے کر گیا تو اسے دیکھ کر سراج وغیرہ کا شوق ایک دم بڑھ گیا۔ دراصل سراج کے ساتھ جو بندہ کل یہاں آیا تھا، وہ ان برتنوں اور مورتیوں وغیرہ کے بارے میں بڑا کچھ جانتا ہے۔ اس کا نام عارف خاں ہے۔ اسے خاں خاں کہتے ہیں۔ اسے ان پرانی چیزوں کی اصل قیمت کا بھی پتا ہے اور اصل میں یہی عارف خاں ہے جس نے خواجے کو لالچ دیا اور بتایا کہ جہاں سے یہ گڑوی ملی ہے، وہاں اور چیزیں بھی ہوں گی۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ عارف خود تمہارے پاس آیا یا سراج یہاں پہنچا۔"

"دونوں ہی یہاں آئے تھے۔ ان دنوں چھیدا ہسپتال میں تھا۔ گھر میں میرے اور میرے بھانجے جہانے کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ خواجے نے مجھے بتایا کہ وہ لاہور کے قریب

رائے ونڈ میں کاروبار کرتا ہے۔ اس نے عارف خاں کو اپنا ملازم بتایا۔ اب پتا نہیں کہ خواجے کی طرح عارف خاں بھی اصلی نام ہے یا جھوٹا ہے۔ بہرحال ان دونوں نے کہا کہ جہاں سے گڑوی ملی ہے وہاں اگر اور کھدائی کی جائے تو اور چیزیں مل سکتی ہیں۔ مجھے پتا تھا کہ یہ غلط کام ہے۔ سرکاری بندے ہر وقت یہاں نظر رکھتے ہیں۔ چوکیدار بھی گھومتے رہتے ہیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ خواجہ اور عارف خاں پہلے لالچ دیتے رہے پھر ڈرانے دھمکانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میرے بھانجے جہانے کو ہتھکڑی لگ سکتی ہے کیونکہ اس نے یہ گڑوی ناجائز طور پر نکالی ہے اور بیچی ہے۔ اس کے علاوہ بھی بڑا کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں ان کی بات مان لوں۔ میں اکیلی عورت ذات تھی اور یہ بات بھی صحیح تھی کہ جہاناں گڑوی بیچ چکا تھا۔ عاشق مسیح نے اس سے ڈھائی ہزار روپے کی وصولی پر انگوٹھا بھی لگوایا تھا۔ مجھے ان کی بات ماننی پڑی۔ اس کے بعد خواجے نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی اس کے ساتھ عارف خاں بھی ہوتا تھا۔ چھیدا ہسپتال سے واپس آ گیا تھا۔ خواجے نے اس کو بھی ڈرایا دھمکایا اور پھر انہوں نے کھدائی کا کام شروع کر دیا۔"

"کھدائی کون کرتا تھا؟"

"عارف خاں اور جہاناں۔ سب سے بڑا مسئلہ مٹی چھپانے کا تھا۔ پہلے تو خواجہ تھوڑی بہت مٹی چھت پر ڈلواتا رہا اور ویہڑے کی بڑی کیاری میں پھنکواتا رہا۔ پھر اس نے رستہ ڈھونڈ لیا۔ وہ کھدائی سے نکلنے والی مٹی بوریوں میں بھر کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اب پتا نہیں لاہور لے جاتا تھا یا راستے میں کہیں پھینکتا تھا۔ بہرحال یہاں تو اپنی سفید گاڑی میں بھر کر لے جاتا تھا۔"

"محلے میں یا اڑوس پڑوس میں کسی کو پتا نہیں چلا کہ تم لوگ کھدائی کر رہے ہو؟" اقبال نے پوچھا۔

خواجہ کھرپیوں سے کھدائی کرواتا تھا۔ یہ کام جب بھی ہوا، رات کو ہوا۔ دن کے وقت ہم اس کمرے کو تالا لگا چھوڑتے تھے۔"

عمران ٹارچ کی روشنی زلیخا کے گورے چٹے چہرے پر ڈال کر بولا۔ "زلیخا بی بی! یہ بات ماننے والی ہرگز نہیں ہے کہ تم لوگوں نے اتنی کھدائی کر لی اور تمہیں یہاں سے ملا کچھ نہیں۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ گڑوی کے بعد یہاں سے ایک بھی کام کی شے نہیں ملی۔ خواجہ ہم سے کہتا تھا کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے۔ گڑوی بھی یہاں سے نہیں نکلی ہوگی۔ ہم نے کسی کی

چرائی ہے یا کہیں اور سے نکالی ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کھدائی کرتے ہوئے یہاں سے کچھ نکلا ہو مگر ان لوگوں نے میرا مطلب ہے کہ سراج اور عارف نے تم سے چھپایا ہو؟"

"اللہ کی اللہ ہی جانے..... پر میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ جب بھی کھدائی ہوتی تھی، جہاناں ساتھ ہوتا تھا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو اسے پتا چل جاتا۔" بات کرتے ہوئے زلیخا کے ایک گال پر چھوٹا سا گڑھا پڑتا تھا اور وہ قدرے خوبصورت نظر آنے لگتی تھی۔

"وہ عاشق مسیح اب کہاں ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"اس پر جھگڑے اور ناجائز اسلحے کا کوئی کیس بنا ہوا ہے۔ آج کل وہ گھر سے غائب ہے۔ تین چار مہینے سے اسے دیکھا نہیں ہے۔"

اگلے ایک گھنٹے میں عمران اور اقبال اس زلیخا نامی عورت سے مسلسل سوال جواب کرتے رہے۔ اس ساری گفتگو سے جو کچھ معلوم ہوا اور جو کچھ ہم نے اخذ کیا، وہ کچھ اس طرح تھا۔

زلیخا ہوشیار عورت تھی۔ وہ جو یہ بات کر رہی تھی کہ اس نے خوف زدہ ہو کر سراج وغیرہ کا ساتھ دیا۔ غلط تھی۔ ممکن ہے کہ اس پر تھوڑا بہت دباؤ بھی ہو مگر اس کے ملوث ہونے کی اصل وجہ اس کا لالچ اور اس کی عیش پسندی تھی۔ سیٹھ سراج نے زلیخا کی فطرت کو سمجھتے ہوئے اسے بڑی ہوشیاری سے شیشے میں اُتارا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف یہاں زلیخا کے ساتھ اپنی راتوں کو گرما رہا تھا بلکہ نوادر کی تلاش میں کھدائی بھی کرواتا رہا تھا۔ زلیخا کو اپنے لاغر خاوند کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ اس کا گھر میں موجود ہونا یا نہ ہونا زلیخا کے لیے برابر تھا۔ بھانجا جہاناں بھی ایک نمبر کا بے غیرت تھا۔ اسے بھی پروا نہیں تھی کہ اس کی ماسی کیا کرتی ہے۔ اسے بس نشے پانی سے مطلب تھا اور یہ نشہ اسے وافر مل رہا تھا۔ اس کی جیب بھی سراج کی مہربانی سے ہمہ وقت گرم رہتی تھی۔ جب سراج اپنے سوزوکی ڈبے پر یہاں آتا تو اکثر عارف خاں بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ عارف اور جہاناں دونوں کھدائی میں مصروف رہتے تھے اور سراج علیحدہ کمرے میں زلیخا کے ساتھ مصروف وقت گزارتا تھا۔ اس نے زلیخا کو مٹھی میں رکھنے کے لیے سونے کی چوڑیاں دی تھیں اور ہر ہفتے نقد پیسے بھی دیتا تھا۔ زلیخا ان عورتوں میں سے تھی جنہیں سونے کی چمک دکھا کر اور نوٹوں کی کڑکڑاہٹ سنا کر کسی بھی کام پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ ویسے یہاں سوچنے کی بات یہ تھی کہ سیٹھ جیسا امیر کبیر شخص اگر ہفتے میں دوبار لاہور سے چل کر یہاں پہنچتا تھا اور اس سارے معاملے میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا تھا تو پھر اسے

یہاں سے غیر معمولی فائدے کی بھی توقع رہی ہوگی۔ یہ فائدہ ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ہوگا۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے، سراج اور عارف خالی کمرے کے اندر کھدائی سے مایوس ہوتے گئے۔ انہیں کوئی خاص چیز نہیں مل سکی۔ اس کے بعد سراج، زلیخا کے ساتھ بھی سرد مہری سے پیش آنے لگا۔ زلیخا کوئی ایسی حور پری نہیں تھی کہ وہ اس پر فدا ہو جاتا۔ وہ تو فقط اپنے مطلب کے لیے اس کے نازنخرے اُٹھا رہا تھا۔ آٹھ دس روز پہلے سراج نے عارف خاں کے ساتھ ساتھ زلیخا اور اس کے خاوند کو بھی صلواتیں سنائیں اور انہیں کہا کہ انہوں نے اس کا وقت برباد کیا ہے۔ کل یہ جھگڑا مزید بڑھا۔ زلیخا کے بیان کے مطابق اس کے خاوند کے ساہیوال کے ہسپتال میں دو تین ٹیسٹ ہونے تھے۔ اسے پھیپھڑوں میں پانی کی شکایت تھی۔ زلیخا نے سراج سے کچھ پیسے مانگے۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے پہلے انکار کیا پھر جھلاہٹ میں زلیخا کو طمانچے مارے جس کی وجہ سے اس کا ہونٹ بھی پھٹ گیا۔ اس نے زلیخا کی چوڑیاں بھی اُتروا لیں اور اس کی الماری کے اندر کے خانے سے بیس بائیس ہزار روپے بھی نکال لیے۔ زلیخا نے بہت واویلا کیا کہ وہ اب کیا کرے گی۔ وہ جو اتنا بڑا گڑھا اس کے گھر میں کھود دیا گیا ہے، وہ کیسے بھرا جائے گا اور اگر گڑھا ایسے ہی رہا تو کب تک چھپا رہے گا اور اگر گھر کی بنیادوں کو کچھ ہو گیا تو کیا بنے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان ساری معلومات کے بعد اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ سیٹھ سراج اور عارف خاں وغیرہ نے یہاں جو کچھ کرنا تھا۔ وہ کر کے جا چکے ہیں اور جاتے جاتے زلیخا وغیرہ کو بھی سخت خفا کر کے گئے ہیں۔ عمران کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی وہ بڑی ''چابک دستی'' سے زلیخا اور چھیدے کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ان کا تعلق پولیس سے ہے اور وہ ایک خفیہ اطلاع پر یہاں پہنچے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زلیخا اور خاص طور سے اس کا شوہر چھیدا بہت سہمے ہوئے تھے۔ ممکن تھا کہ شروع میں زلیخا نے کچھ تن فن دکھائی ہو لیکن اب وہ بھی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بول رہی تھی اور ہر سوال کا جواب فرفر دے رہی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے آنے سے پہلے عمران اور اقبال نے ان میاں بیوی کو اس معاملے میں معافی دینے کا تاثر دیا تھا۔

زلیخا تو کافی دیر سے ٹسوے بہا رہی تھی، اب مجھے چھیدے کی آنکھوں میں بھی نمی نظر آنے لگی تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک سیاہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا اور پھر پسلیوں پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگتا تھا۔ زلیخا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم تینوں...... واقعی...... پولیس والے ہو تو

پھر تم عام کپڑوں میں کیوں آئے ہو؟ اور تم نے اپنے منہ بھی چھپائے ہوئے ہیں۔ اب ہمیں کیا پتا کہ تم واقعی پولیس والے ہو یا نہیں...... اگر ہم تمہاری وجہ سے...... کسی اور چکر میں پھنس گئے تو پھر؟''

''ہوشیار عورت ہو۔'' عمران نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر اس ہوشیاری میں سے کچھ ہوشیاری پہلے دکھائی ہوتی تو سراج کے جال میں نہ آتیں۔ لگتا ہے کہ اس وقت تمہاری ہوشیاری پر ٹھپا لگ گیا تھا اور آنکھوں پر لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔'' پھر وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دکھاؤ بھئی اس ہوشیار عورت کو اپنا کارڈ۔''

اقبال نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر زلیخا کی طرف بڑھا دیا۔ یہ پتا نہیں کس محکمے کا کارڈ تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔ زلیخا اور چھیدے کی خاک سمجھ میں آنا تھا۔ دونوں ہی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئے۔ عمران نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بی بی صاحبہ! اگر آپ کو تسلی نہیں ہو رہی تو پھر علاقہ انچارج سے فون پر آپ کی بات کرا دیتے ہیں یا پھر ایس پی صاحب سے کہتے ہیں کہ وہ خود یہاں آ کر آپ کے پاس حاضری لگوا جائیں۔''

''نن...... نہیں...... ہم آپ پر شک تو نہیں کر رہے جی...... بب...... بس اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ ہم پر کوئی اور مصیبت نہ آ جائے۔'' زلیخا کا شوہر چھیدا منمنایا۔

زلیخا نے عاجزی سے کہا۔ ''ہم بڑے وچارے لوگ ہیں بھرا جی! ہم میں تھانے کچہریوں کی ہمت نہیں ہے۔ آپ جو کہیں گے۔ ہم ویسا ہی کریں گے۔ بس ہم پر اس معاملے کا بوجھ نہ پڑے۔''

''ہم تو یہی چاہتے تھے۔ پر اب تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے کہ تم لوگ خوار ہونے کا پروگرام بنا رہے ہو۔ یہ بڑا سخت کیس ہے بی بی! یہ جو تمہارا گھر شر ہے نا، یہ بس چار چھ مہینے میں بک جانا ہے اور یہ جو تیرے پنڈے پر چربی چڑھی ہوئی ہے نا، یہ بھی پگھل جانی ہے سنٹرل جیل میں۔'' عمران کا انداز جلالی تھا۔

''مم...... مجھے مافی دے دو صاحب جی! میں نے تو بس یونہی بات کی تھی۔ آ...... آپ جو کہیں گے، ہم ویسا ہی کریں گے۔ ہم تو خود چاہتے ہیں کہ خواجے اور اس کے یار کو ہتھکڑیاں لگیں۔ اللہ کرے...... اللہ کرے ان کے جنازے نکلیں جیل کے اندر سے۔ اس خواجے نے میرے ساتھ جو کیا ہے، میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ کل جہانے اور چھیدے کے سامنے، مجھے ماں بہن کی گندی گالیاں دی ہیں۔ مجھے چیزیں ماری ہیں۔ میری قمیص پھاڑی ہے۔ آپ خود دیکھ لیں وہ سامنے الماری میں پڑی ہوئی ہے۔'' وہ ایک بار پھر آنسو بہانے لگی۔ اس کے آنسو

ہمدردی کے طالب تھے۔

عمران پتھر کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ روایتی تھانیداروں کی طرح اس کے انداز میں کوئی لچک نظر نہیں آ رہی تھی۔ غالباً دل میں وہ اس صورتِ حال کو انجوائے بھی کر رہا تھا۔ اسے بے حرکت بیٹھتے دیکھ کر چھیدے نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''ماف کر دیں جی! اس نے غلط بات کہی ہے، اس کے لیے میں مافی مانگتا ہوں۔ ہم آپ سے پورا پورا تعاون کریں گے۔''

اب عمران نے تھوڑی سی نرمی دکھائی اور دوبارہ سوال جواب شروع کیے۔ اس نے زلیخا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو زلیخا! میں اس سارے معاملے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ یہاں سراج اور عارف خاں کے علاوہ اور کون کون آیا ہے؟ انہوں نے کیا کیا ہے؟ ان کے درمیان کیا باتیں ہوتی رہی ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں اس بارے میں کوئی بھی چھوٹی بڑی بات چھپاؤ مت۔ کون سی بات ہمارے لیے ضروری ہے اور کون سی نہیں، یہ ہم خود طے کریں گے۔''

زلیخا نے ایک بار پھر تھوڑی سی منت سماجت کی کہ ان دونوں کو اور جہانے کو اس معاملے میں سے نکال لیا جائے۔ عمران نے اس بات پر نیم رضامندی ظاہر کی۔ اس کے بعد زلیخا کو چارپائی سے کھول دیا گیا۔ اس کی گردن اور بازوؤں پر گہری خراشیں تھیں۔ یہ تازہ خراشیں آج ہی کی کھینچا تانی کا نتیجہ تھیں۔ جہاں جہاں رسّی کا بل آیا تھا، وہاں اس کے گورے جسم پر نشان سے پڑ گئے تھے۔ وہ ان نشانوں کو سہلانے لگی۔ پھر اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص الماری میں سے نکال کر ہمیں دکھائی۔ عمران اور اقبال نے قمیص دیکھ کر ایک طرف رکھ دی۔ عمران کے کہنے پر وہ چادر اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور ایک بار پھر شروع سے اپنی روداد سنانے لگی۔ اس بار وہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی بتا رہی تھی۔ شوہر کی موجودگی کی وجہ سے صرف اس روداد کا ''رومانی پہلو'' مختصر کر رہی تھی۔

اس کی باتوں سے پتا چلا کہ وارثی نام کا ایک بندہ بھی دو بار سیٹھ سراج کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر زخم کا ایک پرانا نشان تھا۔ اس نے بھی عارف خاں اور جہانے کے ساتھ کھدائی میں حصہ لیا تھا۔ ایک خاص بات جو زلیخا نے بتائی، وہ یہ تھی کہ سراج اور عارف خاں کی باتوں میں اکثر ''لال کوٹھیوں'' کا ذکر آتا تھا۔ ''لال کوٹھیاں'' لاہور میں ہی کوئی جگہ تھی۔ وہاں سراج کے علاوہ عارف اور وارثی وغیرہ بھی جاتے رہتے تھے۔ لال کوٹھیوں کے ساتھ کسی میڈم کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ یہ میڈم یا تو لال کوٹھیوں والی جگہ پر رہتی تھی یا پھر اس کا بھی وہاں آنا جانا تھا۔

عمران نے زلیخا سے دریافت کیا۔ ''تم دونوں نے کبھی اس سے پوچھا نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ خاص طور سے تمہارے ساتھ تو وہ ہر طرح کی بات کرتا تھا اور بہت سارا وقت گزارتا تھا۔'' عمران کا لہجہ ایک بار پھر معنی خیز تھا۔

زلیخا کی گردن جھک گئی۔ ''نہیں جی...... میں سچ کہتی ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔''

عمران نے اقبال اور مجھ سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''ہاں بھئی...... تم دونوں نے کچھ سنا ہے لال کوٹھیوں کے بارے میں؟''

اقبال بولا۔ ''ہری کوٹھیوں کے بارے تو سنا ہے۔ اس جگہ کو ہری کوٹھیاں اسٹاپ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ سمن آباد لاہور میں ہے لیکن لال کوٹھیاں تو نہیں سنا۔''

عمران نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''لال کوٹھی، پیلی کوٹھی، سفید کوٹھی...... اس طرح کے نام تو اکثر گلی محلوں میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ اس طرح تو رنگوں کے نام سے لاہور میں ہزاروں کوٹھیاں ہوں گی مگر یہاں ہمارے لیے تھوڑی سی آسانی موجود ہے۔ یہ ایک کوٹھی نہیں بلکہ ایک سے زیادہ ہیں۔ یقیناً یہ کوٹھیاں ساتھ ساتھ ہوں گی اس لیے انہیں لال کوٹھیاں کہا جانے لگا ہے۔''

''ہاں...... ظاہر ہے کہ لال کوٹھی کا نام تو کسی بھی بڑے شہر میں بہت سی جگہوں کا ہو سکتا ہے مگر لال کوٹھیاں بہت زیادہ جگہوں کا نہیں ہوگا۔'' میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری ترقی ضرور ہو جائے گی۔'' عمران نے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔ ''اب تم نے دماغ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔''

وہ فقرہ چست کرنے سے کہیں بھی باز نہیں آتا تھا۔

زلیخا کا خاوند اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اسے سب کچھ دیکھنے سننے لیکن خاموش رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ذرا سیدھا ہو کر بیٹھا تو عمران نے پوچھا۔ ''کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

وہ پُرسوچ انداز میں منمنایا۔ ''کیا لاہور میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں کبوتر وغیرہ اُڑانے پر پابندی ہے۔''

''کبوتر اُڑانے پر؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی؟'' اقبال نے کہا۔ ''ہم نے تو کبھی ایسا نہیں سنا اور اگر کوئی ایسی پابندی ہو بھی تو پورے شہر پر ہوتی ہے، کسی ایک جگہ تو نہیں۔''

''تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو؟'' عمران نے چھیدے سے پوچھا۔

""بس جی...... ویسے ہی۔ ایک دن عارف خاں یہاں موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ دوسرا بندہ لال کوٹھیوں میں تھا۔ وہ عارف کو بتا رہا تھا کہ یہاں کسی نے شکایت کر دی ہے کہ ہم نے کوٹھی میں کبوتر رکھے ہوئے ہیں۔ اب ناظم کا ٹیلی فون آ گیا ہے۔ کچھ اس طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔'' اقبال نے کہا۔ ''کچھ گلی محلوں یا کالونیوں میں علاقے کے لوگ خود ہی کبوتر اور پتنگ بازی وغیرہ پر پابندی لگا لیتے ہیں یا لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

عمران کے چہرے پر سوچ کی لکیریں تھیں۔ اس نے بڑے دھیان سے چھیدے کی طرف دیکھا۔ وہ چھیدے کی بات پر گہرائی سے غور کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے انگلی اُٹھائی اور بولا۔ ''میرے خیال میں ہمیں چھیدے کی اطلاع غور کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اقبال نے پوچھا۔

''میری معلومات کے مطابق لاہور میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں ہوا میں پرندوں کی موجودگی کو پسند کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ سول ایوی ایشن والے دھیان رکھتے ہیں کہ اس علاقے کی فضا پرندوں، پتنگوں وغیرہ سے خالی رہے۔''

''سول ایوی ایشن اس میں کہاں سے آ گئی؟'' اقبال نے استفسار کیا۔

''تم شاید اخبار غور سے نہیں پڑھتے۔ ابھی پچھلے دنوں بھی اس طرح کی ایک خبر آئی تھی۔ انتظامیہ کے کسی اعلیٰ افسر نے کہا تھا کہ ہوائی اڈوں کے اردگرد کی فضا کو صاف رہنا چاہیے۔ دوسری صورت میں جہازوں کو لینڈنگ اور ٹیک آف کے وقت خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس خبر میں علاقے کے اندر صفائی ستھرائی کی ضرورت پر بھی خاص زور دیا گیا تھا۔ کیونکہ کوڑے کرکٹ کی وجہ سے پرندوں کی آمد بڑھ جاتی ہے۔''

''ہاں...... اس قسم کی خبریں آتی رہتی ہیں۔'' میں نے تائید کی۔

''کبوتر بازی اور پتنگ بازی پر پابندی والی بات بھی میں نے کہیں سنی تھی۔ متعلقہ محکمے کے کسی عہدے دار نے کہا تھا کہ ایئرپورٹ کے اردگرد کے علاقے میں ایسے حفاظتی انتظامات کو یقینی بنایا جائے۔'' عمران نے وضاحت کی۔

چھیدے نے ایک بار پھر گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ اس روز عارف خاں نے موبائل پر جو گل کی تھی، وہ اسی طرح کی تھی۔ اس میں تھانے کی بات بھی ہوئی تھی کہ کہیں کبوتروں کی وجہ سے کوئی پرچہ وغیرہ نہ ہو جائے۔

عارف خاں نے گالی دیتے ہوئے کہا تھا کہ کسی کی شامت نہیں آئی ہے کہ ایسی چھوٹی سی بات پر ہم پر پرچہ کرائے۔''

کچھ دیر تک عمران، اقبال اور چھیدے میں اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ عمران کو لال کوٹھیوں والا ''کلیو'' اب خاصا اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ کم از کم میں نے تو یہی اندازہ لگایا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں عمران نے زلیخا اور چھیدے کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اگر اس سنگین کیس میں وہ اپنے لیے کچھ نرمی چاہتے ہیں تو انہیں کیا کرنا ہوگا۔ انہیں اس سارے معاملے میں فی الحال بالکل خاموش رہنا تھا۔ یہاں تک کہ محکمے کے چوکیدار سعید سے بھی کوئی بات نہیں کرنا تھی۔ نہ ہی گھر کو تالا لگا کر کہیں غائب ہونا تھا۔ عمران نے ان کو تسلی دی کہ وہ انہیں اس معاملے سے نکالنے کی کوشش کرے گا، یا کم از کم سلطانی گواہ بنا دے گا۔ زلیخا اور چھیدے سے بات کرتے ہوئے عمران نے اپنا لب ولہجہ بالکل پولیس اہلکاروں جیسا بنا لیا تھا۔ وہ اپنا اور ہمارا تعلق خفیہ پولیس سے بتا رہا تھا اور ہم نے جو اپنے چہرے چھپا رکھے تھے، اس کی وجہ بھی یہی بیان کر رہا تھا۔

رات تین بجے کے لگ بھگ ہم اپنے میزبان امتیاز کے گھر واپس آ گئے۔ وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس انتظار میں کئی کپ چائے کے علاوہ ڈیڑھ دو کلو مونگ پھلی بھی کھا چکا تھا۔

زلیخا اور چھیدے کے گھر میں جو کچھ نظر آیا تھا، اس نے عمران کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ وہ ایک دم پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پختہ ارادہ بن گیا تھا کہ وہ سیٹھ سراج سے تعلق رکھنے والے اس معاملے کی تہہ تک ضرور پہنچے گا۔ ان لمحوں میں وہ مجھے ایک بازی گر سے زیادہ ایک جاسوس دکھائی دیا۔ سیٹھ سراج کے کالے کرتوت کو سامنے لانے کا سودا اس کے دماغ میں سما گیا تھا اور اب وہ پیچھے ہٹنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا اور پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ وہ یہ کام کر گزرے گا۔ اس تھوڑے ہی عرصے میں مَیں نے اس کے بہت سے گن دیکھ لیے تھے اور مجھے اس پر اعتماد سا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس شخص کے اندر سے ہر وقت ایک توانائی سی پھوٹتی رہتی ہے اور یہ توانائی اس کے اردگرد کے لوگوں کو گرماتی ہے۔ ان میں حیران کن تبدیلیاں لاتی ہے۔ میں خود پر ہی غور کرتا تو ان تبدیلیوں کا ثبوت سامنے آ جاتا تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند دن پہلے میں نے بیسیوں افراد کے سامنے ایک خطرناک کھیل کھیلا تھا۔ ریوالور کے چیمبر میں اصلی گولی رکھ کر اپنے جسم پر فائر کیا تھا۔ بے شک اس عمل میں میرے اندر کی سخت اضطرابی کیفیت نے بھی میری مدد کی تھی لیکن اس کے

لیے اصل حوصلہ مجھے عمران سے ہی ملا تھا۔ تالیوں کی وہ آواز ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو میرے ٹریگر دبانے کے بعد فضا میں اُبھری تھی اور اس واقعے سے صرف تیرہ چودہ گھنٹے پہلے میں اس قدر مایوس تھا کہ ریل کی پٹڑی پر لیٹ کر اپنے جسم کو ٹکڑوں میں بدلنے کا سوچ رہا تھا۔

ہاں...... یہ شخص میرے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کر رہا تھا، بڑی نرمی سے اور صفائی سے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہاں آ کر مجھے اپنے ساتھ زلیخا اور چھیدے کے گھر لے گیا تھا۔ نہ بھی لے کر جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا لیکن وہ شاید میرے اندر دلچسپی اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

ہم علی الصباح بستی کے جاگنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہڑپہ کا قدیم شہر ابھی تاریکی اور دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ہماری گاڑی ان ٹیلوں کے قریب سے گزری جن کے نیچے اور جن کے اردگرد قریباً ساڑھے چار ہزار سال پرانی تہذیب دم سادھے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے ان کھنڈرات کے ہیولوں کو اپنے بالکل قریب محسوس کیا اور سوچا کہ یہ کب سے یہاں موجود ہیں۔ بہت دیر سے...... بے شک بہت دیر سے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں آئے اس وقت بھی یہ در و دیوار قریباً 2600 سال پرانے تھے۔

ہماری مہران کار اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتی ساہیوال کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اقبال اگلی نشست پر عمران کے ساتھ بیٹھا تھا، میں پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم لاہور کے گردونواح میں تھے۔ عمران ایک ٹریکٹر ٹرالی کو مسلسل ہارن دے رہا تھا مگر وہ راستہ نہیں دے رہی تھی۔ ایک دو بار عمران نے بائیں جانب سے نکلنے کی کوشش کی مگر ادھر سے بھی راستہ نہیں ملا۔ ٹرالی میں چارے کے گٹھے تھے اور چھ سات افراد سوار تھے۔ یہ نوجوان تھے اور مستی میں دکھائی دیتے تھے۔ ٹرالی کے ٹیپ ریکارڈر پر بلند آواز سے گانے بج رہے تھے۔

تھوڑا سا رستہ ملا تو عمران نے کوشش کر کے اوورٹیک کرنا چاہا۔ اسی دوران میں ٹرالی ڈرائیور نے ٹرالی کو تھوڑا سا لہرایا اور ہماری کار کے پچھلے حصے پر ایک لمبی رگڑ آ گئی۔ ”الو کے پٹھے۔“ عمران نے دانت پیس کر کہا۔

آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی اور ہاتھ کے اشارے سے ٹرالی والوں کو بھی رُکنے کا کہا۔ کار سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ٹرالی بھی رُک گئی۔ اس میں سے لڑکے چھلانگیں لگا کر نیچے اُتر آئے۔ کار کے دونوں بائیں دروازوں پر اچھی خاصی رگڑ آئی تھی۔ ٹرالی والوں

سے تو تکرار ہوئی۔ اگر وہ ذرا سی بھی شرمندگی ظاہر کرتے تو عمران نہیں جانے دیتا لیکن وہ ایک نمبر کے اجڈ ثابت ہوئے۔ غالباً ان کا ڈیرہ وغیرہ بھی قریب ہی تھا۔ جب انہوں نے بڑھ بڑھ کر باتیں کیں تو عمران کو بھی تاؤ آ گیا۔ وہ ایسے معاملات میں پیچھے ہٹنے والا کہاں تھا۔ اس نے پھولی ہوئی ناک والے ڈرائیور کا گریبان پکڑا اور ایک طوفانی ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ وہ اُچھل کر کنارے کے کھیت میں جا گرا۔ ایک دوسرے شخص نے اسے عقب سے دبوچنا چاہا۔ وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور اپنے عقب والے شخص کو بھرپور طاقت سے ٹرالی کے ساتھ ٹکرا دیا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اسی جگہ کراہ کر ڈھیر ہو گیا۔ اسی دوران میں اقبال نے بھی ایک شخص پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ عمران کی طرح وہ بھی لڑائی بھڑائی میں ماہر نظر آتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں گھمسان کا رن پڑ گیا۔ عمران اور اقبال کم از کم پانچ بندوں سے بھڑ گئے تھے۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عمران کس بلا کا نام ہے۔ اس نے بے حد مہارت اور بڑی بے رحمی سے چند سیکنڈ کے اندر اندر دو افراد کو بے بس کر دیا۔ ایک اپنا چہرہ پکڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا، دوسرا ٹرالی سے ٹکرانے کے بعد بے حال ہو گیا۔ عمران کے ورزشی جسم میں وہی غیر معمولی پھرتی نظر آئی جو سرکس میں زمین سے قریباً چالیس فٹ کی بلندی پر ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے نظر آتی تھی۔ اب اس پھرتی میں طیش کا عنصر بھی شامل تھا اس لیے اب یہ اور بھی قابلِ دید ہو گئی تھی۔ عمران اور اقبال کو یوں لڑتے اور غالب آتے دیکھ کر میرے اندر کا خوف بھی ماند پڑنے لگا۔ میں ابھی تک الگ کھڑا تھا اور کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی دوران میں عمران نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر نشست کے نیچے سے جیک کا آہنی راڈ نکال لیا۔ اس نے جیک کا راڈ میری طرف اُچھالا اور خود جیک کو ہتھیار کے طور پر سنبھال لیا۔

جیک کا راڈ میری طرف اُچھال کر اس نے ایک طرح سے مجھے اس لڑائی میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔ حالانکہ میں نے صاف دیکھ لیا تھا کہ میرے شامل ہوئے بغیر بھی عمران اور اقبال آسانی سے نمٹ لیں گے ابھی میں تذبذب میں ہی تھا کہ کیا کروں۔ اچانک ٹرالی والوں میں سے ایک بندہ مجھ پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی لاٹھی تھی۔ اس نے لاٹھی مجھ پر چلائی۔ میں ایک طرف ہٹا۔ لاٹھی میرے کندھے کو چھوتی ہوئی ٹرالی کو لگی۔ میں نے آہنی راڈ گھما کر مدِمقابل کی گردن پر رسید کیا اور حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی میں یہ ”پہلا وار“ تھا جو میں نے حقیقی لڑائی میں کسی پر کیا۔ ایک لمحے کے لیے میں خود دنگ رہ گیا کہ یہ میں نے کس طرح کر لیا۔ گردن پر راڈ کی ضرب کھا کر میرا مدِمقابل بُری طرح ڈگمگایا۔ میرا حوصلہ

بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، میں نے راڈ کی ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی۔ یہ زیادہ زوردار ضرب نہیں تھی پھر بھی مجھے تسلی ہوئی۔ مدِمقابل نے اپنا توازن درست کیا اور مجھ پر جوابی وار کرنے کے لیے تیار ہوا مگر یہی وقت تھا جب عمران عقاب کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ مدِمقابل کی لاٹھی اُٹھی رہ گئی اور وہ ڈکراتا ہوا گنے کے کھیت میں جا گرا۔

ٹرالی میں موجود دو ادھیڑ عمر افراد بیچ بچاؤ کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ چند مزید افراد بھی وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں ایک اسٹیشن وین سے اُترنے والے افراد بھی تھے۔ یہ کسی ادارے کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کر بیچ بچاؤ کرایا۔ اقبال کا سر پھٹ گیا تھا اور عمران کے ہاتھ پر معمولی چوٹ آئی تھی۔

اس جھگڑے کو ختم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ عمران کی گاڑی کا نقصان ہوا تھا، دوسری طرف ٹرالی والوں کو خاصی جسمانی ضربیں آئی تھیں۔ ایک لاچے کُرتے والے لڑکے کی تو کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ تھانے کچہری میں جانے کے بجائے معاملے کو وہیں نمٹا لیا گیا۔ اس سلسلے میں ایک فون نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہ فون عمران نے لاہور سے کروایا تھا۔ فون کرنے والا ایک ایس ایس پی تھا۔

ہم دن گیارہ بجے کے لگ بھگ واپس عمران کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ اقبال کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عمران کو بھی ہاتھ پر ہلکی سی بینڈ ایج کرانا پڑی تھی۔ بہرحال وہ دونوں بالکل ہشاش بشاش تھے۔ ان کے لیے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ آج کا دن میرے لیے بہت...... بہت اہم رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا تو نگاہوں میں ایک بار پھر ٹرالی سواروں کے ساتھ ہونے والی لڑائی کے مناظر گھومنے لگے۔ مجھے اب بھی بھروسہ نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اس لڑائی میں حصہ لیا ہے۔ پتا نہیں، وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں نے خود پر جھپٹنے والے پر آہنی راڈ کا وار کیا تھا اور یہ اکیلا وار نہیں تھا دو وار تھے۔ میری زندگی کے پہلے دو وار۔

جو کچھ آج میں نے کیا تھا، اس کی مجھے ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی۔ اب تک کی زندگی میں بے شمار موقعے ایسے آئے تھے جب مجھے لڑنا چاہیے تھا لیکن میں لڑ نہیں سکا تھا۔ اپنی اس بے بسی کا بدلہ میں نے ہمیشہ خود ہی سے لیا تھا۔ اپنے اندر ہی جلتا کڑھتا رہا تھا۔ اپنے آپ کو اذیت دی تھی یا پھر اپنا سارا غصہ کسی ہینڈ بیگ پر اُتارا تھا۔ مارشل آرٹ کی مہارت حاصل کرنے کا جنون بھی دراصل میری انہی محرومیوں و ناتوانیوں کا شاخسانہ تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو جگر؟'' عمران کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس یونہی لیٹا ہوں۔''

''یار! اب یونہی نہیں لیٹنا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ قدرت نے ہمیں ایک بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ ویسے تو ہم شاید سیٹھ سراج جیسے بندے سے ٹکر نہ لے سکتے لیکن اب حالات خود اس سے ٹکر لے رہے ہیں۔ شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے اپنے کرتوت ہی اس کی سزا کو آواز دے رہے ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ اقبال دوسرے کمرے میں سو رہا تھا۔ عمران پھیل کر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''تم کیا چاہ رہے ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جو میں چاہ رہا ہوں، وہ تم بھی اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ تمہاری منگیتر ثروت کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار سراج کا اوباش بیٹا واجی تھا۔ اس کے بعد ثروت کی فیملی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کی ذمے داری سراسر اس خبیث سراج پر آتی ہے۔ ان باپ بیٹے نے تمہیں اُجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ تابش! یہ دونوں کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ کم از کم میں تو انہیں کسی صورت معاف نہیں کر سکتا۔''

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو عمران! سیٹھ اور اس کے بیٹے کو سزا ملنے سے مجھے وہ سب کچھ واپس مل جائے گا جو میں کھو رہا ہوں۔''

عمران نے اپنے لمبے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارا اشارہ ثروت کی طرف ہے اور میں تمہارے دُکھ کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم اس سلسلے میں بھی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے۔ بلکہ ہار مانیں گے ہی نہیں۔ ہم سردھڑ کی بازی لگائیں گے میرے شہزادے۔ کچے گھڑے پر تیر جائیں گے اور دریا ہی پار نہیں کریں گے بلکہ سمندر پار کریں گے۔ ہم ڈھونڈیں گے اس کو اور اتنی شدت سے ڈھونڈیں گے کہ اس کو ملنا ہی پڑے گا لیکن اب جو بات میں کر رہا ہوں، یہ بھی غیر اہم نہیں ہے۔ قدرت ہمیں سیٹھ سے بدلہ لینے کا ایک سنہری موقع فراہم کر رہی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ آسانی سے گرفت میں آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ ہماری توقع سے زیادہ لمبے ہوں۔''

''لیکن ہم بھی تو اس پر نرم ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے۔ نرم ہاتھ ڈالنا ہوتا تو وہ آج بھی سلاخوں کے پیچھے نظر آ سکتا تھا۔ کم از کم اس پر ایک عدد ''پرچہ'' تو ہو ہی سکتا تھا۔ اس کے لیے چھیدے اور زلیخا کے بیان کافی تھے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے شک ہو رہا ہے کہ سیٹھ جو کچھ کر رہا ہے، اس کا دائرہ ہماری توقع سے زیادہ وسیع ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اس سلسلے میں تھوڑی سی پڑتال کریں۔ چھیدے نے جو لال کوٹھیوں والی اطلاع دی ہے، یہ ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ ہمارے لیے یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔''

''لال کوٹھیوں والی جگہ مل گئی تو پھر کیا ہوگا؟''

''پھر یہ پتا چلے گا کہ سراج اور عارف کی باتوں میں بار باران کوٹھیوں کا ذکر کیوں آتا رہا ہے۔ یہ میڈم صاحبہ کون ذات شریف ہیں اور کیا سیٹھ سراج جو کچھ ہڑپ میں کرتا رہا ہے، اس کا تعلق ان لال کوٹھیوں سے بھی ہے؟''

میں ویسے تو اس سارے معاملے سے بیزاری ظاہر کر رہا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب میرے اندر بھی ایک لہر سی جاگی ہوئی تھی۔ سیٹھ سراج اور اس کے بیٹے کے لیے میرے اندر چند روز پہلے جو بے پناہ نفرت پیدا ہوئی تھی اور جس نے مجھے خودکشی کی طرف مائل کر دیا تھا، اب ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ میں سیٹھ سراج کو سزا کے شکنجے میں دیکھنا چاہ رہا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر جو تبدیلی واقع ہوئی تھی، اس کی بڑی وجہ خود عمران تھا۔ اس شخص کو عجیب و غریب کردار اور اس کا بے پایاں حوصلہ مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا یہ لال کوٹھیوں والی جگہ ڈھونڈنا آسان ہوگا؟''

''یہ ہوئی نا فائیو اسٹار بات۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''اب تم نے دلچسپی ظاہر کر دی ہے تو یہ کام ایسا مشکل بھی نہیں ہوگا۔ یہ دیکھو، میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کام کیسے ہوگا۔'' اس کے انداز میں شوخی تھی۔

اس نے الماری میں سے ایک اوور کوٹ نکال کر پہنا، سر پر پی کیپ جمائی اور ہاتھ میں پائپ کی جگہ بڑے اسٹائل سے ایک چمچ پکڑ لیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر وہ شرلاک ہومز کے اسٹائل میں بولا۔ ''دیکھو ڈاکٹر واٹسن! میرا مطلب ہے ڈاکٹر تابش! کہ لاہور میں ایک جگہ ہے جو لال کوٹھیوں کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور کی آبادی ساٹھ ستر لاکھ ہو چکی ہے۔ اتنی بڑی آبادی میں سے یہ جگہ ڈھونڈنی مشکل تھی مگر اب ہمارے لیے کافی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جگہ ایک ایسے علاقے میں ہے جو لاہور ایئر پورٹ کے اردگرد ہے۔ اس طرح یہ کام کافی ''شارٹ لسٹ'' ہو جاتا ہے۔ ہو جاتا ہے کہ نہیں؟''

''بالکل ہو جاتا ہے۔'' میرے بجائے ساتھ والے کمرے سے اقبال نے جواب دیا۔ وہ ابھی ابھی بیدار ہوا تھا۔ اس کی کنپٹی پر ایک میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔

''ویری گڈ! میرا خیال ہے کہ کل تم جیلانی اور سرفراز کو لے کر علاقے کا سروے کرو۔ دو چار ڈاک خانوں میں جاؤ۔ مجھے امید ہے کہ اس جگہ کا پتا چل جائے گا۔''

''جو حکم وڈے تھانیدار صاحب!'' اقبال نے اسٹائل سے کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

میں بدستور سنجیدہ رہا۔ ہنسنا اور مسکرانا تو میں جیسے بھول ہی چکا تھا۔ عمران نے بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یار! ایک بار گھر فون کر لو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہو جائے گی۔''

وہ پچھلے دو تین روز میں کم از کم ایک درجن مرتبہ یہ مشورہ دے چکا تھا۔ شروع میں تو مجھے یہ مشورہ بالکل ناقابلِ عمل لگ رہا تھا مگر اب میرے ردِعمل میں تھوڑی سی تبدیلی آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں ایک بار واقعی گھر میں بات کر لوں تو گھر والوں کی پریشانی بڑی حد تک کم ہو سکتی ہے۔ خاص طور سے مجھے والدہ کی بات سے فکر لاحق تھی۔ میری گمشدگی کی پریشانی انہیں کسی بڑی مصیبت سے دوچار کر سکتی تھی۔ میں نے دیر تک اس معاملے پر غور کیا اور پھر شدید تذبذب میں سے نکل آیا۔

میں نے عمران سے اس کا سیل فون لیا اور گھر کی چھت پر چلا گیا۔ دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے میں نے گھر کا نمبر ملایا۔ فون والدہ نے ہی اُٹھایا۔ انہوں نے میری آواز سنی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ اس رونے میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ ''تم کہاں ہو تابی! خدا کے لیے بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟ تم ٹھیک تو ہو نا۔ تم ایسا کیوں کر رہے ہو ہمارے ساتھ؟ تمہیں پتا ہے میں پورے دو دن ہسپتال رہ کر آئی ہوں۔ کیا تم میری جان لینا چاہتے ہو؟ کیا مارنا چاہتے ہو مجھے۔'' وہ بغیر رُکے بولتی چلی گئیں۔

میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ بتایا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں اور اپنی مرضی سے یہاں موجود ہوں۔

وہ فریاد کناں انداز میں بولیں۔ ''تم کیوں واپس نہیں آ رہے ہو۔ تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟ اگر واجی اور اس کے باپ والا مسئلہ ہے تو ہم یہ گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تمہاری پھوپھی کے گھر سرگودھا چلے جائیں گے، تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ بس واپس آ جاؤ۔''

''مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے امی! بس ایک مجبوری ہے۔ میں آ کر آپ کو بتاؤں گا لیکن ابھی کچھ دن میں نہیں آ سکتا۔ میں آپ کو فون کرتا رہوں گا۔''

''کتنے دن نہیں آ سکتے؟ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ اس طرح ہمیں انتظار کی سولی پر مت لٹکاؤ۔''

ابھی دوران میں فرح نے والدہ سے ریسیور لے لیا۔ وہ بھی رونے بلکنے لگی۔ ''بھائی!

آپ کو میری قسم، آپ واپس آ جائیں۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

میں نے اس کو پچکارا اور تسلی دی۔ چھوٹے بھائی عاطف اور چچا وغیرہ سے بھی میری بات ہوئی۔ اس گفتگو سے یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کہ پارک میں سیٹھ سراج کے کارندوں نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کی خبر ہر ایک کو ہو چکی ہے۔ شروع میں تو میرے گھر والوں اور عزیزوں کو یہی اندیشہ تھا کہ مجھے پارک میں مارنے پیٹنے کے بعد سراج نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے، وہ تھانے جانا چاہتے تھے تاہم بعد میں علاقے کے ناظم نے سیٹھ کی طرف سے اس بات کی گارنٹی دی کہ میں سیٹھ کی تحویل میں نہیں ہوں۔ بعد میں میری طرف سے عمران نے میرے گھر فون بھی کر دیا تھا۔ اس فون کے بعد گھر والوں کو کچھ تسلی ہوگئی تھی۔

میں عمران کے گھر کی چھت پر ٹہلتا رہا اور ساتھ ساتھ گھر والوں سے بات بھی کرتا رہا۔ وہ رو رہے تھے اور میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے۔ فی الحال میں انہیں تسلی تشفی کے سوا کچھ نہیں دے سکتا تھا۔ والدہ مسلسل فریاد کناں تھیں۔ ''تابی! تُو تو ناشتہ بھی نہیں کر کے گیا تھا۔ بھوکے پیٹ نکل گیا تھا گھر سے۔ تیری جیب میں تو پیسے بھی نہیں تھے۔ بس ایک جوڑا تھا تیرے پاس۔ کیا پہنتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟''

میں نے انہیں بتایا کہ میں لاہور میں ہی ہوں اور اپنے ایک قریبی دوست کے گھر میں ہوں۔ میری ہر ضرورت پوری ہو رہی ہے۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ دوبارہ فون کروں گا اور بات ختم کر دی۔ ہمارے گھر کے فون میں سی ایل آئی نہیں تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ عمران کا سیل نمبر گھر والوں کو معلوم نہیں ہوگا۔

گھر میں بات کر کے مجھے کافی تسلی ہوئی۔ یوں لگا کہ سر پر رکھا ہوا ایک بہت بھاری بوجھ اُتر گیا ہے۔ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جس نے پچھلے چند روز سے میری گردن توڑ رکھی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تاہم کچھ نہ کچھ ریلیف مجھے ضرور مل گیا تھا۔

میں جن حالات سے گزر رہا تھا، یہ بڑے تند و تیز تھے۔ عمران کی پارا صفت طبع نے انہیں مزید تند و تیز بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود ثروت کا دھیان کسی گھڑی بھی میرے ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ وہ کہاں ہوگی۔ کیا کر رہی ہوگی؟ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس طرح کے بے شمار سوالات ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے۔ میرے پاس ثروت یا ناصر بھائی سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان سے یوں اوجھل ہوئے تھے کہ اپنے پیچھے کوئی نشان ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ان کا واحد نشان ان کے محلے کے پراپرٹی ڈیلر وہ حاجی صاحب تھے جنہیں وہ اپنے مکان کی فروخت کا ذمے دار بنا گئے تھے۔ بعدازاں حاجی صاحب نے مجھے

بتایا تھا کہ ناصر بھائی انہیں مکان کا مختارنامہ بھی دے گئے ہیں۔ سیٹھ سراج کے ساتھ لڑائی والا واقعہ پیش آنے سے پہلے میں دو تین دفعہ حاجی صاحب کے پاس گیا تھا لیکن وہ مجھے ناصر بھائی کا کوئی سراغ فراہم نہیں کر سکے تھے۔ بہرحال انہوں نے ہامی ضرور بھری تھی۔ ایک دو بار مجھے ایسے بھی لگا تھا کہ شاید وہ ناصر بھائی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دانستہ مجھے مکمل معلومات نہیں دے رہے۔

اس روز رات گئے عمران سرکس میں ڈیوٹی دے کر واپس آیا تو میں جاگ رہا تھا جبکہ اقبال سرِشام ہی کھانا کھا کر سو گیا تھا۔ میری سرخ آنکھیں دیکھ کر وہ اپنے مخصوص دل نشیں انداز میں مسکرایا اور میری طرف جھک کر بولا۔ ''کیا بات ہے جگر! رونے دھونے کی پریکٹس تو نہیں کر رہے تھے؟''

''رونے سے کچھ ہو سکتا تو سارے شہر کو ڈبو دیتا۔'' میں نے آہ بھری۔

''ثروت یاد آ رہی ہے نا؟'' وہ قدرے شوخی سے بولا۔ پھر ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ ''چلو اُٹھو...... ابھی چلو میرے ساتھ۔''

''کہاں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی ثروت سے ملنے چلتے ہیں اور کہاں؟ یہاں سے اسلام آباد پہنچتے ہیں۔ وہاں سے ویزا لگواتے ہیں۔ سیدھا جرمنی لینڈ کرتے ہیں۔ وہاں مسجدوں میں نہیں نہیں...... گرجا گھروں میں اعلان کرواتے ہیں کہ ایک اُجلے اُجلے مکھڑے کی سوہنی سوہنی لڑکی جس نے پاکستانی لباس پہن رکھا ہے اور اس کی آنکھوں میں کسی کا پیار بسا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پاکستان سے نکلی، ابھی تک واپس نہیں آئی اور نہ اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی ہے...... لہٰذا......''

''یار! مسخری نہ کرو۔ میں ایسے موڈ میں نہیں ہوں۔''

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اب اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اچانک بولا۔ ''کیوں نہ کل ہی انہی حاجی صاحب کے پاس چلیں جن سے تمہارے ناصر بھائی کی بات ہوتی ہے؟''

یہ اس نے میرے دل کی بات کہی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا تھا جیسے وہ دفعتاً میرے دل میں جھانک لیتا ہے۔ میں نے کہا۔ ''وہاں جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ ناصر بھائی اپنا اتا پتا تو حاجی صاحب کو بھی نہیں بتاتے۔''

وہ مسکرایا۔ ''حاجیوں میں سے کچھ حاجی بڑے پکے پیٹھے ہوتے ہیں۔ دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ بڑی گہرائی ہوتی ہے ان کے اندر۔ ہوسکتا ہے یہ حاجی صاحب بھی اسی قسم کے

ہوں۔ بہرحال میں ساتھ ہوں گا تو ہم کچھ نہ کچھ کر گزریں گے۔''

ہمارا پروگرام بنا کہ اگلے روز شام کو ہم حاجی صاحب سے ملیں گے مگر شام سے پہلے ہی ایک ایسی بات ہوگئی کہ یہ پروگرام ملتوی ہو گیا اور ہم ایک دوسرے گمبھیر چکر میں اُلجھ گئے۔

قریباً چار بجے کا وقت تھا، عمران ابھی سو کر اُٹھا تھا اور اپنے ہاتھ کی مالش کر رہا تھا۔ یہ ہاتھ ٹرالی سواروں کے ساتھ لڑائی میں تھوڑا سا مڑ گیا تھا۔ بہرحال اب ٹھیک تھا اور عمران کو اُمید تھی کہ کل تک وہ سرکس میں موٹر سائیکل کے علاوہ جھولوں والے آئٹمز بھی پیش کر سکے گا۔ اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اقبال تھا۔ اس نے عمران کو کوئی من پسند خبر سنائی تھی اور اس خبر کی وجہ سے عمران کے چہرے پر سرخی جھلکنے لگی تھی۔

دو تین منٹ تک اقبال سے بات کرنے کے بعد عمران نے موبائل جیب میں ڈالا اور میرے زانو پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولا۔ ''مبارک ہو جگر! لال کوٹھیوں کا پتا چل گیا ہے۔ ہمارے اندازے کے عین مطابق یہ کوٹھیاں جس علاقے میں ہیں، وہ ایئرپورٹ سے زیادہ دور نہیں۔ اقبال نے بھی پورا ڈاکٹر واٹسن والا کام ہے۔ وہ کل سے اس چکر میں تھا۔''

اس کے بعد اس نے خود ہی اپنا کندھا تھپک کر خود کو شاباش دی اور مسرور نظر آنے لگا۔

''اور کیا کہہ رہا ہے اقبال؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے بتایا ہے کہ یہ ایک ہی ڈیزائن کی دو کوٹھیاں ہیں۔ دس پندرہ سال پہلے تین بھائیوں نے اپنی رہائش کے لیے بنائی تھیں۔ پھر ان میں ناچاقی ہوئی اور تینوں یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔ اب یہ دونوں کوٹھیاں کسی اور کی ملکیت ہیں۔ اقبال اس بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر رہا ہے، ابھی تھوڑی دیر میں آ کر بتائے گا۔''

ہم بے چینی سے اقبال کا انتظار کرنے لگے۔ وہ تھوڑی تاخیر سے آیا۔ بہرحال اس کا چہرہ دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ اس کے پاس دلچسپ اور اہم معلومات ہیں۔ اس نے بتایا۔

''ان دونوں کوٹھیوں میں اب دو بہنیں رہتی ہیں۔ بڑی بہن کا خاوند کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ اسٹیٹ ڈویلپر تھا اور اس کی بنائی ہوئی دو تین ہاؤسنگ اسکیمیں کامیابی سے فروخت ہوئی تھیں۔ اس کی وفات کے بعد اس کا کام اس کی بیوی نے سنبھال لیا تھا۔ آج کل وہ بھی ایک ہاؤسنگ اسکیم تیار کر رہی ہے۔ اسی جواں سال خاتون کو میڈم یا میڈم شیرازی کہا جاتا ہے۔ ساتھ والی کوٹھی میں اس کی چھوٹی بہن رہتی ہے۔ یہ ذرا پُراسرار قسم کی شے ہے۔ اسے بہت کم دیکھا گیا ہے۔ باہر نکلے بھی تو رنگین شیشوں والی گاڑی میں ہوتی ہے۔ یہ اپنے انجینئر خاوند سے طلاق لے چکی ہے۔ اس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ یہ

بھی پتا نہیں چل سکا۔''

''اس کو بھی میڈم کہتے ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔

''کہنے نہ کہنے کا سوال تو تب ہے یار! جب یہ کسی سے ملتی ہو۔'' اقبال نے کہا۔ ''کم از کم جن دو چار بندوں سے میری بات ہوئی ہے، وہ میڈم شیرازی کو ہی جانتے ہیں اور اسی کے بارے میں بتا سکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر کوئی دوسرا نہیں بتا سکا تو ہم خود معلوم کر لیتے ہیں۔ ہم یہاں کس لیے بیٹھے ہیں؟''

''پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانے کے لیے۔'' اقبال نے ترنت جواب دیا اور پھر ہنسنے لگا۔

''بھئی پھڈے تو ہوتے ہی ٹانگ اڑانے کے لیے ہیں۔ ہم نہیں اڑائیں گے تو کوئی اڑائے گا اور اگر کوئی غلط بندہ کسی غلط پھڈے میں ٹانگ اڑائے گا تو اسے اور غلط کر دے گا۔''

''غلط پھڈا میں پہلی بار سن رہا ہوں۔ پھڈا تو ہوتا ہی غلط ہے۔'' میں نے تصحیح کی۔

''چلو تم بولے تو سہی۔ چاہے لفظ صحیح کرنے کے لیے بولے۔'' عمران چہکا۔

○……❖……○

اس رات عمران اور اقبال نے دیر تک لال کوٹھیوں کے بارے میں سرگوشیاں کیں۔

اب تک میں نے عمران کے مزاج کو جو سمجھا تھا، اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ ہر وقت کوئی بھی ضروری یا غیر ضروری خطرہ مول لینے کے لیے ایک دم تیار رہتا ہے۔ وہ اس قسم کی صورتِ حال کو تفریح کے طور پر لیتا تھا اور اس تفریح میں ہر حد تک جانے کے لیے آمادہ ہوتا تھا۔ جہاں وہ سمجھتا تھا کہ کوئی زیادتی ہو رہی ہے یا ناجائز کام ہو رہا ہے، وہاں وہ خدائی فوجدار بن کر دخل در معقولات اور غیر معقولات کے لیے پر تولنے لگتا تھا۔

اب بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہنچ گئی تھی۔ سیٹھ سراج کو راہ چلتے تھوڑا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے اپنے ساتھیوں کے ذریعے اس کا ایکسیڈنٹ کروایا تھا۔ اس ایکسیڈنٹ میں اتفاقیہ طور پر بوریوں والا معاملہ سامنے آیا تھا اور اب بوریوں سے بات آگے بڑھ کر لال کوٹھیوں تک جا پہنچی تھی۔ زلیخا کے خاوند چھیدے نے کوٹھیوں کا ذکر کچھ ایسے بھید بھرے انداز میں کیا تھا کہ عمران کا تجسس پوری طرح جاگ اُٹھا تھا اور اب یہی تجسس اسے کوٹھیوں اور ان کے مکینوں کی طرف کشش کر رہا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اگلے روز بھی عمران اور اقبال لال کوٹھیوں کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا پروگرام بھی ترتیب دیتے رہے۔ یہ پروگرام رات کو گیارہ بجے کے لگ بھگ میرے سامنے آیا۔ سرکس سے واپس آتے ہی عمران اور اقبال نے کہیں جانے کی تیاری شروع کردی۔ عمران نے بڑی اپنائیت سے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

''لیکن پتا تو چلے کہ جانا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ذرا لال کوٹھیوں تک۔'' عمران بولا۔

''مجھے اوکھلیوں میں سر دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''لیکن ہمیں تو ہے نا یار! تم بس یہ دیکھنا کہ اوکھلیاں کیسے چلتی ہیں اور ان میں سر کیسے دے کر کیسے نکالا جاتا ہے۔ تم کچھ نہ کرنا۔ بس ہمارے ساتھ چلو۔ بے شک گاڑی میں بیٹھے رہنا اور اگر دیکھو کہ ہمارا سر واقعی اوکھلیوں میں پھنس گیا ہے تو بلا جھجک واپس چلے آنا۔ ہم اپنے نقصان کے خود ذمے دار ہوں گے۔''

''ویسے اندر کی بات ہے تابش بھائی! ایسی چھوٹی موٹی اوکھلیاں ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔'' اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لگتا تھا کہ عمران کے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی اسی جیسا ہو گیا ہے۔

اس معاملے پر دس پندرہ منٹ بحث ہوئی۔ آخر عمران نے مجھے اس حد تک راضی کر لیا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں گا لیکن کوٹھیوں سے فاصلے پر کار کے اندر بیٹھا رہوں گا۔

مجھے اس حد تک راضی کر لینا بھی بس عمران ہی کا کام تھا۔ اگر یہ شخص ساتھ نہ ہوتا تو میں اس قسم کے کسی کام کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ شخص اپنے اندر سے پھوٹنے والی توانائی کے ذریعے مسلسل میری کیمسٹری تبدیل کر رہا تھا۔

ہم رات بارہ بجے کے قریب مہران کار میں بیٹھے اور راوی روڈ سے ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ تاریک آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ کسی وقت ہلکی پھوار پڑنی بھی شروع ہو جاتی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ ہم پینتالیس منٹ کے اندر ایئرپورٹ کے نواح میں پہنچ گئے۔ میرے جسم میں سنسنی کی ایک ہلکی سی لہر چلنی شروع ہو گئی تھی۔ ایسی ہی لہر میں نے اس وقت محسوس کی تھی جب درجنوں تماشائیوں کے سامنے میں نے عمران کے اُکسانے پر ''دو...... چھ'' کا کھیل کھیلنے کا ارادہ کیا تھا۔ گاڑی تاریک سڑک پر پھسلتی چلی جا رہی تھی۔ عمران نے مجھے بتایا نہیں تھا مگر مجھے پتا تھا کہ اس کی جیکٹ کے اندر

سیاہ رنگ کا بریٹا پسٹل موجود ہے۔ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ دونوں سرپھرے لال کوٹھیوں پر جا کر کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ سیدھے طریقے سے ملاقات کے بہانے اندر جائیں گے؟ کیا وہ چوری چھپے اندر گھسیں گے۔ کیا وہ کسی کو یرغمال وغیرہ بنا کر معلومات حاصل کرنا چاہیں گے؟ ذہن میں کئی سوال اُبھر رہے تھے لیکن میں ان سوالات کے جوابات حاصل کر کے خود کو اور پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم ایک پوش رہائشی علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں درختوں کی بھرمار تھی۔ دس مرلے اور ایک کنال کی بہت سی کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ عمران نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''دیکھ لو بھئی لال کوٹھیاں...... تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔''

یہ دونوں کوٹھیاں دو منزلہ تھیں۔ ایک کوٹھی کی کسی کسی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی لیکن دوسری یکسر تاریک تھی۔ شیشم، کچنار اور توت کے بلند و بالا درختوں نے دونوں کوٹھیوں کو گھیر رکھا تھا۔ عمران نے ایک چھوٹا سا چکر کاٹا اور کوٹھیوں کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ پچھواڑے کی چھوٹی سڑک بالکل سنسان تھی اور ایک طرف کے پلاٹ ابھی خالی پڑے تھے۔ انہوں نے گاڑی سڑک سے ہٹا کر گارڈینا کی ایک باڑ کے قریب پارک کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ آج دن کے وقت وہ اس جگہ کا پورا سروے کر چکے ہیں اور اپنا لائحہ عمل ترتیب دے چکے ہیں۔ ان کی ساری حرکات نپی تلی تھیں۔

''تابش! تم ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاؤ۔'' عمران نے گاڑی سے اُترتے ہوئے کہا۔

میں حسبِ پروگرام ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی اگنیشن میں ہی تھی۔ وہ میرا کندھا تھپک کر عجیب جوشیلے انداز میں بولا۔ ''فکر نہیں کرنا جگر! یہ بڑا فائیو اسٹار کھیل ہے۔ جوں جوں کھیلیں گے، مزہ بڑھتا جائے گا۔''

اور واقعی مجھے لگا کہ میرا خوف دب رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ سوچا کہ اگر یہ بندہ میرے ساتھ ہے تو پھر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟

ان دونوں نے کرکٹ کی اننگ شروع کرنے والے بیٹسمینوں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ سے ہاتھ ٹکرایا اور محتاط قدموں سے لال کوٹھی کی بیرونی دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ اس عقبی دیوار میں ایک چھوٹے دروازے کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ دیوار کی اونچائی دس فٹ سے کم نہیں تھی۔ یہ وہی کوٹھی تھی جو مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے گاڑی کے اندر سے دیکھا، عقبی دیوار کے قریب پہنچ کر عمران کا ہیولا ہوا میں اُچھلا۔ یہ ویسی ہی جست تھی

جیسی وہ ایک جھولے سے دوسرے جھولے تک پہنچنے کے لیے لگاتا تھا۔ اس جست کے ساتھ اس نے باؤنڈری وال کا بالائی کنارہ تھام لیا اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ دیوار میں نظر آنے والا دروازہ بے آواز کھل گیا ہے۔ اقبال اس دروازے میں داخل ہوا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

اب میں تھا اور میرے دل کی زیر و زبر ہوتی دھڑکنیں تھیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ایک خطرناک مہم جوئی میں شامل ہو چکا تھا۔ اب اس مہم جوئی سے متعلق سارے خطرے میرے لیے بھی تھے۔ میرے کان ہر گھڑی کسی اَن چاہی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ یہ آواز کسی کے چلانے کی ہو سکتی تھی، گولی چلنے کی ہو سکتی تھی یا پھر ملا جلا شور ہو سکتا تھا۔

اسٹیئرنگ پر جمی میری ہتھیلیوں پر پسینہ آنے لگا۔ بارش کی ہلکی پھوار ونڈ اسکرین کو دھندلاتی چلی جا رہی تھی۔ اسی طرح قریباً پچیس منٹ گزر گئے۔ تاریک کوٹھی مسلسل تاریک تھی کہیں کسی حرکت کے آثار نہیں تھے۔ فقط ایک بالکونی میں دو تین سیکنڈ کے لیے روشنی نظر آنے کے بعد بجھ گئی تھی۔ اچانک ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا موبائل فون جاگ گیا۔ یہ فون اقبال میرے لیے ہی یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل اور چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کال ریسیو کی۔ دوسری طرف عمران خود تھا۔ اس نے نارمل لہجے میں کہا۔ ''تابی! گھبرانے کی بات نہیں ہے لیکن یہاں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟''

وہ مدھم آواز میں بولا۔ ''تمہاری مدد کی ضرورت ہے تمہیں بس دو تین منٹ کے لیے اندر آنا ہو گا۔''

''وہ کیوں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''یار! ایک دروازے کو باہر سے کنڈی لگ گئی ہے۔ اب وہ باہر سے ہی کھل سکتا ہے۔ جلدی آؤ ورنہ ہمارا سارا مشن بے ہوش ہو کر کومے میں چلا جائے گا۔'' وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔

''دیکھو عمران! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں گاڑی سے باہر نہیں آؤں گا۔ تم نے......''

''جگر! بات تو سنو۔'' اس نے تیزی سے قطع کلامی کی۔ ''میں تمہیں یہاں جوڈو کراٹے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ صرف دو منٹ کے لیے اندر آنا ہے۔ باؤنڈری وال والا دروازہ کھلا ہے۔ صحن کے آگے برآمدہ ہے۔ برآمدے میں بائیں طرف والا کمرہ ہے۔ بس باہر سے کنڈی

کھول کر واپس چلے جاؤ۔ یار! اتنی سی مدد تو کوئی راہ چلتا بھی کر دیتا ہے۔''

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ ''لیکن کنڈی لگی کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا لیکن یہ گارنٹی ہے کہ خطرہ کوئی نہیں ہے یہاں۔ ساری کوٹھی سنسان پڑی ہے۔ بس آ جاؤ جلدی سے۔'' مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے بالکونی میں روشنی بھی ہوئی تھی۔ وہ بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس میں خوف کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اُس کا لب و لہجہ ایسا ہوتا تھا کہ میرے لیے اس کی بات ٹالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں نے اپنی ہمت بندھانے کی کوشش کی اور یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمت بندھ گئی ہے۔ میں اپنے اندر جو غیر معمولی تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا، شاید یہ ان کی ہی ایک کڑی تھی۔ سیٹھ کو تھپڑ مارنا پھر اپنی جان لینے کی نہایت سنجیدہ کوشش کرنا۔ پھر سرکس میں ریوالور کے کھیل میں خود پر گولی چلانا اور اس کے بعد ہڑپہ سے واپس آتے ہوئے راستے میں ٹرالی سواروں سے لڑنا اور ایک ٹرالی سوار پر اپنے ہاتھ سے وار کرنا۔ یہ سب ان تبدیلیوں کی ہی جھلکیاں تھیں۔

میں اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتا ہوا گاڑی سے اُترا اور باؤنڈری وال کا دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا۔ یہ عقبی صحن تھا۔ قریباً تین چار مرلے میں ہو گا۔ ایک طرف گراسی لان تھا جس میں لوہے کی سفید کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایسی جگہوں پر رکھوالی کے کتے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اگر کتا ہوتا تو آدھ گھنٹہ پہلے ہی سامنے آ گیا ہوتا۔ برآمدہ تاریک تھا۔ میں نے موبائل فون مسلسل کان سے لگا رکھا تھا۔ ''اندر آ گئے ہو؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہوں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''برآمدے میں بائیں طرف دیکھو۔ ایک چھوٹا دروازہ ہے، دوسرا بڑا ہے، گہرے پیلے رنگ کا نظر آ رہا ہے؟'' میں نے پھر ہنکارا بھرا۔

''دروازے کو باہر سے چٹخنی چڑھائی گئی ہے، اسے آرام سے گرا دو۔''

میں نے ہدایت پر عمل کیا اور لرزتے ہاتھوں سے پیلے رنگ کے دروازے کی چٹخنی گرا دی۔ دونوں سامنے ہی کھڑے تھے۔ عمران نے کندھا تھپک کر مجھے شاباش دی۔ ''جیتے رہو۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔ تمہاری ہر دلی مراد پوری ہو۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ تھی۔ ایسی ہی ٹارچ اقبال کے ہاتھ میں بھی نظر آ رہی تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ عمران اور اقبال دونوں نے بڑے سائز کے گرم مفلروں کے ذریعے اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ ان کے سروں پر پہلے ہی ''پی کیپس'' تھیں۔ لہٰذا اب ان کی آنکھوں اور

تھوڑی سی پیشانی کے علاوہ باقی چہرہ پوشیدہ تھا۔

''لو...... یہ ٹوپی پہن لو تم بھی۔'' عمران نے جیکٹ کی جیب سے ایک گرم ٹوپی نکال کر میری طرف بڑھائی۔ یہ وہی ٹوپی تھی جس میں سے صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ سر، چہرہ اور گردن وغیرہ چھپ جاتے ہیں۔

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

میں اب واپس جانا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ بھانپ کر عمران نے جلدی سے سرگوشی کی۔ ''ایک چیز دیکھ لو پھر چلتے ہیں۔'' اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے میں کھینچا اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ کوٹھی میں چاروں طرف مکمل سناٹا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے پنسل ٹارچ روشن کی۔ ٹارچ کا چھوٹا سا دائرہ فرش کے قالین پر پڑنے لگا۔ عمران محتاط قدموں سے چلتا ہوا ایک بغلی دروازے تک پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ہم ایک مستطیل کمرے میں تھے۔ اس کمرے کی دیواروں پر بہت سی پینٹنگز نظر آ رہی تھیں۔ یہ نہایت قیمتی فریموں والی پرانی تصویریں تھیں۔ زیادہ تر وکٹوریہ دَور کے مناظر کو پیش کر رہی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ ان ساری تصویروں میں عریانی کا عنصر نمایاں تھا۔ چند تصویروں کو تو فحش بھی کہا جا سکتا تھا۔ ان میں عورتوں کے علاوہ مرد بھی تھے۔ وکٹوریہ دور کے ایک دربار کی پینٹنگ نہایت بولڈ تھی۔ مصور نے دربار میں شراب نوشی، بدمستی اور عیش و عشرت کے مناظر پینٹ کیے تھے۔ بادشاہ اور درباری جام پر جام لنڈھا رہے تھے اور عورتوں کے عریاں جسموں سے کھیل رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

میں ان تصویروں پر نگاہ دوڑا رہا تھا لیکن میرا دھیان پیچھے کی طرف ہی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ یا کم از کم میں تو واپس گاڑی میں پہنچ جاؤں۔ بے شک کوٹھی میں مکمل سکوت تھا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا کہ سکوت برقرار بھی رہے اور پھر سوچنے کی بات تھی کہ برآمدے والے دروازے کو باہر سے کنڈی کس نے لگائی تھی؟ آخر کوئی نہ کوئی تو یہاں جاگ رہا تھا۔ شاید اس نے یونہی دروازہ چیک کیا تھا اور اسے کھلا دیکھ کر باہر سے چٹخنی چڑھا دی تھی۔ پھر میری نگاہوں میں سیٹھ سراج کا چہرہ گھوما۔ اس کا تعلق بھی تو ان کوٹھیوں سے بیان کیا جا رہا تھا۔ اگر سیٹھ سراج یا اس کے کسی کارندے سے یہاں ملاقات ہو جاتی تو میرا بھانڈا بُری طرح پھوٹ سکتا تھا۔ ان لمحوں میں مَیں نے محسوس کیا کہ مجھے عمران کی ''ٹوپی والی بات'' مان لینی چاہیے تھی۔ ٹوپی اس کی جیکٹ کی بائیں جیب میں تھی۔ میں نے یہ گرم ٹوپی نکالی اور ذرا سی جھجک کے ساتھ پہن لی۔

عمران کی ٹارچ کا دائرہ اب ایک سائیڈ بورڈ پر رینگ رہا تھا۔ اس نہایت دیدہ زیب سائیڈ بورڈ پر گندھارا آرٹ کے کچھ نمونے سجائے گئے تھے۔ تین چار منٹ مزید گزر گئے۔

''عمران! اب چلو یہاں سے۔'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، ایسا کچھ ہوا جس کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں تو خیر اس سارے معاملے کی گہرائی سے ویسے ہی بے خبر تھا، عمران اور اقبال کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ صورتِ حال یوں اچانک پلٹا کھائے گی۔ یہ تاریک مستطیل کمرہ اچانک چکا چوند روشنی سے بھر گیا۔ ایک نہایت تنومند شخص دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول مَیں صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چنگھاڑنے والے انداز میں کچھ کہا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ عمران سے ایسے فوری اور انتہائی برق رفتار ردِعمل کی توقع مجھے نہیں تھی اور یقیناً اس گرانڈیل شخص کو بھی نہیں تھی جو اندر گھسا تھا۔ میں نے بس عمران کی لات کو حرکت کرتے دیکھا۔ اس کے بعد دوسرا منظر جو میری آنکھیں پکڑ سکیں، پستول کے ہوا میں اُڑنے اور کمرے کی منقش چھت سے ٹکرانے کا تھا۔ عمران ایک لحظہ ضائع کیے بغیر کسی عقاب کی طرح نو وارد پر جھپٹا۔ اس کا گھٹنا مدِمقابل کی ناف پر لگا پھر ایک ایسی ٹکر اس کے چہرے پر پڑی جو شاید پتھر میں بھی دراڑ ڈال سکتی تھی۔ گرانڈیل شخص ڈکراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے عمران پر مکا چلایا۔ یہ بے جان وار، عمران نے آسانی سے جھک کر بچایا اور تب اس کے سر کی دوسری شدید ترین ضرب مدِمقابل کے چہرے پر لگی۔ اس بار وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا اور تیورا کر ایک خوبصورت مرتبان پر گرا۔ مرتبان اور وہ دونوں زمین بوس ہوئے۔ یہی وقت تھا جب دو مزید افراد بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچے۔ وہ صورتوں سے اس عمارت کے پہرے دار ہی نظر آتے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے کی صورتِ حال کو دیکھ کر رائفل استعمال کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتا، اقبال دروازے کی اوٹ سے رائفل بردار پر جھپٹا اور ایک اندھا دھند جھٹکے کے ساتھ رائفل اس سے چھین لیا۔ دوسرے شخص نے اپنی سیاہ جیکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ یقیناً وہ بھی ہتھیار نکالنا چاہ رہا تھا۔ ''خبردار'' عمران دھاڑا اور اپنے بریٹا پستول کی نال اس کے سینے کی طرف کر دی۔ یہ دونوں پہرے دار جہاں کے تہاں سکتہ زدہ کھڑے رہ گئے۔

یہ سارا ایکشن ناقابلِ یقین حد تک تیز رفتار تھا۔ مجھے اس بے پناہ مہارت کا احساس ہوا جو عمران اور اس کے ساتھی کو ایسے کاموں کے لیے حاصل تھی۔ سب سے زیادہ قابلِ دید وہ

پھرتی تھی جس کی مدد سے عمران نے گرانڈیل شخص کو صرف دو تین سکنڈ میں چاروں شانے چت کیا تھا۔ یہ اٹھائیس تیس سالہ خطرناک صورت شخص عمران سے قریباً ڈیڑھ گنا وزن تو رکھتا ہوگا۔ اس کے سانولے چہرے پر زخموں کے نشان اس کی جارحانہ طبع کی گواہی بھی دے رہے تھے لیکن فی الوقت وہ اپنے لہولہان چہرے کے ساتھ مرتبان کے ٹکڑوں کے درمیان بے دست و پا پڑا تھا۔

عمران نے بعد میں آنے والے پہرے داروں کو بھی اس گرانڈیل شخص کے پاس کھڑا کر دیا اور ان تینوں کو ایک ساتھ رائفل کے نشانے پر لے لیا۔ یہ وہی آٹھ ایم ایم رائفل تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اقبال نے پہرے دار سے چھینی تھی۔ دھینگا مشتی میں عمران کے چہرے سے مفلر اُتر چکا تھا۔

گرانڈیل شخص کے ہاتھ سے نکلنے والا پسٹل اقبال نے قالین سے اُٹھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد باہر سے کسی عورت کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ اس نے چلانے کی ادھوری کوشش کی تھی۔ پھر قدموں کی چاپ اُبھری اور اقبال ایک عورت کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ یہ چالیس پینتالیس سال کی ایک فربہ اندام ملازمہ تھی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چربی دار جسم تھل تھل کر رہا تھا۔

''اسی بھینس نے باہر سے کنڈی لگائی تھی۔'' اقبال نے اس کی پشت پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ سخت حیران بھی تھی۔ میرا یہ اندازہ درست لگتا تھا کہ وہ دروازہ کھلا دیکھ کر بے دھیانی میں کنڈی چڑھا گئی ہے۔

آج میں عمران کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ ان لمحوں وہ خاصا بے رحم نظر آ رہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہ تھے کہ اگر ان تین افراد میں سے کسی نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو وہ انہیں زخمی کرنے کے لیے بے دریغ گولی چلا دے گا۔ ظاہر ہے جو شخص ریوالور کے تین خانوں میں گولی رکھ کر خود پر فائر کر سکتا تھا، وہ دوسروں پر بھی کر سکتا تھا۔

''تم چاروں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟'' عمران نے پوچھا۔

''کک......کوئی نہیں۔'' لمبے قد والے پہرے دار نے جواب دیا۔

''اگر بات جھوٹ نکلی تو مرغا بننا پڑے گا۔'' اقبال نے وارننگ دی۔

پہرے دار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''اقبال! یہ سامنے والے باتھ روم کا دروازہ کھولو۔''

اقبال نے دروازہ کھولا۔ ''چلو تم دونوں گھس جاؤ باتھ روم میں۔ اگر گرم پانی آ رہا ہے تو نہا لو۔ اگر نہیں آ رہا تو انتظار کرو۔ چلو شاباش۔'' اس کا اشارہ بعد میں آنے والے دونوں گارڈز کی طرف تھا۔

وہ دونوں متحیر نظروں سے عمران کو دیکھتے رہے۔ ''میں فارسی میں نہیں بول رہا۔'' وہ پھنکارا۔ ''اندر گھس جاؤ اور اگر آواز وغیرہ نکالی تو پھر وہ آخری آواز ہوگی۔'' اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی اُتری ہوئی تھی۔

پہرے دار مرعوب تو یہی دیکھ کر ہو چکے تھے کہ ان کا پہلوان چند سیکنڈ میں لہولہان ہو کر زمین بوس ہو گیا تھا، اب رہی سہی کسر عمران کے انداز نے پوری کر دی۔ وہ رائفل کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھے۔ ''ٹھہرو'' عمران نے نیا حکم جاری کیا۔ وہ ٹھٹک کر رُک گئے۔ عمران نے اقبال سے کہا کہ وہ ان کی تلاشی لے۔ کہیں ان کی جیبوں میں موبائل فون وغیرہ نہ ہو۔ اقبال نے بڑی احتیاط اور مہارت سے دونوں کی تلاشی لی۔ ایک کی جیب سے موبائل نکل آیا۔ اقبال نے دونوں کو باتھ روم میں دھکیل کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

چند سیکنڈ بعد گرانڈیل شخص اور فربہ اندام ملازمہ کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ عمران اور اقبال نے تلاشی کے بعد ان دونوں کو دوسرے باتھ روم میں لاک کر دیا۔ گرانڈیل شخص میں ابھی تک کچھ دم خم موجود تھا۔ اس کی تلاشی لیتے ہوئے عمران نے یہ احتیاط کی تھی کہ اس کی جیکٹ ہی اُتروا لی تھی۔

ابھی گرانڈیل شخص اور ملازمہ کو باتھ روم میں بند کیے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ ان پر ایک اور آفت ٹوٹ پڑی۔ یہ آفت ایک لڑکی کی صورت میں تھی۔ بعینہٖ یہی لگا کہ یہ لڑکی اچانک زمین میں سے اُگ آئی ہے۔ وہ بغلی دروازے سے برآمد ہوئی اور عجیب انداز میں چلا کر عمران سے لپٹ گئی۔ وہ عقب سے آئی تھی۔ اس نے عمران کو رائفل سمیت اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور اس کے بال مٹھی میں بھینچ لیے۔

عمران نے خود کو تیزی سے گھمایا اور لڑکی کی بانہوں کا گھیرا توڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔ اس سے پہلے کہ عالم وحشت میں وہ پھر عمران پر جھپٹتی، اقبال نے اسے چھاپ لیا۔ اقبال نے ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کے منہ پر جمایا اور ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے تھوڑا سا ہوا میں اُٹھا دیا۔ وہ ہوا میں ٹانگیں چلا کر رہ گئی۔ اس کی آواز اس کے منہ میں ہی دب گئی تھی۔ بس مشتعل ''غوں غاں'' سنائی دے رہی تھی۔

یہ تیئس چوبیس سالہ قبول صورت لڑکی تھی۔ سب سے حیران کن چیز لڑکی کا حلیہ تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ بالکل یہی لگا کہ کسی انگریزی یا نئی انڈین فلم کا سین دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی کے جسم پر مختصر ترین لباس تھا۔ چند انچ کپڑا بالائی جسم پر اور اتنا ہی زیریں جسم پر۔ اس کا دودھیا جسم ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی میں دمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی سوئمنگ پول سے نکل کر سیدھا یہاں آگئی ہے۔

اتنی رات گئے، ایسی سردی میں، ایسا لباس؟ یہ بات سمجھ سے باہر تھی۔ اگر وہ کسی نیم گرم بیڈ روم سے نکل کر آئی تھی تو بھی اس کے قیامت خیز جسم پر سلیپنگ گاؤن وغیرہ تو ہونا چاہیے تھا۔ ''بس بے بی! بس'' اقبال نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں لے کر بُری طرح جھنجوڑا تو اس کا ہیجان قدرے کم ہوا۔ تاہم وہ خود کو چھڑانے کی کوشش مسلسل کر رہی تھی۔

عمران نے اپنی جیب سے ایک چوڑی انگلش ٹیپ نکالی اور اس کے دو پیس بڑی مضبوطی اور صفائی کے ساتھ لڑکی کے ہونٹوں پر چپکا دیئے۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا، ٹیپ چپکانے کے دوران میں ہی اس نے عمران کی ناف میں اپنے ننگے پاؤں کی ایک زوردار ضرب لگائی۔ عمران نے بمشکل اس ناگہانی ضرب کو برداشت کیا۔

دفعتاً نہ جانے کس طرح لڑکی نے خود کو اقبال کی گرفت سے چھڑایا اور ساتھ والے کمرے کی طرف دوڑی۔ عمران اور اقبال اس کے پیچھے گئے۔ پہلے اس نے اپنے منہ سے ٹیپ اُتارنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی، پھر وہ بیڈ روم میں گھسی بڑی پھرتی سے اس نے ایک الماری کھولی۔ شاید وہ یہاں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کہ اسے کوئی کامیابی ہوتی، عمران نے اسے دوبارہ دبوچ لیا۔ اس نے پلٹ کر عمران کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا۔ عمران نے گھما کر اسے بستر پر پٹخا اور اس کے دونوں بازو کھول کر دونوں طرف دبا لیے۔ وہ عمران کے نیچے بے بس نظر آنے لگی۔ دھینگا مشتی میں اس کی عریانی مزید عریانی میں بدل گئی تھی۔ اس کے بال بکھر گئے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اب وہ کراہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ ہتھیار نکالنے کے لیے جو الماری اس نے کھولی تھی، اس میں شراب خانہ خراب کی بہت سی بوتلیں سجی ہوئی تھیں، ساتھ میں چمکیلے گلاس تھے۔

''اقبال! تم پہرے داروں کا دھیان رکھو۔'' عمران نے کہا۔

اقبال فوراً رائفل سنبھال کر باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ لڑکی کی مزاحمت مزید کم کرنے

کے لیے عمران نے اس کے منہ پر دو تھپڑ رسید کیے تو وہ رونے لگی۔ وہ عمارت کے اس اندرونی کمرے میں شاید اپنی بے بسی کو پوری طرح محسوس کر چکی تھی۔ اب اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہی گھر کی مالکہ ہے۔ میڈم کی وہ چھوٹی بہن جو بہت کم گھر سے نکلتی ہے اور جس کے بارے میں اقبال نے پُراسرار اور ناقابلِ فہم ہونے کی رپورٹ دی تھی۔ اس نے موقع دیکھ کر ایک بار پھر عمران کا منہ نوچنے کی کوشش کی تو عمران نے بے رحمی سے اسے اوندھا کر دیا اور اس کے دونوں بازو پیچھے موڑ دیئے۔ ''اس خبیث کو باندھو۔'' عمران نے مجھ سے کہا۔

میں نے عمران کا سرخ مفلر اس کے کندھوں سے اُتارا اور لڑکی کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھ دیئے۔ یہ کام کرتے ہوئے میں نے اپنے اندر ایک عجیب سا تھرل اور حوصلہ محسوس کیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اس ماردھاڑ کا حصہ بنا ہوا ہوں اور عمران کے کہنے پر وہ سب کچھ کر رہا ہوں جو اس سے پہلے صرف تصورات میں کر سکتا تھا۔

عمران نے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑے اور اس کا چہرہ تکیے پر رگڑتے ہوئے پھنکارا۔ ''اب نچلی بیٹھ جا...... ورنہ بُری طرح پچھتائے گی۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک تیرا حشر نشر شروع ہو گیا ہوتا۔ خدا کا شکر کر کہ تیرا واسطہ شریفوں سے پڑا ہے۔''

میں نے اطمینان کی سانس لی ورنہ چند لمحے پہلے مجھے خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید عمران مشتعل ہو کر کوئی غلط راستہ اختیار کرنے والا ہے۔ اسی دوران میں مَیں نے عمران کے چہرے پر کچھ اُلجھن دیکھی۔ وہ منقش چھت کے ایک گوشے کو دھیان سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور پھر مجھے بھی شک گزرا کہ یہاں کوئی وی ٹی آر کیمرا نصب ہے۔

اچانک ایک بندہ لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے پینٹ اور جرسی پہن رکھی تھی۔ عمر کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہو گی۔ عمران اسے دیکھ کر چونکا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس شخص کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی چونکہ عمران کے نیچے اوندھی دبی ہوئی تھی، لہٰذا وہ اس شخص کی آمد کو دیکھ سکی اور نہ اشارے کو۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگا کہ یہ شخص اس کوٹھی کے مکینوں میں سے ہے لیکن وہ عمران کو اشارہ کیوں کر رہا تھا اور کیا عمران اسے جانتا تھا؟

اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا کہ عمران اس شخص کو جانتا ہے۔ اس

شخص کی طرف سے باہر آنے کا اشارہ ملنے کے فوراً بعد عمران نے لڑکی کی عریاں ٹانگوں کو ایک اسکارٹ نما سوتی کپڑے کے ساتھ نہایت مضبوطی سے باندھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہاتھ اور پاؤں بندھنے کے بعد لڑکی اب پوری طرح بے بس تھی۔ وہ کسی لاچار پرندے کی طرح بس تھوڑا بہت پھڑ پھڑا سکتی تھی۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی باہر آ گیا۔

لنگڑانے والا قبول صورت شخص کوریڈور میں عمران کے پاس کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''خدا کا شکر کریں کہ میں یہاں موجود ہوں اور آپ کو خطرے کے بارے میں بتا رہا ہوں۔ بس آپ یہاں سے نکل جائیں۔''

''لیکن کچھ پتا تو چلے۔''

''یہ دیکھیں ہیرو بھائی! میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' وہ سخت ہیجانی لہجے میں بولا۔ ''آپ کو کچھ اندازہ نہیں۔ دیکھیں آپ کے مجھ پر بڑے احسان ہیں۔ میں آپ کو کسی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز ہیرو بھائی۔''

''کیا مطلب ہے، یہاں اور لوگ بھی موجود ہیں؟''

''بالکل ہیں بھائی! یہ حرام زادی ڈراما کر رہی ہے۔ میں خود آ کر آپ کو سب کچھ بتاؤں گا۔ ایک ایک بات بتاؤں گا۔ بس ابھی آپ نکل جائیں۔''

عمران کے چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لگ رہا تھا کہ وہ نووارد کی باتوں پر بھروسہ کر رہا ہے۔

''ادھر آئیں، میں دکھاؤں آپ کو۔'' اس نے ہیجانی انداز میں عمران کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کوریڈور میں چلا کر ایک گیلری نما کمرے میں لے گیا۔ یہاں بھی فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر غالیچے آویزاں تھے۔ میں بھی عمران کے پیچھے ہی گیلری میں داخل ہو گیا۔ ہم یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ یہاں دیواروں کے ساتھ ایک پینل پر پانچ چھ مانیٹر نظر آ رہے تھے۔ مانیٹرز کی اسکرینوں پر اس کوٹھی کے مختلف مناظر کلوز سرکٹ پر دکھائی دے رہے تھے۔ ایک اسکرین پر وہ دیوار نظر آ رہی تھی جو ایک گھنٹہ پہلے عمران نے پھاندی تھی اور وہ دروازہ بھی جس سے گزر کر میں یہاں پہنچا تھا۔ پھر ایک نیم روشن راہداری کا منظر تھا۔ ایک اور نہایت روشن منظر میں اقبال آٹھ ایم ایم رائفل تھامے باتھ رومز کے دروازوں پر پہرا دے رہا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں عمران اور گرانڈیل شخص کے درمیان طوفانی لیکن مختصر لڑائی ہوئی تھی۔

نووارد نے ایک بار پھر عمران کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ کوریڈور میں پہلے والے مخصوص

مقام پر پہنچ کر وہ پھر سرگوشی میں بولا۔ ''یہ چھوٹی میڈم بڑی انوکھی اور خطرناک شے ہے۔ آپ کے اندر آنے کے پندرہ بیس منٹ بعد ہی اس کو پتا چل گیا تھا کہ آپ یہاں ہیں۔ میں آپ کو اس کے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا مگر اس وقت آپ یہاں سے چلے جائیں۔'' نووارد کے لہجے میں التجا، محبت، ہمدردی بہت کچھ یکجا ہو گیا تھا۔

''میرا ایڈریس معلوم ہے تمہیں؟''

''بالکل ہیرو بھائی۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

صرف دو تین منٹ بعد ہم تینوں عقبی دروازے سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ عمران اور اقبال بھی اُلجھن میں تھے۔ تاہم لگتا تھا کہ عمران نے کسی حد تک صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔ ہماری گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ایک ٹیک آف کرتا ہوا جہاز عین ہمارے سروں کے اوپر سے شور مچاتا گزر گیا۔ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا، ہم اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم واپس گھر جا رہے تھے۔

○......❖......○

اگلے دن میں بے چین رہا۔ مجھے صورتِ حال سے سنگین اندیشوں کی بُو آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال کی ''خطرات پسندی'' بھی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ بھی شک تھا کہ کل رات دروازے کو باہر سے کنڈی لگ جانے کے بعد عمران نے مجھے جان بوجھ کر اندر بلایا تھا۔ ورنہ وہ اس جگہ سے نکلنے کے لیے کوئی اور راستہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ پینٹنگز والے کمرے کے پاس سے ایک زینہ بھی تو اوپر جاتا تھا۔ شاید وہ اس طرح سے میرے اندر حوصلہ اُبھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہر حال یہ سارا معاملہ ہی پُر اندیش تھا۔

زلیخا اور چھیدے کے گھر میں جو کچھ سامنے آیا تھا۔ وہی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ وہاں ایک گھر کی چار دیواری کے اندر بڑی راز داری سے ایک کنویں جیسا گڑھا کھودا گیا تھا اور قیمتی اشیاء نکالنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ ابھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ یہ پروگرام کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا یا نہیں۔ اب یہ لال کوٹھیوں والا معاملہ شروع ہوا تھا اور دونوں معاملات کی کڑیاں آپس میں مل رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ عمران اور اقبال ایک سنگین معاملے کو چھیڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ان دونوں کو جیسے کچھ پروا ہی نہیں تھی۔ انہوں نے ڈٹ کر حلوہ پوری کا ناشتہ کیا تھا، دوپہر کو مٹن کڑاھی کھائی تھی۔ پھر عمران کی گرل فرینڈ شاہین کا فون آ گیا تھا۔ دونوں نوک جھونک کرتے رہے تھے۔ اب عمران اور اقبال آپس میں ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ ان میں کافی بے تکلفی تھی۔ گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ہاتھا پائی بھی کر گزرتے تھے۔ اب بھی میں دیکھ رہا تھا کہ رات والے واقعات ان دونوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ ہاں وہ انتظار ضرور کر رہے تھے اور یہ عمران کے اس شناسا کا انتظار تھا جس نے آج اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ عمران نے اس کا نام سلیم بتایا تھا اور اس کا کچھ غائبانہ تعارف بھی مجھ سے کرایا تھا۔

اس تعارف کے مطابق کچھ عرصہ پہلے تک سلیم اس کے ساتھ ہی سرکس میں کام کرتا تھا۔ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل سے گر کر اس کی ٹانگ کی ہڈی تین جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ عمران نے اپنے خرچ پر اس کا علاج کرایا اور اس کی بیماری کے دوران میں اس کے بیوی بچوں کی بھرپور کفالت بھی کی۔ مگر صحت یاب ہونے کے بعد سلیم نے اس سے کچھ رقم اُدھار لی اور اس اُدھار کے حوالے سے عمران کے ساتھ دھوکا کیا۔ اس واقعے کو قریباً ایک برس گزر چکا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ عمران نے ملاقات کی کوشش کی تھی۔

سلیم نے پانچ بجے تک آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔ اس کی آمد رات کے آٹھ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ حسبِ سابق ذرا لنگڑاتا ہوا داخل ہوا۔ وہ کل کی طرح بہت جذباتی نظر آتا تھا اور بار بار عقیدت کے انداز میں عمران کا ہاتھ تھام رہا تھا۔ رسمی گفتگو اور چائے کے دور کے بعد اصل بات شروع ہوئی۔ سلیم نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں ہیرو بھائی! کل رات آپ تینوں ایک بہت بڑے خطرے سے بچے ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ وہاں کیوں آئے تھے اور کیا چاہتے تھے؟ مگر وہ جو کچھ بھی تھا، بہت سخت مصیبت میں ڈالنے والا تھا۔ یہ لڑکی نادیہ ایوب جسے ہم چھوٹی میڈم بھی کہتے ہیں، بڑی عجیب وغریب شے ہے۔ ایک نمبر کی ڈرامے باز، مکار اور نشئی۔ اس کی کئی کہانیاں مشہور ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ دراصل یہ ایک بیمار لڑکی ہے۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال نے اس کے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیئے۔''

''اس کے بیمار ہونے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''میں شاید آپ کو ٹھیک سے سمجھا نہ سکوں۔ یہ ٹوٹل طور پر بے راہ رو لڑکی ہے۔ اپنے انجینئر شوہر سے طلاق کے بعد بالکل ہی آزاد ہو گئی ہے۔ ہر طرح کے مردوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ جنہیں پسند کرتی ہے، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارتی ہے۔ پھر انہیں ایک دم لات مار کر نکال دیتی ہے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔''

''نشہ کیا کرتی ہے؟''

''کوئی ایک نشہ ہو تو بتاؤں۔ شراب سے لے کر ہیروئن اور کوکین تک اس سے کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہے۔ بڑی بہن مجبور ہے۔ اسے خود اس کے لیے نشہ مہیا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نشے کی حالت میں اپنے جسم پر کٹ لگا لیتی ہے اور ان میں مرچیں بھر کر سسکتی رہتی ہے۔ کبھی سخت سردی میں یخ بستہ پانی سے نہانا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے سارے شوق عجیب وغریب ہیں۔ شاید آپ نے گھر میں لگی ہوئی پینٹنگز دیکھی ہوں۔ یہ ساری پینٹنگز ننگی اور گندی ہیں۔

پتا نہیں کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہے۔'' سلیم نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ کل جب آپ گھر میں گھسے اور گارڈز سے مارا ماری کی تو یہ کلوز سرکٹ پر سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر جب آپ نے گارڈز اور ملازمہ آسیہ کو بے بس کر کے باتھ روموں میں بند کر دیا تو یہ اچانک آپ کے سامنے آئی تو سردی کے باوجود بالکل تھوڑے کپڑوں میں تھی۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر کپڑے تھے۔''

''ہاں...... یہ بات ذہن میں آتی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''اس نے آپ کے پیٹ میں لات ماری پھر تھپڑ بھی مارا۔ اس کے پیچھے بھی وجہ تھی۔ وہ آپ کو غصہ دلانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد وہ بھاگی اور بیڈ روم میں آ گئی۔ یہاں اس نے الماری کھولی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے پستول وغیرہ نکالنا چاہ رہی ہو۔ پر مجھے پتا ہے کہ وہاں پستول تھا ہی نہیں۔ وہ دراصل صرف الماری کھولنا چاہ رہی تھی۔ آپ تینوں کو شراب کی بوتلیں دکھانا چاہ رہی تھی۔ آپ کو شاید میری ان باتوں پر یقین نہیں آئے گا لیکن میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ ایک بیمار عورت ہے۔ یہ چاہ رہی تھی کہ آپ...... اس سے زبردستی کریں۔ یہ آپ کو ''ریپ'' کی طرف لا رہی تھی۔ حالانکہ اپنے ہاتھ بندھنے سے پہلے وہ جب چاہتی، بیڈ پر لگا ہوا ایک نیلا بٹن دبا کر ساتھ والی کوٹھی سے ایک درجن گارڈز کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔''

ہم سب تعجب کے عالم میں سن رہے تھے۔ فضا میں سنسناہٹ سی تیرتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ واقعی ناقابلِ فہم لڑکی تھی اب سلیم کی باتوں سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ مجھے پہلے بھی شک ہوا تھا کہ وہ ہمارے سامنے جان بوجھ کر مختصر ترین لباس میں آئی تھی اور پھر اس کی حرکات...... سب کچھ ایک خاص سمت میں اشارہ کرتا تھا۔

عمران نے سلیم سے نادیہ ایوب کی بڑی بہن کے بارے میں سوالات کیے۔ سلیم نے بتایا۔ ''اسے بڑی میڈم کہتے ہیں۔ اس کی عمر چھوٹی میڈم سے دو تین سال زیادہ ہو گی۔ وہ بھی خاصی اسمارٹ ہے۔ آج کل رئیل اسٹیٹ کا کام چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ......'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

عمران نے کہا۔ ''اس کے علاوہ کے بعد چپ کیوں ہو گئے ہو؟ ہم تو وہی سننا چاہتے ہیں جو اس کے علاوہ ہے۔''

سلیم کے چہرے پر تردد کے آثار تھے۔ وہ اپنی پیشانی کی سلوٹوں کو بڑھاتے ہوئے

بولا۔ ''چھوٹی میڈم کی طرح بڑی میڈم کو بھی پرانی چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ ان کے گھر میں بہت سی مورتیاں، تصویریں اور برتن وغیرہ سجے ہوئے ہیں۔ کسی اچھی چیز کے بارے میں انہیں جہاں سے بھی خبر ملتی ہے، وہ وہاں اپنا آدمی بھیجتی ہیں یا خود پہنچ جاتی ہیں۔ اپنے اس شوق پر پیسے خرچ کرنے میں وہ بالکل بھی دریغ نہیں کرتیں۔''

عمران نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو سلیم! ہم ایک دوسرے پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہاں جو بھی بات ہو گی، وہ ہم چاروں کے درمیان ہی رہے گی۔ اس بارے میں تم بالکل بے فکر رہو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میڈم کو صرف پرانی چیزوں کا شوق ہے یا بات اس سے آگے بھی کچھ ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے، ان چیزوں کو ملک سے باہر بھیجنا۔ اسمگلنگ وغیرہ۔''

''م...... میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہیرو بھائی! جہاں تک مجھے معلوم ہے، دو تین بار میڈم نے کچھ چیزیں باہر کے لیے بک تو کرائی تھیں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ وہ قانونی طریقے سے بھیجی گئی تھیں یا نہیں......''

''آخر تم وہاں ملازمت کرتے ہو سلیم! اس چار دیواری کے اندر رہتے ہو۔ تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو گا؟''

''اصل میں ہیرو بھائی! لال کوٹھیوں میں ہر کام بڑی پلاننگ سے ہوتا ہے۔ جس ملازم کا جو کام ہے، وہ اس کے بارے میں جانتا ہے۔ ملازموں کا آپس میں میل جول بھی بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ تنخواہ تو اچھی دی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ سختی بھی بہت ہے۔ مثلاً اب مجھے ہی لیں، میری ڈیوٹی چھوٹی میڈم کی کوٹھی میں ہے۔ پچھلے ایک سال میں مَیں ایک بار بھی دوسری کوٹھی میں نہیں گیا۔ چھوٹی میڈم کی طرف میری ڈیوٹی کچن میں ہے۔ میں بازار سے سودا سلف لاتا ہوں۔ کوئی پارٹی وغیرہ ہو تو اس کا انتظام بھی کرتا ہوں اور کبھی کبھی خانساماں کا ہاتھ بھی بٹاتا ہوں۔ اردگرد کیا ہوتا ہے، مجھے اس کی کچھ زیادہ خبر نہیں۔ ہاں...... یہ بات ضرور ہے کہ بڑی میڈم سے کچھ انجانے لوگ ملنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی رات کے وقت کوئی ولز جیپ یا مرسڈیز گاڑی بھی نظر آتی ہے۔ ان میں اکثر پٹھان ٹائپ بندے ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے قد کا دیہاتی سا شخص اکثر آتا رہتا ہے۔ کافی بڑی پگ ہوتی ہے اس کے سر پر۔ وہ چادر کی بکل مارتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ ٹیکسلا یا حسن ابدال کی طرف کا ہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے علاقے سے ''اینٹیکس'' وغیرہ لاتا ہو۔''

"ہاں جی...... بالکل ہوسکتا ہے۔اصل میں بڑی میڈم ایسی چیزوں کی منہ مانگی قیمت دیتی ہیں اس لیے بیچنے والے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کوئی اچھی چیز ہاتھ لگے تو اس کے سودے کی بات سب سے پہلے بڑی میڈم سے کی جائے۔"

ہمارے اور سلیم کے درمیان تقریباً دو گھنٹے گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں کھانے اور چائے سے بھی دودو ہاتھ ہوئے۔سلیم کی باتوں سے پتا چلا کہ کل رات ہمارے چلے آنے کے بعد میڈم نادیہ بڑی بے مزہ ہوئی تھی۔ اس نے ملازموں کو آوازیں دی تھیں۔ان آوازوں کے جواب میں سب سے پہلے سلیم ہی وہاں پہنچا تھا۔اس نے میڈم نادیہ کے ہاتھ کھولے تھے اور اس کے ہونٹوں پر سے ٹیپ اُتاری تھی۔

میڈم نادیہ حیران تھی کہ ہم اس طرح اچانک سب کچھ چھوڑ کر نکل کیوں گئے؟ کیا ہمیں کوئی خطرہ محسوس ہوا تھا یا ہم جس مقصد کے لیے گھر میں داخل ہوئے تھے وہ پورا نہیں ہوسکا تھا؟ ہمارا مقصد کیا تھا، یہ بھی میڈم اور اس کے گارڈز کو ٹھیک سے معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ بہرحال آزاد ہونے کے بعد میڈم نادیہ نے اپنے ذاتی گارڈز کو خوب خوب ڈانٹ پلائی تھی۔ خاص طور سے انچارج گارڈ شیرے کو۔ یہ شیرا وہی کسرتی جسم والا ہٹا کٹا شخص تھا جس کے ساتھ عمران نے سونی لسٹن والا سلوک کیا تھا۔مشہور باکسر محمد علی نے ناقابلِ شکست سونی لسٹن کو پہلے ہی راؤنڈ میں آناً فاناً چت کر کے پوری دنیا میں تماشائیوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔کل رات عمران نے بھی دو تین سیکنڈ کے اندر پہلوان نما شیرے کو دو ٹکروں میں ناک آؤٹ کر ڈالا تھا۔اس نشست میں سلیم نے میڈم نادیہ کی عجیب وغریب شخصیت کے بارے میں اور بھی کئی باتیں ہمارے گوش گزار کیں۔

رات گیارہ بجے کے قریب سلیم واپس جانے کے لیے تیار ہوگیا۔اس نے عمران سے وعدہ کیا کہ وہ اس سے رابطہ رکھے گا اور دونوں میڈم بہنوں کے بارے میں اسے جو کچھ بھی مزید معلوم ہوسکا، اس تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔عمران کے اس سوال کا جواب وہ یقین سے نہیں دے سکا تھا کہ بڑی میڈم صفورا اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہے یا نہیں۔ وقتِ رخصت سلیم نے عمران سے علیحدگی میں بھی مختصر ملاقات کی۔ اس ملاقات میں اس نے یقیناً عمران سے اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگی ہوگی۔ اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔عمران کے احسانات کے بدلے سلیم نے اسے رقم کے معاملے میں دھوکا دیا تھا اور قریباً ایک سال تک اوجھل رہا تھا۔

سلیم کے جانے کے فوراً بعد عمران کے تاثرات تبدیل ہوگئے۔ اس نے اقبال سے

کہا۔"اس کے پیچھے جاؤ اقبال! پتا کرو یہ کہاں جاتا ہے؟ لیکن ذرا احتیاط سے۔"

اقبال جیسے پہلے ہی سے کسی ایسے اشارے کا منتظر تھا۔اس نے جلدی سے بوٹ پہنے اور پرس جیب میں رکھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں حیران تھا اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔اقبال کے باہر جانے کے بعد عمران نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔"میں سلیم کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔میرے خیال میں اس نے بتایا کم اور چھپایا زیادہ ہے۔شاید یہ کچھ ڈر بھی رہا ہے۔"

"اقبال اب کیا کرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا پیچھا کرے گا۔یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ یہ اب کہاں جاتا ہے۔اگر اس کے گھر کے بارے میں پتا چل سکا تو یہ بھی اچھی بات ہوگی۔"

"اور اگر اسے معلوم ہوگیا کہ اس کا پیچھا کیا گیا ہے تو؟"

"اقبال کچا کھلاڑی نہیں ہے۔ایسے معاملوں کا بڑا فائیو اسٹار تجربہ ہے اسے۔دو سال تک سیالکوٹ پولیس کا انفارمر رہ چکا ہے۔اس سے پہلے ریڈیو پاکستان میں کام کر چکا ہے اور ہاں اس میں ایک بڑی مزے دار صلاحیت بھی ہے۔آوازوں کی نقل بھی کر لیتا ہے۔ہر فلمی اور سیاسی ایکٹر کی آواز نکال لیتا ہے اور......"

"یار! میں دوسری بات کر رہا ہوں۔اگر سلیم کو پتا چل گیا کہ اقبال اس کے پیچھے آرہا ہے؟"

"میری جان! اس بارے میں بےفکر رہو۔ویسے بھی وہ زیادہ دیر اس کے پیچھے نہیں رہے گا۔اگر معاملے نے طول کھینچا تو وہ اپنے کسی اور دوست کو اس کے پیچھے لگا دے گا اور یہ ایسا شخص ہوگا جس کے بارے میں سلیم کچھ نہیں جانتا ہوگا۔"

"فرض کرو کہ اگر کسی طرح سلیم کو پتا چل ہی گیا تو پھر؟ اس طرح تو تمہاری ٹکر سیدھی سیدھی چھوٹی اور بڑی میڈم سے ہوجائے گی۔سیٹھ سراج سمیت ان سارے لوگوں کو تمہارے اس ٹھکانے کا پتا بھی چل جائے گا۔پھر کیا ہوگا؟"

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" عمران نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔"یار تابی! ایک تو پتا نہیں تم دور دراز کے اندیشوں میں کیوں کھو جاتے ہو۔ایک دانشور نے کہا ہے کہ ہماری زندگی کی اسّی فیصد پریشانیاں جھوٹے اندیشوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔"

میں پچھلے پہر سو گیا۔اقبال سے میری ملاقات اگلے روز صبح نو دس بجے کے قریب

ہوئی۔ وہ ابھی ابھی اپنی مہم جوئی سے واپس لوٹا تھا اور مطمئن نظر آتا تھا۔ عمران اور وہ دونوں نہاری نان کا ناشتہ کر رہے تھے۔ ساتھ میں لسی کے دو بڑے بڑے گلاس تھے۔ ایک گلاس پلیٹ سے ڈھکا ہوا پاس ہی رکھا تھا۔ یقیناً یہ میرے لیے تھا۔ میرا ناشتہ بھی پلیٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

میں نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتے میں شریک ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں بھئی اقبال! کیا رہا تمہاری جاسوسی کا؟''

''سلیم کے گھر کا پتا چل گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ مسلم ٹاؤن کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ دس مرلے کی کوٹھی ہے۔ دس بارہ ہزار روپے کرایہ دے رہا ہے۔ موٹر سائیکل بھی رکھی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ چھوٹی میڈم اچھی تنخواہ دے رہی ہے۔''

''اس کے علاوہ دوسری خاص بات یہ پتا چلی ہے کہ سلیم کی علیک سلیک جنوبی لاہور کے ایک جانے پہچانے کن ٹٹے مجید مٹھو سے بھی ہے۔'' عمران نے کہا۔ وہ اس دوسری اطلاع کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔

''مجید مٹھو کا نام تو شاید میں نے بھی کہیں سنا ہوا ہے۔ شاید اخبار میں پڑھا تھا۔ لڑائی جھگڑے یا ڈکیتی وغیرہ کی کوئی واردات تھی۔'' میں نے بتایا۔

''ظاہر ہے یار! مجید مٹھو کا نام کسی مشاعرے یا ادبی کانفرنس کی خبر میں تو آنے سے رہا۔ یہ بیرون لاہور کے چند سکہ بند غنڈوں میں سے ہے۔ کل یہاں سے روانہ ہونے کے بعد سلیم سیدھا اپنے گھر مسلم ٹاؤن گیا تھا لیکن راستے میں چند منٹ کے لیے وہ ثمن آباد کے علاقے میں بھی رُکا۔ یہ مجید مٹھو کا گھر تھا۔''

''تو کیا اب مجید مٹھو سے جھگڑا مول لینے کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''توبہ...... توبہ۔'' عمران نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ہم ان کن ٹٹوں سے جھگڑ کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔ ہم تو اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر بس یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ جن میں خیر سے ہمارے محترم سیٹھ سراج صاحب بھی شامل ہیں، آخر کر کیا رہے ہیں۔ اس گورکھ دھندے کا کوئی سرا ہاتھ آ گیا تو ہم یہ سرا پولیس والوں کو تھما دیں گے اور خود ایک دم الگ ہو جائیں گے۔ ہمارا کام یہ نہیں پیارے ہمارا کام کچھ اور ہے۔''

''ہمارا کام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارا کام ایک دکھیارے دل کی آواز سننا ہے۔ یہ دکھیارا دل خاموشی کی زبان میں فریاد کر رہا ہے، کسی کو پکار رہا ہے اور جس کو پکار رہا ہے، وہ پتا نہیں کہاں ہے۔ بس اس کو

ڈھونڈنا ہے۔'' عمران کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے حالات کی طرف اور ثروت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ثروت کا خیال ذہن میں آتے ہی ایک تیر سا دل میں پیوست ہو جاتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک دبیز اندھیرے کی چادر کھلنے لگتی تھی۔ اس اندھیرے کی دوسری جانب سے وہ مجھے پکارتی تھی۔ ''تم کہاں ہو تابش! دیکھو وقت ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو رہی ہوں۔ کیا تم اسی طرح مجھے چلے جانے دو گے؟''

بارہ بجے کے قریب عمران اور اقبال دونوں باہر نکل گئے۔ وہ اقبال کی موٹر سائیکل پر گئے تھے۔ عمران نے مجھے کھل کر نہیں بتایا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ سلیم والے چکر میں ہی نکلے ہیں۔ کل رات انہیں معلوم ہوا تھا کہ سلیم اور مجید مٹھو نامی شخص کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ مزید جاننا چاہتے ہوں۔ میں جوں جوں عمران اور اقبال کو جان رہا تھا، میری حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے۔ خاص طور سے عمران تو راہ جاتی مصیبت کو اپنے گلے ڈال کر دلی مسرت محسوس کرتا تھا۔ اپنی خیریت، سلامتی اور زندگی کے بارے میں وہ اتنا بے پروا ہو جاتا تھا کہ سخت حیرت ہوتی تھی۔ اس کے لیے شدید خطرے میں کودنا ایسے ہی تھا جیسے تفریح کے لیے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگانا۔ یہ سلسلہ سیٹھ سراج کی وجہ سے شروع ہوا تھا اور سیٹھ کے بارے میں مَیں نے ہی عمران کو سب کچھ بتایا تھا۔ اب یہ سلسلہ خود بخود ہی ایک خاص سمت میں بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے روکنے سے یہ سب کچھ رُکنے والا نہیں۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ میں اس ساری صورت حال سے الگ تھلگ ہو جاؤں۔ خاموشی سے کہیں نکل جاؤں۔ یہ نہ ہو کہ عمران جس آگ کو ہوا دے رہا ہے، اس کی تپش براہِ راست مجھ تک اور میرے گھر والوں تک پہنچنے لگے۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد ڈھائی تین گھنٹے تک میں عجیب تذبذب میں رہا۔ اسی دوران میں اقبال کے موبائل پر عمران کی کال آ گئی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ بڑا پُر جوش محسوس ہو رہا تھا۔ ''تابی یار! بڑا مزے کا کام ہوا ہے۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''میں یہاں سمن آباد میں ہوں۔ تم بس فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے ایک بڑے کام کی شے ہے۔''

''کام کی شے...... میں سمجھا نہیں؟''

''یہاں آ کر سب سمجھ جاؤ گے۔ بس یہ سمجھو کہ اس بندے سے ہمیں ثروت کا کھوج مل سکتا ہے اور یہ بھی پتا چل سکتا ہے کہ اصل میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

ثروت کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے عمران سے تفصیل جاننا چاہی لیکن ایسے معاملوں میں وہ یکسر چکنا گھڑا ثابت ہوتا تھا۔ بہرحال اس کی بات نے میرے اندر بے پناہ تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میری کار کی چابی، سائیڈ ٹیبل کی اوپر والی دراز میں ہے۔ گاڑی لے کر فوراً نکل آؤ۔ سمن آباد کے دوسرے گول چکر سے دائیں طرف مڑنا ہے۔ آگے ایک گراؤنڈ آئے گا۔ اس کے بعد......'' وہ مجھے پورا ایڈریس سمجھتا چلا گیا۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد میں چند سیکنڈ شدید اُلجھن میں رہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ عمران ساتھ ہوتا تھا تو مجھے شہر میں گھومتے ہوئے کوئی خاص اندیشہ محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن جب میں اکیلا کہیں نکلنے کا سوچتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ باہر نکلتے ہی سیٹھ سراج کے کارندوں سے ملاقات ہو جائے گی اور میں کسی سخت مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

بہر طور عمران جو کچھ بتا رہا تھا اس کے بعد میرا گھر سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے ہر طرح تسلی دی تھی کہ وہاں موقعے پر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ایسی تسلیاں تو وہ خیر پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا اور یہ طفل تسلیاں ہی ثابت ہوئی تھیں۔ تاہم اب میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی طرح کا کوئی رسک ہو بھی تو عمران اس سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیتیں رکھتا ہے۔

میں نے عمران کی کار نکالی اور اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف روانہ ہو گیا۔ بازار کے کئی دکانداروں نے مجھے دیکھ کر سلام کیا۔ وہ اب مجھے اپنے ہیرو بھائی کے مہمان دوست کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ آج میں کئی روز کے بعد ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑکیں، ٹریفک اور لوگوں کی گہما گہمی سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں مطلوبہ ایڈریس پر موجود تھا۔ یہ عام آبادی سے الگ تھلگ بنا ہوا ایک مکان تھا۔ اس کے پچھلی طرف قبرستان تھا۔ سامنے کسی سرکاری دفتر کی سرخی مائل دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہ مٹھو نامی غنڈے کی رہائش گاہ تھی۔

اپنی گاڑی کا ہارن پہچانتے ہی عمران گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ بالکل مطمئن نظر آتا تھا جیسے اپنے ہی گھر میں مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہو۔ گاڑی لاک کر کے میں باہر آیا اور عمران کے ساتھ اندر چلا گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سات آٹھ مرلے کے اس مکان کا نیم پختہ صحن پار کر کے ہم برآمدے میں پہنچے۔ یہاں ایک کتا بندھا ہوا تھا۔ وہ شکل وصورت سے خاصا بیمار نظر آتا تھا۔ اس کے راتب پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ قریب ہی اقبال کی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ ایک کونے میں شراب کی دو خالی بوتلیں اور مرغی کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مٹھو یا پھر جو کوئی بھی اس گھر

میں رہتا ہے، عورت کے بغیر رہتا ہے۔ یعنی یہاں کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو مستقل طور پر اس گھر میں رہتی اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی ہو۔ عمران نے موٹر سائیکل کی ڈکی میں سے ایک مفلر نما کپڑا نکالا۔ یہ وہی مفلر نما شے تھی جو ہڑپہ میں اور پھر لال کوٹھی میں اپنے چہرے چھپانے کے لیے عمران اور اقبال نے استعمال کی تھی۔

''اس کا کیا کرنا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے عمران نے اس مفلر نما کپڑے کا ڈھاٹا میرے چہرے پر باندھنا شروع کر دیا۔

ایک منٹ کے اندر اس نے میرا سر اور چہرہ اس طرح چھپا دیا کہ آنکھوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ بولا۔ ''فی الحال تمہیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ اگر کوئی بات کرنا ہوئی تو مجھ سے مشورے کے بعد کرنا۔''

''لیکن یار! یہ کر کیا رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں رہا۔''

''یہاں ایک لڑکا ہے۔ وہ اپنا نام رفیق بتا رہا ہے لیکن اس کے پاس سے جو شناختی کارڈ نکلا ہے، اس پر قادر نام لکھا ہوا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ لڑکا ان لڑکوں میں سے ہے جنہوں نے ثروت کو بس اسٹاپ سے اُٹھوایا اور بسوں کی فیکٹری میں لے کر گئے۔''

میری دھڑکن میں شدت آ گئی۔ منہ خشک ہوتا محسوس ہوا۔ میں عمران کے ساتھ گھر کے درمیانی کمرے میں پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹے دروازے سے دو ڈھائی فٹ چوڑی سیڑھیاں اُتر کر نیچے جاتی تھیں۔ یہ ایک تہ خانہ تھا۔ وہاں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے عین سامنے اقبال نظر آیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور اپنا سیاہ پسٹل اس نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے عین سامنے سنگل صوفے پر ایک دوسرا بندہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اپنا سارا خون سر میں چڑھتا محسوس ہوا۔ ایک دم ہی یوں لگا کہ پورے جسم میں انگارے دہک اُٹھے ہیں۔ میں اس لڑکے کو کیوں نہ پہچانتا؟ یہ واجی کا ساتھی قادر لمبا تھا۔ یہ اس چنڈال چوکڑی کا رکن تھا جس نے چند ماہ پہلے ثروت کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی۔ پھر یہ لوگ اس معاملے کو اس حد تک لے گئے تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ان کی بدمعاشی نے نہ صرف ثروت کے والدین کی جان لی تھی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر اچھے امکان کو خاکستر کر دیا تھا۔ قادر لمبے کے چہرے پر ایک نیل نظر آ رہا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے عمران اور اقبال کے ساتھ اس کی ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ قادر لمبے کو دیکھتے ہی میں طیش اور نفرت کے ایک تند و تیز ریلے میں بہہ گیا۔ عمران نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی شناخت چھپائے رکھوں اور بولنے کی کوشش

بھی نہ کروں لیکن قادر لمبے کو دیکھ کر میں یہ باتیں بھول گیا۔ میں چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ ''حرام زادے...... کتے......خنزیر کی اولاد......'' میرے منہ میں جو آیا میں بولتا چلا گیا۔ میرے گھونسوں اور ٹھوکروں نے قادر لمبے کو صوفے سے اُچھال کر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔ میں اسے مار رہا تھا اور پھنکار رہا تھا۔

''تم نے مجھے برباد کر دیا۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ ثروت کی زندگی تباہ کر دی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے! اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گا۔'' میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی تھی۔

اقبال آگے بڑھا تا کہ قادر لمبے کو مجھ سے چھڑا سکے مگر عمران نے اسے راستے ہی میں روک لیا۔ شاید وہ چاہ رہا تھا کہ اگر میرے ''ہاتھ پاؤں کھل رہے ہیں تو انہیں کھلنے دینا چاہیے۔'' چند سیکنڈ میں صورتِ حال یہ تھی کہ قادر لمبا دہشت کے عالم میں فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی تھا۔ میری ٹھوکریں تواتر سے اس کے جسم پر برس رہی تھیں۔

آخر میں ہانپ کر ذرا رُکا تو اقبال مجھے اپنی بانہوں میں لے کر کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ میرے چہرے کو ڈھانپنے والا مفلر نما کپڑا بھی جزوی طور پر کھل گیا تھا۔ اگر اب وہ مکمل طور پر کھل جاتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اب قادر لمبا مجھے پہچان چکا ہے۔ میں نے وہ کپڑا اُتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

عمران نے بالوں سے پکڑ کر قادر لمبے کو اُٹھایا اور دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔ قادرے کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی جرسی پھٹ گئی تھی اور قمیص کی بھی بُری حالت تھی۔ اپنے خونچکاں چہرے کے ساتھ وہ ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''تو میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ یہ حرامزادہ ان غنڈوں میں شامل تھا۔'' عمران نے اطمینان سے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ بدذات، ان سب سے زیادہ کمینہ تھا۔ اس کی ہلاشیری نے ہی اس کتے واجی کے حوصلے بڑھائے تھے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مار ڈالوں گا۔'' میں ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

اس مرتبہ عمران نے میرا راستہ روکا اور بولا۔ ''یار! اس گدھ کا گلا مروڑنے سے تمہیں کون روکتا ہے۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ پہلے اس مکروہ کے سارے پر نوچیں، اس کے بعد اس کی گردن مروڑیں لیکن اس کارروائی سے پہلے اس کے منحوس منہ سے کچھ اُگلوا تو لیں۔ اگر

ہمیں واجی وغیرہ کے بارے میں یہ نہیں بتائے گا تو اور کون بتائے گا؟''

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ثروت اور اس کے گھر والوں پر قیامت توڑنے کے بعد جب بات تھانے کچہری تک پہنچی تھی تو واجی اور اس کے تینوں دوست اچانک نظر سے اوجھل ہو گئے تھے۔ بعد ازاں ان میں سے صرف ایک سامنے آیا تھا مگر وہ لڑکا تھا جو ثروت کے اغوا میں براہِ راست شریک نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور ناصر بھائی وغیرہ کو پورا یقین تھا کہ باقی لڑکوں کو سیٹھ سراج نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید سیٹھ سراج کے سرپرست ایم این اے مشتاق گورایا نے انہیں کہیں اپنی زمینوں پر بھجوا دیا ہے لیکن اب یہ قادر لمبا یہاں سمن آباد کے اس تنہا مکان میں میرے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا اور بار بار فرش پر خون تھوک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ اقبال تو قادر کے سرہانے کھڑا رہا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک میز پر تاش کے پتے بکھرے تھے۔ سامنے والی دیوار پر پستول کا خالی ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ یہ جگہ واضح طور پر ایک بدمعاش کا ٹھکانا دکھائی دیتی تھی لیکن بدمعاش کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

قادر لمبے پر جھپٹنے اور اسے مارنے کے بعد میرا جسم اب ہولے ہولے لرزنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں قادر پر پل پڑا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے اندر بتدریج چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ شاید اس کی وجہ میرے سخت ترین حالات تھے اور شاید اس کی وجہ عمران بھی تھا۔ عمران کی موجودگی میں ایک دم اپنی اندرونی کمزوریوں پر غلبہ پالیتا تھا۔

عمران نے مدھم آواز میں کہا۔ ''میں نے تم سے گزارش بھی کی تھی کہ یہاں اپنی شناخت چھپانی ہے۔ اس لیے خاموش رہنا۔ تم نے سب کچھ اُلٹ کر دیا۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خبیث کیسے ملا ہے تمہیں؟ اس کے ساتھی کہاں ہیں؟''

''تمہارا دوسرا سوال وائیڈ بال کی طرح ہے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ تمہارے پہلے سوال کا جواب میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ میں اور اقبال کل سے اس چکر میں تھے کہ سلیم یہاں مجید مٹھو کے مکان میں کیا کرنے آیا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اقبال نے کافی پرچول کی ہے۔ اقبال کا ایک ساتھی کل سے اس مکان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج سویرے ہمیں پتا چلا کہ مجید مٹھو گھر کو تالا لگا کر اپنے ایک دوست کے ساتھ رکشے میں بیٹھا ہے اور بادامی باغ کے بس اڈے پہنچا ہے۔ وہاں سے وہ جہلم جانے والی بس پر سوار ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا

کہ مٹھو کا گھر اب خالی ہے اور جلد ہی مٹھو کے آنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ دیر پہلے ہم یہاں آن پہنچے۔ پہلے ہم نے ایک ''ماسٹر کی'' سے بیرونی دروازے کا ہضمی تالا کھولنے کی کوشش کی لیکن گلی میں اِکا دُکا راہگیروں کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہم مکان کے پچھواڑے گئے اور قبرستان کی طرف سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، پچھلی دیوار درختوں سے گھری ہوئی ہے اس لیے ہمیں مشکل پیش نہیں آئی۔ پہلے تو ہمیں یہ گھر بالکل خالی لگا مگر پھر تہ خانے کا دروازہ نظر آ گیا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ اندر کوئی ہے۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم تمہارے اس بدبخت محلے دار قادرے تک پہنچ گئے۔ یہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔ پہلے اس نے بتایا کہ وہ مٹھو کا ملازم ہے پھر کہا کہ دوست ہے۔ اس نے اپنا نام رفیق بتایا لیکن کچھ دیر بعد اس کا شناختی کارڈ مل گیا۔ اس پر قادر ولد امانت علی لکھا ہوا ہے۔ تم نے ثروت کو اغوا کرنے والے جن لڑکوں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے ایک نام قادر بھی تھا۔ مجھے شک ہو گیا۔ میں نے پوچھ تاچھ کی لیکن اس خبیث نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ پھر میں نے فون کر کے تمہیں بلا لیا۔''

میں نے کہا۔ ''تم بتا رہے ہو کہ گھر کی دیوار پھاند کر یہاں آئے ہو لیکن اب تو دروازہ کھلا ہوا ہے؟''

''وہ ہم نے بعد میں کھولا ہے یار! اس قادر کے پاس گیٹ کی دوسری چابی ہے۔'' عمران نے وضاحت کی۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ قادرے کے سامنے آ کر میں کتنی بڑی غلطی کر چکا ہوں۔ میرے جسم کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں قادر لمبے کے سامنے ہی نہیں آیا، سیٹھ سراج، انسپکٹر اشرف اور ایم این اے مشتاق وغیرہ کے سامنے بھی آ چکا ہوں۔ اب وہ سارے خطرات ایک دم زندہ ہو گئے تھے جن سے مجھے یا میرے گھر والوں کو واسطہ پڑ سکتا تھا۔

عمران نے میرا تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے حوصلہ دیا اور میرا شانہ تھپک کر بولا۔ ''چلو جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم اس معاملے کو دیکھ لیں گے لیکن پہلے ہمیں اس قادرے کو نچوڑنا پڑے گا۔''

''نچوڑنا پڑے گا۔'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ مسکرایا۔ ''یار! یہ اپنی خاص لینگویج ہے۔ نچوڑنے کا مطلب ہے کہ اس کے اندر سے باتیں اُگلوانی پڑیں گی۔''

''تو تم اس سے مار پیٹ کرو گے؟''

''مار پیٹ تو نہیں......بس تھوڑا سا ڈرائیں دھمکائیں گے۔ وہ جیسے کرکٹ میں بلے باز کو بیک فٹ پر کرنے کے لیے باؤنسر وغیرہ مارے جاتے ہیں۔''

عمران اور اقبال اب بھی بالکل ایزی موڈ میں تھے جبکہ میں خاصا تناؤ محسوس کر رہا تھا۔ جب ہم کمرے میں واپس پہنچے تو اقبال ایک جگ میں سے پانی گرا کر قادر کا منہ دھلوا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ناک سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

عمران نے قادر کے عین سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر کرسی سنبھال لی۔ اس کا چہرہ بدستور مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں میں عجیب سی سختی عود کر آئی تھی۔ وہ قادرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو قادر لمبا صاحب! بات یہ ہے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے۔ تم واجی کے لنگوٹیے یار قادر ہو اور تم تین چار دوستوں نے مل کر تابش کی منگیتر کو اغوا کیا تھا۔ تمہاری اس بدمعاشی کے جو نتیجے نکلے، وہ سب کے سامنے ہیں۔ اب تم قانون سے بھاگے پھر رہے ہو اور اپنے خلاف کیس کو سخت سے سخت بنا رہے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بہت زیادہ خراب نہ ہو تو پھر تمہیں اپنے باقی دونوں یاروں کے بارے میں بتانا پڑے گا اور اگر......''

''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔'' وہ لرزتی آواز میں عمران کی بات کاٹ کر بولا۔

''یہ تم نے کوئی انوکھی بات نہیں کی۔ ہر چور، ڈاکو، ذلیل و خوار ہونے سے پہلے ایسے ہی اقوالِ زریں دہراتا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا، مجھے بے گناہ پھنسایا گیا ہے، میں بے قصور ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر ان سنہری مقولوں پر اعتبار کر لیا جائے تو دنیا میں کوئی بھوتنی کا چور ڈکیت پکڑا نہ جا سکے۔''

''یہ ایسے نہیں مانے گا یار جی! اس کو سیب کھلاؤ۔'' اقبال نے کہا۔

''ہاں......لگتا ہے کہ سیب ہی کھلانا پڑے گا۔'' عمران نے تائید میں سر ہلایا۔

''سیب......کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی ہماری خاص لینگویج ہے ڈیئر۔'' عمران نے کہا اور پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے ایک سیب نکال لیا۔

گول مٹول سیب کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے اس نے دوسری جیب میں سے چمکدار چاقو نکال کر کھولا اور بولا۔ ''یہ سیب میں تمہیں خود کاٹ کر کھلاؤں گا لیکن میرے کاٹنے کا انداز ذرا

دوسرا ہے۔''

قادر ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔

عمران نے سیب اقبال کی طرف اُچھال دیا۔ اقبال، قادر کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے اچانک سیب قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے تیزی سے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ میری نگاہوں میں جیسے برق سی کوند گئی۔ عمران کے دائیں ہاتھ سے جدا ہونے والا لمبے پھل کا چاقو گولی کی رفتار سے قادر کے سر کی طرف گیا۔ چاقو سیب میں گھسا۔ پھر چاقو اور سیب دونوں عقبی دیوار سے ٹکرانے کے بعد اقبال کے قدموں میں لڑھک گئے۔

یہ سارا عمل بس سیکنڈ کے نصف حصے میں مکمل ہو گیا تھا۔ ایسی رفتار تھی کہ قادر اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کر سکا تھا۔ چاقو سمیت سیب کو زمین پر لڑھکتے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ میں بھی ششدر کھڑا تھا۔ یہ عمل ناقابلِ یقین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سفاک بھی۔ نشانے کی ذرا سی غلطی قادر کو جان لیوا طور پر زخمی کر سکتی تھی۔

میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ بے رحمی سے مسکرا رہا تھا۔

اقبال نے جزوی طور پر کٹا ہوا سیب عمران کو تھما دیا۔ سیب کا جائزہ لینے کے بعد اس نے چاقو سیب میں سے کھینچا اور بولا۔ ''اس پر ایک بار اور چاقو چلانا پڑے گا۔ چلو رکھواسے دوبارہ قادر بیٹے کے سر پر۔''

قادر ''بیٹے'' کا بُرا حال تھا۔ جب اس نے دوبارہ اپنے سر پر سیب رکھے جانے کی خوشخبری سنی تو ایک دم اُچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''خبردار'' اقبال اس پر پستول تان کر گرجا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ نیچے بیٹھ جاؤ۔'' اقبال کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ قادر لرز کر بیٹھ گیا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اقبال نے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگائی اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کو خالی خولی دھمکی مت سمجھنا شہزادے! ہم گولی چلانا بھی جانتے ہیں۔ اُٹھک بیٹھک کرو گے تو کنپٹی میں تین، آٹھ کا سوراخ ہو جائے گا اور اس سوراخ میں سے لال لال چیز بہنے لگے گی۔''

''خدا کے لیے...... ایسا مت کرو...... میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جو جانتا تھا تمہیں بتا دیا ہے۔''

''ہم بھی جو جانتے ہیں تمہیں بتا دیا ہے۔ جب اس پستول کا ٹریگر دبایا جائے گا تو تمہاری کھوپڑی شریف میں سوراخ ضرور ہو گا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔'' اقبال نے کہا۔

عمران نے پھر چاقو اپنے ہاتھ میں تولا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ مجھ پر اس شخص

کے نئے نئے گن کھل رہے تھے۔ دو منٹ پہلے اس نے جس طرح قادر پر چاقو پھینکا تھا، وہ کوئی ماہر ترین چاقو باز ہی پھینک سکتا تھا۔ سرکس کے کھیل تماشوں میں خنجر زنی کے ایسے کرتب دکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کوئی تماشہ نہیں تھا۔ یہ ایک جیتا جاگتا واقعہ تھا اور جس پر یہ واقعہ بیتا تھا، وہ ابھی تک عالمِ دہشت میں لرزاں تھا۔

اقبال نے بڑے اطمینان سے ادھ کٹا سیب دوبارہ قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے چاقو کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہاتھ میں جھلایا مگر اس مرتبہ قادر بیٹھے رہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ کنپٹی پر پستول ہونے کے باوجود وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''نہیں......نہیں......ایسا مت کرو۔'' وہ گھگیایا۔

اقبال نے کھٹاک سے اس کے سر پر پستول کا آہنی دستہ رسید کیا۔ ضرب زوردار تھی، وہ کراہتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اقبال نے اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑی اور وحشیانہ جھٹکا دے کر بولا۔ ''زیادہ پھڑکو گے تو پھر سیب کے بجائے تمہارے سر پر خوبانی یا آلو بخارا رکھیں گے۔ بالکل چپکے بیٹھے رہو۔''

''مم...... میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پچھلے ایک مہینے سے واجی اور اختر کو دیکھا تک نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ امیر باپوں کے بیٹے ہیں۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ میں پھنس گیا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے اس لڑکی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔ میں تو...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب اس طرح ہو گا۔ میں تو بس واجی کی باتوں میں آ گیا تھا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میرا قصور بس یہ ہے کہ میں واجی کا یار تھا۔'' ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو جھڑے اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ''وہ حرامزادہ واجی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے لیے بچاؤ کا راستہ نکل آیا ہے۔ جس کا کوئی قصور نہیں، اس کے گلے میں رسہ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ کہاں کا قانون ہے؟''

میرا دماغ گھومنے لگا۔ قادر لمبے کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کا یہ فقرہ تو بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا کہ میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔

وہ ثروت کی بات کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ کیا ثروت کسی وجہ سے زخمی ہو چکی تھی؟ یہ خیال ہی مجھے دہلانے کے لیے کافی تھا۔ میں گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟'' میں نے کراہتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

عمران نے انگلی سے نفی کا اشارہ کیا اور آنکھوں آنکھوں میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ شاید مجھے یہ بتا رہا تھا کہ قادر لمبا اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر ہے۔

اگلے دو چار منٹ میں عمران کا یہ اندازہ درست محسوس ہونے لگا۔ قادر لمبا گڑگڑا رہا تھا اور بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ پولیس نے واجی کے وارثوں سے پیسے کھا لیے ہیں اور اسے بے وجہ پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرا ہوا بھی تھا۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ ثروت کے حوالے سے بدترین اندیشے رکھتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ثروت نے خود کو آگ لگا کر اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوئی ہے۔

میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ قادر کی معلومات ناقص ہیں۔ اس کے باوجود یہ صورتِ حال اتنی گمبھیر تھی کہ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس گورکھ دھندے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی خاص مقصد کے تحت کسی نے جان بوجھ کر قادرے کو غلط اطلاعات دے رکھی ہیں اور اسے دہشت زدہ کر رکھا ہے۔

عمران نے اس سے مزید سوال جواب کیے۔ وہ بہت ڈر چکا تھا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ اُگلنے لگا۔ عمران کا اہم سوال یہ تھا کہ وہ یہاں مجید مٹھو کے گھر میں کیسے پہنچا اور اس کے دیگر دونوں ساتھی کہاں ہیں؟

قادر نے بتایا۔ ''میں پھر کہتا ہوں کہ واجی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ میرے ساتھ صرف شکیل تھا۔ ہمیں پولیس سے بچانے کے لیے انکل سراج نے لال کوٹھی بھجوا دیا تھا۔ لال کوٹھی میں ہم دونوں بڑی میڈم صفورا کے پاس تھے۔ انکل سراج کا خیال تھا کہ ہم پانچ چھ ہفتے یہاں رہیں۔ اس دوران میں مخالف پارٹی سے صلح صفائی کی بات ہو جائے گی۔ مگر پھر ایک دن پتا چلا کہ معاملہ زیادہ بگڑ گیا ہے۔ انکل سراج نے مجھے بتایا کہ تابش کی منگیتر نے اپنے گھر میں خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اس نے خود کو آگ لگائی ہے۔ میوہسپتال میں اپنے بیان میں اس نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے اور اسے بس اسٹاپ سے اُٹھا کر ویگن میں ڈالنے والوں میں سب سے آگے میں تھا۔ انکل گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔ انکل نے مجھے بتایا کہ اب ہمارا بچنا بہت مشکل ہے۔ ہم پکڑے گئے تو بہت لمبی سزا ہونی ہے اور......اور ہوسکتا ہے کہ......'' قادر کی آواز بھرا گئی۔ وہ فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

''اچھا......پھر کیا ہوا؟'' عمران نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

''انکل سراج نے کہا کہ اب ہمارا لال کوٹھی میں رہنا ٹھیک نہیں۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔''

''تو انکل سراج نے تجھے یہاں پارسل کر دیا۔ مجید مٹھو کے پاس؟''

''ہاں جی......اب میں پچھلے قریباً دو ہفتے سے یہاں ہوں۔ مجھے اب شکیل کا بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ واجی کی طرح اس کا باپ بھی کھاتا پیتا ہے۔ ہوسکتا ہے، اس کے گھر والوں نے اسے کہیں دبئی یا ابوظہبی کی طرف نکال دیا ہو۔''

قادرے کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے۔ انسان جب کسی مصیبت کے شکنجے میں پھنستا ہے تو کتنا مختلف نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی قادرا تھا جس نے واجی کے ساتھ مل کر مجھے اور ثروت کو اسنیک بار کی پارکنگ میں ذلیل کیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی بڑی بڑی موٹر سائیکلیں میری کار کے پیچھے پارک کر دی تھیں اور ہمیں دیر تک وہاں سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ تب کتنا پھنے خان نظر آتا تھا یہ قادر۔ اب بالکل ''عاجز بکری'' بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی زردی تھی اور رُخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔

اس سارے معاملے میں کوئی بعید نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی قادرے نے میوہسپتال کا ذکر کیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ثروت اور اس کے گھر والوں کو ابھی تک لاہور میں مقیم سمجھ رہا تھا جبکہ وہ ڈھائی تین ماہ پہلے جرمنی پہنچ چکے تھے۔

ابھی ہم قادر سے بات چیت کر ہی رہے تھے کہ میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ قادر چونک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے کہا۔ ''کال ریسیو کرو مگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا۔''

اقبال بولا۔ ''ورنہ ہم سیب کی جگہ خرمانی بلکہ بیر رکھیں گے تمہارے سر پر۔''

''اور اسپیکر آن کر دو تاکہ ہمیں تمہاری گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔'' عمران نے دوسرا حکم دیا۔

قادرے نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کال اٹینڈ کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے ایک نرم لیکن بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو قادر! کیسے ہو؟''

''بس ٹھیک ہوں صدیقی صاحب! آپ نے کہا تھا کہ میں چکر لگاؤں گا جمعرات کو لیکن آپ آئے ہی نہیں۔''

''بس یار! تمہارے ہی کام میں پھنسا ہوا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ لڑکی کی گواہی ہمارے خلاف آ گئی تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا اور ابھی تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ بچتی بھی ہے یا نہیں۔''

''آپ اپنے کسی ساتھی کا ذکر کر رہے تھے۔''

"ہاں...... بیرسٹر فیروز خاں! وہ مجھ سے سینئر ہے اور دوست بھی ہے۔ میں اس سے بھی مشورہ کر رہا ہوں۔ ہم کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اللہ رب العزت نے چاہا تو ہم تمہیں گرم ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مصیبت فوراً آ جاتی ہے لیکن جاتے ہوئے کچھ وقت تو لگتا ہے نا۔"

"بب...... بس...... اب آپ ہی کا آسرا ہے۔"

"نہیں...... نہیں...... آسرا بس اوپر والے کا ہوتا ہے۔ بندے کا کام تو کوشش کرنا ہے۔ کون سی کوشش کامیاب ہوگی اور کون سی نہیں، یہ بس اوپر والے کو پتا ہے۔ بہر حال تم فکر مند نہیں ہونا اور نہ والدہ اور کنول کو ہونے دینا ہے۔ فون پر بات ہو تو انہیں پوری تسلی دو اور ایک بار پھر کہوں گا۔ والدہ اور کنول کے سوا کسی سے بھول کر بھی رابطہ نہیں کرنا۔ پولیس ہر طرف تمہیں سونگھتی پھر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے جی! جیسے آپ کہتے ہیں۔"

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔ تمہارے ہی سلسلے میں جا رہا ہوں۔ ایک بڑے خاص بندے سے ملنا ہے۔ کل پھر رابطہ کروں گا۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ جی۔" قادر نے کہا اور بات ختم کر دی۔

"یہ ذات شریف کون ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ ابرار صدیقی صاحب بہت بڑے وکیل ہیں۔ بڑی میڈم صفورا کے جاننے والے ہیں۔ میڈم صفورا نے ان سے میری سفارش کر رکھی ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جس طرح بھی ہوا، وہ مجھے اس کیس میں سے نکال لیں گے۔ تسلی تشفی کے فون بھی کرتے رہتے ہیں۔"

"اور یہ کنول؟"

"یہ...... میری بہن ہے۔"

"یہ صدیقی صاحب اس کا ذکر کیوں فرما رہے تھے؟"

"دراصل والدہ اور کنول ایک دو بار میرے کیس کے لیے صدیقی صاحب سے ملی ہیں۔ وہ میری والدہ کی بڑی عزت کرنے لگے ہیں۔ ویسے وہ خود بھی نیک بندے ہیں وکالت کے علاوہ دینی کاموں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے کوئی فرم بنا رکھی ہے۔ جس میں بے سہارا لوگوں کو مفت قانونی مدد دی جاتی ہے۔"

"مفت قانونی مدد۔" اقبال نے سر ہلایا۔ "اس لفظ "مفت" میں بڑا جادو ہے بھئی۔

مفت زہر بھی ملے تو ہم لوگ فوراً پھانکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور جہاں تک صدیقی صاحب کے نیک ہونے کا سوال ہے، اس کے لیے یہ ثبوت ہی کافی ہے کہ وہ تیرے جیسے نیک بندے کا کیس فی سبیل اللہ لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

قادرے کے ساتھ عمران اور اقبال کی تفتیشی گفتگو جاری تھی اور میری پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جذبات کا شکار ہو کر قادرے کے سامنے آ گیا تھا اور اس کا صریح مطلب تھا کہ میں سیٹھ سراج اور دیگر لوگوں کے سامنے بھی آ گیا ہوں۔ اب میرے گھر والوں کے لیے کوئی بھی سنگین خطرہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

عمران میرے ساتھ پہلو کے کمرے میں آیا اور صورتِ حال کے بارے میں مشورہ کیا۔ عمران بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ قادرے کو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر انٹا غفیل کیا جائے اور پھر گاڑی میں ڈال کر یہاں سے نکال لیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ بے ہوشی کا انجکشن اور سرنج وغیرہ اس کی گاڑی میں موجود ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تمہیں پہلے سے پتا تھا کہ کسی کو بے ہوش کرنا پڑے گا؟"

"دیکھو جگر! ہمارا بازی گری کا سارا کام "جج منٹ" پر ہوتا ہے۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگاتے ہوئے، موٹر سائیکل پر کرتب دکھاتے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر خنجر چلاتے ہوئے۔ سب کچھ جج منٹ پر "ڈی پینڈ" کرتا ہے۔ یہاں بھی بس ایک جج منٹ ہی تھی کہ شاید ایسا کچھ کرنا پڑے۔"

"لیکن یہ تو بہت خطرناک کام ہوگا۔ سیدھا سادا اغوا کا معاملہ بن جائے گا۔"

"میرے خیال میں تو یہ اغوا کا معاملہ نہیں ہوگا۔ بلکہ ہم ایک اغوا شدہ شخص کو بازیاب کرائیں گے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہمارے ساتھ رہو گے جگر تو سمجھنا بھی سیکھ جاؤ گے۔ مجھے شک پڑ رہا ہے کہ سیٹھ سراج وغیرہ اس بدبخت قادرے کے خلاف ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ کسی خاص مطلب کے لیے اس کو ثروت کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ ڈرایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صدیقی نام کا بندہ بھی سیٹھ سراج کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو۔ وہ قادرے کو اس کیس سے بچانے کا لالچ دے کر اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔"

"کہیں...... قادرے کی بہن ہی کا کوئی چکر نہ ہو۔ میرا مطلب ہے صدیقی نے دو تین بار قادرے کی بہن کی بات بھی کی ہے۔"

"ان باتوں کا پتا تو وقت کے ساتھ ہی چل سکتا ہے۔ فی الحال تو فوری طور پر ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم قادرے کو یہاں چھوڑ جائیں یا پھر مہمان بنا لیں، اپنے فائیو اسٹار گھر میں۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور...... مجھے پتا ہے کہ تم میری بات مانو گے بھی نہیں۔"

"دیکھا نا اب باتیں آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہیں۔" وہ بڑی ادا سے مسکرایا۔ پھر انگلی سے اپنی کنپٹی کھجا کر بولا۔ "اچھا ایک کام کرو۔ دو منٹ کے لیے مجھے اور اقبال کو اکیلے میں مشورہ کرنے دو۔ اس دوران میں تم ذرا اس مصیبت کے پاس رُکو۔" اس نے مجھے پستول دے دیا۔ میں نے روانی میں پستول تھام تو لیا لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بڑی ہوشیاری سے مجھے اپنے نیک کاموں میں شریک کرتا چلا جا رہا ہے۔ آج سے چند روز پہلے میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس طرح ایک بھرا ہوا پستول تھام کر واجی کے ایک بدمعاش دوست کو گن پوائنٹ پر رکھوں گا اور وہ نظریں جھکائے میرے سامنے بیٹھا رہے گا۔

میں عمران کی ہدایت کے مطابق پستول بدست قادرے کے پاس رہا اور دوسرے کمرے میں عمران اور اقبال آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اپنے ہاتھ میں ایک سرنج لیے نمودار ہوا۔ اس کے عقب میں اقبال تھا۔ سرنج دیکھ کر قادرے کے زخمی چہرے پر بہت سے سوالیہ نشان اُبھر آئے۔

"یہ ٹیکا لگوا لو۔ تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ درد ٹھیک ہو جائے گا اور انفیکشن بھی نہیں ہوگا۔" عمران نے قادرے سے کہا۔

"نن...... نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔"

"ٹھیک نہیں ہو بیٹا جی! دیکھو تمہارا رنگ بالکل پیلا ہو رہا ہے۔ اس سے تھوڑی سی طاقت بھی آئے گی اور تمہارا دماغ بھی اچھے طریقے سے کام کرنے لگے گا۔ اس ایک ٹیکے میں بہت کچھ ہے۔ تمہارے بہت سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ سمجھو ٹیکا نہیں جادو کی چھڑی ہے۔ چلو شاباش۔"

پستول بدستور اقبال کے ہاتھ میں تھا۔ قادر لمبا جانتا تھا کہ مزاحمت کرے گا تو سر پر پھر پستول کی تکلیف دہ ضرب سہنی پڑے گی۔ اقبال نے اس کی آستین چڑھائی اور عمران نے انجکشن دے دیا۔ دو چار منٹ میں ہی قادرے کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ کچھ دیر بڑبڑاتا رہا۔ پھر صوفے پر ایک طرف کو جھکتا جھکتا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

سارا پروگرام جیسے عمران اور اقبال نے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ عمران نے مجھ سے گاڑی کی چابی لی اور گھر کا گیٹ کھول کر اسے اندر لے آیا۔ بے ہوش قادرے کو اُٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر اس طرح لٹایا گیا کہ اس کا سر میری گود میں آ گیا۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا کمبل ڈال دیا گیا۔ اب دیکھنے میں بعینہ یہی لگ رہا تھا کہ ہم کسی بیمار کو ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ مجید مٹھو کا گھر چھوڑنے سے پہلے عمران اور اقبال نے وہاں اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا دیئے۔ جن جگہوں پر فنگر پرنٹس کا اندیشہ تھا، وہاں کی صفائی کر دی۔ گھر کی ہلکی پھلکی تلاشی میں انڈین شراب کی چند بوتلیں، ہیروئن کی پڑیاں اور دو رنائفلیں بھی نظر آئیں۔ بہر حال ان اشیاء کو جہاں کا تہاں رہنے دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مجید مٹھو کے گھر سے نکل رہے تھے۔ گلی میں اِکا دُکا افراد نے ہمیں دیکھا لیکن کسی نے بھی خصوصی توجہ نہیں دی۔ قریباً پینتالیس منٹ بعد ہم راوی روڈ میں عمران کے گھر داخل ہو چکے تھے۔

شام کے بعد ہی قادرا مکمل طور پر ہوش میں آ سکا تھا۔ اس نے خود کو ایک اجنبی جگہ دیکھ کر واویلا کیا۔ وہ یہ بات جان گیا تھا کہ اسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر کے سمن آباد والے مکان سے نکال لیا گیا ہے۔

جب اس کے ہوش کچھ ٹھکانے پر آئے تو عمران نے اسے چائے پلوائی اور اس سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ عمران اس سے ابرار صدیقی نامی شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہا تھا۔ قادر نے بھرائی ہوئی مسکین آواز میں کہا۔ "میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ صدیقی صاحب وکیل ہیں۔ ان کا کافی نام ہے۔ جب میں اور شکیل لال کوٹھی میں میڈم صفورا کے پاس تھے، یہ وہاں دو تین بار آئے تھے۔ انکل سراج سے بھی ان کی جان پہچان لی ہے۔ انہوں نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔"

"میڈم صفورا اور سیٹھ سراج سے اس بندے کا کیا تعلق ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں مگر لگتا ہے کہ میڈم صفورا کی طرح صدیقی صاحب کو بھی پرانی چیزوں کا تھوڑا بہت شوق ہے۔ یہی مورتیاں، پرانے برتن اور زیور وغیرہ۔"

"تمہاری والدہ سے صدیقی کی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟" اقبال نے دریافت کیا۔

"میری والدہ اور بہن ایک دو بار لال کوٹھی آئی تھیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے شاید وہیں پر صدیقی صاحب نے انہیں دیکھا تھا۔"

"اب تم کہتے ہو کہ تمہاری والدہ سے صدیقی کی اچھی جان پہچان ہو چکی ہے۔"

’’جی ہاں...... میرے خیال میں انکل سراج نے ہی والدہ کو بتایا تھا کہ صدیقی صاحب مجھے اس کیس سے نکالنے میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد والدہ اور کنول، صدیقی صاحب سے ملنے ان کے دفتر بھی گئی تھیں؟‘‘

’’وہ خود کیوں گئی تھیں؟ کیا اس کام کے لیے کوئی مرد نہیں تھا؟‘‘ اقبال نے پوچھا۔

قادرے نے چونک کر اقبال کو دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ’’اور کون جاتا؟ ایک بھائی کے سوا میرا کوئی اور ایسا نہیں ہے جو یہ بھاگ دوڑ کر سکے۔ وہ بھائی بھی مسقط میں بیٹھا ہوا ہے۔‘‘

عمران نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ’’اس وقت تو یہی لگ رہا ہے کہ تم دنیا کے مظلوم ترین بندوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری آمدن اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تھانے کچہریوں کے خرچے برداشت کر سکو۔ تمہیں ناکردہ گناہ کی سزا سے بچانے کے لیے تمہاری بوڑھی والدہ اور جوان بہن کو خود ہی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ تم بھی شکیل کی طرح جان بچانے کے لیے پاکستان سے باہر جا سکو، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ ساری باتیں تب تمہارے دماغ میں نہیں آئیں جب تم نے ایک غنڈے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ ایک شریف لڑکی کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور وا جی کے ساتھ مل کر اسے اُٹھانے اور بے آبرو کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر اس وقت تم اپنی والدہ اور جوان بہن کا خیال کرتے جو اب تمہیں بچانے کے لیے جگہ جگہ دھکے کھا رہی ہیں۔‘‘

قادرے کی جھکی ہوئی گردن بدستور جھکی رہی۔ آج دوپہر والی چوٹوں کی وجہ سے اس کا چہرہ جگہ جگہ سے سوج گیا تھا اور سوزش کے سبب ایک آنکھ تقریباً بند تھی۔ اپنے حلیے کے سبب وہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

اقبال نے پوچھا۔ ’’تمہیں پتا ہے کہ یہ صدیقی کہاں رہتا ہے؟‘‘

’’نہیں...... گھر کا پتا نہیں۔ پر ان کا دفتر پرانی انارکلی کی طرف ہے۔ صدیقی لاء ایسوسی ایٹس کے نام سے۔‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت وہ اپنے دفتر میں ہوگا؟‘‘

قادرے نے وال کلاک پر نظر ڈالی، ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ وہ بولا۔ ’’ہاں...... اگر وہ لاہور سے باہر نہیں گئے تو دفتر میں ہی ہوں گے۔‘‘

یہی وقت تھا جب قادرے کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ موبائل فون اب عمران کی جیب میں تھا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین کا جائزہ لیا۔ اس پر ’’کنول‘‘ کا نام چمک رہا

تھا۔ یہ قادرے کی بہن کی کال تھی۔

عمران نے سرسراتے لہجے میں قادرے کو حکم دیا۔ ’’چل، کال ریسیو کر...... اور خبردار کوئی ہوشیاری نہیں دکھانی۔ اسی طرح بات کر جس طرح مجید مٹھو کے گھر میں کرتا تھا اور اسپیکر آن کر لے۔‘‘

قادرے کے چہرے پر پریشانی بڑھ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ ایک جوان نسوانی آواز کمرے میں گونجی۔ ’’ہیلو......‘‘

’’ہیلو......‘‘ قادرے نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

’’السلام علیکم قادر بھائی۔‘‘ کنول نے کہا۔

’’وعلیکم السلام...... کیسی ہو۔‘‘

’’بس ٹھیک ہوں۔‘‘

’’کیا بات ہے، آج آپ کچھ سُست لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟‘‘

’’ہاں...... ہاں خیریت ہے بس سر میں ہلکا سا درد تھا۔‘‘

’’سر درد پریشانی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے بھائی! لیکن اب اللہ نے چاہا تو ہماری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اوپر والے نے صدیقی صاحب کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ وہ دوپہر کو پھر آئے ہوئے تھے۔ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا ہے۔ عصر کے بعد گئے ہیں۔ بڑی تسلی دے رہے تھے۔‘‘

قادر خاموش رہا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہماری وجہ سے کہہ نہیں پا رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد کنول کی آواز دوبارہ اُبھری۔ ’’بھائی! آپ میری طرف سے بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں...... میں...... صدیقی صاحب...... کے ساتھ...... میرا مطلب ہے...... میں ان کے ساتھ...... خوش رہوں گی۔ میں...... ان کو بڑی حد تک جان گئی ہوں۔ وہ دل کے بہت...... بہت اچھے ہیں۔ امی نے چاچا امین کے ذریعے پتا کروایا ہے۔ صدیقی صاحب نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ آٹھ دس سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ دو سال بعد ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اکیلے رہ رہے ہیں۔ بچہ بھی کوئی نہیں ہے۔ خدا ترس اور ہمدرد بندے ہیں۔ علاقے میں ان کی نیک نامی ہے۔‘‘

قادر اب بھی خاموش رہا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ غالباً اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فون بند کر دے مگر ہماری وجہ سے وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"ہیلو قادر بھائی! آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"نن......نہیں۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کنول نے کہا۔"بھائی! امی بتا رہی تھیں کہ آپ عمر کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ صدیقی صاحب کی عمر تھوڑی زیادہ ہے۔ بھائی! یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں ہے۔ میری اور ان کی عمر میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا۔ ہمارے ہی خاندان میں دو تین شادیاں ایسی ہو چکی ہیں جن میں میاں بیوی کی عمر میں آٹھ دس سال کا فرق ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے بھائی کہ صدیقی صاحب نیک اور ہمدرد ہیں۔ ان کی طبیعت میں جو ہمدردی ہے وہ امی کو اور...... مجھے بہت پسند آئی ہے۔"

"اچھا......اس بارے میں پھر بات کریں گے۔" قادر بولا۔

"کیا......آپ کے پاس کوئی اور بھی ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"نہیں تو......بس ذرا درد ہو رہا ہے سر میں۔"

"اگر زیادہ ہو رہا ہے تو پھر ڈاکٹر کو دکھائیں۔" کنول کے لہجے میں ایک بہن کی بیتاب محبت تھی۔ دونوں کے درمیان ایک دو جملوں کا مزید تبادلہ ہوا۔ اسی دوران میں قادرے کے فون کی بیٹری جواب دے گئی اور رابطہ ختم ہو گیا۔

صورتِ حال ایک دم ہی واضح تر ہو گئی تھی۔ ہمارا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ یہ صدیقی نام کا ایڈووکیٹ قادرے کی ماں بہن کے ساتھ جو والہانہ ہمدردی دکھا رہا تھا، اس کے پیچھے مقصد تھا اور یہ مقصد تھا قادرے کی بہن۔ قادرے کے نقوش بھی بُرے نہیں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بہن خوبصورت رہی ہوگی۔ اس کی یہی خوبصورتی اس صدیقی کو قادرے اور اس کے گھر والوں کے قریب لے آئی تھی۔ یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔

قادرا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ورم زدہ چہرے پر شرمندگی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ بہن جو کچھ بھی کہہ رہی تھی، وہ اپنی جگہ تھا مگر اندر کی حقیقت قادرا بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کی بہن وہی کچھ کر رہی تھی جو حوا کی بیٹی ہمیشہ سے کرتی رہی ہے۔ قربانی دیتی رہی ہے۔ کبھی اپنے باپ اور بھائی کی عزت بچانے کے لیے، کبھی شوہر کو آفات سے نکالنے کے لیے اور کبھی اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے۔ اس کے جسم اور اس کی روح کو ناکردہ گناہوں کے کفارے میں ہمیشہ چھیدا گیا ہے۔ اسے ایسی جنگوں کی سزا دی گئی ہے جو اس نے چھیڑی ہی نہیں تھیں۔ اسے ان بداعمالیوں کے عوض قربان گاہوں پر لٹایا گیا ہے جو اس نے کی ہی نہیں

تھیں۔ اسے ایسی رسموں کی خاطر آگ میں زندہ جلایا گیا ہے جن کا مقصد صرف مرد کی عظمت کو ثابت کرنا تھا اور ان سارے مظالم کے حوالے سے عورت کا قصور صرف اور صرف اتنا رہا ہے کہ وہ کمزور تھی اور عورت تھی۔

عمران نے قادرے کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھی اور اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اوپر اُٹھاتے ہوئے بولا۔"قادر بیٹا! شرمندہ ہونے کی کون سی بات ہے؟ زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں۔ تمہاری جان چھوٹ رہی ہے، اس کے بدلے تمہاری بہن کو ایک بڑی عمر کے عاشق سے شادی کرنی پڑ جائے گی۔ یہ نقصان کا سودا نہیں۔"

قادرے کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ بے عزتی کا احساس اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش کو اور بھی بگاڑنے لگا۔

"ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو دل سے نہیں لگایا کرتے قادرے صاحب۔" اقبال نے بھی طنز کا زہریلا تیر چھوڑا۔"یہ ابرار صدیقی تیز طرار بندہ لگتا ہے۔ لمبے چکروں میں نہیں پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار مہینے پاس رکھ کر چھوڑ دے تمہاری بہن کو......اور تم جیسوں کی مائیں بہنیں تو ہوتی ہی اس لیے ہیں۔ تمہارے کارناموں کے بدلے سب سے پہلے ان کو ہی گالی دی جاتی ہے اور کارنامہ جتنا بڑا ہوتا ہے، گالی بھی اتنی بڑی ہوتی ہے۔ تم نے ایک شریف لڑکی کو سڑک سے اُٹھایا تھا، اب تمہاری بہن کو بھی کوئی اُٹھا رہا ہے۔ بس طریقے کا فرق ہے۔"

قریباً ایک گھنٹے بعد قادرے کے موبائل کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ موبائل اس وقت چارجر پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ اس پر "انکل" کا نام آ رہا تھا۔ دھیان سیدھا سراج کی طرف گیا۔ عمران نے بھی اسکرین دیکھی اور پھر قادرے سے کہا کہ وہ پہلے کی طرح موبائل کا اسپیکر آن کر کے کال ریسیو کرے۔

قادرے نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے سیٹھ سراج کی منحوس آواز اُبھری۔"ہاں بھئی قادر! کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہوں جی۔"

"مٹھو کہاں ہے؟"

"وہ تو آج سویرے چلے گئے تھے۔ کہتے تھے ضروری کام ہے۔ کل شام تک آؤں گا؟"

"وہ اپنے صدیقی صاحب نے بھی چکر لگایا ہے یا نہیں ہے؟"

"نہیں......آئے تو نہیں۔"

"بس وہ تمہارے ہی کم میں پھنسیا ہویا ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ کل عدالت وچ بھی پیش ہویا تھا۔ نہ پیش ہوندا تو تم کو جج نے اشتہاری بنا دینا تھا۔ بہت چنگا اور بیبا بندہ ہے صدیقی۔ بغیر لالچ کے کم کرنے والے ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوندے ہیں۔"

سیٹھ سراج نے دو چار منٹ صدیقی کی تعریفیں کرنے میں صرف کیے۔ وہ قادرے کو باور کرا رہا تھا کہ فی الوقت اس کا اور اس کے گھر والوں کا نجات دہندہ یہ صدیقی ہی ہے۔ سیٹھ کی آواز اسپیکر سے نکل کر کمرے میں گونج رہی تھی۔ اقبال اپنے موبائل پر اس کی آڈیو ریکارڈنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ابرار صدیقی کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی اپنے موبائل میں محفوظ کی تھی۔

سیٹھ سراج کی باتوں سے عیاں تھا کہ ابھی تک کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں ہے کہ قادرے کو مجید مٹھو کے سمن آباد والے مکان سے اُٹھایا جا چکا ہے۔

سیٹھ سراج سے قادرے کی بات ختم ہوئی تو عمران گہری سوچ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے قادرے سے پوچھا۔ "وہاں مٹھو کے مکان میں تمہارے پاس کون کون آتا رہا ہے؟"

"دو تین بار صدیقی صاحب آئے ہیں۔ پھر چھوٹی میڈم کا ایک ملازم سلیم بھی آتا رہا ہے۔"

"اور یہ تمہارا انکل سراج؟"

"یہ بھی ایک بار آیا تھا، سلیم کے ساتھ ہی۔"

عمران کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اقبال کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابرار صدیقی سے بات کر لو گے؟"

"اگر تم چاہتے ہو تو ضرور کروں گا۔" اقبال بولا۔

عمران نے قادرے کے ہاتھ سے اس کا موبائل فون لیا۔ ہم تینوں قادرے کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی گئی۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اقبال نے اپنا موبائل میز پر رکھا اور اس میں ریکارڈ ہونے والی سیٹھ سراج کی آواز کو بغور سننے لگا۔ اس نے تین چار بار یہ ریکارڈنگ چلا کر سنی۔ اس کے بعد وہ سیٹھ کی آواز کی نقل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ صرف ایک دو بار کی کوشش سے وہ کافی حد تک سیٹھ سراج کی آواز سے ملتی جلتی آواز نکالنے لگا۔ وہ اپنے لب و لہجے کو بھی سیٹھ کے لب و لہجے سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کسی اداکار کی طرح سیٹھ سراج کے بولے ہوئے فقرے چند بار دہرائے اور مجھے ششدر کر دیا۔ اسے اس کام میں ساٹھ ستر فیصد

کامیابی ہوئی تھی۔ آڈیو ریکارڈنگ سے تو اس کو مدد مل ہی رہی تھی، وہ ایکسیڈنٹ والی لڑائی میں سیٹھ کی Live آواز بھی سن چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ عمران کی ہدایت کے مطابق ابرار صدیقی کو فون کر رہا تھا۔ اس کال کے لیے وہ قادرے والا فون ہی استعمال کر رہا تھا۔ اس نے ابرار صدیقی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ابرار کی آواز اُبھری۔ "ہیلو۔"

"ہیلو! صدیقی صیب! میں آپ کا خادم بول رہا ہوں جی، سراج احمد۔"

"اوہو...... سراج بھائی تم؟ یہ تو قادرے کا نمبر ہے۔"

"بس میں اِدھر آیا ہوا تھا قادرے کے پاس۔ میرے پاس بیلنس ختم ہے اس لیے قادرے کے فون سے کر رہا ہوں۔ ہور سناؤ جی! کیا حال چال ہے؟" اقبال نے کھانستے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے سراج بھائی! تمہاری آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ زکام لگ گیا ہے؟"

"زکام اور کھانسی دونوں ہی۔ کل رات بس اچار گوشت کھا لیا تھا۔"

"کل؟ کل تو تم رات کو بھٹی صاحب کے بیٹے کے ولیمے پر تھے۔ وہاں تو ون ڈش تھی۔"

اقبال ذرا گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ "نہیں...... بعد میں گھر جا کر تھوڑا سا چکھ لیا تھا اور سناؤ جناب! کب تک انتظار کرواؤ گے۔ کوئی خوشخبری وغیرہ سنا دو جی ہم کو بھی۔" اقبال نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔ غالباً اس نے کوشش کی تھی کہ ابرار صدیقی اپنی نجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائے۔

ابرار صدیقی نے کہا۔ "یار! کیا بتاؤں تمہیں؟ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں فون کروں۔ تمہاری اس خوشخبری کو تو لاہور سے باہر لے جانا پڑا ہے۔ جہلم میں۔"

"وہ کیوں؟" اقبال نے پھر اندھیرے کا تیر چلایا۔

"بس یہاں کچھ خطرہ لگ رہا تھا۔ رات کو کوٹھی کے آس پاس کچھ مشکوک بندے گھومتے دیکھے تھے۔ پھر اس کسٹم والے عابد شاہ کا فون آ گیا۔ اسے کسی نے مخبری کی تھی کہ میرے پاس ایک "پیس" آیا ہے۔ بڑی اسپیشل چیز ہے۔ میں نے سوچا کہ اب "مال" پر گندی نظریں پڑنا شروع ہو گئی ہیں۔ اس لیے اسے یہاں سے نکال لینا چاہیے۔"

"تو اب کہاں رکھا ہے؟" اقبال نے سیٹھ سراج کے لہجے میں ٹوہ لی۔

"وہیں جہلم میں۔" ابرار صدیقی نے گول مول جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بولا۔

''تمہاری آواز صاف نہیں آرہی۔ کچھ گونج رہی ہے۔''

اقبال نے ایک بار پھر کھانسنا شروع کیا۔ ''بس طبیعت ذرا خراب ہے۔ اچھا ٹھیک ہے، کل پھر بات کریں گے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔''

''رب راکھا......'' اقبال نے سراج کے انداز میں کہا اور فون بند کر کے گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

عمران نے اسے انگوٹھا دکھا کر اشارہ کیا کہ اس نے اچھی ایکٹنگ اور صدا کاری کی ہے۔

اقبال نے سراج کی آواز میں بات کرتے ہوئے خوشخبری کا ذکر کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس لفظ کو سن کر شاید صدیقی اپنی ''عاشقانہ مصروفیت'' کا کوئی ذکر کرے۔ یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی کہ وہ قادرے کی بہن کنول میں دلچسپی لے رہا ہے۔ بہر حال صدیقی نے ''خوشخبری'' کے لفظ سے کوئی اور مطلب لے لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ خوشخبری تو اس نے لاہور سے جہلم پہنچا دی ہے کیونکہ یہاں کچھ لوگ اس کے بارے میں باخبر ہو چکے تھے۔

عمران نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ ''ہاں جگر! کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟''

''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم دونوں خود کو خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنساتے چلے جا رہے ہو اور مجھے یہ کوئی چھوٹی مصیبت نہیں لگتی۔''

''مصیبت کوئی بھی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی یار! بندے کی سوچ اسے چھوٹا بڑا بناتی ہے۔ ذرا غور کرو، وہی بلے باز جو نوے تک آسانی سے اسکور بنا لیتا ہے۔ بعد کے دس اسکورز کو ایک بڑی مشکل سمجھنے لگتا ہے اور سنچری کا آخری اسکور تو اس کے لیے پہاڑ بن جاتا ہے۔ حالانکہ وہی پچ ہوتی ہے، وہی باؤلر اور وہی سب کچھ۔ ثابت یہ ہوا کہ ہماری سوچ ہی کسی کام کو مشکل یا آسان بناتی ہے۔''

میں منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں...... تم بتاؤ۔ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟''

اقبال نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ صدیقی نوادر کی بات کر رہا تھا۔ ''پیس'' کا لفظ یہ لوگ عام طور پر نادر چیزوں کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شاید صدیقی کے پاس کوئی بہت خاص الخاص شے ہے جسے وہ بہت سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس شے کو حفاظت کی خاطر اس نے لاہور سے جہلم منتقل کر دیا ہے۔''

''ہاں...... بات تو سمجھ میں آ رہی ہے۔ صدیقی، میڈم صفورا اور سراج سے ملتا ہے۔ یقیناً وہ بھی نوادرات میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تم نے خوشخبری کی بات کی تو اس کا دھیان فوراً اس نادر شے کی طرف کیوں چلا گیا؟''

''ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اس شے کو کسی بھاری قیمت پر فروخت کرنا چاہ رہے ہوں۔ صدیقی نے خوشخبری والی بات کو اسی بیک گراؤنڈ میں دیکھا ہو یا پھر اس سے ملتی جلتی کوئی اور بات ہو۔'' اقبال نے کہا۔

''یہاں مغز ماری کرنے کے بجائے کیوں نہ قادرے سے پوچھا جائے۔'' عمران نے خیال ظاہر کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ایک بار پھر قادرے کے پاس پہنچے اور ان نئی معلومات کے حوالے سے اس سے سوال جواب کیے۔ وہ اس بارے میں تو کچھ نہیں بتا سکا تاہم اس سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ جہلم میں فردوس پلازہ نامی بلڈنگ کے اندر صدیقی کا ایک شاندار فلیٹ ہے۔

صدیقی کے بارے میں عمران نے کرید کرید کر قادرے سے کچھ مزید معلومات بھی حاصل کیں۔ ان معلومات کا خلاصہ قادرے کے مطابق یہ تھا کہ ابرار صدیقی صاحب ایک نہایت دیندار، پرہیز گار اور ہمدرد انسان ہیں۔ لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام کرتے ہیں اور انہوں نے بے سہارا لوگوں کو فی سبیل اللہ قانونی امداد فراہم کرنے کے لیے ایک باقاعدہ فرم بنا رکھی ہے۔

اس ابرار صدیقی کے بارے میں اب تک ہم اتنا سن چکے تھے کہ اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ اپنی آواز اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ کافی دبنگ قسم کا شخص محسوس ہوتا تھا۔ ایسا شخص جو اپنی قوتِ گفتار سے کسی کو بھی قائل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے دیکھا کہ عمران اور اقبال کہیں جانے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ناشتہ کر چکے تھے اور میرا ناشتہ حسبِ معمول ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ تھرماس میں چائے موجود تھی۔

''کہاں کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جہلم......'' عمران نے ترت جواب دیا۔ ''آج اور کل کام سے (سرکس سے) چھٹی ہے۔ سوچا کہ ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔ تم ناشتہ کر لو۔''

''میں بعد میں کر لوں گا۔''

''بعد میں...... کیا مطلب؟ گاڑی میں کرو گے؟''

''میں کہیں نہیں جا رہا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تو پھر ہم بھی کہیں نہیں جا رہے۔" عمران نے دھوپ کا چشمہ اور پی کیپ اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔

"کیا کوئی زبردستی ہے؟"

"بس یہی زبردستی ہے کہ ہم بھی نہیں جائیں گے۔ ہمارے نہ جانے سے سیٹھ سراج کا جتنا فائدہ ہوگا، اس کے تم ہی ذمے دار ہو گے۔"

"مجھے سیٹھ کے فائدے نقصان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بھاڑ میں جائے وہ اور اس کے چیلے چانٹے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں صرف ثروت کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہاری بس اپنی دلچسپیاں ہیں۔ میں کسی ایسے کھیل کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔" میں نے کڑوے کسیلے لہجے میں کہا۔

"یار! ایک تو تم بدگمان بہت ہو۔ اگر تمہارے ساتھ میری تھوڑی سی بے تکلفی اور ہوتی نا تو میں نے تمہاری اس خوبصورت ناک پر گھونسہ مار دینا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بالکل بے خبر بیٹھا ہوا ہوں؟ مجھے تمہارے اندر کی حالت کا کچھ پتا نہیں؟"

"دیکھنے میں تو ایسے ہی لگتا ہے۔" میرا موڈ بدستور آف تھا۔

وہ فلم اسٹار محمد علی کے انداز میں بولا۔ "دیکھ لو دنیا والو۔ یہ ہے وفاؤں کا صلہ۔ یہ میرا دوست ہے۔ میری جان ہے۔ میرا جگر ہے اور آج...... آج اس بھری عدالت میں یہی مجھ پر بے وفائی کا الزام لگا رہا ہے۔ مجھے اپنے دُکھ درد سے ناآشنا سمجھ رہا ہے۔ اتنے بڑے الزام کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ میں خود اپنی جان لے لوں۔ اپنی زندگی دے کر اپنی سچائی ثابت کر دوں۔ لانا یار اقبال! کہاں ہے میرا پستول؟"

اقبال نے مسکراتے ہوئے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور عمران کی طرف اُچھال دیا۔ عمران نے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے کنپٹی سے لگایا۔ مگر پھر ٹریگر دبانے سے پہلے اس کا چیمبر کھول کر دیکھا اور غصے سے اقبال کی طرف دیکھ کر بولا۔ "یار! بڑے بیوقوف ہو تم...... اس میں تو پوری گولیاں ہیں۔ کم از کم دو تین گولیاں تو نکال لو۔ کچھ نہ کچھ چانس تو باقی رہے۔ وہ شاہین بیچاری تو بے موت ماری جائے گی۔ پرسوں اس غریبنی کی سالگرہ ہے۔ ایسی خوشی کے موقعے پر اسے میرے قل پڑھنے پڑ گئے تو پھر؟"

"سرکس میں تم سے کہیں اچھے مسخرے موجود ہیں۔ اس فیلڈ میں کوشش نہ ہی کیا کرو تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

"دیکھ لو دنیا والو۔ میری برباد زندگی کا تماشہ دیکھ لو۔ اب مجھے مسخرہ بھی کہا جا رہا ہے۔" عمران نے ادا سے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

اقبال مسکراتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ "تابش یار! عمران تمہارے والے کام سے غافل نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ تمہارا کام بھی ہو رہا ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے میرا کام؟"

"بتاؤ عمران! کیا ہو رہا ہے کام؟" اقبال نے کہا۔

"نہیں یار! تم ہی بتاؤ۔ میں بولوں گا تو کہے گا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔" عمران مصنوعی ناراضی کے ساتھ بولا۔

اقبال نے کہا۔ "حاجی صاحب سے بات چیت ہو رہی ہے۔ عمران تمہیں بتائے بغیر دو دفعہ ان سے مل چکا ہے۔"

"کون حاجی صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"اماں یار! وہی پراپرٹی ڈیلر...... جن کو تمہارے ناصر بھائی اپنا مکان بیچنے کی ذمے داری دے گئے ہیں۔ یہ حاجی صاحب بھی عمران کے جاننے والے ہی نکل آئے ہیں۔ وہ اپنے بازار کا چاچا نذیر ہے نا جو اونچا سنتا ہے۔ وہ حاجی صاحب کا چچیرا بھائی ہے۔ حاجی صاحب کبھی کبھی اس کے پاس آتے ہیں۔ وہیں عمران سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اب حاجی صاحب نے عمران سے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔"

"کیسا وعدہ؟"

"تمہارے ناصر بھائی کے مکان کا بیعانہ ہو گیا ہے۔ دو تین ہفتے میں مکان کی پے منٹ بھی ہو جانی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس رقم کا پے آرڈر بنوا کر حاجی صاحب نے جرمنی بھیجنا ہے۔ پے آرڈر کے لیے کوئی اکاؤنٹ نمبر، ایڈریس وغیرہ تمہارے ناصر بھائی مہیا کریں گے۔ بس یہی ناصر بھائی کا سراغ ہوگا۔"

میرے سینے میں لہر سی دوڑ گئی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اُمید کی کرن پیدا ہوئی تھی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "اگر تم حاجی صاحب سے ملے تھے تو پھر مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"یار! میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن تم ایک دم بے صبرے ہو۔" عمران کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

"چلو سمجھو کہ مجھے سرپرائز مل گیا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

عمران نے مجھے اس حوالے سے تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ یہ تفصیل حوصلہ افزا تھی۔ فون

کے سلسلے میں تو ناصر بھائی بے حد احتیاط کرتے تھے۔ اب تک حاجی صاحب کو ان کی جتنی بھی کالز آئی تھیں، وہ کسی نہ کسی پبلک بوتھ سے کی گئی تھیں مگر رقم منگوانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا کوئی پتا ٹھکانا فراہم کرتے۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بتاؤ اب ناشتہ کرنا ہے اور نکلنا ہے یا پھر ہم بھی رضائیاں لے کر لیٹ جائیں؟''

میں گہری سانس لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس شخص کی مرضی کے خلاف چلنا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ان دونوں نے قادرے کو ایک اندرونی کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد عمران کا ایک ساتھی آصف یہاں آنے والا تھا جس نے ہماری غیر موجودگی میں یہاں رہنا تھا اور قادرے کی دیکھ بھال بھی کرنا تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم مہران کار پر سوار لاہور سے براستہ جی ٹی روڈ جہلم کی طرف جا رہے تھے۔ عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ اقبال اس کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ میں پچھلی نشست پر نیم دراز تھا۔ ڈیک پر غزل کے بول گونج رہے تھے۔

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نبھاہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

میرے دل میں درد اُتر رہا تھا۔ ثروت کا مکان بک گیا تھا۔ وہ در و دیوار، وہ جھروکے اور وہ سارے دھوپ سائے بک گئے تھے جن میں میری اور ثروت کی محبت رچی بسی تھی۔ اس چار دیواری میں ہماری محبت نے جنم لیا تھا پھر وہ پروان چڑھی تھی۔ پھر وہ ہمارے روئیں روئیں میں سما گئی تھی۔ کتنی بیتابی تھی ہمارے اندر ایک دوسرے کے لیے۔ ہم اپنے ملن کے لیے ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہے تھے اور کئی دفعہ تو یہ بے قراری اتنی بڑھ جاتی تھی کہ ہم دنوں کے بجائے گھڑیاں گننے لگتے تھے۔ عجیب ہیجانی انداز میں اس دن کا انتظار کرنے لگتے تھے، جب شہنائیاں گونجنا تھیں۔ جب ڈولی سجنی تھی اور ایک حسین شب کی مانگ میں وصل کے ستارے جھلملانے تھے لیکن اب وہ سب کچھ بعید از قیاس لگتا تھا۔ ہر اچھا امکان ایک تاریک دھند کے پیچھے چھپ گیا تھا اور ناپید ہو گیا تھا۔

گاڑی جہلم کی طرف رواں دواں تھی۔ یہ موسم سرما کا آخری دور تھا۔ سنہری دھوپ نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھی۔ ''وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''فردوس پلازہ تلاش کریں گے پھر ابرار صدیقی کے فلیٹ پر پہنچیں گے۔ اس سے

چائے پئیں گے اور گرما گرم سموسے کھائیں گے، ٹماٹو کیچپ کے ساتھ...... پھر واپس آ جائیں گے۔''

''اور اگر سموسے زیادہ گرم ہوئے تو پھر؟'' اقبال مسکرایا۔

''تو پھر...... تابش کو نہیں کھانے دیں گے۔ ہماری زبانیں تو گرم سرد کھا کھا کر کافی ڈھیٹ ہو چکی ہیں۔''

''دیکھو...... میں ایک بات تمہیں صاف صاف بتا دوں۔ میں تمہارے ساتھ تو چل پڑا ہوں لیکن کسی بھی اُلٹے سیدھے کام میں شریک نہیں ہوگا۔''

عمران بولا۔ ''میرے خیال میں اُلٹے سیدھے کام سے تمہارا مطلب خطرناک کام ہے۔ اول تو یہ کام خطرناک نہیں ہے اور اگر تھوڑا بہت ہو بھی تو یار...... ''دو...... چھ'' والے کھیل سے زیادہ خطرناک کیا ہوگا اور ''دو...... چھ'' تم آسانی سے کھیل چکے ہو۔''

وہ ہر ایسے موقعے پر۔ ''دو...... چھ'' کا حوالہ دیتا تھا اور مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں سٹپٹا کر کچھ کہنے والا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کی گرل فرینڈ شاہین تھی۔ وہ شاہین سے گپ شپ کرنے لگا۔ وہ اسے ڈنر پر چلنے کا کہہ رہی تھی اور وہ اسے ٹالنے کے لیے بے پر کی اُڑا رہا تھا۔ اس نے اسپیکر بھی آن کر دیا تھا تاکہ ہم بھی ان کی گپ شپ سن سکیں۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ آج شام مصروف ہے۔ اداکارہ ریما نے اسے اپنی فلم ''اندھی لڑکی'' میں ایک خاص الخاص رول دینے کے لیے اپنے گھر بلایا ہے۔''

شاہین کی آواز اُبھری۔ ''ویسے یہ ریما غضب کی آرٹسٹ ہے، اندھی لڑکی کا رول کرنے کے لیے اس نے واقعی اپنی آنکھیں نکلوا لیں۔ بھئی واہ...... بہت بڑی قربانی ہے فن کے لیے۔''

''آنکھیں کیوں نکلوائے گی وہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''لو...... اگر آنکھیں نہیں نکلوائیں تو پھر تمہیں کیوں کاسٹ کرے گی وہ؟ کیا کوئی اور ڈھنگ کا بندہ لاہور میں نہیں ہے؟''

''ڈھنگ کا بندہ ہوتا تو تم میرے بجائے اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھتیں اور موت کے کنویں میں داد وصول کرتیں۔ میرے جیسی بے ڈھنگی موٹر سائیکل پاکستان میں کوئی چلا سکتا ہے؟''

''اتنا بھی اترانے کی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے ''اسٹنٹ مین'' بھرے ہوئے ہیں فلم

انڈسٹری میں۔ وہاں تمہاری دال گلنے والی نہیں۔''

''مونگ کی دال گلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور ریما جی کو مونگ کی دال بڑی پسند ہے۔''

''لگتا ہے کہ تم بس میرا اور اپنا ٹائم ضائع کر رہے ہو۔''

''نہیں اپنا...... تمہارے پاس تو ٹائم ہی ٹائم ہے۔''

''اچھا...... بھاڑ میں جاؤ۔'' شاہین نے کال منقطع کر دی۔

وہ دلکش انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کے دانت خوبصورت تھے۔ ''اب دو تین دن روٹھی رہے گی۔ پھر ایک دن گھر سے کوئی اچھا سا کھانا پکا کر لائے گی۔ ایک پلیٹ میں ڈال کر سینڈو کے ہاتھ مجھے بھی بھجوائے گی۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ وہ ماننے کے لیے تیار ہے۔ میں جاؤں گا تو وہ مان جائے گی۔''

''بہت خوب۔'' میں نے کہا۔ ''روٹھتی بھی وہ ہے اور کھانا بھی وہ کھلاتی ہے۔''

''ہیرو بننے کے یہی تو فائدے ہوتے ہیں جگر۔'' وہ ادا سے بولا۔

میں نے نشست پر کشن کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم واقعی اس سے پیار کرتے ہو یا بس وقت گزاری ہے؟''

''سچ بتاؤں؟''

''چلو آج یہ کام بھی کر گزرو۔'' میں نے کہا۔

''وقت گزاری۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ان لمحوں میں پہلی بار مجھے اس کی دلکش آنکھوں میں عجیب سا کرب کروٹ لیتا محسوس ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندازہ ہوا کہ عمران کی ہنستی کھیلتی قہقہے بکھیرتی زندگی کے پیچھے ایک پردہ ہے اور اس پردے کے عقب میں ایک دردناک کہانی چھپی ہے۔

مگر عمران کی آنکھوں کا یہ تاثر بس چند لمحے ہی قائم رہا، اس کے بعد وہی شوخی ایک ریلے کی طرح اس کی آنکھوں میں بہنے لگی۔

جس وقت ہم جی ٹی روڈ سے اُتر کر جہلم شہر میں داخل ہوئے، دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ایک اچھے ہوٹل سے ہم نے لنچ کیا۔ وہیں سے ہمیں فردوس پلازہ کا پتا بھی چل گیا۔ عمران نے مجھے یقین دلایا تھا کہ فی الحال وہ صرف سروے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پلازہ دیکھیں گے اور ابرار صدیقی کے فلیٹ کا بیرونی جائزہ لے کر واپس آ جائیں گے۔ پھر بھی سابقہ تجربوں کی بنا پر میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں نے عمران سے کہا کہ میں ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا ہوں، وہ چکر لگا کر آ جائیں مگر وہ مجھے ساتھ لے جانے پر مُصر تھا۔

ہم شہر کے گنجان علاقے سے گزر کر نسبتاً کشادہ سڑکوں پر آ گئے۔ جلد ہی عمران کو فردوس پلازہ کی سبز عمارت نظر آ گئی۔ یہ پانچ منزلہ بلڈنگ یقیناً حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ نیچے دکانیں، اوپر دفاتر اور اس سے اوپر لگژری فلیٹس تھے۔ عمران نے کار پلازہ سے قریباً پچاس میٹر دور سڑک کے کنارے روکی۔ اس سے پہلے کہ مزید تحقیق شروع ہوتی، ایک منظر نے اگلی نشست پر بیٹھے اقبال کو بُری طرح چونکا دیا۔ وہ پلازہ سے نکلنے والے ایک سانولے سے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور اس کے بال گھنگریالے تھے۔ اپنی چرمی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ باہر نکلا اور ایک پرانے ماڈل کی سوزوکی کار میں آ بیٹھا۔

''یہ مجید مٹھو ہے۔'' اقبال نے پورے وثوق سے کہا۔

''دیکھ لو۔ کہیں دھوکا نہ ہو رہا ہو۔'' عمران بولا۔

''دیکھ لیا ہے یار! سو فیصد وہی ہے۔'' اقبال کی آواز میں جذباتی لرزش تھی۔

''پھر پیچھا کریں اس کا؟''

''بالکل کرنا چاہیے۔'' اقبال نے جواب دیا۔

مجید مٹھو روانہ ہوا تو ہماری مہران کار اس کے پیچھے چل پڑی۔ یہ مجید مٹھو وہی کن ٹٹا تھا جس کے سمن آباد میں واقع گھر سے عمران اور اقبال نے قادر لمبے کو نکالا تھا۔ غالباً عمران اور اقبال کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہاں فردوس پلازہ پر پہنچتے ہی مجید مٹھو سے ملاقات ہو جائے گی۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے جہلم کی مختلف سڑکوں سے گزرنے لگیں۔ یہاں ٹریفک زیادہ تھا اور سڑکوں کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ قریباً دس منٹ بعد مٹھو کی گاڑی ایک کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ ہم کوٹھی کی نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے سامنے سے گزر گئے۔ کوٹھی کا نمبر 100 تھا اور یہ کسی چودھری منصب علی کی ملکیت تھی۔ کچھ دور جا کر ہم نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور کوٹھی سے کچھ فاصلے پر چند دکانوں کے سامنے رُک گئے۔ اقبال قریبی شاپ سے الائچی سپاری پان لے کر آیا۔ ہم پان چباتے ہوئے صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔ مجید مٹھو کے یہاں ہونے کا مطلب یہ تھا کہ صدیقی وغیرہ سے اس کا براہِ راست تعلق ہے۔ ممکن تھا کہ جو نادر شے لاہور سے یہاں جہلم پہنچائی گئی تھی، مجید مٹھو اسی کے سلسلے میں یہاں پہنچا ہو۔

اچانک مٹھو کی نیلی کار پھر کوٹھی سے نکلتی دکھائی دی۔ عمران کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ مٹھو اتنی جلدی یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ اقبال نے ابھی پان والے سے بقایا پیسے بھی لینے تھے۔

تاہم یہ ستر اسّی روپے اس کو گفٹ کرتے ہوئے ہم پھر نیلی کار کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ مٹھو نے ایک جگہ رُک کر گاڑی میں ''سی این جی'' ڈلوائی۔ ایک ورکشاپ کے اندر جا کر کسی سے ملا اور باہر آیا۔ یہ لکڑی کی ورکشاپ تھی۔ جب مٹھو ورکشاپ سے باہر آیا تو اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ نوجوان کا چہرہ افسردہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ مٹھو اسے سمجھانے والے انداز میں کچھ بول رہا تھا۔ پھر اس نے نوجوان کا کندھا تھپکا اور اسے واپس ورکشاپ میں بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ شہر کے جنوبی حصے کی طرف چل دیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے مختلف سڑکوں پر بھاگ رہی تھیں۔

اچانک عمران بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس باندر کو شک ہو گیا ہے۔''

''ہاں...... لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔'' اقبال نے تائید کی۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ مجید مٹھو کی گاڑی یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ وہ چند بغلی سڑکوں پر بھی مڑا۔ عمران نے درمیانی فاصلہ کافی بڑھا دیا مگر لگتا تھا کہ اب فاصلہ بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اقبال بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس خبیث نے ایک دم کہیں غائب ہو جانا ہے۔ تم اب اس کے قریب ہی رہو تو بہتر ہے۔''

عمران خود بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔ نیلی کار کی رفتار بھی ایک دم بڑھ گئی۔

دونوں گاڑیاں تیزی سے آگے پیچھے بھاگتی اور مختلف سڑکوں سے گزرتی مضافاتی علاقے میں آ گئیں۔

''مجھے لگتا ہے یہ باندر وقت گزار رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے موبائل پر اپنے مددگار بلا لیے ہوں۔'' عمران نے خیال ظاہر کیا۔

''لیکن ابھی تک کوئی نظر تو نہیں آیا۔'' اقبال نے عقب میں اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں مٹھو کی نیلی کار نے ایک شارپ ٹرن لیا اور جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر چڑھ گئی۔ یوں محسوس ہوا کہ مٹھو کے ذہن میں کوئی خاص منزل ہے۔ شاید وہ ہمیں اس طرف لے جا رہا تھا جہاں اسے مدد مل سکتی تھی۔ اس امر کا امکان تھا کہ اس سڑک پر آگے جا کر مٹھو کے ساتھی موجود ہوں۔

عمران نے کار کی رفتار ایک دم بہت بڑھا دی اور مٹھو کی کار کے برابر آ گیا۔ میرے جسم میں سنسناہٹ پھیل رہی تھی اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہی ہو رہا تھا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یہ

دونوں سر پھرے ایک بار پھر راہ جاتی مصیبت کو گلے کا ہار بنا رہے تھے اور میری بدقسمتی تھی کہ میں بھی ان کے ساتھ گاڑی میں موجود تھا۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں ہوٹل کی نیم گرم لابی اور ٹی وی وغیرہ کو چھوڑ کر ان خدائی فوجداروں کے ساتھ چل پڑا تھا۔ عمران کی ہمیشہ مسکراتی آنکھوں میں اب وہی سرد جارحیت نظر آتی تھی جس کا مشاہدہ میں پہلے ہڑپہ میں زلیخا کے ہاں اور پھر لاہور سمن آباد میں مٹھو کے مکان میں کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر اقبال نے مجید مٹھو کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے رفتار کم کرنے کے بجائے اور تیز کی تو اقبال نے اپنی جیکٹ میں سے پستول نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے مٹھو کی کار کو سائیڈ ماری۔ مٹھو کی کار بُری طرح لہرائی اور سائیڈ کے کھیت میں جا کر تھوڑا سا گھوم گئی لیکن وہ پھر بھی رُکا نہیں۔ جس طرف کو گاڑی کا رُخ ہو گیا تھا، وہ اسی طرف کو بھگاتا چلا گیا۔ عمران نے بھی اس کے پیچھے گاڑی ناہموار کھیت میں ڈال دی۔ یہ تقریباً سنسان جگہ تھی۔ گہری ہوتی شام میں بس اِکا دُکا راہگیر نظر آتے تھے۔ دونوں گاڑیاں کھیت میں دوڑتی چلی گئیں۔

مٹھو کھیت میں سے نکل کر دوبارہ ایک چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کھیت سے نکل آئے۔ یہ ریس بڑی اندھا دھند ثابت ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ میں عمران کی زبردست مشاقی بھی مجھ پر کھل رہی تھی۔ میں خود بھی بڑی اچھی ڈرائیونگ کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف تاریک پہاڑیاں تھیں، جہلم شہر کی روشنیاں دور عقب میں دکھائی دے رہی تھیں۔ عمران نے کئی خطرناک موڑ تیزی سے کاٹے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوا کہ گاڑی اس کے کنٹرول سے باہر ہو گی۔

جلد ہی اس نے پھر مٹھو کی گاڑی کو جا لیا۔ ''اس کا ٹائر پھاڑ دوں؟'' اقبال نے اپنے کولٹ پسٹل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی ویسے ہی کوشش کرتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

اب ایک بار پھر دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو دوڑ رہی تھیں۔ عمران نے اوورٹیک کرنے کے بجائے مٹھو کی گاڑی کو دبانا شروع کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ گاڑی کی رفتار کم کرنے اور اسے روکنے پر آمادہ ہو جائے لیکن مٹھو بھی شاید آخری حد تک مزاحمت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بجائے اچانک ہماری گاڑی کو زوردار سائیڈ ماری۔ یہ بڑی اندھا دھند حرکت تھی۔ دونوں گاڑیوں کی سائیڈوں کے تصادم سے زوردار آواز پیدا

ہوئی۔شیشہ ٹوٹنے کا چھنا کا اُبھرا۔عمران تو کسی طرح گاڑی سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا لیکن جس نے ٹکر ماری تھی، وہی اپنی گاڑی سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔موڑ پر اس کی گاڑی بُری طرح لہرائی۔کسی پتھر سے ٹکرا کر گھومی اور پھر نشیب کے کمزور درختوں کو توڑتی ہوئی تاریکی میں جا گری۔

یہ سنسنی خیز منظر تھا۔چھوٹی سی بل کھاتی سڑک بالکل تاریک اور سنسان تھی۔عمران نے گاڑی کو بریک لگائے اور وہ بیس تیس میٹر آگے جا کر رُک گئی۔ہم تیزی سے باہر نکلے اور نشیب کی طرف لپکے۔گاڑی کی ہیڈ لائٹس شاید ٹوٹ چکی تھیں، صرف عقبی بتیوں کی مدھم سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ہمیں اندازہ ہوا کہ گاڑی تیس چالیس فٹ نیچے اُلٹی حالت میں پڑی ہے۔

عمران کے ہاتھ میں ٹارچ تھی، وہ سب سے پہلے نیچے اُترا۔اس کے عقب میں اقبال تھا۔اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پسٹل میں صاف دیکھ سکتا تھا۔''احتیاط سے عمران! ہوسکتا ہے وہ باہر نکل آیا ہو۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

میں اقبال کے بالکل پیچھے تھا۔جس سڑک پر سے مٹھو کی گاڑی گری تھی، یہ کسی گاؤں کی طرف جانے والی پتلی سی سڑک تھی۔دور تک کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ہم احتیاط سے چلتے آگے بڑھتے رہے اور گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔پٹرول کی بُو پھیلی ہوئی تھی۔سائیڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے تاہم اپنی جگہ پر موجود تھے۔عمران نے ٹارچ روشن کی۔مجید مٹھو اوندھی گاڑی میں اوندھا پڑا نظر آیا۔وہ بے حرکت تھا۔اقبال نے ایک پتھر کی مدد سے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو کھڑکی سے علیحدہ کیا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول دیا۔مٹھو کو کھینچ کر باہر نکالا۔اس کام میں مَیں نے بھی مدد کی۔وہ خاصا وزنی اور ٹھوس جسم والا تھا۔بظاہر اس کو کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ہم اسے اُٹھا کر گاڑی سے تھوڑا دور لائے اور یہی وقت تھا جب میری نگاہوں کے سامنے برق سی چمک گئی۔مجید مٹھو کے دائیں ہاتھ نے بڑی تیزی سے حرکت کی اور جیکٹ کے نیچے گیا۔ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔اتفاقاً اس وقت میں ہی مجید مٹھو کے زیادہ قریب تھا۔میں نے اضطراری طور پر ٹانگ چلائی۔میرے وزنی بوٹ کی ضرب مجید مٹھو کے ہاتھ پر لگی۔یہ بڑی کارگر ضرب تھی۔پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔مجید مٹھو نے لیٹے لیٹے مجھے لات ماری۔میں لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گیا۔اسی اثناء میں مٹھو نے اُٹھ کر دوڑ لگا دی۔یقیناً اس سے پہلے وہ مکر رہا تھا۔

''رُک جاؤ......گولی مار دوں گا۔'' اقبال دھاڑا۔

مگر وہ رُکا نہیں۔عمران نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔وہ ڈھلوان پر لمبی لمبی جستیں لگاتا ہوا تیزی سے مٹھو کے قریب پہنچ گیا۔پھر میں نے اس کے سائے کو ہوا میں جست لگا کر مٹھو کے سائے پر گرتے دیکھا۔اس نے قریباً پچاس میٹر نیچے مٹھو کو چھاپ لیا تھا۔میں اور اقبال سنبھل سنبھل کر اُترے اور ان دونوں کے سر پر پہنچ گئے۔ہمارے پہنچنے سے پہلے مجید مٹھو اور عمران کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔مٹھو تکلیف سے بُری طرح کراہ رہا تھا اور عمران کے نیچے دبا ہوا تھا۔ٹارچ کی روشنی میں اس کا گریبان تار تار تھا۔

''باندھو اس کتے کو اسی کے مفلر سے۔'' عمران نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اقبال نے مٹھو کا گرا ہوا مفلر اُٹھایا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر مضبوطی سے کس دیئے۔اس کے بعد وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے واپس گاڑی تک لے آئے۔اقبال نے گاڑی کے اگنیشن میں سے چابی نکال لی اور اس کی عقبی روشنیاں آف کر دیں۔گاڑی کی چھت اور ایک سائیڈ بُری طرح برباد ہو گئی تھی۔پٹرول ٹینکی سے بہہ نکلا تھا اور بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

مجید مٹھو دھمکیاں دینے لگا۔''تم مجھے جانتے نہیں ہو۔میں برباد کر دوں گا تمہیں۔تمہارے بچے مار ڈالوں گا۔''

عمران نے عقب سے اس کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ مارا۔چٹاخ کی آواز اُبھری اور مٹھو اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔عمران پھنکارا۔''تمہیں یہ کس نے کہا ہے کہ ہم تمہیں جانتے نہیں۔تمہیں جانتے ہیں، اسی لیے تو آج تیری آٹھ دس ہڈیاں توڑ کر کسی کھڈ میں پھینکنے والے ہیں۔''

''ایک ہڈی تو شاید اس کی ٹوٹ بھی گئی ہے۔'' اقبال نے مٹھو کے بازو کو کندھے کے نیچے سے ٹٹولا۔

مٹھو سخت جان ہونے کے باوجود کراہ اُٹھا۔اس کے بازو کو واقعی نقصان پہنچ چکا تھا اور یہ کام حادثے کے وقت نہیں ہوا تھا، تب ہوا تھا جب عمران اور وہ اوپر نیچے پتھروں پر گرے تھے اور دور تک لڑھک گئے تھے۔عمران نے اچھی طرح مجید مٹھو کی تلاشی لی۔اس کی جیب سے کچھ کرنسی، چند رسیدیں، موبائل اور سگریٹ کا پیکٹ ملا۔یہ ساری اشیاء مٹھو کے رومال میں باندھ کر ایک طرف رکھ دی گئیں۔ٹارچ کی مدد سے اقبال نے مٹھو کا گرا ہوا پستول بھی ایک پتھر کے نیچے سے ڈھونڈ لیا۔

اس کے بعد عمران نے اُلٹی ہوئی گاڑی کی ڈکی کھولی۔اس میں بڑے بڑے تین

شاپروں کے اندر بکرے کا بہت سارا گوشت اور ان کے سری پائے پڑے تھے۔ ''یہ اتنی ساری خوراک کس کے لیے لے جا رہا تھا مچھندر؟'' اقبال نے اسے ٹہوکا دے کر پوچھا۔

''تیری بہن کی برات کے لیے۔'' مٹھو ایک دم بھڑک کر بولا پھر اس نے اندھا دھند اقبال پر لات چلائی۔ وار خالی گیا اور مٹھو پھسل کر پشت کے بل گرا۔ عمران نے اسے دبوچ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا اور چلانے لگا۔ ''حرامزادو! چھوڑ دو مجھے۔ میں تمہاری جان لے لوں گا۔ کتے کی موت مار دوں گا۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے۔''

شاید وہ چاہ رہا تھا کہ اس کی یہ آہ و بکا اوپر سڑک تک پہنچ جائے اور وہاں سے اسے کوئی مدد مل جائے لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ گرد و پیش کے ٹیلوں کی طرح اوپر سڑک بھی یکسر تاریک اور خاموش تھی۔ اگر ڈرائیونگ کے دوران میں مٹھو نے اپنے کسی مددگار کو فون کیا بھی تھا تو ہمیں اس حوالے سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کھیت کراس کرنے کے بعد دونوں گاڑیاں مین روڈ سے ہٹ گئی تھیں اور اب ہم جہاں پہنچ گئے تھے، وہاں کسی کی رسائی خاصی مشکل تھی۔

ڈکی میں گوشت سے بھرے ہوئے شاپروں کے علاوہ کچھ اوزار اور ایک نائیلون کی رسّی بھی تھی۔ عمران نے رسّی نکالی۔ اس دوران میں اقبال نے کوشش کر کے مٹھو کے منہ میں گاڑی صاف کرنے والا کپڑا ٹھونس دیا تھا اور اس کے گلے کے لاؤڈ اسپیکر کو بے کار کر دیا تھا۔ اس کام میں مَیں نے بھی اقبال کی مدد کی۔ میرے اس تعاون پر عمران دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ٹانگ چلا کر مٹھو کے ہاتھ سے پسٹل چھڑایا تھا۔ میری اس کارکردگی کو بھی عمران نے بڑی تحسین کی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فرصت ملتے ہی وہ اس حوالے سے میری لمبی چوڑی تعریف بھی کرے گا۔

''باندھو ذرا اس باندر کو...... گاڑی سے۔'' عمران نے بڑے اطمینان سے کہا اور نائیلون کی رسّی اقبال کی طرف اُچھال دی۔

اقبال نے مٹھو کو گھسیٹ کر گاڑی کے قریب کیا پھر وہ دونوں مل کر اسے کار کے دونوں دروازوں کے درمیانی پلر سے باندھنے لگے۔ مٹھو طیش کے عالم میں واویلا کر رہا تھا مگر اب وہ گلے سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکال پا رہا تھا۔ جلد ہی ان دونوں نے اسے بیٹھی ہوئی حالت میں گاڑی کے ساتھ کس دیا۔ یہ سارا عمل بس ڈیڑھ دو منٹ میں مکمل ہو گیا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ مجید مٹھو اپنے علاقے کا نامی گرامی بدمعاش تھا مگر فی الوقت وہ ان دونوں ''سرپھروں'' کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی بے دردی کے ساتھ اس سے بدترین

سلوک روا رکھے ہوئے تھے۔ خاص طور سے عمران کے لیے یہ سب کچھ ایک دلچسپ کھیل کی طرح تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ جو لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتے ہیں، ان کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ ہیچ ہو جاتا ہے۔

چاروں طرف تاریک سناٹا تھا۔ دائیں طرف ٹیلوں سے آگے کئی میل کے فاصلے پر کچھ مدھم روشنیاں نظر آتی تھیں۔ یہ شاید دریائے جہلم کے کنارے آباد کوئی مچھیروں کی بستی تھی۔ ہوا نہیں چل رہی تھی اس لیے موسم میں زیادہ خنکی بھی نہیں تھی۔ مجید مٹھو کی گاڑی کے اندر سے ہی ایک کمبل نما دھسا بھی ملا تھا۔ اسے اقبال نے ہموار جگہ پر بچھا دیا تا کہ اس پر بیٹھا جا سکے۔ مجید مٹھو کو باندھنے کے بعد عمران بڑے اطمینان سے ایک پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی۔

''ہاں بھئی...... میاں مٹھو! اب دو ٹوک بات ہو جائے۔'' عمران بولا۔ ''تم نے ہمیں کچھ بتایا ہے یا بس ٹیں ٹیں کی رٹ لگائی ہے۔''

''مجھے تو نہیں لگتا یار! کہ یہ آسانی سے کچھ بتائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے بھی سیب شیب کھلایا جائے یا پھر کوئی کڑوا بادام۔''

''کیوں نہ سگریٹ پلا دی جائے اسے؟'' عمران نے رائے دی۔

''ہاں...... یہ بھی ٹھیک ہے۔ اسے سگریٹ کی کمی بھی محسوس ہو رہی ہو گی۔''

''نکالو اس کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ اور لائٹر...... لیکن یار ٹھہرو۔ کیوں نہ سگریٹ کے بجائے آج ان اسپیشل ڈے پر اس میاں مٹھو کو سگار پلایا جائے۔ وہاں ہماری گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھے ہیں دو سگار۔'' وہ دونوں اپنی اسپیشل لینگوئج میں بات کر رہے تھے۔

''او کے۔'' اقبال نے عمران کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

وہ چھلانگیں لگاتا ہوا چڑھائی کی طرف گیا۔ پہلے اس نے سڑک پر کھڑی اپنی مہران کار کو سڑک سے اُتار کر بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں کیا پھر سگار لے کر نیچے آ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں بھی ''سیب کو سر پر رکھنے'' جیسا کوئی تماشہ ہونے والا ہے۔

عمران نے سگار کا کونا توڑ کر اسے لائٹر سے سلگایا۔ چند بڑے کش لیے اور دھواں فضا میں چھوڑا۔ یکا یک مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ٹینکی سے بہنے والے پیٹرول کی بُو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پتھریلی اور نیم پتھریلی زمین تھی۔ پیٹرول اس میں پوری طرح جذب نہیں ہوا تھا۔ وہ گاڑی کے ارد گرد پھیلا

ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

عمران آگے بڑھا اور اس نے سلگتے ہوئے سگار کو مٹھو سے دو تین فٹ کے فاصلے پر بڑی احتیاط سے ایک اینٹ نما پتھر پر رکھ دیا۔ اس نے سگار اس طرح رکھا تھا کہ اس کا آدھا حصہ پتھر پر اور آدھا ہوا میں معلق تھا۔ پتھر پر وہ حصہ تھا جو سلگ رہا تھا۔ اب اگر یہ حصہ مسلسل سلگتا رہتا تھا تو چند منٹ میں ہلکا ہو جاتا اور سگار پتھر پر اپنا توازن کھو کر نیچے گر جاتا۔ سگار کے پتھر سے گرنے کے بعد جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ بالکل عیاں تھا۔ پلک جھپکتے میں یہ گاڑی اور گاڑی کے ساتھ بندھا ہوا مجید مٹھو آگ کی لپیٹ میں آ جاتے۔

یہ سب کچھ مجید مٹھو کی سمجھ میں بھی آ گیا تھا، لہٰذا وہ اسی طرح پھڑ پھڑانے لگا جیسے طوطا پنجرے کے سامنے بلی کو دیکھ کر پھڑ پھڑاتا ہے۔ اس نے اتنا زور لگایا کہ اُلٹی ہوئی گاڑی کا پورا ڈھانچا ہلنا شروع ہو گیا۔ بہرحال نائیلون کی رسّی بہت مضبوط تھی۔ مجید مٹھو کچھ بولنے کی کوشش میں مسلسل غوں غاں کر رہا تھا۔ پھر چند سیکنڈ بعد وہ ایک دم شانت ہو گیا۔ یہ بات جیسے اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ تڑپنے پھڑکنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اگر وہ آنے والے چند منٹ میں ایک خوفناک صورتِ حال سے بچنا چاہتا ہے تو پھر اسے عمران وغیرہ کی ہدایت پر عمل کرنا ہو گا۔ اس کی تبدیل شدہ کیفیت دیکھ کر عمران نے اقبال کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مٹھو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ مٹھو تھوڑی دیر تو واویلا کرتا رہا۔ پھر قدرے پُرسکون ہو گیا۔ وہ واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ اگر اس نے وقت ضائع کیا تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔

عمران نے اس سے کہا۔ ''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ یہ گوشت سے بھرے ہوئے شاپر کس خوشی میں لے کر جا رہے ہو؟''

''یہ مولانا صدیقی صاحب کے ہیں۔ انہوں نے یتیم خانے کے لیے بھیجے ہیں۔ وہیں دینے جا رہا تھا۔ وہ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو صدقہ وغیرہ بھیجتے ہیں۔''

''صدقہ وغیرہ؟''

''یہ تین کالے بکروں کا گوشت ہے جو یتیم خانے کے بچوں کے لیے ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ یقیناً اس کے بازو کی سنگین چوٹ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور تکلیف دے رہی تھی۔

''تمہیں یہ کب پتا چلا کہ ہم تمہارا پیچھا کر رہے ہیں؟''

''میں یتیم خانے والی سڑک پر مڑ رہا تھا مجھے شک ہوا تھا۔ اس کے بعد......''

''ہاں...... اس کے بعد؟''

''اس کے بعد میں نے گاڑی کو اِدھر اُدھر گھمایا اور مجھے پتا چلا کہ تم لوگ پیچھے آ رہے

ہو۔''

''تم نے کسی کو اپنے تعاقب کی اطلاع دی؟''

''مم...... میں نے سوچا تو تھا پر اس کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ میں بڑی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔''

شاید مجید مٹھو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ابھی تک اس کے موبائل پر کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلایا ہوتا تو وہ اس کے گم ہو جانے کے بعد رابطہ ضرور کرتے۔

''صدیقی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''بس...... علیک سلیک ہے۔ کسی وقت وہ مجھ سے کوئی کام شام لے لیتے ہیں۔''

''کس طرح کا کام شام؟''

مجید مٹھو نے ڈری ہوئی نظروں سے سلگتے سگار کو دیکھا اور بولا۔ ''انہیں پُرانی چیزیں اکٹھی کرنے کا شوق ہے۔ اس کے لیے مردان، سوات اور ٹیکسلا وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔''

''اور میڈم صفورا سے کیا ناطہ ہے تمہارا؟'' عمران نے اچانک سوال کیا۔

مجید مٹھو ایک دم گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''دراصل...... میری جان پہچان میڈم صفورا سے ہی ہے۔ میڈم صفورا کو بھی پرانی چیزوں کا بہت زیادہ شوق ہے۔ میڈم صفورا کا ملنا جلنا صدیقی صاحب سے تھا۔ اس طرح صدیقی صاحب سے بھی علیک سلیک ہو گئی۔''

''دیکھ میاں مٹھو! تجھے ہر بات کھل کر بتانی پڑے گی۔ یہ سگار تجھے زیادہ ٹائم نہیں دے گا۔ یہ گر گیا تو پھر ہم بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''مم...... میں...... کچھ نہیں چھپا رہا تم سے۔'' وہ سٹپٹایا۔

''قادر لمبے کو اپنے گھر میں کیوں چھپایا ہوا ہے تم نے؟'' عمران نے پھر اچانک دھماکا خیز سوال کیا۔

اس مرتبہ مٹھو گھبرا گیا۔ ''کک...... کون...... قادر؟'' وہ ہکلایا۔

''وہی جس کو سیٹھ سراج نے پہلے میڈم صفورا کی کوٹھی میں چھپایا تھا پھر تمہارے حوالے کر دیا۔''

مجید مٹھو ایک دم خاموش ہو گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بڑی اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس کا واسطہ بڑے خطرناک

لوگوں سے پڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اونٹ خود کو پہاڑ کے نیچے محسوس کر رہا تھا۔

"دیکھ میاں مٹھو! یہ بات بھول جا کہ بس ٹائیں ٹائیں کر کے اپنی جان بچا لے گا۔ اگر ٹھوس باتیں بتائے گا تو پھر تیرے بچنے کی کچھ امید پیدا ہو سکتی ہے۔ ورنہ پکی بات ہے کہ کل ٹی وی پر تیری خبر ضرور ملے گی۔ لاہور کے میاں مٹھو صاحب! تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جہلم کے پاس ایک کھائی میں گر گئے اور گاڑی کے ساتھ ہی جل کر بھسم ہو گئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے فلاں فلاں کو چھوڑا ہے۔"

مجید مٹھو نے پھر خوف زدہ نظروں سے سگار کو دیکھا۔ وہ اینٹ نما پتھر پر رکھا تھا اور کسی "بارودی فلیتے" کی طرح مسلسل سلگ رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی۔ سگار کے ہوا وغیرہ سے گرنے کے امکانات تو نہیں تھے مگر وہ "اَن بیلنس" ہو کر کسی بھی وقت گر سکتا تھا۔

مجید مٹھو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں، پر پہلے اسے یہاں سے ہٹاؤ۔" اس کا اشارہ سگار کی طرف تھا۔

"اسے ہٹائیں گے تو تم بھی پٹڑی سے ہٹ جاؤ گے۔ ہاں...... یہ کر دیتے ہیں کہ اسے تھوڑا سا آگے کھسکا دیتے ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے سگار کو حرکت دی اور اسے تھوڑا سا مزید پتھر پر چڑھا دیا۔

میں عمران کی اس "انوکھی ترکیب سازی" پر حیران ہو رہا تھا۔ ایک عام سے سگار کو اس نے "ٹائم بم" کی شکل دے دی تھی اور یہ ٹائم بم مجید مٹھو جیسے بے رحم غنڈے کا پتا پانی کر رہا تھا۔ مجید مٹھو کی اس حالت میں کچھ عمل دخل اس کی جسمانی اذیت کا بھی تھا۔ اس کا دایاں بازو کہنی کے اوپر سے ٹوٹ چکا تھا اور اس کی یہ تکلیف مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مٹھو صاحب! بس مختصر لفظوں میں یہ بتاؤ کہ پرانی چیزوں کی یہ اسمگلنگ کس طرح ہو رہی ہے اور اس میں اور کون کون شریک ہے؟"

"اسمگلنگ؟"

"ہاں...... ہاں...... اسمگلنگ...... ہمارے پاس اس سارے کالے دھندے کے ثبوت ہیں۔ بس، ہم تمہارے منہ سے سننا چاہ رہے ہیں۔"

مجید مٹھو نے پس و پیش کی۔ وہ انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دوسری طرف سلگتی ہوئی موت بھی اس کے سامنے تھی۔ سگار کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ ٹینکی سے ہلکا ہلکا رساؤ جاری تھا اور مہلک بُو نتھنوں میں گھس کر شدید خطرے کا احساس دلاتی تھی۔

بالآخر مجید مٹھو نے ہتھیار ڈال دیئے اور عمران جو جو کچھ پوچھتا گیا، وہ بتاتا چلا گیا۔ اس

کی تیز رفتار گفتگو سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

صدیقی جسے مٹھو نے ایک دو بار مولانا بھی کہا، میڈم صفورا ہی کی طرح نوادرات میں دلچسپی رکھتا تھا اور ان کا بیوپار بھی کرتا تھا۔ یہ لوگ نادر اشیاء کو منہ مانگی قیمتوں پر خریدتے تھے۔ اس کے بعد انہیں ملک سے باہر بھیجتے تھے یا پھر مقامی شوقینوں کو فروخت کرتے تھے۔ میڈم صفورا اور ابرار صدیقی کے درمیان دوستی تھی لیکن وہ کاروباری حریف بھی تھے۔ کچھ دن پہلے ابرار صدیقی نے ٹیکسلا یا تخت بائی کی طرف سے کوئی نہایت نادر چیز خریدی تھی۔ میڈم صفورا بھی اس شے کی خرید میں دلچسپی رکھتی تھی لیکن اس معاملے میں ابرار صدیقی پہل کر گیا۔ وہ مقامی فروخت کنندہ سے ملا اور اس نے آناً فاناً یہ سودا کر لیا تھا۔ اب وہ شے صدیقی کی تحویل میں تھی۔ پہلے اس نے اسے لاہور میں رکھا تھا لیکن پھر وہاں کسی طرح کا خطرہ محسوس کر کے وہ اسے یہاں جہلم میں لے آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صفورا کے علاوہ کوئی اور پارٹی بھی اس قدیم پیس آف آرٹ کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صدیقی نے صرف اس چیز کی اہمیت بڑھانے کے لیے اور میڈم صفورا کو زچ کرنے کے لیے یہ تیسری پارٹی والا شوشا چھوڑا ہو۔ میڈم صفورا نے سیٹھ سراج کو یہ کام سونپ رکھا تھا کہ وہ کسی طرح ابرار صدیقی سے اس "پیس آف آرٹ" کا سودا کرے۔ سیٹھ سراج پچھلے ڈھائی تین مہینے سے صدیقی کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح یہ "پیس" میڈم کو فروخت کر دے۔ اس نے میڈم کی طرف سے "پیس" کی خاصی قیمت بھی لگائی تھی مگر صدیقی رضامند نہیں ہوا تھا لیکن پھر انہی دنوں اس صورتِ حال میں ایک دلچسپ تبدیلی رُونما ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کا ذکر مجید مٹھو نے ان الفاظ میں کیا۔

ان دنوں قادر لمبا اور اس کا یار شکیل میڈم کی کوٹھی میں چھپے ہوئے تھے۔ لڑکی کے اغوا والے چکر میں انہیں گرفتاری کا ڈر تھا۔ قادر لمبے کی ماں، بیٹے کے لیے بڑی پریشان تھی۔ وہ چوری چھپے دو تین بار بیٹے سے ملنے میڈم کی کوٹھی میں آئی۔ اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کا نام کنول ہے۔ وہ کافی سوہنی ہے۔ ایک دن جب ماں بیٹی کوٹھی میں آئیں تو صدیقی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی نظر لڑکی پر پڑ گئی۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ لڑکی ایک دم ان کو بڑی پسند آ گئی۔ سیٹھ سراج بھی اس ویلے وہیں پر تھا۔ سیٹھ کی نظر بھی بڑی تیز ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکی، صدیقی صاحب کے دل کو بھا گئی ہے۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے کا سوچ لیا۔ وہ ویسے تو صدیقی صاحب کو خرید و فروخت پر راضی نہیں کر سکا تھا، وہ اس لڑکی کو بیچ میں لے آیا۔ اس نے صدیقی صاحب کو آفر دی کہ اگر وہ اپنی شے بیچنے پر تیار ہو جائیں تو وہ

اس لڑکی کا معاملہ ان کے ساتھ سیدھا کرا دے گا۔ صدیقی صاحب نے تھوڑی بہت رضامندی دکھائی تو سیٹھ اس کام میں لگ گیا۔ اس کو پتا تھا کہ قادر لمبا پولیس کیس سے جتنا زیادہ ڈرے گا، اس کے ماں بہن بھی اتنی ہی ڈرتی جائیں گی اوران کو اپنے راستے پر لانا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔''

تباہ حال گاڑی کے سامنے مجید مٹھو سے ہونے والی اس گفتگو کے بعد صورتِ حال کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئیں اور حالات کی ایک واضح تصویر اُبھرنے لگی۔

مجید مٹھو ابھی تک گاڑی سے بندھا ہوا تھا۔ تاہم اس کے راہِ راست پر آنے کے بعد عمران نے سلگتا ہوا سگار پتھر پر سے اُٹھا لیا تھا۔ آخری دس پندرہ منٹ کی گفتگو اس سگار کے بغیر ہی ہوئی تھی۔ تکلیف سے مجید مٹھو کا بُرا حال تھا۔ وہ اب باقاعدہ کراہ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے جلد از جلد اس تباہ حال کار سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کی چوٹ کے لیے کچھ کیا جائے تاکہ اسے تکلیف سے نجات ملے۔

عمران نے کہا۔''بس پیارے! ایک دو آخری سوال۔ پھر تمہارے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔''

''میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن پہلے مجھے یہاں سے کھولو۔'' وہ کراہا۔

''یار! اتنے بے صبرے کیوں ہوتے ہو؟ اب ہم نے کچھ زیادہ پوچھنا نہیں ہے۔ بس ایک دو سوال ہی دماغ میں اُبھر رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر سیٹھ سراج، صدیقی کے لیے کنول کو حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس کے لیے اسے اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ ماں بیٹی تو گھڑے کی مچھلی کی طرح تھیں۔ لال کوٹھی میں آتی تھیں۔ سیٹھ سراج کسی بھی وقت کنول کو بے بس کر کے صدیقی کے سامنے ڈال دیتا۔ سیٹھ جیسے خبیثوں کے لیے ایسے کام تو معمولی کیس ہوتے ہیں۔''

''لیکن صدیقی صاحب اس کام کو اور طرح کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ نماز روزے کے پابند ہیں۔ وہ کنول سے باقاعدہ نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ سیٹھ سراج بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے وہ کنول اور اس کے وارثوں کو پریشر میں لا کر راضی کرنا چاہتا ہے۔''

''قادر لمبے کو یہ بات کس نے بتائی تھی کہ ثروت نے خود کو آگ لگا کر مرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ہسپتال میں زخمی پڑی ہے۔'' اقبال نے پوچھا۔

''یہ جھوٹ بھی سیٹھ نے ہی بولا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ قادرے اور اس کے گھر والوں کو

ڈرایا جائے۔ اسے لال کوٹھی سے میرے گھر لانے کی وجہ بھی یہی تھی۔''

''کیا تمہارے محترم صدیقی صاحب کو پتا ہے کہ ان کے لیے کنول کو اس طرح راضی کیا جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شروع میں پتا نہیں تھا، پر اب لگ گیا ہے۔ سیٹھ سراج نے ان کی منت کی ہے کہ اب وہ اس معاملے میں خاموش رہیں کیونکہ اب اگر بات کھلی تو وہ سب جھوٹے ثابت ہو جائیں گے۔ سیٹھ نے صدیقی سے کہا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی ذمے داری پر کر رہا ہے اور اس کا کسی پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔''

''یہ تیرا صدیقی بڑی خرانٹ شے ہے میاں میٹھو۔'' عمران نے کہا۔''اس جیسے گھنے لوگ مذہب کو موم کی ناک بنا لیتے ہیں۔ جدھر چاہا موڑ لی۔ اس سے تو بڑی اچھی طرح سمجھیں گے ہم۔ شرط یہی ہے کہ بس ایک دفعہ ملاقات ہو جائے حضرت سے۔''

گاڑی سے پیٹرول رِسنا اب بند ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹینکی خالی ہو چکی ہے۔ ڈھلوان سے اوپر تپلی سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا ٹریکٹر ٹرالی روشنی بکھیرتی گزرتی تھی اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ پیٹرول کی بُو ابھی تک خنک ہوا میں موجود تھی۔

ایک دم میرے ذہن میں اس افسردہ صورت لڑکے کا خیال آیا جس سے راستے میں مجید مٹھو کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لکڑی کی ورکشاپ میں سے مجید مٹھو کے ساتھ باہر نکلا تھا اور پھر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے مٹھو سے کہا۔''وہ لڑکا کون تھا جس نے رونے والا منہ بنایا ہوا تھا اور تم نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے ورکشاپ میں واپس بھیجا تھا؟''

''وہ...... ایک جاننے والا تھا۔ روزگار کے لیے کویت جانا چاہتا ہے۔ وہاں ورکشاپ میں کارپینٹری سیکھ رہا ہے۔''

''صدیقی اور سیٹھ والے معاملے سے تو اس کا تعلق نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں...... یہ علیحدہ...... معاملہ ہے۔'' مجید مٹھو نے کراہتے ہوئے کہا۔

عمران، مٹھو کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔''میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ کون تھا وہ لڑکا؟ نام کیا تھا اس کا؟''

''اکمل...... اکمل سلطان۔''

''رہتا کہاں ہے؟''

''لاہور میں۔''

''تو کام سیکھنے کے لیے یہاں جہلم میں کیوں آ گیا؟'' عمران نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ......بس......لاہور میں رہنا نہیں چاہتا۔ بھائیوں سے جھگڑا ہے۔"

"کہیں اس کے ساتھ بھی تو کوئی غنڈا گردی نہیں کر رہے ہو تم؟"

مجید مٹھو نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا مگر لگتا تھا کہ عمران کا شک برقرار ہے۔ اس نے مٹھو سے سوال جواب جاری رکھے۔ یہاں تک کہ اس کو پریشر میں لانے کے لیے ایک بار پھر سگار سلگایا۔ سگار کی دہشت بڑی کارگر تھی۔ دوسری طرف بازو کی تکلیف بھی مٹھو کو بے حال کر رہی تھی۔ چار پانچ منٹ بعد اس نے ایک دم ہتھیار ڈال دیئے۔ اپنے سر پر عمران کے بوٹ کی ایک زوردار ٹھوکر کھا کر مجید مٹھو نے یہ انکشاف کیا کہ اکمل دراصل قادر لمبے کا ماموں زاد بھائی ہے اور وہ قادر کی بہن کو پسند کرتا ہے۔

یہ چکرا دینے والا انکشاف تھا۔ عمران کے ایک سوال کے جواب میں مجید مٹھو نے اعتراف کیا کہ اس نے اکمل کا نام غلط بتایا ہے۔ اس کا اصل نام فیاض ہے۔ فیاض اور کنول ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اب فیاض پاکستان سے باہر جانا چاہ رہا ہے۔

عمران نے کہا۔ "تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ فیاض باہر جانا نہیں چاہ رہا بلکہ تم اسے بھیج رہے ہو۔ اپنا اور صدیقی کا رستہ صاف کرنے کے لیے۔"

جواب میں مجید مٹھو خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے بازو کی تکلیف برداشت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے سفاک لہجے میں اقبال سے کہا۔ "یہ لاتوں کا بھوت ہے...... لاتیں پڑتی رہیں گی تو بولتا رہے گا۔ سگار رکھو اس کے سامنے۔"

اس مرتبہ عمران کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجید مٹھو اندر تک ہل گیا۔ اپنے خشک ہونٹ تر کرنے کے لیے اس نے پانی مانگا۔ اقبال نے بوتل سے اسے پانی پلایا۔ اس کے بعد مٹھو نے درخواست کی کہ سگار اس کے سامنے سے اُٹھا لیا جائے۔ وہ فیاض کے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپائے گا۔ عمران نے سلگتا ہوا سگار جس کی حیثیت اب ٹائم بم سے کم نہیں تھی، مٹھو کے سامنے سے اُٹھوا لیا۔

"ہاں...... اب بتاؤ۔ کہاں غائب کرنا چاہ رہے ہو لڑکے کو؟"

"غائب کرنے کی بات نہیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں پاکستان سے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ورک ویزے پر بھجوا دیتا ہوں۔"

"اب لگے ہاتھ یہ بھی بتاؤ کہ وہ کیوں جانا چاہتا ہے؟"

"تم تینوں سمجھ ہی گئے ہو۔ وہ کنول کو پسند کرتا ہے، پر اب کنول اس کی طرف توجہ نہیں دے رہی۔ وہ سمجھ گئی ہے کہ اگر وہ اپنے بھائی کو بچانا چاہتی ہے تو پھر اس کو صدیقی صاحب

سے شادی کرنی پڑے گی۔ دو تین ہفتے پہلے کنول کے گھر میں فیاض اور کنول کی بات ہوئی تھی۔ دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ کنول نے کہا تھا کہ وہ بار بار ان کے گھر کے چکر نہ لگائے، اس طرح ان کی بدنامی ہوتی ہے۔ کنول کی ماں نے بھی فیاض کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل کنول اور فیاض قریباً ہم عمر ہی ہیں۔ کنول کی ماں نے فیاض سے کہا کہ کنول کی شادی کی عمر گزری جا رہی ہے اور ایک سال کے اندر اندر وہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے لیکن وہ ابھی بے روزگار ہے۔ دو تین سال سے پہلے کمانے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ کنول کا خیال چھوڑ دے۔ اس کے بعد سے فیاض بڑا بددل تھا۔ اُلٹی سیدھی باتیں سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا اور کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ میں اس کام میں اس کی مدد کروں گا۔"

عمران نے کہا۔ "میاں مٹھو! میرے خیال میں اب بھی تم آدھا سچ بول رہے ہو۔ تم نے اس لڑکے کو سمجھایا نہیں بلکہ دھمکایا ہے۔ چلو وقت کے ساتھ یہ پول بھی کھل جائے گا۔"

"لڑکے کو لڑکی کے بدلے ہوئے رویے کی اصل وجہ کا پتا چلا ہے یا نہیں؟" اقبال نے سوال کیا۔

"بس اس کا یہی اندازہ ہے کہ کنول کی ماں اپنی بیٹی کی شادی کسی کھاتے پیتے بندے سے کرنا چاہ رہی ہے۔"

مٹھو سے کافی سوال جواب ہو چکے تھے۔ عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا۔ ہم تباہ حال گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ "اب اس کا کیا کرنا ہے؟" عمران نے اقبال سے پوچھا۔ اس کا اشارہ مجید مٹھو کی طرف تھا۔

"اس نے ہماری گاڑی دیکھ لی ہے اور ممکن ہے نمبر وغیرہ بھی پڑھ لیا ہو۔ اب ہم اسے چھوڑیں گے تو مصیبت میں پڑیں گے۔ اس کے علاوہ سیٹھ اور صدیقی وغیرہ بھی ایک دم ہوشیار باش ہو جائیں گے۔" اقبال نے کہا۔ اس نے بڑے اسٹائل سے سگار ہونٹوں میں دبا رکھا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، لگاؤ اس کو بھی انجکشن اور گاڑی میں ڈال لو۔ چار پانچ گھنٹے تو انٹا غفیل رہے گا۔ اتنے میں لاہور پہنچ جائیں گے۔"

"انجکشن ہے گاڑی میں؟" اقبال نے کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"میرے خیال میں ایک پڑا ہوا ہے۔ دیکھ لو نہیں تو پھر گولیوں سے کام چلائیں گے۔"

اقبال اوپر گاڑی کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ دور نیچے نشیب میں

کچھ ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں ایک دو روشنیاں شاید لالٹینوں کی تھیں، باقی ٹارچوں کی لگتی تھیں۔ یہ روشنیاں ڈھلوان پر قریباً ایک کلومیٹر دور ہوں گی۔ وہ سُست روی سے جائے حادثہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''لگتا ہے۔ کچھ لوگ اسی طرف آ رہے ہیں۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''تو پھر چلتے ہیں، اس کو انجکشن وغیرہ گاڑی میں ہی لگالیں گے۔'' عمران نے سرگوشی کی۔

اقبال نے میرے ساتھ مل کر مجید مٹھو کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ عمران اپنی موجودگی کی دیگر نشانیاں ختم کرنے لگا۔ رسیاں کھل گئیں تو مجید مٹھو درد سے کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میرا بازو ٹوٹ رہا ہے۔ ہاتھ کھول دو۔''

واقعی وہ شدید اذیت میں تھا۔ ٹوٹے ہوئے بازو کو پیچھے موڑ کر باندھا گیا تھا جس کی وجہ سے بازو کی شکل عجیب ہو گئی تھی۔

اقبال نے اس کے ہاتھ کھول دیئے اور یہ غلطی تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ ہاتھ کھولنے سے پہلے ہی پستول اپنے ہاتھ میں کر لیتا۔ لیکن پستول ابھی تک اس کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ یہ مجید مٹھو والا بریٹا پستول ہی تھا۔ مجید مٹھو جو بالکل نڈھال بلکہ نیم جان تھا، موقع دیکھ کر ایک دم حرکت میں آیا۔ اس نے پھرتی سے پستول پر جھپٹا مارا۔ پستول تو اس کے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس سے پہلے ایک اور کام ہو گیا اور اس کام کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ مجید مٹھو کو بھی نہیں تھی۔ اقبال کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگار ہوا میں اُچھلا اور پیٹرول پر جا گرا۔ پستول چھیننے کے بعد مجید مٹھو ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا تھا اور گاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اچانک بھک بھک کی زوردار آوازوں سے آگ بڑھکی اور اس نے مجید مٹھو اور اقبال کو لپیٹ میں لے لیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم پتھرا کر رہ گئے۔ مٹھو گاڑی کے زیادہ قریب تھا اس لیے وہ پورے کا پورا آگ کی زد میں آیا۔ اقبال کا نچلا دھڑ بھی آگ میں تھا۔ اقبال چلاتا ہوا پیچھے ہٹا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ عمران نے اس موقعے پر زبردست حاضر دماغی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے نیچے بچھا ہوا کمبل نما دھسا اُٹھایا اور اقبال پر پھینک دیا۔ شعلے پوری طرح بھڑکنے سے پہلے ہی دھوئیں میں تبدیل ہو گئے۔ مگر دوسری طرف کا منظر دیکھنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔

مجید مٹھو نے سرتاپا آگ پہن لی تھی اور بھیانک آواز میں چلا رہا تھا۔ وہ چند قدم مخالف

سمت میں دوڑا پھر ایک دم ٹھوکر کھا کر گرا اور کھائی میں لڑھک گیا۔ قریباً چالیس فٹ نیچے پتھریلی زمین سے اس کے ٹکرانے کی آواز بڑی لرزہ خیز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی مجید مٹھو کی کربناک آہ و بکا دم توڑ گئی تھی۔ پیٹرول، دھوئیں اور جلتے گوشت کی بُو نے فضا کو ایک دم مکدر کر دیا تھا۔

فوری طور پر ہم میں سے کوئی بھی ہمت نہ کر سکا کہ کنارے پر جا کر مجید مٹھو کا حشر دیکھ سکے۔ اقبال کی آگ بجھ گئی تھی تاہم وہ نڈھال سا زمین پر پڑا تھا اور یہی وقت تھا جب ایک خوفناک دھماکا ہوا اور پوری گاڑی آگ کا گولا بن گئی۔ اس کا گیس سلنڈر پھٹ گیا تھا۔ گاڑی کے کئی جلتے ہوئے ٹکڑے اُڑ کر دور تک گئے۔ عمران نے ٹارچ تھامی اور دل کڑا کر کے نشیب میں اُترا۔ میں بھی چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے گیا۔ میں نے دس پندرہ قدم کی دوری سے دیکھا، مجید مٹھو کا سلگتا ہوا جسم پتھروں اور سرخی مائل مٹی کے درمیان بے حرکت پڑا تھا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں اس کا سر ایک طرف سے بالکل پچکا ہوا نظر آیا۔ وہ مر چکا تھا۔ ہاں وہ شخص جو فقط ایک ڈیڑھ منٹ پہلے زندہ تھا اور بول رہا تھا، اب مٹی کا خونچکاں ڈھیر بن چکا اور بہت دور جا چکا تھا۔ یہی حیات کی بوالعجبی ہے۔

ہم ڈرتے ہوئے واپس آئے۔ عمران نے مجید مٹھو کا کمبل نما دھسا اُٹھا کر شعلوں میں پھینکا پھر اس کا پستول بھی ٹھوکر مار کر آگ میں پھینک دیا۔ نشیب سے اوپر آتی ہوئی روشنیاں اب نزدیک پہنچ گئی تھیں۔ یقیناً ان کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ آنے والے اب کسی بھی وقت موقعے پر پہنچ سکتے تھے۔ اقبال بغیر سہارے کے چلنے کے قابل تھا۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور دوڑتے ہوئے کار تک پہنچ گئے۔ چند ہی لمحے بعد ہماری گاڑی بل کھاتی پتلی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ہمارا رُخ واپس جہلم شہر کی طرف تھا۔

اقبال کی پتلون تقریباً نیکر کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ مجھے اس کی ٹانگوں پر جلنے کے سرخی مائل نشان نظر آئے۔ کہیں کہیں جلد چھل بھی گئی تھی۔ تاہم وہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔

''سوری یار! جو کچھ ہوا بالکل اچانک ہوا۔'' اقبال بولا۔ ''میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ مجھے سگار منہ میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

''مجھے بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس حالت میں ایسا کام کرے گا۔ بڑا ڈھیٹ پن دکھایا اس نے۔ لگتا ہے کہ وہ ہماری توقع سے زیادہ سخت جان تھا۔'' عمران نے کہا۔ میری نگاہوں میں سگار گرنے اور پھر ایک دم آگ بھڑک اُٹھنے کے مناظر گھومنے لگے۔ مجید مٹھو کا پچکا ہوا سر اور پھر سرخی مائل مٹی کو مزید سرخ کرتا ہوا اس کا خون...... مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کے

ساتھ ہی یہ خوف دامن گیر ہوا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ ایک نہایت سنگین واقعے میں ملوث ہو چکا ہوں۔ اگر پولیس تفتیش میں یہ حاشہ...... حاشہ نہ رہتا، قتل بن جاتا تو پھر میں بھی ملزمان کی فہرست میں آتا تھا۔

عمران کے اپنے چہرے پر بھی قدرے پریشانی کے آثار تھے لیکن جب اس نے مجھے پریشان دیکھا تو ایک دم اس نے اپنا مخصوص موڈ بحال کر لیا اور مسکرا کر بولا۔ ''آج بہت خاص دن ہے۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات ہو رہے ہیں۔''

''مثلاً؟'' میں نے جل کر پوچھا۔

''اقبال کی پینٹ کا دیکھتے ہی دیکھتے نیکر بن جانا کوئی معمولی واقعہ ہے؟ اور پھر دیکھو یہ کیسی انہونی ہوئی ہے کہ تم جیسے دابو شخص نے بھی آج ببر شیر والا کام کر دیا۔ بروقت ٹانگ چلا کر مجید کے ہاتھ سے پستول چھڑا دیا۔ اس کے بعد جو دھڑا دھڑ انکشافات ہوئے ہیں ہم پر...... وہ بھی کوئی معمولی نہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اب اگر پولیس پر بھی دھڑا دھڑ کچھ انکشافات ہو گئے تو پھر کیا ہوگا؟ تم نے مجید کو قریباً ڈیڑھ گھنٹہ رسیوں سے باندھے رکھا ہے۔ اگر اس کے جسم پر رسی کے نشان مل گئے تو اس سارے واقعے کا رُخ ہی بدل جائے گا اور پھر وہ لوگ جو نیچے کسی بستی سے موقعے کی طرف آ رہے تھے، وہ پتا نہیں کون تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بندہ پہلے اُلٹی ہوئی گاڑی کو دیکھ گیا ہو اور پھر نیچے سے بستی والوں کو لے کر اوپر آ رہا ہو۔ ایسے میں یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ہماری گاڑی اور اس کا نمبر بھی دیکھ لیا ہو۔''

عمران نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دور سے تمہاری تصویریں بھی اُتار لی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خفیہ پولیس ہی کا کوئی بندہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے پھرتی دکھائی ہو اور ہماری اس مہران کے نیچے سگنل چھوڑنے والی کوئی ڈیوائس بھی لگا دی ہو۔ یار! ایک تو تم سب سے پہلے وہ بات سوچنے لگتے ہو جو سب سے بعد میں اور سب سے بُرے حالات میں سوچنی چاہیے۔ بالکل پُرسکون رہو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ سے اور اپنی پولیس کی طرف سے پُرامید رہو۔ ہماری پولیس تفتیش کرتے ہوئے غور و فکر کے علاوہ اور سب کچھ کرتی ہے اور غور و فکر کے بغیر موقعے سے کچھ بھی ملنے والا نہیں۔''

''یارو! اب کچھ غور و فکر میری ٹانگوں پر بھی کر لو۔ تھوڑی تھوڑی جلن شروع ہو گئی ہے۔''

''ان کا انتظام بھی ابھی ہو جاتا ہے۔'' عمران نے اطمینان سے کہا۔

اب شہر کی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ عمران نے ایک ٹکا شاپ کے سامنے گاڑی روک

دی۔

''کیا میری ٹانگوں کو مزید روسٹ کرانا ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ سامنے گارمنٹس کی دکان ہے، وہاں سے تمہارے لیے پینٹ لیتے ہیں اور ساتھ ہی میڈیکل اسٹور ہے، وہاں سے دوا مل جائے گی۔ ایک دم فائیو اسٹار کام ہو جائے گا۔''

ہم گاڑی میں بیٹھے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد عمران جینز کی ایک پتلون لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ میں وہ ''ڈرمازین'' مرہم بھی لایا تھا۔ مرہم فوری طور پر اقبال کی ٹانگوں پر لگایا گیا اور اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی پتلون بھی پہن لی۔ عمران گاڑی کو سیدھا ایک ہوٹل لے گیا۔ یہاں تین بیڈ کا ایک کمرہ بک کرانے اور شفٹ ہونے میں ہمیں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہوٹل کی کھڑکی سے دریائے جہلم کے پل کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔

ہم نے ٹی وی کھولا تو نیوز چینل پر تھوڑی ہی دیر بعد کار حادثے کی پٹی چلنی شروع ہو گئی۔ خبر کچھ اس طرح دی جا رہی تھی۔ برانچ روڈ پر کار کھائی میں گر گئی۔ گیس سلنڈر پھٹنے سے آگ لگ گئی۔ جانی نقصان کا اندازہ لگایا جا رہا ہے۔

چند منٹ بعد یہ خبر دی جانے لگی۔ کار سوار شخص موقع پر ہلاک۔ آگ حادثے کے کافی دیر بعد لگی، عینی شاہدین کا بیان۔ موقعے پر گوشت سے بھرے ہوئے تین بڑے شاپر بھی ملے ہیں۔

''بند کرو جگر اس کو...... خوامخواہ کی ٹینشن ہے۔'' عمران نے کہا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ عمران، اقبال کے لیے کھانے والی دوا لایا تھا، اس کے علاوہ ایک انجکشن بھی تھا۔ اس نے اقبال کو انجکشن دیا۔ جلد ہی اسے تکلیف میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ وہ دونوں یوں صورتِ حال پر تبصرہ کرنے میں مصروف ہو گئے جیسے کوئی خاص واقعہ رُونما ہی نہیں ہوا۔ پتا نہیں وہ کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔

مجھے آج پھر سکون بخش گولیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پانی کے ساتھ دو گولیاں اکٹھی نگل لیں اور اپنا دھیان دو گھنٹے پہلے رُونما ہونے والے واقعات سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹی وی کی خبروں سے امید تو پیدا ہو گئی تھی کہ شاید اس حادثے کو اتفاقیہ ہی سمجھا جائے گا۔ یہ ایک بالکل ویران سڑک کے کنارے ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ عمران نے بڑی ہوشیاری سے موقعے پر سے ساری شہادتیں ختم کر دی تھیں۔ تیسری حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اپنے تعاقب کے دوران میں مجید مٹھو کسی ساتھی سے رابطہ قائم نہیں کر سکا تھا۔

جلد ہی میں سو گیا۔ اگلی صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی ذہن میں رات والے واقعات کی تشویش نے آ گھیرا۔ دل پر ایک دم بہت سا بوجھ پڑ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ بتدریج ایک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ دن کے ساڑھے دس ہو رہے تھے۔ سکون بخش گولیوں کا خمار ابھی تک حواس پر موجود تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی چوتھا شخص بھی موجود ہے۔ میں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ حسبِ معمول عمران اور اقبال ناشتہ کر چکے تھے بلکہ وہ چوتھا شخص بھی کر چکا تھا جو ان کے ساتھ ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے ہم نے کل شام لکڑی کی ورکشاپ سے مجید مٹھو کے ہمراہ نکلتے دیکھا تھا۔

مجھے جاگتے دیکھ کر عمران نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی لڑکے کا جائزہ لیتے ہوئے، عمران کے پیچھے ہوٹل کی بالکونی میں آ گیا۔ نیچے سڑک پر جہلم کا ٹریفک رواں دواں تھا۔ عمران مدھم آواز میں بولا۔ ''تم نے پہچان لیا ہوگا، یہ وہی فیاض ہے جس کے بارے میں کل رات مجید مٹھو نے بتایا تھا۔ یہ قادرے کی بہن کو پسند کرتا ہے۔''

''لیکن یہ یہاں کیسے پہنچا؟''

''میں سویرے اسے ورکشاپ سے نکال کر یہاں لایا ہوں۔ اس کے سامنے مجید مٹھو وغیرہ کی کوئی بات نہیں کرنی۔ میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں اور اس کی مدد کرنا چاہ رہے ہیں۔ پہلے تو وہ بہت ڈرا ہوا تھا، پر اب نارمل ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنستے جا رہے ہیں۔''

''بس سوچ کا فرق ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ہم پھنس رہے ہیں لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ ہم پھنس نہیں رہے بلکہ کسی پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہیں۔ اس کی مدد کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سکون محسوس کر رہا ہوں اور تمہارے چہرے پر ساڑھے دس بجے ہی بارہ بج گئے ہیں۔''

''کس پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہو؟''

''اس فیاض کو۔ یار! یہ بڑا دُکھی بندہ ہے۔ اس کو پیار کا روگ لگا ہوا ہے اور تم...... تو خود

اسی کشتی کے سوار ہو۔ ایک عاشق کو تو دوسرے عاشق کا درد سمجھنا چاہیے۔ تم اس تکلیف کو محسوس نہیں کرو گے تو کیا ہم جیسے کریں گے جنہوں نے کبھی اس ''گلی'' میں قدم ہی نہیں رکھا۔'' اس نے عجیب لہجے میں کہا اور مسکرانے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ فیاض صوفے پر کندھے جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے خوبرو چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا، ہاتھ میں وہی کھردرا پن محسوس ہوا جو محنت مشقت کرنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

میرے جاگنے سے پہلے شاید وہ لوگ کنول کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اب یہ گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوئی۔

عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہاں...... کیا کہہ رہے ہو تم؟''

وہ بوجھل آواز میں بولا۔ ''مجھے تو لگتا ہے سر جی! وہ بہت بدل گئی ہے۔ شاید وہ اب میرا ساتھ دینا ہی نہیں چاہتی۔''

''وہ بدلی نہیں۔ اسے بدلا گیا ہے۔ بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں کافی کچھ پتا کیا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ اس کا بھائی قادر اور والدہ کچھ بُرے لوگوں کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ بتا نہیں سکتی اس لیے بے وفائی کا الزام اپنے سر پر لے رہی ہے۔ آہستہ آہستہ ساری باتیں تم پر کھل جائیں گی۔ تم فی الحال ان باتوں کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ اپنے پھوپھی زاد قادرے کے بارے میں تمہیں کیا پتا ہے؟''

وہ کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر مرعوب لہجے میں بولا۔ ''سر جی! مجھے تو بس یہی پتا ہے کہ قادر بھائی کا اُٹھنا بیٹھنا کچھ خراب لڑکوں میں تھا۔ انہوں نے پھر محلے کی ایک لڑکی کو سڑک سے اُٹھایا۔ قادر بھائی بھی اس معاملے میں پھنس گیا۔ جن لڑکوں کا اصل قصور تھا، وہ تو امیر گھروں کے تھے۔ ان کے گھر والوں نے انہیں دائیں بائیں کر دیا۔ اب اس واردات کا بہت سارا بوجھ قادر بھائی پر آ رہا ہے۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے کہیں چھپا ہوا ہے۔ پولیس اس کے گھر والوں کو تنگ کرتی رہتی ہے۔ پھوپھی بہت پریشان ہے۔''

''اچھا...... مجید مٹھو سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟''

''میں ان دنوں بڑا پریشان تھا جی۔ مر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ بچوں کے ایک پارک میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ مجید صاحب میرے پاس آ بیٹھے۔ انہوں نے مجھ سے ہمدردی

کی باتیں کیں۔ میری کہانی سنی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے حالات اچھے کرنے کے لیے کویت چلا جاؤں۔ انہوں نے اس سلسلے میں میری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کوئی ہنر ہے؟ میں نے بتایا کہ ہنر تو کوئی نہیں۔ ایف اے کیا ہوا ہے، اب اپنے محلے میں ایک جنرل اسٹور چلاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں تین چار ہفتے لگا کر تھوڑی سی کارپینٹری سیکھ لوں۔ اس کے بعد وہ مجھے ورک ویزے پر باہر بھیج دیں گے۔ جو تھوڑے بہت پیسے میرے پاس تھے، وہ میں نے انہیں دے دیئے۔ انہوں نے کہا کہ باقی پیسے میں باہر جانے کے بعد بھیج دوں۔ مجھے مجید صاحب کے بارے میں زیادہ پتا نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کو مجھ سے ہمدردی ہے۔''

فیاض ''ہمدردی ہے'' کے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی تک مجید مٹھو کے المناک انجام سے بے خبر ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ کل رات اپنی ہی چالاکی کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا ہے۔

عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں مجید مٹھو سے کبھی ملا نہیں لیکن جہاں تک مجھے پتا ہے، اس کی شہرت ایک غنڈے کی ہے۔ ایسے لوگ بلاوجہ کسی سے ہمدردی نہیں جتاتے۔ تمہاری بات سننے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہے کہ مجید بھی ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے جنہوں نے قادر اور اس کے گھر والوں کو اپنے چکر میں پھنسایا ہوا ہے۔ یہ لوگ صرف کنول کو شادی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کر رہے ہیں۔ تمہیں اگر باہر بھیجا جا رہا ہے تو اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تمہیں کنول اور قادر وغیرہ سے دور کرنا چاہتے ہیں۔''

فیاض کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے عمران کی باتوں پر یقین آنا شروع ہو گیا ہے۔ اس یقین کے بعد اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی بیتابی کروٹیں لینے لگی تھی۔

''تم کب جا رہے تھے کویت؟'' اقبال نے پوچھا۔

''اگلے ہفتے جی...... پاسپورٹ بننے گیا ہوا ہے۔ میڈیکل بھی مجید صاحب نے کروا دیا تھا، اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا...... لیکن...... لیکن۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''کہو...... کہو۔'' عمران نے اسے حوصلہ دیا۔ ''تم ہم پر پورا اعتماد کر سکتے ہو۔ پورا اعتماد کرو گے تب ہی ہم تمہاری مدد کر سکیں گے۔''

''جو کچھ آپ بتا رہے ہیں جی...... اس کے بعد تو میں باہر جانے کا نہیں سوچوں گا۔ میں ایک بار پھر کنول سے ملنا چاہتا ہوں اور پھوپھی جان سے بھی۔''

''تمہیں ضرور ملنا چاہیے۔ بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس کے علاوہ تمہیں قادرے سے بھی ملاقات کرنی چاہیے۔''

''مگر قادر بھائی کا تو مجھے پتا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟'' فیاض نے کہا۔

''گھبراؤ مت، اس کو بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' عمران نے فیاض کا شانہ تھپکا۔

عمران کے اس انداز نے مجھے اس دن کی یاد دلا دی جب سیٹھ کے کارندوں نے مجھے مارا تھا اور میں بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کر ریلوے لائن پر سر رکھنے کا سوچ رہا تھا۔ تب بھی عمران ایسے ہی ایک پُرخلوص غم خوار کے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر جو تھپکی دی تھی، اس نے میرے اندر زندگی کی توانائی پیدا کی تھی۔ آج ویسی ہی تھپکی وہ فیاض کو دے رہا تھا۔

○......❖......○

ہم نے اگلے چوبیس گھنٹے جہلم کے اسی ہوٹل میں گزارے۔ مجید مٹھو کا موبائل فون ابھی تک عمران کے پاس تھا لیکن اس نے اسے آف کر دیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ضائع کر دے مگر ابھی تک اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ اقبال کو اپنی جلی ہوئی ٹانگوں کے سبب چلنے پھرنے میں تکلیف ہو رہی تھی تاہم وہ اسے برداشت کر رہا تھا۔ فیاض ہمارے ساتھ ہی تھا۔ وہ اس سازش سے کافی حد تک آگاہ ہو چکا تھا جو کنول کے گھر والوں کے اردگرد بُنی جا رہی تھی اور جس سے خود فیاض بھی بُری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگیں۔

ہم اگلے روز جہلم سے لاہور روانہ ہوئے اور قریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد راوی روڈ پر عمران کے گھر پہنچ گئے۔ یہاں عمران کا ساتھی آصف موجود تھا۔ وہ تیس پینتیس کے پیٹے میں تھا اور درمیانے قد کا خوش باش سا شخص تھا۔ میں اسے عمران کے ساتھ سرکس میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ہماری غیر موجودگی میں اس نے قادرے کی دیکھ بھال کی تھی۔ اس نے بتایا کہ قادر رات کو روتا گڑگڑاتا رہتا ہے۔ کل سے اسے تیز بخار بھی ہے۔ بہرحال گھر واپس پہنچتے ہی عمران نے آصف کو فارغ کر دیا اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی عمران نے فیاض کو بتا دیا تھا کہ وہ اس کی ملاقات ایک جانے پہچانے شخص سے کرانے والا ہے۔ اسے دیکھ کر فیاض کو خوشی ہوگی۔ فیاض کے چہرے پر تجسس نظر آ رہا تھا۔

عمران نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں قادرے کو رکھا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی قادر کی نظر سب سے پہلے اپنے ماموں زاد فیاض پر پڑی۔ قادر مجسم حیرت بن گیا۔ کچھ یہی

کیفیت فیاض کی بھی ہوئی۔ وہ کبھی قادر اور کبھی عمران کا چہرہ تکتا تھا۔ پھر قادر بھاگ کر آگے آیا اور فیاض سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ فیاض کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جب سے قادر پولیس کے ڈر سے روپوش ہوا ہے، آج پہلی بار فیاض اور وہ مل رہے ہیں۔

قادرا ابھی تک اسی لباس میں تھا جس میں ہم اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ دو دن پہلے میں نے طیش میں آ کر اس سے جو مار پیٹ کی تھی، اس کے آثار ابھی تک دو گہرے نیلوں کی صورت میں اس کے سرخ و سپید چہرے پر موجود تھے۔ ''قادر بھائی! تم کیسے ہو؟ ہم سب تمہارے لیے بڑے پریشان تھے۔'' فیاض نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''یہ سارے سوال جواب بعد میں ہو جائیں گے۔'' عمران نے تیزی سے کہا۔ ''فی الحال تمہیں اپنے گھر میں ایک فون کرنا ہے اور گھر والوں سے چار باتیں کرنی ہیں۔'' عمران کے لہجے میں تحکم تھا۔

''کیا کہنا ہے؟'' قادر ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔'' عمران نے کہا پھر وہ فیاض سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلو یار! تم ذرا دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

فیاض اپنے پھوپھی زاد قادر پر ایک پریشان نظر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ قادر کی حالت دیکھ کر یقیناً فیاض جان گیا تھا کہ اسے یہاں زبردستی رکھا گیا ہے اور اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے جیب سے قادر والا سیل فون نکالا۔ یہی فون تھا جس پر دو دن پیشتر قادر کی بہن کنول کا فون آیا تھا اور بعد میں اسی فون سے اقبال نے سیٹھ سراج کی آواز کی کامیاب نقل کرتے ہوئے صدیقی سے بات کی تھی۔ بعد ازاں عمران نے یہ فون آف کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

فون کو آن کرنے کے بعد عمران نے کہا۔ ''ہاں...... قادر بیٹا! فون پر کال کر کے تم نے اپنی بہن یا امی جان کو یہ بتانا ہے کہ......'' بات کرتے کرتے عمران ایک دم رُک گیا اور پُرسوچ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے اسے رُکتے ہوئے پوچھا۔

''ایک منٹ...... میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے کہا۔

ہم دونوں کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر کے برآمدے میں آ گئے۔ ''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یار جی! قادرے کے ساتھ کوئی بھی بھلائی کرنے سے پہلے تم سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اگر تم اسے معاف کرو گے تو میں بھی کر سکوں گا۔ ورنہ پھر بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ۔''

''تو تم اسے چھوڑنا چاہ رہے ہو؟''

''چھوڑیں گے...... تو اس کی بہن زبردستی کی شادی سے بچے گی نا۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، آخری فیصلہ تمہارا ہونا ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ قادر کے سامنے آنے کے بعد سے میں نے اس پر جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالی تھی۔ اسے بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ گالیاں دی تھیں، ذلیل کیا تھا۔ وہ معافی تلافی کرتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ دہائی بھی دیتا رہا تھا کہ وہ واجی اور اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم اس کے موبائل فون کے ذریعے واجی اور شکیل وغیرہ کے نمبروں پر کال ملانے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن وہ دونوں اپنی سم بدل چکے تھے۔ اب اس صورتِ حال میں قادرے کو مزید بند رکھنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں اسے اپنے کیے کی کافی سزا مل چکی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ اس کے گھر والے شدید معاشی بدحالی کا شکار تھے اور اس سارے چکر میں اس کی بہن کی زندگی بھی برباد ہو رہی تھی۔

اگر بات صرف قادرے کی ہوتی تو شاید میرے دل میں اس کے لیے اتنی جلدی نرم گوشہ پیدا نہ ہوتا مگر یہاں ایک بے گناہ لڑکی کی زندگی اور عزت کا سوال بھی تھا۔ اسے بھائی کے جرم کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں جب میں کنول اور فیاض کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے اپنا اور ثروت کا دُکھ یاد آ جاتا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا تھا عمران نے...... اگر ایک دل فگار دوسرے دل فگار کے درد کو نہیں سمجھے گا تو اور کون سمجھے گا۔ وہیں کھڑے کھڑے ایک دم میرا دل آنسوؤں سے بھر گیا۔ میں نے سوچا، میں ایک بے گناہ لڑکی کو برباد ہونے سے بچاؤں۔ شاید اس کے صلے میں قدرت مجھ پر اور ثروت پر بھی رحم کرے۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور عمران ایک بار پھر کمرے میں قادرے کے پاس تھے۔ وہ سکڑا سمٹا صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ عمران نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ''تم نے ترس نہیں کھایا تھا لیکن ہم تم پر ترس کھ

رہے ہیں۔ تیری بہن کو بچانا چاہ رہے ہیں جو تیرے کرتوتوں کی سزا زبردستی کی شادی کی شکل میں بھگتنے والی ہے۔ تم بھی سب کچھ جانتے ہو مگر بے غیرت بنے ہوئے ہو۔ اپنی جان چھڑانے کے عوض اپنی بے قصور بہن کو دوزخ میں دھکیل رہے ہو۔ دھکیل رہے ہو یا نہیں؟''

قادرے کے چہرے پر بزدلی اور خوف کی زردی چھائی رہی اور اس کا سر جھکا رہا۔ ندامت کے آنسو اس کی گدلی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

''چل فون لگا اپنی والدہ کو اور ان کو بتا کہ فیاض ان سے ملنے آرہا ہے۔ وہ ان کے لیے اچھی خبر لا رہا ہے۔ وہ ہر صورت اسے ملنے دیں۔''

''فیاض کو کیا کہنا ہے ان سے؟'' قادرے نے دبی آواز میں پوچھا۔

''سوال کرے گا تو مجھے تاؤ آ جائے گا۔ جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کر۔ باقی باتیں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ چل شاباش۔''

قادرے نے عمران کی ہدایت کے مطابق اپنے گھر کال ملائی۔ اس کی بہن کنول نے ہی کال اٹینڈ کی۔ ''بھائی! آپ کہاں تھے؟ اتنی کالیں کی ہیں کہ انگلیاں دُکھنے لگی ہیں۔ آپ نے فون بند کیوں کیا ہوا تھا؟''

''چارجر نہیں مل رہا تھا۔ ابھی ملا ہے۔'' قادرے نے بہانہ بنایا۔

''آپ کو پتا چلا ہے کہ کچھ مجید صاحب کے بارے میں؟'' کنول نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' قادرے نے چونک کر پوچھا۔

''آپ کو واقعی اب تک پتا نہیں؟'' کنول کی آواز بھرا گئی۔ قادرے نے نفی میں جواب دیا۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''جہلم کے قریب مجید صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ موقعے پر ہی ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے صدیقی صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا ہے۔''

''اوگاڈ......'' قادرے نے سر تھام لیا۔ پھر ڈری ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

عمران نے جھلائے انداز میں اشارہ کیا کہ وہ یہ باتیں چھوڑے اور وہ بات کرے جس کے لیے فون کیا ہے۔

اظہارِ حیرت اور اظہارِ افسوس کے چند جملوں کے بعد قادرے نے بہن کو بتایا کہ فیاض ایک بہت خاص کام کے لیے ان کے پاس آرہا ہے اور اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔

''لیکن وہ کیوں آرہا ہے؟'' کنول جز بز ہو گئی۔

''بس ایک اچھی خبر لا رہا ہے ہم سب کے لیے۔ باقی باتیں بعد میں بتاؤں گا۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد وہ متعجب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ غالباً وہ عمران کے منہ سے اس بات کی تصدیق چاہتا تھا کہ مجید مٹھو واقعی راہیِ ملکِ عدم ہو چکا ہے لیکن عمران نے اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی اور کمرے سے نکل آیا۔ اس گفتگو کے دوران میں قادرے، عمران کی ہدایت پر کنول سے یہ بھی پوچھ چکا تھا کہ صدیقی صاحب تو گھر میں نہیں ہیں یا انہیں آنا تو نہیں ہے؟ کنول نے ان سوالوں کا جواب نفی میں دیا تھا۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ عمران، کنول کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ کافی جلدی میں نظر آتا تھا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا تھا مگر جو کچھ بھی تھا، وہ اسے جلد سے جلد نمٹا لینا چاہتا تھا۔ اقبال تو اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے پر قائل کر لیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، اب میں اس کی باتوں سے جلدی قائل ہونے لگا تھا۔ اس کے علاوہ اس بھاگ دوڑ میں مجھے ذاتی دلچسپی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جتنی دیر عمران کے ساتھ مصروفِ عمل رہتا، میرا دھیان اپنے جانکاہ دُکھ کی طرف سے ہٹا رہتا تھا۔

قادرے کا گھر رشید پارک کے علاقے میں تھا۔ پانچ چھ مرلے کا مکان تھا۔ متوسط آبادی تھی۔ قادرے نے بتایا تھا کہ یہ کرائے کا گھر ہے۔ گلی اتنی بڑی نہیں تھی کہ گاڑی پارک کی جا سکتی۔ ہم نے گاڑی سے باہر ہی کھڑی کی۔ فیاض نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے سہمی ہوئی نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔ ''کون؟''

''میں فیاض ہوں پھوپھی جی۔''

چند سیکنڈ بعد ایک پریشان چہرے والی چالیس پینتالیس سالہ عورت نے دروازہ کھول دیا۔ فیاض نے اسے سلام کیا جس کا جواب سپاٹ لہجے میں دیا گیا۔ فیاض نے کہا۔ ''پھوپھی جی! ذرا بیٹھک کا دروازہ کھول دیں۔ میرے ساتھ دو مہمان بھی ہیں۔''

ادھیڑ عمر عورت پہلے ہی تذبذب میں تھی۔ مہمانوں کا سن کر مزید متذبذب ہو گئی۔ اس نے سرتاپا ہمارا جائزہ لیا۔ پھر اُلجھی اُلجھی سی اندر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد گلی میں کھلنے والے ایک دوسرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ یقیناً یہ بیٹھک کا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور ہم اندر چلے گئے۔

اسی دوران میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ قادرے والا فون تھا۔ عمران نے مجھے دیا تھا اور میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ فون اسکرین پر صدیقی صاحب کے الفاظ

چمک رہے تھے۔ عمران نے بھی نام پڑھا۔ پھر اشارے سے مجھے کہا کہ میں کال ریسیو کروں مگر خاموش رہوں۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے صدیقی کی پریشان آواز آئی۔

''کیا بات ہے قادر! ہیلو...... کہاں ہو۔ تم...... ہیلو۔ میں دس منٹ سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ بیل دے رہا ہوں۔ ہیلو...... ہیلو۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' عمران نے سرگوشی میں پوچھا۔

''لگتا ہے کہ وہ مجید مٹھو کے گھر کے باہر کھڑا ہے۔ اس کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ قادر وہاں گھر کے تہ خانے میں ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''ہمیں یہاں زیادہ وقت نہیں لگانا چاہیے۔ اگر ہو سکے تو......''

عمران کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ ادھیڑ عمر عورت دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ رہا تھا اور سانس تیز چل رہی تھی۔ ''پھوپھی جان!'' فیاض پکارا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالا۔ پھر اس نے آواز دی۔ ''کنول...... کنول۔''

ایک لڑکی چلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ فیاض کے ساتھ مل کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالنے لگی۔ ہم نے بھی مدد کی اور عورت کو سنگل صوفے سے اُٹھا کر بڑے صوفے پر لٹا دیا۔

لڑکی پانی لے آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ماں کو پانی پلایا۔ پھر اسے زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی۔ لڑکی جو یقیناً کنول تھی، شاید عام حالات میں ہمارے سامنے نہ آتی مگر شدید پریشانی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ اچھی شکل صورت کی تھی۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور ناک میں چھوٹا سا کوکا چمک رہا تھا۔ ماں کی حالت ذرا سنبھل گئی تو اس نے سر پر دوپٹہ لے لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔

فیاض نے صوفے پر ایک طرف دو تکیے رکھ کر کنول کی والدہ کو نیم دراز کر دیا۔ کنول نے اسے مزید دوا دی۔ عورت کراہتے ہوئے بولی۔ ''فیاض! ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ تمہیں خدا رسول کا واسطہ ہے۔ کیوں ہم سب کی جان لینے پر تلے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو ہماری جان۔''

وہ باقاعدہ رونے لگیں۔

عمران نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ''خالہ جان! یہ آپ نہیں، آپ کی مجبوریاں بول رہی ہیں اور ہمیں پتا ہے کہ آپ کی مجبوریاں کیا ہیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آ...... آپ لوگ کون ہیں؟'' کنول نے پوچھا۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

''تم ہمیں اپنے بھائی کا دوست سمجھ سکتی ہو لیکن وہ دوست نہیں جنہوں نے اسے تباہ

کرنے کی کوشش کی بلکہ وہ جو اسے تباہی سے بچانا چاہتے ہیں۔ دوبارہ زندگی کی طرف لانا چاہتے ہیں۔'' عمران نے کہا۔

''آپ...... کچھ نہ کریں بھائی جان!'' کنول نے پھر جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔ ''ہم اپنے طور پر کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آٹھ دس دن تک قادر بھائی گھر پہنچ جائیں گے۔'' بات کرتے ہوئے وہ بیچارگی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس خستہ تھا اور کندھے پہ قمیص کی سلائی اُدھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کندھے کو بار بار دوپٹے سے ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھی۔ گھر کی حالت سے بھی غربت جھلک رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ ''میری بہن! ٹھیک ہے کہ آپ دونوں قادر کو بچانے کی کوشش کرتی رہی ہیں لیکن وہ جس طرح کی کوشش تھی، اس کے بارے میں ہم اچھی طرح جان چکے ہیں اور آپ دونوں کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ اب کسی طرح کی کوشش کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ وہ مجبوری اب ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے آپ دونوں کو بار بار ابرار صدیقی سے ملنا پڑ رہا تھا اور اس کی ہر ہاں میں ہاں ملانا پڑ رہی تھی۔''

ابرار صدیقی کے نام نے ماں بیٹی کے چہرے متغیر کر دیئے۔ ''پپ...... پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' کنول ہکلائی۔

''تمہیں پتا ہے میری بہن۔'' عمران نے کہا۔ ''اور آپ دونوں کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ قادر کے لیے اب کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

قادر کی والدہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر دیکھا جائے تو قادر کے لیے کبھی کوئی بڑا خطرہ تھا ہی نہیں۔ بے شک اس نے جرم کیا ہے مگر کچھ لوگوں نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لیے اس جرم کا سارا بوجھ قادر پر ڈالا ہے۔ قادر کو اور آپ دونوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کچھ سوچے سمجھے جھوٹ بولے گئے ہیں۔''

''جھوٹ بولے گئے ہیں؟'' کنول کی والدہ حیران تھیں۔

''آپ کو بتایا گیا ہے کہ جس لڑکی کو اُٹھایا گیا تھا، اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ وہ جل گئی ہے اور ہسپتال میں خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ اس نے بیان دیا ہے کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے اور اس کا بڑا مجرم قادر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری باتیں بس ایک ڈرامے کا حصہ ہیں اور ڈراما یہی ہے کہ آپ لوگوں کو اتنا دہشت زدہ کر دیا جائے کہ آپ ہر جائز ناجائز بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ قادر بالکل خیر خیریت سے ہے اور ہمارے پاس ہے۔ اب آپ لوگوں کو تھوڑی سی ہمت کرنا ہوگی اور ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا ہوگا۔''

"آپ کا مطلب ہے کہ...... وہ لڑکی ہسپتال میں نہیں ہے اور اس کا بیان؟" کنول نے حیران لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ہے۔ یہ سب سیٹھ سراج کی چالبازی ہے۔ وہ بس ایڈووکیٹ صدیقی کے لیے راستہ صاف کر رہا ہے۔"

"پر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" کنول کے خوبرو چہرے پر اُلجھن تھی۔

اب عمران اسے کیا بتاتا اور اگر بتاتا بھی تو کنول اور اس کی ماں کی سمجھ میں کیا آنا تھا۔ درحقیقت تو یہ ٹیکسلا یا مردان کے کھنڈر سے نکلی ہوئی کسی "نادر شے" کا شاخسانہ تھا۔ وہ شے جو غالباً کسی گندھارن مورتی کی شکل میں تھی اور ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کے پاس تھی۔ اس گندھارن پیس آف آرٹ کو حاصل کرنے کے لیے سیٹھ سراج وغیرہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اس ایڑی چوٹی کے زور میں کنول کا کومل بدن اور اس کا شباب بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ بیچاری بے خبری میں ایک ایسے کھیل کا حصہ بن گئی تھی جو نادر اشیا کی نہایت منافع بخش نقل و حمل سے متعلق تھا۔ اسے رشوت کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا اور وہ لاعلم تھی۔

میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہنچی ہے۔ سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے سرِ راہ اس کی گاڑی کو ٹکر لگوائی تھی۔ اس ٹکر کے نتیجے میں گاڑی کے اندر رکھی ہوئی کچھ بوریاں پھٹ گئی تھیں اور ان میں سے چاولوں کے ساتھ مٹی برآمد ہوئی تھی۔ اس مٹی کے ڈانڈے بہت دور جا ملے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ عمران کے تیز رفتار ذہن نے رات کو ہی بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ کنول، اس کی والدہ اور قادر کو فوری طور پر لاہور سے ملتان بھجوانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لیے وہ کافی حد تک انتظام بھی کر چکا تھا۔ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر وہ ماں بیٹی کو پوری طرح قائل کر چکا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اور وہ حالات کی اس حیران کن تبدیلی پر ششدر نظر آتی تھیں۔ فیاض کی کیفیت بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ اب ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی بڑی اچھی طرح آ رہی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ مجید مٹھو اسے بیرون ملک بھجوانے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا، اس کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس نے یہ ساری بات اپنی پھوپھی اور پھوپھی زاد کنول کو بتائی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر کنول اور اس کی والدہ گھر کو تالا لگا کر ہمارے ساتھ روانہ ہو رہی تھیں۔ گھر میں کوئی ایسا قیمتی سامان تھا ہی نہیں جسے وہاں سے سمیٹا جاتا۔ بس ایک دو گہنے اور تھوڑی سی نقدی تھی۔ یہ چیزیں انہوں نے ساتھ لے لیں۔ ہم واپس راوی روڈ پر پہنچے۔ وہاں

سے قادر کو گاڑی میں بٹھایا گیا۔ قادر نے ماں اور بہن کے گلے لگ کر آنسو بہائے۔ تب اس نے اچانک میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور رو رو کر معافی مانگی۔ میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے دل میں سوچا، میں معافی دینے یا نہ دینے والا کون ہوتا ہوں؟ معافی تو وہ دیں جن کے والدین کی جان اس جرم نے لے لی۔ جن کا گھر اجڑا...... جو دربدر ہوئے۔ قادر کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ ہونے کے باوجود میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ عمران ان چاروں کو لے کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ ان چاروں میں قادر، کنول ان کی والدہ اور ماموں زاد فیاض شامل تھے۔ ان کو لاہور اسٹیشن سے ملتان جانے والی ایکسپریس ٹرین میں سوار ہونا تھا۔ ملتان میں انہیں عمران کے دوست نے محفوظ ٹھکانے تک پہنچانا تھا۔ وقتِ رخصت میں نے کنول کی آنکھوں میں اُمید کی خوبصورت کرنیں دیکھیں۔ کچھ ایسی ہی کرنیں فیاض کی آنکھوں میں بھی تھیں۔

میں بستر پر لیٹا رہا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج قادر اور اس کے گھر والوں کا ملاپ دیکھ کر مجھے اپنے بچھڑے ہوئے بھی شدت سے یاد آنے لگے تھے۔ پتا نہیں کہ کتنا وقت گزر چکا تھا ان سے ملے ہوئے؟ اب تو میں دنوں کی گنتی بھی بھول چکا تھا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے والے چاند نے میری اُداسی کچھ اور بڑھا دی۔ مجھے لگا کہ ایک زمانہ بیت گیا ہے اپنی والدہ کی گود میں سر رکھے ہوئے اور اپنی بہن کا ماتھا چومے ہوئے اور اپنے بھائی کو گلے سے لگائے ہوئے۔

میری آنکھوں میں نمی جاگنے لگی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کیوں میں اپنے گھر والوں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا؟ اگر میں اپنے محلے میں نہیں جانا چاہتا تھا، اپنی جان پہچان والوں سے نہیں ملنا چاہتا تھا تو یہ اور بات تھی مگر اپنے گھر والوں سے ملنے کا کوئی راستہ تو مجھے نکالنا چاہیے تھا۔ میں دیر تک اس بارے میں غور کرتا رہا۔ پھر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو اقبال میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے ہی مجھے ہلا کر جگایا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یار! عمران ابھی تک نہیں آیا۔ اس کا فون بھی بند ہے۔"

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ "اتنی دیر کیوں کر دی؟" میں نے کہا۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک اسے آ جانا چاہیے تھا۔ گیارہ بجے ٹرین چلنی تھی۔"

"لیکن ہماری ٹرینیں لیٹ بھی ہوں تو گھنٹوں اور دنوں کے حساب سے ہوتی ہیں۔"

"بھئی فون تو کر دیتا۔" اقبال نے کہا اور ایک بار پھر اسے کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

"جیلانی یا کسی اور یار دوست کو کر کے دیکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"کیا ہے لیکن کسی کو پتا نہیں۔" اقبال بولا اور ایک بار پھر کسی کو کال ملانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اُٹھ کر چائے تیار کی اور اقبال کے ساتھ مل کر عمران کا انتظار کرنے لگا۔ یہ گھر بارونق علاقے میں تھا۔ سارا دن گلی محلے اور بازار کا شور سنائی دیتا رہتا تھا لیکن اب اس گھر کے اردگرد زندگی سوئی پڑی تھی۔ اذانیں ابھی نہیں ہوئی تھیں۔ "کوئی بات نہیں یار! کہیں رُک گیا ہوگا۔" میں نے اقبال کو تسلی دی۔

"میں اس لیے پریشان ہوں کہ وہ ایسی غیر ذمے داری دکھاتا نہیں۔ اسے کہیں رُکنا ہوتا تو کسی بھی طرح فون پر اطلاع ضرور دیتا۔"

"ہو سکتا ہے کہ آناً فاناً کوئی کام پڑ گیا ہو۔ وہ خدائی فوجدار تو ہے ہی...... کسی کا مسئلہ حل کرنے میں لگ گیا ہوگا۔ پچھلے ہفتے بھی تو ہم لنچ پر اس کا انتظار کرتے رہے تھے اور وہ چاچے نذیر کو لے کر ہسپتال پہنچا ہوا تھا۔"

ہم باتیں کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کسی ایسی آواز یا آہٹ کے منتظر رہے جو عمران کی آمد کی نوید دیتی۔ بازار سے کوئی گاڑی گزرتی تو ہمارے کان کھڑے ہو جاتے لیکن جلد ہی اندازہ ہوتا کہ یہ عمران کی گاڑی کی آواز نہیں ہے۔

دن چڑھ گیا تھا لیکن عمران کی واپسی نہیں ہوئی۔ اقبال کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ایک تو وہ اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے تکلیف میں تھا، دوسرے عمران کی پریشانی اسے شدید متاثر کر رہی تھی۔ اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بازار کے شیر فروش غلام نبی کا ملازم لڑکا ایک ٹرے میں ہم تینوں کا بھاری بھرکم ناشتہ لیے کھڑا تھا۔ روزانہ یہی لڑکا ناشتہ لے کر آتا تھا۔ نہاری، نان، حلوہ اور زبردست قسم کی لسی۔

میں ناشتہ لے کر اندر آ گیا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ دس بج گئے مگر ہم دونوں میں سے کسی نے ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پریشانی بڑھ رہی تھی۔ عمران جس قسم کے روز و شب گزار رہا تھا، وہ میرے سامنے تھے۔ اس کی دوستیاں بہت تھیں تو دشمنیاں بھی بہت تھیں۔

ساڑھے دس بجے کے قریب جیلانی آ گیا۔ اس نے کہا۔ "ریلوے اسٹیشن سے ہو کر آ رہا ہوں۔ ملتان جانے والی ٹرین صرف پندرہ بیس منٹ کی تاخیر سے سوا گیارہ بجے روانہ ہو گئی تھی۔"

"کہیں اور بھی پتا کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میو ہسپتال اور گنگا رام کی ایمرجنسی دیکھ کر آیا ہوں۔ سرفراز سے کہا ہے کہ وہ آس پاس کے دو تین تھانوں میں پتا کر لے۔ مگر لگتا نہیں کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ اگر ہیرو بھائی نے رابطہ کرنا ہوتا تو وہ کہیں سے بھی کر سکتے تھے۔ یا تو وہ کہیں بُری طرح پھنس گئے ہیں یا جان بوجھ کر رابطہ کرنا نہیں چاہ رہے۔"

"کہیں آزاد ہونے کے بعد اس قادر لمبے نے ہی کوئی چکر نہ چلا دیا ہو؟" جیلانی نے کہا۔

"لگتا تو نہیں ایسے۔" اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو بس اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کا اصل چہرہ بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔ وہ ان سے کہیں دور چلا جانا چاہتا ہے۔"

اگلے تین چار گھنٹے بھی شدید پریشانی میں گزرے۔ کہیں سے عمران کا فون آیا اور نہ اس کی گاڑی کا کوئی سراغ ملا۔ قادر کا موبائل بھی عمران ہی کے پاس تھا۔ اس نمبر پر بھی اقبال اور جیلانی نے بہت سی کالیں کیں مگر جواب ندارد۔ اسی دوران میں سرکس سے اسسٹنٹ منیجر عباس کا فون آ گیا۔ اسے عمران کی گمشدگی کی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ بھی ازحد پریشان تھا۔ اپنے طور پر وہ بھی عمران کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

سرکس سے فون آیا تو میرا دھیان شاہین کی طرف چلا گیا۔ وہ عمران کی گرل فرینڈ تھی۔ کم از کم عمران کہتا تو یہی تھا۔ وہ اکثر سرکس میں اور پھر فون پر بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ وہ اسے اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کہتا تھا۔ اس نے بچوں کے نام اور پیشے وغیرہ بھی منتخب کر رکھے تھے۔ اس حوالے سے شاہین کے ساتھ اس کی دلچسپ نوک جھوک ہوتی تھی۔ میں نے اقبال سے کہا۔ "یار! کہیں وہ شاہین کے پاس ہی نہ چلا گیا ہو۔"

"نہیں یار! اس کے بارے میں وہ اتنا سنجیدہ نہیں کہ رات گزارنے اس کے پاس چلا جائے۔"

"مگر شاہین کا بھی تو کوئی فون نہیں آیا۔ اگر سرکس میں اس کے گم ہونے کا پتا چل گیا ہے تو شاہین کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔"

"لیکن ضروری نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ عباس نے جان بوجھ کر یہ خبر شاہین سے چھپائی ہو۔ وہ بڑی جلدی رونا دھونا شروع کر دیتی ہے۔"

پتا نہیں کیوں مجھے چند ہی گھنٹوں کے اندر اپنے اردگرد ایک خلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ عمران کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ اس کی غیر موجودگی کو نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ حواس پر چھا جاتا تھا۔ دل و دماغ میں سرایت کر جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا، ایک دن وہ تھا کہ ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے وہ مجھے سرِراہ ملا تھا۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن وہ میرے مُردہ جسم کے ساتھ زندگی بن کر چمٹ گیا تھا۔ میں دو تین روز اس کوشش میں رہا تھا کہ موقع ملتے ہی اس کے پاس سے کہیں کھسک جاؤں لیکن آج یہ صورتِ حال تھی کہ اس کی غیر موجودگی مجھے اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنی تمام تر پریشانیوں کے ساتھ میں ایک دم اکیلا رہ گیا ہوں۔ کسی کی خوبصورت مسکراہٹ، کسی کی چوڑی چھاتی اور مضبوط بازوؤں نے میرے اردگرد حفاظت کا جو حصار سا بنا رکھا تھا، وہ ایک دم ٹوٹ گیا ہے۔ میں اسے دوبارہ دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوگیا۔

شام کے سات بجے تھے۔ جیلانی اور سرفراز، عمران کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ گھر میں اقبال اور میں تھے۔ کال بیل ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا اور چونک گیا۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ یہ عمران کا وہی پرانا دوست تھا جس نے ایک رات ہمیں میڈم کی لال کوٹھی سے بروقت نکالا تھا اور ایک بڑی مصیبت سے بچایا تھا۔ بعد میں وہ یہاں عمران سے ملنے بھی آیا تھا۔ آج کافی دنوں بعد میں دوبارہ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ "السلام علیکم" اس نے کہا اور لنگڑاتا ہوا تیزی سے اندر آ گیا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے۔" اس نے ترت جواب دیا۔ "اقبال کہاں ہے؟" میں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "کوئی اور تو نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں۔"

ہم دونوں کمرے میں اقبال کے پاس آ گئے۔ اقبال نے اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے نیکر پہن رکھی تھی اور کسی کو فون کر رہا تھا۔ سلیم کو اور اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر وہ بھی چونک گیا۔ سلیم نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ "اقبال بھائی! اچھی خبر نہیں ہے۔ ہیرو بھائی کو میڈم کے گارڈز نے پکڑ لیا ہے اور کوٹھی لے گئے ہیں۔ میڈم کو بہت کچھ پتا چل گیا ہے۔"

یہ دھماکا خیز اطلاع تھی۔ اندیشے تو ہمارے ذہنوں میں بہت سے تھے لیکن یہ تو بدترین

اندیشہ تھا جو حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" اقبال نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے اقبال بھائی! عمران بھائی کی گاڑی بھی لال کوٹھی میں ہے۔ گاڑی کی رجسٹریشن بک میرے اندازے کے مطابق گاڑی کے اندر سے نہیں ملی لیکن رجسٹریشن آفس سے تو ایڈریس کا پتا چل سکتا ہے۔ اگر رجسٹریشن میں یہاں کا ایڈریس ہی لکھا ہے تو میڈم کے بندے کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہیرو بھائی کے بعد اب آپ دونوں بھی سخت خطرے میں ہیں۔ آپ دونوں کو فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

"لیکن...... یہ سب ہوا کیسے؟"

"میں نے کہا ہے نا بھائی! یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ آپ بس فوراً یہاں سے نکلیں۔ میں خود کو سخت خطرے میں ڈال کر صرف آپ کی خاطر یہاں آیا ہوں۔"

"ہم کہاں جا سکتے ہیں؟"

"کہیں بھی...... لیکن یہاں سے تو فوراً نکلنا ہوگا۔"

"کیسے جائیں گے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میں ایک دوست کی سوزوکی وین لایا ہوں۔ بازار کے کونے پر کھڑی ہے۔"

سلیم کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ واقعی پریشان ہے اور جو کہہ رہا ہے خلوص سے کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں نے آپس میں مختصر مشورہ کیا اور سلیم کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اقبال نے پتلون پہنی اور کچھ ضروری اشیاء ایک شولڈر بیگ میں رکھیں۔ ان میں کولٹ پسٹل اور اس کی قریباً پانچ درجن گولیاں بھی تھیں۔

سلیم نے کہا۔ "اپنے باقی ساتھیوں کو بھی اطلاع دے دو کہ ان میں سے کوئی بھی اب یہاں نہیں آئے۔ وقتی طور پر یہ سارے لوگ اپنے ٹھکانوں سے اِدھر اُدھر ہو جائیں۔"

اقبال نے جیلانی کا نمبر ملایا اور اسے مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اسی دوران میں سلیم سوزوکی وین کو بالکل گھر کے دروازے کے پاس لے آیا۔ یہ اقبال کے لیے بہتر تھا۔ اپنی زخمی ٹانگوں کے ساتھ چلنا اس کے لیے کافی دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد ہم گھر کو تالا لگا کے سوزوکی وین میں سوار ہو رہے تھے۔ میں سلیم کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اقبال پچھلی نشست پر چلا گیا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ بازار کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ دکانوں پر رش تھا۔ ٹی وی چل رہے تھے، قہقہے گونج رہے تھے۔ ایک تھڑے پر

چاچا نذیر، میاں اکبر اور ان کے دیگر عمر رسیدہ ہم جولی چائے پینے اور گپیں لگانے میں مصروف تھے۔ زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ اس کا موسم عموماً ایک ہی رہتا ہے۔ تاہم دیکھنے والی آنکھ کے لیے یہ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کا تعلق انسان کے اپنے اندر کے موسم سے ہوتا ہے۔ ہمارے اندر دُکھ، پریشانی اور کسی حد تک خوف کا موسم تھا اور اس کیفیت کی وجہ سے ہمارے اردگرد موجود زندگی کی کیفیت بھی بدل گئی تھی۔

ڈبل ڈور وین سُست روی سے چلتی بازار سے گزری اور پھر بڑی سڑک پر آگئی۔ بڑی سڑک پر آتے ہی جیسے سلیم کی شدید پریشانی ماند پڑنا شروع ہوگئی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب تم دونوں کم از کم فوری مصیبت سے تو بچ گئے ہو۔ اب کسی بازار کے چائے خانے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر سوچ لو کہ اب کہاں جانا ہے۔"

"عمران! ٹھیک تو ہے نا؟" میں نے اندرونی بیتابی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"تابش بھائی! میں آپ لوگوں کو جھوٹی تسلی دینا نہیں چاہتا۔ انہوں نے عمران بھائی سے مار پیٹ کی ہے لیکن...... یہ تو شروعات ہے۔ آگے کیا ہوگا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میڈم بہت زیادہ غصے میں نظر آتی ہے۔"

گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رُکی۔ یہ مینار پاکستان کا علاقہ تھا۔ منٹو پارک کی طرف جانے والی سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ ایک شخص دائیں طرف سے گاڑی کے قریب آیا۔ میں سمجھا کہ وہ مانگنے والا ہے یا پھر راستہ پوچھنے والا۔ اچانک اس نے گاڑی کا سلائیڈنگ دروازہ کھولا اور اقبال کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عین اسی لمحے بائیں طرف والے دروازے پر بھی ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے ادھ کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر لاک ہٹایا اور دروازہ کھول کر اقبال کی بائیں طرف بیٹھ گیا۔

یہ اتنی تیزی اور صفائی سے ہوا کہ بھری پُری سڑک کے باوجود کسی کو کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ دیکھنے والوں کو بالکل یہی لگا ہوگا کہ اندر آنے والے ہمارے شناسا ہیں اور ہم نے شاید انہیں سرِ راہ لفٹ دی ہے۔ پہلے داخل ہونے والے شخص نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

"میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

اس کی آواز میں موجود سنگینی گواہ تھی کہ وہ صرف دھمکا نہیں رہا۔ میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ہاتھ بڑھا کر میری سائیڈ والے دروازے کو لاک کر دیا اور احتیاطاً اپنا ہاتھ لاک کے اوپر ہی رکھا تاکہ میں اچانک باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کے پاس سے الکحل اور

سگریٹ کی ملی جلی بُو آرہی تھی۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ منطقی طور پر پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اس سے پہلے عمران پر ہاتھ ڈال چکے ہیں۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، سلیم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ "خبردار سلیمے۔" دائیں طرف والا شخص پھنکارا۔ "اب کوئی چالاکی دکھائی تو یہیں پر ڈھیر کر دوں گا اور پستول پر سائلنسر چڑھا ہے، کسی کو آواز تک نہیں آئے گی۔ تیرا کھوپڑا اٹوٹنے کی۔"

بولنے والے کی آواز میں ایسی درندگی تھی کہ سلیم بے ساختہ اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا۔

"چل...... اشارہ کھل گیا ہے۔ بس چپ چاپ سیدھا چلتا جا۔ جہاں مڑنا ہوگا، تمہیں بتا دیں گے۔"

اب اس بات میں شبہ کم ہی رہ گیا تھا کہ یہ میڈم نادیہ یا صفورا کے پالتو غنڈے تھے۔ ممکن تھا کہ کسی شک کی بنا پر انہوں نے سلیم کا پیچھا کیا ہو اور یہاں تک پہنچ گئے ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد یہ "پیچھے" والی بات درست معلوم ہونے لگی۔ ایک ٹویوٹا جیپ مسلسل ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ ہماری وین میں گھسنے والے دونوں افراد نے جیپ والوں کو ہاتھ سے چند اشارے بھی کیے۔ ہماری گاڑی میں گھسنے والے دونوں افراد صورتوں سے ہی بدمعاش نظر آتے تھے۔ وہ دونوں یقیناً اس جیپ سے ہی اُترے تھے۔ دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں لمبی نال کا پستول تھا جس کی ایک جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ یہ لمبی نال دراصل پستول کا سائلنسر تھا۔ دوسرے شخص نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ مجھے شک پڑ رہا تھا کہ اس کی چادر کے نیچے کوئی چھوٹے بیرل والی رائفل ہے۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست ہوا۔

ایک جگہ سلیم نے گاڑی آہستہ کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا یا اس قسم کا کوئی اور کام ہو جائے گا۔ وہ کانپتی آواز میں گرم چادر والے کو مخاطب کر کے بولا۔ "میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں بختیار صاحب۔"

"بکواس بند کرو۔" عقب سے دھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ "چپ چاپ گاڑی چلاتے رہو۔ اب جو بات ہوگی، کوٹھی پہنچ کر ہی ہوگی۔"

"لیکن میں نے......"

"چپ ہو جا۔" گرم چادر والا چنگھاڑا۔ "نہیں تو ابھی گردن توڑ دوں گا۔" میں نے

بولنے والے کی آواز اور لب و لہجے سے اندازہ لگایا کہ یہ ان گارڈز میں سے ایک ہے جن سے چھوٹی میڈم کی کوٹھی میں عمران اور اقبال کی مارا ماری ہوئی تھی۔ بعدازاں عمران نے ان ہٹے کٹے گارڈز کو دو باتھ رومز میں بند کر دیا تھا۔

عقب میں بیٹھا ہوا چادر پوش ڈرائیونگ کے سلسلے میں سلیم کو ہدایات دیتا رہا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم شاہراہ قائداعظم پر آ گئے ہیں اور ایئرپورٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ ایئرپورٹ کی طرف جانے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہمیں لال کوٹھیوں میں لے جایا جا رہا ہے۔

میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ ہمیں کسی پولیس ناکے پر روک لیا جائے اور پولیس والوں کو علم ہو جائے کہ اس گاڑی میں کیا صورتِ حال ہے لیکن یہ تو تب ہوتا، جب پولیس اہلکار سرسری جائزہ لینے کے بجائے غور و فکر کرتے اور عمران نے صرف تین دن پہلے کہا تھا کہ ہماری پولیس غور و فکر کرنے کے علاوہ اور سب کچھ کرتی ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم دو ناکوں پر سے گزرے اور خیر خیریت سے گزر گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ''خیر خیریت'' میڈم کے کارندوں کے نقطہ نظر سے تھی۔

یہ بڑا کٹھن سفر تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں پھانسی کا سزاوار ہوں اور پھانسی پانے کے لیے تختۂ دار کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں کیا ہو گا؟ وہ لوگ کس طرح پیش آئیں گے؟ کیا وہ جان چکے ہیں کہ ہم اس سے پہلے ایک دفعہ لال کوٹھی میں گھسے تھے؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ مجید مٹھو کی موت میں ہمارا ہاتھ ہے؟ اس طرح کے اَن گنت سوالات تھے جو ذہن میں اودھم مچا رہے تھے اور گاڑی بھاگتی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر تناؤ اور خاموشی کی ایک ایسی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں کل رات اپنے گھر والوں سے ملنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ مجھے آج یا پھر کل اس پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ والدہ، فرح اور عاطف کو گھر سے باہر کہیں بلانا تھا اور ان سے ملاقات کرنا تھی لیکن اب وہ ملاقات ایک دور دراز کا خیال محسوس ہوتی تھی۔ ایک بعید از قیاس سوچ۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں جن راستوں پر چل کر لال کوٹھیوں کی طرف جا رہا ہوں، ان راستوں کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ نہ ان در و دیوار کو نہ ان لوگوں کو، نہ اس شہر کی گہما گہمی کو۔ مجھے شاید گولی مار دی جائے گی اور لال کوٹھی کے اندر ہی کسی باغیچے وغیرہ میں گاڑ دیا جائے گا۔

پھر عمران کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے ایک دن کہا تھا۔ ''یار! ایک تو تم وہ بات سب سے پہلے سوچنے لگتے ہو جو سب سے آخر میں سوچنی چاہیے۔ تمہارے

ذہن میں ہر طرح کے اندیشے بجلی کی رفتار سے داخل ہوتے ہیں۔''

کیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا؟ میں خوف پیدا کرنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس طرح تکلیف دہ خیالات سے چھٹکارا کہاں ملتا ہے۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی رہائشی علاقے میں داخل ہوئیں اور پھر لال کوٹھیوں کے اندر چلی گئیں۔ اقبال تو شاید پہلے بھی اس طرح کے حالات سے گزرتا رہا تھا مگر میری حالت بُری تھی۔ لگتا تھا کہ دل سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہے اور پورے جسم میں سے خون نچڑ گیا ہے۔

میرے لیے سب سے تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ اگر یہاں لال کوٹھیوں میں میری ملاقات سیٹھ سراج یا اس کے کسی ایسے کارندے سے ہو گئی جو مجھے جانتا ہوا تو پھر کیا ہو گا؟ ایسی صورت میں مَیں براہِ راست اس سارے معاملے میں ملوث ہوتا تھا۔ میرے ملوث ہونے کے بعد میرے اور میرے گھر والوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور یہی وہ خوف تھا جو پہلے دن سے آج تک ہر گھڑی میرا دامن گیر رہا تھا۔

گاڑی چھوٹی میڈم یعنی نادیہ کی کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر رُک گئی۔ اس کے پیچھے ٹویوٹا جیپ رُک گئی۔ گاڑی رُکتے ہی میڈم کے گارڈز نے سلیم کو کھینچ کر وین میں سے نکال لیا اور بُری طرح مارنا شروع کر دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ منت بھی کر رہا تھا۔ اس کا کوٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ لوگ اسے کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ عمران کی موجودگی میں میرے اندر جو خاص قسم کی توانائی پیدا ہو جاتی تھی، اس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

بہر طور خیریت ہی گزری۔ فوری طور پر ہمارے ساتھ مار پیٹ نہیں کی گئی۔ ہمیں کوٹھی کے مہمان خانے میں لے جایا گیا۔ اس عمارت کے داخلی دروازے پر ''انیکسی'' کے الفاظ لکھے تھے۔ پہلے ہمیں ایک چوکور کمرے میں بٹھایا گیا۔ گرم چادر والا خطرناک صورت گارڈ مسلسل ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے چادر کے نیچے سے روسی ساخت کی چھوٹے بیرل والی رائفل نکال لی تھی۔ ایک گارڈ کمرے سے باہر بھی چوکس حالت میں موجود تھا۔ عمارت کے کسی قریبی کمرے سے رونے چلانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں ہمارے رونگٹے کھڑے کر رہی تھیں۔ بلاشبہ یہ سلیم کی آوازیں تھیں۔ اسے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''انتظار کی تکلیف کے لیے تم دونوں

سے معافی چاہتے ہیں۔ تمہارے یار سلیم کو پھینٹی لگ رہی ہے۔ پانچ دس منٹ میں وہ فارغ ہو جاتے ہیں تو پھر تمہاری باری آتی ہے۔"

میرے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ گارڈ بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میرے تاثرات نوٹ کرنے کے بعد بولا۔ "اگر سلیم صاحب والی عزت افزائی سے بچنا چاہتے ہو تو کچھ چھپا کر نہ رکھنا۔ بس یہی ایک قیمتی مشورہ ہے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میری نگاہیں عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی سلامتی اور زندگی کے حوالے سے میری بے قراری انتہا کو پہنچنے لگی۔ اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر میں نے دو گارڈز کے ساتھ ایک عورت کو آتے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اسے یہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یقیناً اقبال کی بھی یہی کیفیت رہی ہوگی۔ یہ ہٹی کٹی عورت زلیخا تھی۔ وہی جس سے ہماری ملاقات ہڑپہ کے ایک مکان میں ہوئی تھی۔ اس دھند آلود سرد رات میں ہم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ زلیخا کے گھر کے ایک کمرے میں ایک کنواں نما گڑھا ہے۔ زلیخا کے ساتھ سراج کا ناجائز تعلق بھی ثابت ہوا تھا۔ بعدازاں زلیخا اور اس کے بارے میں اپنی زبان بالکل بند رکھیں گے مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے۔

زلیخا نے چادر کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ وہ آج بھی زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھی اور کانوں میں جگمگاتے جھمکے تھے۔ وہ بولی۔ "ہاں جی...... یہی ہیں وہ دونوں۔ یہ اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں۔"

"یہ کون سی خفیہ پولیس ہے بھئی جس کا پتا خفیہ پولیس کو بھی نہیں؟" گارڈز نے اقبال کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

اقبال کی ٹانگ پہلے ہی زخمی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

زلیخا سے ہماری شناخت پریڈ کرانے کے بعد اسے واپس بھیج دیا گیا۔ اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے بلند ہونے والی آہ و بکا ختم ہوگئی۔ شاید سلیم کی خلاصی ہوگئی تھی یا پھر وہ ویسے ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے ایک بار پھر بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ غالباً اسے میرے چہرے پر کوئی ایسی بات نظر آئی جس نے اسے باور کرا دیا کہ مجھ سے پوچھ گچھ نسبتاً آسان ثابت ہوگی۔ اس نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اُٹھنے میں دیر کی تو دو افراد نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا اور دروازے کی طرف لے جانے لگے۔

اقبال نے پکار کر کہا۔ "دیکھو...... اسے کچھ پتا نہیں۔ جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔ یہ بس ہمارے ساتھ تھا...... ہمارے کسی کام میں شامل نہیں تھا۔"

گارڈ بولا۔ "تم ذرا چھری کے نیچے سانس لو۔ تم سے بھی پورے سوال جواب کریں گے۔"

وہ مجھے پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں تھیں اور دروازہ شیشم کی مضبوط لکڑی کا تھا۔ میرا رہا سہا خون بھی نچڑ گیا۔ چھت سے نائیلون کی ایک رسی لٹک رہی تھی۔ یہ یقیناً مطلوبہ معلومات کے لیے مطلوبہ شخص کو سیدھا یا اُلٹا لٹکانے کے لیے تھی۔ ایک تختہ نظر آ رہا تھا جس پر کسی کو لٹایا جا سکتا تھا اور اس کی کلائیوں اور ٹخنوں وغیرہ کو "اسٹریپس" سے باندھا بھی جا سکتا تھا۔ پانی کا ایک بڑا ٹب بھی پڑا تھا جس کا مقصد فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا دوست سلیم تھوڑی دیر پہلے یہیں موجود تھا۔ فرش پر لہو کے تازہ قطرے تھے۔ سلیم کی گرگابی اور اس کی ٹوٹی ہوئی گھڑی بھی وہیں فرش پر پڑی تھی۔ غالباً ان اشیاء کو میری اعصاب شکنی کے لیے قصداً وہاں پڑا رہنے دیا گیا تھا اور مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ میرے اعصاب واقعی ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ قرب و جوار میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی بھی وقت بے ہوشی کے اندھیرے میں کھو جاؤں گا۔ ہاں...... میں وہی تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ہاتھ سے اپنے جسم پر گولی چلائی تھی لیکن تب کی اور اب کی کیفیت میں بہت فرق تھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے چمک سی لہرا گئی۔ میں نے دیکھا کہ میڈم نادیہ ہوشربا چال چلتی میری طرف آ رہی ہے۔ وہ ایک سیاہ نیکر اور دو بڑے پھولوں والی سفید شرٹ میں تھی۔ شرٹ پر ایک رائل بنگال ٹائیگر کی شبیہہ پرنٹ تھی۔ یہ شیر نادیہ کے جسم سے لپٹا نظر آتا تھا۔ نادیہ کی آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا۔ اپنی اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی، وہ میرے عین سامنے کھڑی ہوئی تو کسی قیمتی پرفیوم کی مہک میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ گرم چادر والے گارڈز کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ "اوئے بختیار! کیا کرنے لگے ہو اس کے ساتھ۔ اس کو مارنا ہے؟ اس کا چہرہ نہیں دیکھ رہے تم...... یہ اور ٹائپ کا ہے۔ پیار سے ہی سب کچھ بتا دے گا۔ کھول دو اسے۔"

میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میڈم نے سمجھا کہ مجھے باندھا گیا ہے۔ گارڈ بختیار بولا۔ "ابھی ہم نے اسے باندھا ہی نہیں ہے جی۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے ایک مہمان کی طرح ڈرائنگ روم میں لاؤ۔ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے کر آؤ۔"

"اور وہ دوسرا میڈم؟" بختیار کا اشارہ یقیناً اقبال کی طرف تھا۔

"دیکھو...... گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا کرتے۔ وہ خرانٹ ہے۔ اس سے دوسری طرح نمٹیں گے۔"

چند ہی سیکنڈ بعد میں اس ٹارچر روم سے نکل کر ایک سجے سجائے شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ میرے پاؤں دبیز پالین میں دھنس رہے تھے۔ دروازوں، کھڑکیوں پر نیلے رنگ کے مخملی پردے لہراتے تھے اور دیواروں پر نایاب پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ تاہم ان پینٹنگز کا رنگ ڈھنگ وہی تھا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ عریانی، رنگینی اور فحاشی۔ کہنے کو تو یہ آرٹ تھا لیکن ایسی ہی چیزیں آرٹ کے نام پر بدنما دھبا ہوتی ہیں۔

میڈم نادیہ ہاتھ میں شیری کا گلاس لیے آئی اور بے تکلفی سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر مجھ سے تین چار فٹ کی دوری پر بیٹھ گئی۔ آڈیو سسٹم پر بہت مدھم آواز میں انگلش میوزک بج رہا تھا۔ وہ عجیب انداز میں براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اچانک بولی۔ "اس رات تم اچانک میرے گھر میں آئے اور پھر اچانک بھاگ بھی گئے...... ایسا کیوں کیا تم نے؟"

مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ زبان منہ کے اندر چمڑے کا سوکھا ہوا سخت ٹکڑا بن گئی تھی۔ میری حالت دیکھ کر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شیری کے دو بڑے گھونٹ بھر کر بولی۔

"اچھا چھوڑو اس نازک ٹاپک کو۔ ہم اور بات کرتے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ......" یکا یک اسے رُکنا پڑا۔ اس کے بیش قیمت موبائل فون کی بیل ہونے لگی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"ہاں...... ہاں...... میں نے آواز پہچان لی ہے سراج...... کیسے ہو؟ ہاں...... میں بھی فائن ہوں۔ کب آ رہے ہو تم؟ نہیں...... نہیں ابھی تو ضرورت نہیں۔ صبح آ جاؤ۔ دس بجے کے بعد آرام سے آ جانا۔ اوکے...... بائے۔"

اس نے کال منقطع کر دی۔ تو وہی ہونے والا تھا جس کا اندیشہ میری جان مسلسل کھا رہا تھا۔ چند گھنٹے بعد یہاں سیٹھ سراج سے ملاقات ہونے والی تھی۔ دو ملازماؤں نے چائے اور اس کے بہت سے لوازمات لا کر سامنے خوبصورت میز پر سجا دیے۔ میڈم نادیہ بڑی نرمی سے بولی۔

"دیکھو مسٹر تابش! اس ساری اسٹوری میں مجھے کچھ باتیں تو پہلے سے معلوم ہیں۔ یہ

باتیں تم سے سن کر میں تمہارا اور اپنا ٹائم ضائع نہیں کروں گی۔ تم مجھے صرف وہ باتیں بتاؤ جو مجھے اب تک معلوم نہیں ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ ہڑپہ پہنچنے سے پہلے کیا ہوا؟ اور مثلاً یہ کہ یہاں میرے گھر سے بھاگنے کے بعد کہانی میں کیا ٹرن آئے؟ اور مثلاً یہ کہ...... خیر چھوڑو۔ پہلے تو یہی بتا دو کہ تم لوگ سراج کے پیچھے لگے کیسے؟ وہ تو بڑا خرانٹ بندہ ہے۔ اس نے کہاں تمہیں گنجائش دی کہ تم اس کہانی میں گھس بیٹھے؟"

"دیکھیں میڈم! میں سچ کہتا ہوں۔ میرا اس سارے معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں تو......"

"مسٹر تابش۔" میڈم نادیہ نے انگلی اُٹھا کر مجھے روکا۔ "تمہاری حیثیت میرے گیسٹ کی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تمہارا یہ اسٹیٹس برقرار رہے۔ اس لیے ایک بار پھر بتا دیتی ہوں۔ مجھے وضاحت نہیں چاہیے۔ بس اپنے سوال کا جواب چاہیے اور سوال یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سیٹھ سراج جیسے سیانے کوے کے پیچھے کیونکر لگ گئے؟" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کل سویرے سیٹھ سراج کے یہاں پہنچنے کے بعد میرے بارے میں بہت سی باتیں میڈم نادیہ کو معلوم ہو جانی ہیں۔ تو کیوں نا میں خود ہی اپنے بارے میں بتا کر میڈم نادیہ کا اعتماد حاصل کروں۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ سیٹھ سراج نے اقبال کو بھی یقیناً پہچان لینا ہے۔ یہ اقبال ہی تھا جس نے سرِراہ سیٹھ سراج کی وین سے گاڑی ٹکرائی تھی اور پھر سیٹھ کی تسلی بخش ٹھکائی بھی کر دی تھی۔ تو پھر جب یہ سب کچھ سامنے آنے ہی والا تھا تو پھر بہتر تھا کہ میں اپنی زبان سے بتا دوں۔

میڈم نادیہ کا صوفے پر بیٹھنے کا انداز توبہ شکن تھا۔ وہ مخمور نظروں سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے اس کے بدن سے نگاہیں چرا کر قالین پر گاڑ دیں۔ یوں اس کی شعلہ بدنی سے جدا ہو کر مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں نے اپنے خیالات مجتمع کیے اور کہا۔ ''میڈم! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں جو کچھ میرے علم میں ہے، میں آپ کو صاف صاف بتا دوں گا۔ آپ بھی وعدہ کریں کہ مجھ پر شک نہیں کریں گی۔''

میڈم نادیہ نشیلے انداز میں مسکرائی۔ ''مردوں پر شک نہ کرنا بہت بڑی بیوقوفی ہوتی ہے۔ بہر حال تم کہتے ہو تو یہ بیوقوفی کر لیتے ہیں۔''

''میں ثابت کر دوں گا کہ آپ نے بیوقوفی نہیں کی۔'' میں نے وثوق سے کہا اور پھر اپنی روداد کو بالکل شروع سے بیان کرنے لگا۔

میں نے میڈم نادیہ کو بتایا کہ کس طرح قریباً ڈیڑھ سال پہلے واجی اور اس کے اوباش دوست میری منگیتر ثروت کے پیچھے پڑے۔ کس طرح انہوں نے میرا اور ثروت کا جینا حرام کیا۔ پھر ثروت کے اغوا اور واپسی کی تفصیل بتانے کے بعد میں نے اس حوالے سے واجی کے باپ سیٹھ سراج کے منفی کردار کا ذکر کیا۔ بعد ازاں سیٹھ سراج اور اس کے کارندوں نے میرے گھر کے قریب مجھ پر جو بہیمانہ تشدد کیا، اس کی تفصیل بھی بیان کر دی۔

میڈم نادیہ دھیان سے سنتی رہی اور بیچ بیچ میں مجھ سے سوالات بھی کرتی رہی۔ میں نے میڈم سے کہا۔ ''میں سچ کہتا ہوں، میں سخت مایوس تھا۔ اپنی جان لینے کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ اگر عمران مجھے نہ ملتا تو شاید میں اس وقت آپ کے سامنے نہ ہوتا۔ عمران میری کہانی سن کر بہت دکھی ہوا۔ خاص طور سے سیٹھ نے میرے ساتھ جو مار پیٹ کی تھی، اس کا اسے بہت صدمہ پہنچا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کچھ عرصہ پہلے سیٹھ صاحب کی گاڑی کو ایک وین نے ٹکر ماری تھی اور

بعد میں وہاں لڑائی بھی ہوئی تھی۔''

''ویری گڈ..... بہت خوب۔'' میڈم نے تحسینی انداز میں سر ہلایا۔ ''تو وہ طے شدہ ایکسیڈنٹ تھا۔ ویری اسمارٹ۔''

''دراصل یہی ایکسیڈنٹ تھا میڈم جس کے بعد ہم سیٹھ سراج کے پیچھے لگے۔ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا۔ سیٹھ سراج کی گاڑی میں کچھ بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے چند بوریاں ایکسیڈنٹ کی وجہ سے پھٹ گئیں۔'' اس کے بعد میں نے بوریوں کے بارے میں سارا ماجرا میڈم کے گوش گزار کر دیا اور بتایا کہ صرف ان بوریوں سے پیدا ہونے والا تجسس دور کرنے کے لیے ہم نے سیٹھ سراج کا پیچھا کیا اور ہڑپہ پہنچ گئے۔

آگے کی ساری روداد میڈم کو زلیخا اور اس کے شوہر سے معلوم ہو چکی تھی۔ وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ زلیخا اور اس کے شوہر کی زبان سے ہم نے لال کوٹھیوں کا ذکر سنا اور پھر اپنے ''تجسس کے گھوڑے'' پر بیٹھ کر دگڑ دگڑ کرتے لال کوٹھیوں تک پہنچ گئے۔

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، یہاں تک تو سب کلیئر ہو گیا۔ تم لوگ اس شوق میں یہاں گھس آئے کہ شاید یہاں سے تمہیں بیش قیمت تحفے تحائف مل سکیں گے۔ کروڑ دو کروڑ کی مورتیاں، تین چار کروڑ کی تصویریں اور اس طرح کی دوسری چیزیں، برتن، زیور وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا؟ تم لوگ اچانک روپوش ہو گئے۔ روپوش اور خاموش تو تم لوگ تب ہوتے جب یہاں سے کچھ لے جاتے۔ مگر تم تو خالی ہاتھ گئے تھے پھر تمہاری غیر حاضری کیوں لگ گئی؟''

''دراصل ہم ڈر گئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں کچھ دیر خاموش رہنا چاہیے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ وی سی آر سسٹم میں ہماری تصویریں آ گئی ہوں گی اور ہمیں پہچان لیا جائے گا۔''

''تمہاری یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔ میں تمہارے بارے میں تو ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن وہ تمہارا ہیرو بھائی بڑی خرانٹ شے ہے۔ یقین نہیں آتا کہ وہ ہمارے بارے میں اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی خاموش رہا ہو گا۔ اس کے دماغ میں کھجلی نہیں ہوئی ہو گی؟''

میڈم بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ واقعی خاموش نہیں بیٹھا رہا۔

''کس سوچ میں کھو گئے ہو؟'' میڈم نے بڑی بے تکلفی سے میرے گال پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔

''یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو اپنی بات کا یقین کس طرح دلاؤں۔''

''اچھا...... سلیم لنگڑے نے تم لوگوں سے کیا کہا تھا؟''

''اس نے ہمیں ڈرایا ہی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم نے لال کوٹھیوں میں گھس کر سخت غلطی کی ہے۔ ہم بہت بُری طرح پھنس سکتے تھے۔ ہمیں آئندہ اس طرح کی حرکت نہیں کرنی چاہیے۔'' جواب دینے کے بعد میں نے میڈم نادیہ کے چہرے پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہ میرے جوابات سے سو فیصد مطمئن تو نہیں تھی پھر بھی اس کا ذہن کچھ نہ کچھ صاف ضرور ہوا تھا۔

حوصلہ پا کر میں نے وہ سوال کیا جو دیر سے میرے اندر مچل رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا میں آپ سے ہیرو بھائی کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں؟''

''پوچھو۔'' اس نے ادا سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تو اس کے جسمانی خطوط اور بھی ہوشربا ہونے لگے۔

''مم...... میرا مطلب ہے...... وہ خیریت سے تو ہے؟''

''بہت چاہتے ہو ہیرو بھائی کو؟'' میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ''ویسے وہ ہے بھی چاہے جانے کے قابل...... لیکن اکھڑ گھوڑے کی طرح ہے۔ اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے تھوڑی سی محنت کرنا پڑے گی۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''وہ تمہارا دوست ہے۔ تم ہر وقت اکٹھے رہتے ہو۔ تمہیں اس کے مزاج کی ہر سردی گرمی کا پتا ہوگا۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''میں چاہتی ہوں، وہ میرے بیڈ روم میں ہو۔ بالکل گرم...... جوش سے بھرا ہوا۔ وہ مجھے اور میں اسے جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔'' وہ بڑی بے باکی سے بولی۔ اس کی ہلکی بادامی آنکھوں میں عجیب سی تپش کروٹیں لے رہی تھی۔

مجھ سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت دیکھ کر میں نے نگاہ جھالی۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''جو میرے دل میں ہوتا ہے، وہ میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں اور سچ یہی ہے کہ تمہارا یہ ہیرو بھائی میرے دل میں ٹھاہ کر کے لگا ہے اور جو چیز میرے دل کو بھا جاتی ہے پھر میں اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہتی۔ تم لوگ اچانک میرے گھر سے نکل گئے۔ ہیرو بھی نکل گیا، پر وہ باسٹرڈ میرے اندر سے نہیں نکل سکا۔ میں نے پچھلے

دنوں اس کے لیے بڑی بے چینی محسوس کی ہے اور اسے اپنے طور پر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتی رہی ہوں۔ بس اسے میری ''لک'' سمجھ لو کہ کل رات میرے ملازموں کو اچانک اس کی گاڑی نظر آ گئی۔''

''کیا میں آپ سے......'' میں فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی خاموش ہو گیا۔

وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ معاملہ فہم انداز میں بولی۔ ''میرے خیال میں تم پوچھنا چاہ رہے ہو کہ تمہارے ہیرو بھائی کو میں نے کیسے کیچ کیا...... تو پوچھ لو۔''

''در...... اصل...... میرا ذہن صاف ہو جائے گا تو پھر میں بہتر طور پر سوچ سکوں گا اور آپ کے سوالوں کے جواب دے سکوں گا۔''

''آ جاؤ میرے ساتھ۔'' وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا اور اس کے بدن سے نگاہیں چراتا اس کے وسیع بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس رات کے سارے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے جب ہم چوری چھپے یہاں گھسے تھے اور نادیہ کو باندھ کر بے بس کیا تھا۔ دائیں طرف وہ خوبصورت اٹالین الماری تھی جو سلیم کے بقول میڈم نے صرف اس لیے کھولی تھی کہ ہمیں شراب کی بوتلیں دکھا سکے۔ سامنے ہی وہ جہازی سائز بیڈ تھا جس پر عمران اور میڈم نادیہ کی دھینگا مشتی ہوئی تھی اور عمران نے مشتعل ہو کر نیم عریاں نادیہ کے ہاتھ پاؤں باندھے تھے۔ سلیم نے بتایا تھا کہ اس بیڈ روم کی ایک سائیڈ پر ایک نیلا بٹن ہے جسے دباتے ہی نادیہ درجن بھر گارڈز کو دوسری کوٹھی سے طلب کر سکتی تھی مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' نادیہ نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

میں کسی معمول کی طرح بیش قیمت صوفے کے گداز میں دھنس گیا۔ وہ تکیے کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ سامنے دیوار پر ایک ٹی وی اسکرین نظر آ رہی تھی۔ نادیہ نے ریموٹ کنٹرول سے اسکرین روشن کی پھر کوئی ایک بٹن دبائے۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر ''وی ٹی آر'' کی ایک پرانی فوٹیج چلنے لگی۔ یہ اس رات کے مناظر تھے جب میں، عمران اور اقبال یہاں داخل ہوئے تھے۔ ایک منظر میں اقبال رائفل بدست باتھ رومز کے بند دروازوں کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ ایک منظر میں ہم پرچھائیوں کی طرح اس نیم تاریک گیلری میں گھوم رہے تھے جہاں نہایت نایاب پینٹنگز دیواروں پر سجی تھیں۔ پھر باؤنڈری وال کا منظر دکھائی دیا۔ باؤنڈری وال سے باہر عمران کی مہران گاڑی کھڑی تھی۔ غالباً میڈم نادیہ نے بٹن دبا کر گاڑی کی فوٹیج کو اسکرین پر ساکت کر دیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''میرے پاس تم لوگوں کا بس یہی سراغ تھا مگر تم دیکھ رہے ہو گاڑی کی پوزیشن ایسی ہے کہ نمبر پلیٹس نظر نہیں آ رہیں۔ اگر گاڑی کا نمبر نظر آ جاتا تو شاید دوسرے تیسرے روز ہی ہماری ملاقات ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہاں...... گاڑی کی ایک دو نشانیاں ضرور اس فوٹیج میں ریکارڈ ہو گئیں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ گاڑی کی چھت پر ''کیریئر'' لگا ہوا ہے۔ اب دوسری نشانی دیکھو۔'' نادیہ نے کہا اور اسکرین پر نظر آنے والی گاڑی کی شبیہہ کو کلوز کیا۔ گاڑی کی سائیڈ پر عمران نے یا اقبال نے ایک طویل اسٹیکر چپکایا ہوا تھا۔ یہ ایک جست لگاتے ہوئے چیتے کی شبیہہ تھی اور نیچے انگریزی کے چند حروف تھے۔ اسٹیکر جزوی طور پر اُتر چکا تھا اور حروف بھی مٹے مٹے تھے۔ بہرحال یہ سب کچھ فوٹیج میں دکھائی ضرور دے رہا تھا۔

نادیہ نے ٹی وی اسکرین کو آف کیا اور بولی۔ ''میرے ملازم اس گاڑی کی ٹوہ میں تھے۔ کل رات اتفاقاً میرے ایک ملازم شوکت کو یہ گاڑی ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑی نظر آئی۔ اس نے ساتھیوں کو فون کیا۔ تمہارے ہیرو بھائی کے آنے سے پہلے ہی گاڑی کو گھیرا جا چکا تھا۔ اب آگے کی بات تو تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔''

''وہ...... خیریت سے ہے نا؟ مم...... میرا مطلب ہے آپ نے اس سے مار پیٹ تو نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تو نہیں کی لیکن میرے گارڈز کو اس رات والے واقعے پر غصہ تھا۔ انہوں نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی دو چار ہاتھ لگا دیئے تھے اسے...... بہرحال پریشانی کی بات نہیں۔ وہ اب خیریت سے ہے۔''

یہ بات تو ہرگز ماننے والی نہیں تھی کہ گارڈز نے میڈم کی مرضی کے بغیر ہی عمران سے مار پیٹ کی ہو گی۔ وہ یقیناً تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ میرے تصور میں عمران کا زخمی چہرہ اور اس کا پھٹا ہوا لباس گھومنے لگا۔ میں نے بڑی بے چینی سے سوچا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہو گا؟ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ آسانی سے بے بس ہونے والا نہیں ہے۔ یقیناً اس پر پلاننگ سے ہاتھ ڈالا گیا تھا۔

اب میرے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا تھا کہ سلیم کے بارے میں نادیہ کو شک کیونکر ہوا؟ یہ سلیم ہی تھا جس کی وجہ سے ہم بھی پھنس گئے تھے۔ میں نے محتاط لفظوں میں اس بارے میں پوچھا تو وہ بولی۔ ''لگتا ہے کہ تم اپنے ذہن کو پورا پورا کلیئر کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ چلو بھئی۔ کر لو کلیئر۔''

اس نے ایک بار پھر ٹی وی اسکرین روشن کی اور وی ٹی آر میں کچھ ڈھونڈنے لگی۔ جلد

ہی مطلوبہ فوٹیج اسے مل گئی۔ یہ بھی اسی رات کی فوٹیج تھی جب ہم پہلی بار لال کوٹھی میں آئے تھے۔ پوشیدہ کیمرا ایک خالی راہداری کو دکھا رہا تھا۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ راہداری بالکل خالی نہیں ہے۔ راہداری کے نیم روشن فرش پر تین سائے نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک سایہ واضح طور پر سلیم کا اور دوسرا شاید عمران کا تھا۔ نادیہ نے فوٹیج کو ایک جگہ ''اسٹل'' کر دیا اور بولی ''غور کرو...... یہ کیا ہے؟''

میں خاموش رہا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ان میں سے درمیان والا تو سلیم لنگڑا ہے۔ دائیں طرف تمہارا ہیرو بھائی ہے اور بائیں طرف شاید تم ہو۔ تم تینوں راہداری سے باہر کھڑے ہو مگر تمہاری پرچھائیاں راہداری کے فرش پر پڑ رہی ہیں۔''

''آپ...... کیا بتانا چاہ رہی ہیں؟''

''میں سلیم کی ''بیڈ لک'' بتانا چاہ رہی ہوں۔ وہ بڑا ہوشیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کوٹھی میں وی ٹی آر کیمرے کس کس جگہ کو فوکس کرتے ہیں اور کون کون سی جگہ ان کی پہنچ سے دور ہے۔ اس لیے جب اس نے تم دونوں سے راز داری کے ساتھ بات کی اور تمہیں کوٹھی سے نکل بھاگنے کا مشورہ دیا تو وہ ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں کیمرا تم تینوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی مائیکرو فون کوئی آواز کیچ کر سکتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ تم تینوں کے سائے راہداری میں پڑ رہے تھے اور راہداری کو کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی تھی۔ اس سایوں والی فوٹیج پر میری نظر بس دو تین دن پہلے ہی پڑی ہے۔ اس کے بعد میری ہدایت پر گارڈ بختیار نے سلیم پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب تمہیں ہیرو کی شامت کی اطلاع دینے راوی روڈ پہنچا تو تم دونوں بھی نظر میں آ گئے۔''

بات ختم کر کے نادیہ نے شیری کے چند اور گھونٹ بھرے اور اس کا چہرہ شراب کی حدت سے تمتمانے لگا۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجیب سی تپش تھی۔ جسم کا ہر حصہ انگڑائی لیتا محسوس ہوتا تھا۔ کہنے لگی۔ ''تم بہت سوال کر چکے ہو۔ اب میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔''

''جی کہیں۔''

''ہیرو عمران صاحب کو لڑکیاں پسند ہیں؟'' میڈم نادیہ نے اچانک سوال کیا۔

میں پہلے تو گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ مجھے اس کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزرا۔ سرکس میں کام کرنے والی ایک دو لڑکیوں کے ساتھ اس کا ہنسی مذاق ضرور ہے۔''

''کوئی پکی گرل فرینڈ؟''

''میرے علم میں تو نہیں۔''

''ڈرنک وغیرہ کرتا ہے۔''

''ایک دو بار بیئر پیتے دیکھا ہے۔''

''کوئی خفیہ شادی وغیرہ؟''

میں نے ایک بار پھر لاعلمی میں سر ہلایا۔ ''دراصل عمران اپنے بارے میں اپنے دوستوں کو بھی بہت کم بتاتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ذرا مختلف ٹائپ کا ہے۔''

''نہیں رہے گا مختلف ٹائپ کا۔'' میڈم نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ ''سرکش گھوڑا ہے۔ بس ذرا اس کی سمجھ آ گئی تو ایک دم شانت ہو جائے گا۔ اشاروں پر چلے گا اور سرپٹ بھاگے گا۔'' اس کی بادامی آنکھوں میں ایک بار پھر نشہ تیرنے لگا۔ چند لمحے خاموشی رہی جیسے وہ تصور ہی تصور میں اسے اپنے اشاروں پر چلتا دیکھ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر عجیب سی راحت جھلکنے لگی۔ پھر وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ مت سمجھنا کہ ابھی وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ میں چاہوں تو وہ اب بھی سرپٹ بھاگ سکتا ہے۔ جیسے بھینسوں کا دودھ دھونے کے لیے انہیں انجکشن لگائے جاتے ہیں، اس طرح اڑیل گھوڑوں کو سرپٹ چلانے کے لیے بھی زبردست انجکشن ہوتے ہیں لیکن میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔ کم از کم تمہارے ہیرو عمران کے حوالے سے مجھے یہ بناوٹ بالکل پسند نہیں آئے گی۔ ناٹ ایٹ آل۔ میں چاہوں گی کہ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنی شکست کو تسلیم کرے اور اسے محسوس بھی کرے۔''

شاید سلیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میڈم نادیہ ایک ایب نارمل لڑکی تھی۔ فی الوقت اس کی تمام توجہ کا مرکز عمران بنا ہوا تھا۔ وہ اسے تسخیر کرنے کے چکر میں تھی۔ شاید ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ اس سلسلے میں تھوڑی بہت کوشش کر بھی چکی تھی۔ پتا نہیں کیوں نادیہ کا رویہ دیکھ کر مجھے ایک طرح کی تسلی بھی ہوئی۔ اس سے پہلے مجھے اور اقبال کو اندیشہ تھا کہ عمران کے پکڑے جانے کے پیچھے جہلم میں مجید مٹھو کی ہلاکت کا واقعہ ہے اور نوادرات والا معاملہ بھی اس ساری صورتِ حال کو گمبھیر بنا رہا ہے مگر میڈم نادیہ سے بات کر کے پتا چلا کہ صورتِ حال اتنی نازک نہیں جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ میڈم نادیہ نے صرف اس رات والے واقعے کو انا کا مسئلہ بنایا ہوا تھا۔ وہ عمران کو شکار کرنا چاہ رہی تھی اور اگر اس سارے معاملے میں اسے کسی پر حقیقی غصہ تھا تو وہ سلیم پر تھا۔ وہ اسے غداری کا مرتکب سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک سلیم کا قصور ناقابلِ معافی تھا۔ اس کی وجہ سے نہ صرف پہلی بار ہم تینوں لال کوٹھی سے بچ کر نکل گئے تھے بلکہ دوسری بار بھی اس نے مجھے اور اقبال کو بھگانے کی پوری کوشش کی تھی۔

''مجھے میرے سرکش گھوڑے کے بارے میں کوئی ٹپ دو۔'' وہ سگریٹ سلگا کر بولی۔

''اس پر کاٹھی ڈالنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''ہاں...... تم کیا کہہ سکتے ہو۔ تم گھوڑوں کے سائیس تو نہیں ہو...... لیکن...... لیکن تم گھوڑے تو ہو۔ ایک گھوڑا اپنے ساتھی گھوڑے کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ شروع میں مَیں کافی خوف زدہ تھا مگر اب نادیہ کا رویہ اور اس کا ''نصب العین'' جاننے کے بعد میں خود کو کافی ایزی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میڈم! میں کوئی نفسیات دان تو نہیں ہوں، نہ ہی مجھے یہ دعویٰ ہے کہ میں عمران کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں لیکن ایک بات آپ کو بتا سکتا ہوں۔ وہ اپنے دوستوں کے بارے میں بہت پکّی ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ سلیم کے بارے میں آپ کا رویہ بڑا سخت ہے۔ کچھ دیر پہلے اس کے ساتھ کافی مار پیٹ ہو چکی ہے اور لگتا ہے کہ آپ اسے کوئی کڑی سزا دینے والی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ایسا کر کے غلط کریں گی۔ اپنے نکتہ نظر سے آپ صحیح ہیں لیکن اگر آپ اسے معاف کر سکیں تو اس کا عمران پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔''

''ویری گڈ! تمہارا مطلب ہے کہ عمران کو راہِ راست پر لانے کے لیے سلیم کو استعمال کیا جا سکتا ہے؟''

''جی ہاں......''

''تو پھر کیوں نہ اس کو ذرا اچھے طریقے سے استعمال کیا جائے۔'' نادیہ کا لہجہ بدل گیا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''ہو سکتا ہے سلیم کو معافی دینے کا تمہارے ہیرو صاحب پر وہ اثر نہ ہو جو اسے سزا دینے کا ہو۔ سلیم کو سخت سزا سے بچانے کے لیے بھی تو وہ اپنی سرکشی ختم کر سکتا ہے اور پھر......'' اس نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تم بھی تو اس کے دوست ہی ہو۔ آج کل عمران کے دل میں تمہارے لیے خصوصی ہمدردی جاگی ہوئی ہے۔''

پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی سیدھی اور آسان نہیں جتنی نظر آ رہی ہے۔ اس کے لہجے میں میرے لیے ایک خطرناک دھمکی پوشیدہ تھی۔

وہ میرے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ کر جلدی سے بولی۔ ''نو نو...... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں انگلش میں...... ایک پتھر سے دو پرندے شکار کرنا۔

میں بھی یہی کروں گی۔ اگر میں نے استعمال کرنا ہوا نا تو سلیم لنگڑے کو ہی کروں گی۔ اس کو سزا بھی ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کی سزا سے تمہارے ہیرو صاحب کی دولتیاں بھی ختم ہو جائیں۔''

میں اندر ہی اندر بُری طرح سٹپٹایا اور پچھتایا بھی کہ میں نے ایسی بات کیوں کہی۔ اس نے فوراً میری یہ بات پکڑ لی تھی کہ عمران اپنے دوستوں کے بارے میں بڑا ٹچی ہے۔

عمران کی مصیبت کے خیال نے مجھے ادھ موا سا کر دیا تھا۔ بندہ جس کو نا قابلِ شکست سمجھتا ہے اور جس کی صلاحیتوں پر بہت زیادہ اعتماد ہوتا ہے، وہ اچانک کسی وجہ سے بے دست و پا نظر آئے تو دل کو شدید ٹھیس لگتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ یہی ہو رہا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمران یہاں میڈم نادیہ کی گرفت میں آ چکا ہے اور اسے بے بس کر کے مارا پیٹا گیا ہے۔ عمران کو پریشانی اور بے بسی کی حالت میں دیکھنے کا تصور ہی مجھے ہلکان کر رہا تھا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے نادیہ سے پوچھا۔ ''کیا میں عمران کو دیکھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں...... ابھی لو۔''

اس نے بیڈ پر لیٹے لیٹے بڑے سائز کے ریموٹ کنٹرول پر دو تین بٹن پریس کیے۔

ایک دم اسکرین پر عمران میرے سامنے آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اُچھل کر رہ گیا۔ وہ ایک قالین پر بیٹھا تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ یہ اُسی لال کوٹھی کا کوئی کمرہ نظر آتا تھا۔ عمران کے چہرے پر گہرے نیل تھے۔ دونوں آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا جس پر آہنی گرل تھی۔ گرل کے پاس ایک موٹی ملازمہ کھڑی تھی۔ اس ملازمہ کو ہم پچھلی بار بھی دیکھ چکے تھے۔ یہی تھی جس نے ''روٹین'' میں کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا اور عمران نے مجھے باہر سے بلوا کر دروازہ کھلوایا تھا۔ اس کا نام آسیہ تھا۔ میں نے دیکھا، عمران کے چہرے پر تکلیف کا سایہ ہے اور وہ بیچارگی کے انداز میں ملازمہ آسیہ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ شاید وہ اس سے کسی طرح کی مدد طلب کر رہا تھا۔ عمران کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔

میڈم نادیہ نے کہا۔ ''آواز بھی سننا چاہتے ہو عمران صاحب کی؟''

پھر میرے جواب پر دینے سے پہلے ہی اس نے سائیڈ ٹیبل کے پاس سے کوئی بٹن پریس کیا اور اسکرین پر تصویر کے ساتھ آواز بھی اُبھرنے لگی۔ آواز زیادہ صاف نہیں تھی لیکن سنی جا سکتی تھی۔

عمران کہہ رہا تھا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں آسیہ جی! عورت کی خوبصورتی موٹے یا پتلے ہونے میں نہیں ہوتی، اس کے چہرے میں ہوتی ہے اور تمہارا چہرہ ایک سو ایک فیصد میری منگیتر روزینہ سے ملتا ہے۔ آج اگر روزینہ زندہ ہوتی تو ہو بہو تمہاری طرح ہوتی۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں، میں مذاق نہیں کر رہا۔ تمہیں دیکھ کر میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں۔ ہرے بھی اور لال سرخ بھی۔''

''لگتا ہے تمہیں بکواس کرنے کی عادت ہے۔'' قریب کھڑے ایک گارڈ نے جھڑک کر کہا۔

''عادت نہیں ہے یار! میں تو اتنا خاموش طبع ہوں کہ کبھی بولوں تو یار دوست سمجھتے ہیں شاید آج کوئی تہوار ہے۔ یہ تو آپ کی بہن کو دیکھ کر بولنا پڑ رہا ہے۔ یقین کرو میں تمہیں اپنی روزینہ کی تصویر دکھاؤں تو تم بھی ہکا بکا رہ جاؤ گے اور آسیہ جی تو سمجھیں گی کہ آئینہ دیکھ رہی ہیں۔''

گارڈ دانت پیس کر بولا۔ ''میں ایک بار میڈم سے اجازت لے لوں پھر تمہاری بولتی ایسے بند کروں گا کہ قیامت تک آواز نہیں نکلے گی۔''

''تو اب اور قیامت کیا ہو گی؟ میرے لیے تو قیامت آ چکی ہے میرے برادر۔'' اس نے یکسر فدا ہو جانے والی نظروں سے ملازمہ آسیہ کو دیکھا۔

آسیہ کے ہاتھ میں سفید روئی تھی اور شاید کوئی دوا تھی۔ وہ غالباً عمران کے چہرے کے زخم صاف کرنے کے لیے آئی تھی۔ جھنجھلا کر بولی۔ ''تمہیں دوا لگوانی ہے یا نہیں؟''

''تم اپنے ہاتھ سے لگاؤ گی تو کون کافر انکار کرے گا لیکن......''

ملازمہ نے سٹپٹا کر پلاسٹک کی بوتل اور روئی وغیرہ آہنی گرل کے راستے کمرے میں پھینکی اور اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی چلی گئی۔

میڈم نادیہ نے ریموٹ کے ذریعے اسکرین کو تاریک کر دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''یہ تمہارا ہیرو دلچسپ شے ہے۔ اتنی مار کھا کر بھی شرمندہ نہیں ہے۔''

میں بس سر ہلا کر رہ گیا۔ دلی طور پر مجھے واقعی مسرت ہوئی تھی۔ بے شک عمران کو مارا پیٹا گیا تھا لیکن یہ مار پیٹ اس کے چہرے سے اس کی جادوئی مسکراہٹ چھیننے میں قطعاً ناکام رہی تھی۔ کہیں پڑھی ہوئی یہ بات یاد آنے لگی کہ جو انسان اپنا حوصلہ نہیں ہارتا، وہ کچھ بھی نہیں ہارتا۔ پتا نہیں کیوں عمران کو ہشاش بشاش دیکھنے کے بعد میں خود کو بھی ویسا ہی محسوس کرنے لگا۔

اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نادیہ فون سننے کے لیے سائیڈ روم میں چلی گئی۔
میں وہیں بیٹھا رہا۔ سامنے شیشے کی نہایت نفیس تپائی پر انگریزی اخبار رکھا تھا۔ یہ آج کا ہی تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اندرونی صفحے پر ایک خبر میرے لیے قابلِ توجہ تھی۔ یہ تین دن پہلے جہلم میں پیش آنے والے واقعے سے ہی متعلق تھی۔ دو کالمی خبر کی سرخی تھی۔

''روڈ ایکسیڈنٹ میں مجید مٹھو کی ہلاکت اتفاقیہ نہیں تھی۔''

ذیلیوں میں درج تھا۔ ''پولیس تفتیش میں مجید مٹھو کی ہلاکت کے بارے میں کچھ نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کھائی میں گرنے سے پہلے مجید کی کار کسی اور گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ جائے حادثہ سے کچھ فاصلہ پر سڑک کے اوپر بھی تباہ ہونے والی گاڑی کے شیشے ملے ہیں اور ٹائروں کے نشان بھی ہیں۔ تفتیشی پولیس افسر کے مطابق دونوں طرح کے امکان موجود ہیں۔ یہ اتفاقی حادثہ ہوسکتا ہے اور کسی عداوت کا شاخسانہ بھی۔''

اسی دوران میں میڈم نادیہ اپنی عریاں ٹانگوں کو بڑے اسٹائل سے حرکت دیتی ہوئی واپس آگئی۔ شاید فون پر کسی سے کوئی تلخ بات ہوئی تھی، وہ کچھ برہم نظر آتی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہ بستر پر نیم دراز ہوکر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کوشش میں اس نے شیری کا ایک اور گلاس پیا۔ اس کے علاوہ امپورٹڈ سگریٹ کے چند گہرے کش بھی لیے، تب وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ملنا چاہو گے عمران سے؟''

''اگر آپ پسند کریں تو۔'' میں نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

میں ایک بار پھر اس کے پیچھے چل دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس عمارت میں ہر جگہ کیمرے موجود ہیں اور ڈکٹا فون بھی لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ نادیدہ کان ہمیں سن رہے تھے اور نادیدہ آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اس عمارت میں جگہ جگہ پینٹنگز اور نوادر کی سجاوٹ نظر آتی تھی۔ راہداریوں میں قیمتی قالین تھے اور یہ ساری جگہ سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ جلد ہی ہم ایک مستطیل کمرے میں پہنچ گئے۔ سامنے ہی وہ دیوار گیر آہنی گرل تھی جس کی دوسری طرف عمران موجود تھا۔ گرل کے ساتھ جالی نہیں تھی اس لیے چھوٹی موٹی اشیا گرل میں سے کمرے میں ''پاس'' کی جا سکتی تھیں۔ عمران غالباً سیال آیوڈین کے ذریعے اپنے چہرے کے زخم صاف کر رہا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنا بایاں ہاتھ استعمال کر رہا تھا، دایاں ہاتھ پٹی میں جکڑا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ زیادہ چونکا نہیں۔ یقیناً وہ یہاں ہماری آمد سے آگاہ ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ

کر اس نے مغموم چہرے کے ساتھ ایک لمبی آہ بھری۔ ''اچھا ہوا تابی! تم سے ملاقات ہوگئی۔ اب میں سکون سے مرسکوں گا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''مریں تمہارے دشمن۔'' نادیہ بولی۔

''کہتے سب ہیں، مرتا کوئی نہیں۔'' وہ ترت بولا۔

''یعنی میں تمہاری دشمن ہوں۔''

''میں نے یہ کب کہا؟ اپنا سب سے بڑا دشمن تو میں خود ہوں۔ عاشق خود ہی اپنا دشمن ہوتا ہے۔ مجنوں، رانجھا، فرہاد ان میں سے کون ایسا ہے جس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں ماری۔ عاشق کا شروع سے ایجنڈا ہی ہلاک ہونے کا ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ اب مجھے بھی مرنا ہے۔ اس موچھیل گارڈ کے ہاتھوں یا پھر اپنے تایا ابا کے ہاتھوں۔'' موچھیل گارڈ وہی تھا جس سے ذرا دیر پہلے عمران کی تلخی ہوئی تھی۔

''موچھیل گارڈ اور تایا ابا! یہ کیا بات ہوئی؟'' نادیہ نے عمران کی گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''گارڈ صاحب کے ہاتھوں مرنے کے امکانات یوں روشن ہیں کہ میں ان کی بہن سے عشق فرمانے سے باز نہیں آتا اور وہ مجھے شوٹ کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ ابھی آپ کے آنے سے پہلے ہم دونوں میں ایک جھڑپ بھی ہو چکی ہے اور تایا ابا والی بات یہ ہے کہ وہ ہرفن مولا ہونے کے علاوہ بڑے سخت قسم کے مذہبی ہیں۔ میں جب انہیں بتاؤں گا کہ میری مرحومہ منگیتر روزینہ، لال کوٹھی کی نہایت دلکش اور چربیلی ملازمہ آسیہ کی صورت میں واپس آ گئی ہے تو انہیں شدید جھٹکا لگے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ میں ''آواگون'' پر یقین کرنے لگا ہوں۔ بس اسی بات پر وہ مجھے قتل فی سبیل اللہ کر دیں گے۔''

''جب تمہیں مرنا ہی ہے تو پھر کسی کے کام کیوں نہیں آجاتے باسٹرڈ۔'' نادیہ عجیب نشیلے انداز میں بولی۔

''کام تو میں اسی کے آ سکتا ہوں جس سے مجھے یہ آناً فاناً عشق ہوا ہے۔ اپنی اس چربیلی ملازمہ کو میرے حوالے کر دو۔ تین ساڑھے تین سال کے اندر ہی چار ہٹے کٹے بچے پیدا نہ کر دوں تو مجھے ہیرو نہ کہنا۔'' عمران بڑے یقین کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''تین ساڑھے تین سال میں چار بچے؟'' نادیہ نے بھنویں اُچکائیں۔

''بیس اوووروں میں آج کل دو سو اسکور ہو رہا ہے تو ساڑھے تین سال میں چار بچے کیوں نہیں ہو سکتے؟ میرے خیال میں تو پانچ بھی ہو سکتے ہیں۔ جڑواں بچوں کا چانس بھی تو

ہوتا ہے۔"

نادیہ نے عمران کو گھور کر دیکھا پھر اس کی بادامی آنکھوں میں ایک زہریلی چمک اُبھر آئی۔ وہ لمبی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی۔ "لگتا ہے کہ تمہیں کرکٹ سے کافی دلچسپی ہے۔ چلو ایک ٹوئنٹی ٹوئنٹی میچ تمہیں میں بھی دکھاتی ہوں۔"

اس نے باوردی گارڈز کو کوئی اشارہ کیا۔ اچانک میری شریانوں میں ایک برفیلی لہر دوڑ گئی۔ دو صحت مند گارڈز تیزی سے میری طرف آئے اور مجھے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی ہٹا کٹا شیرا برآمد ہوگیا۔ یہ وہی کرخت چہرہ گرانڈیل تھا جس سے پچھلی مرتبہ عمران کی خونی جھڑپ ہوئی تھی۔ عمران نے اس انچارج گارڈ کو دو خوفناک ٹکروں سے "ناک آؤٹ" کر کے سبھی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ شیرے کے ہاتھوں میں نائلون کی رسی نظر آ رہی تھی۔

مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز کی گرفت بڑی سخت تھی۔ انہوں نے مجھے دھکیل کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ ایسے مناظر اس سے پہلے میں نے کہانیوں میں پڑھے تھے یا فلموں اور ڈراموں میں دیکھے تھے۔ چند ماہ پہلے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن خود میرے ساتھ یہ سب کچھ پیش آئے گا۔ جابر لوگوں کی سختی، اسلحے کی نوک اور موت کا لمس میں اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کروں گا۔

میں نے خود کو چھڑانے کی اضطراری کوشش کی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس وقت میرا چہرہ زرد ہو چکا ہے اور میری آنکھوں کی رنگت مجھے پکڑنے والوں کا حوصلہ بڑھا رہی ہے اور یہی وقت تھا جب میں نے عمران کی طرف بھی دیکھا۔ ان لمحوں میں مجھے عمران کا چہرہ بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ بظاہر چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں ایک ایسی کیفیت تھی جو میں نے پہلے بس ایک دو دفعہ ہی دیکھی تھی۔ یہ کیفیت اس کی معصوم صورت سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ اس میں آگ تھی، سفاکی تھی اور ایک پوشیدہ توانائی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عمران کچھ کر گزرنے کا ارادہ کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی دل نے یہ گواہی بھی دی کہ وہ جو کچھ کرنا چاہ رہا ہے وہ کر گزرے گا۔ ہاں...... اگر میرے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا گیا تو وہ کر گزرے گا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ وہ کیا کرے گا؟ دروازہ مقفل تھا۔ کھڑکی پر آہنی گرل تھی۔ ہاں...... ایک گارڈ ضرور کھڑکی کے قریب موجود تھا۔ کیا وہ گرل میں سے ہاتھ گزار کر اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کرے گا؟ یا پھر کسی زوردار ضرب سے دروازے کا کھٹکا توڑنا چاہے گا؟ ابھی یہ سب کچھ میرے ذہن میں چل ہی رہا تھا کہ ایک اور

واقعہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سامنے کھڑے دو گارڈز ایک دم اٹین شین ہو گئے، ان میں شیرا بھی شامل تھا۔ مجھے پکڑنے والے دونوں گارڈز بھی بے حرکت ہو گئے۔ شاید انہوں نے مجھے تھاما نہ ہوتا تو وہ بھی اٹین شین ہو جاتے۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی اور میں نے ایک جواں سال عورت کو اندر آتے دیکھا۔ اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ لڑکی بھی کہا جا سکتا تھا۔ عمر یہی کوئی پچیس سال رہی ہوگی۔ اس نے چست پتلون اور جرسی پہن رکھی تھی۔ جرسی کے دونوں بازو واڑ سے ہوئے تھے۔ بال بوائے کٹ تھے۔ وہ گداز جسم ہونے کے باوجود کسی یورپین کھلاڑی کی طرح چست اور توانا نظر آتی تھی۔

میرے دل نے پکار کر کہا کہ یہی بڑی میڈم صفورا شیرازی ہے۔ اس کی صورت بھی یہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ میڈم نادیہ کی بڑی بہن ہے۔ اس نے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور بولی۔ "ہیلو نادو! بھئی کیا چل رہا ہے یہاں؟"

"کچھ نہیں سسٹر! بس اس بندے سے چھوٹا سا انٹرویو کرنا تھا۔" نادیہ نے عمران کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ اسے بڑی بہن کی آمد کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ دوسری طرف بڑی بہن نے بھی اس کی نہایت مختصر نیکر اور کھلے گریبان کو ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔

"اچھا...... یہ ہے وہ اسپائڈر مین جو یہاں گھسا تھا؟" صفورا نے عمران کا جائزہ لیا۔

"ہاں سسٹر! یہ بھی...... اور یہ بھی۔" اس مرتبہ نادیہ نے میری طرف اشارہ کیا۔ "ان کے علاوہ ایک تیسرا بھی ہے۔"

"اچھا...... ان میں سے شیرے کے ساتھ جھڑپ کس کی ہوئی تھی؟" میڈم صفورا کے لہجے میں تجسس اُبھرا۔

"اس کی جو اندر بیٹھا ہے۔ عمران نام ہے۔ ہیرو ہیرو بھی کہتے ہیں۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے اور بازی گر کرتا ہے۔"

"زبردست۔" صفورا، عمران کے قریب چلی گئی اور یوں دیکھنے لگی جیسے پنجرے میں بند کسی خاص نسل کے جانور کو دیکھا جاتا ہے۔

نادیہ نے کھنکار کر بڑی بہن کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بولی۔ "سلیم لنگڑے کے ساتھ اس کا پرانا یارانہ ہے۔ وہ بھی سرکس میں کام کرتا تھا۔ اسی کی وجہ سے یہ لوگ یہاں سے نکل بھاگے تھے۔"

میڈم صفورا بڑی شان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نادیہ کے اشارے پر مجھے تھامنے والے

دونوں گارڈز نے مجھے چھوڑ دیا اور ذرا ہٹ کر اٹین شین کھڑے ہو گئے۔

میڈم صفورا نے مجھے دیکھا۔ اس کی کھوجی نظریں جیسے میرے سر کے اندر گھسنے لگیں اور دماغ کا ایکسرے کرنے لگیں۔ وہ نگاہیں واقعی ورمے جیسی تھیں۔ پھر یہ ورما صفت نگاہیں عمران کی طرف اُٹھ گئیں۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ ''نادو! ہمیں اس سارے معاملے کو ایزی نہیں لینا چاہیے۔ یہ صرف چوراچکے ہو سکتے ہیں اور اس سے بڑھ کر بھی۔ ان سے پوری پوچھ گچھ کرو۔ ان کی تلاشی وغیرہ ہوگئی ہے؟''

''ہاں سسٹر! ابھی تک کوئی خاص چیز تو نہیں ملی، سوائے ایک پستول کے۔''

''گاڑی کی تلاشی؟''

''نہیں...... وہ تو نہیں لی۔''

''جاؤ شیرا! گاڑی کو اچھی طرح دیکھو۔''

شیرا حکم کی تعمیل کے لیے تیزی سے باہر چلا گیا۔ عمران کی گاڑی کی چابی یقیناً اس کے پاس ہی تھی۔

شیرے کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہوئی۔ اس دوران میں میڈم صفورا فون پر ہی کسی سے باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتیں رئیل اسٹیٹ کے کاروبار کے بارے میں تھیں۔ زمینوں کی قیمت، بلڈنگ میٹریل کے خرچے اور ٹیکسز...... بس اس طرح کی باتیں تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر نامدار کی موت کے بعد اس کے کاروبار کو بخوبی سنبھال رہی ہے۔ دوسری طرف شاید کوئی پٹھان تھا۔ میڈم نے اسے خان خاناں کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پھر بات کرتے کرتے وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ واپس آئی تو شیرا بھی تلاشی لے کر واپس آ چکا تھا۔

گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے نکلنے والی اشیا اس نے گاڑی کے صفائی والے کپڑے میں باندھ رکھی تھیں۔ اس نے یہ کپڑا میڈم صفورا شیرازی کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھا اور گرہ کھول دی۔ گاڑی کے کاغذات تھے، چند کیسٹس تھیں ایک پیچ کس اور کچھ رسیدیں وغیرہ۔

میڈم صفورا ان چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ کاغذات کو دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے عمران سے سوال کیا۔ ''ہیرو صاحب! تم جمعرات کے دن جہلم گئے تھے، جی ٹی روڈ کے ذریعے۔''

''جی ہاں......'' عمران نے مغموم لہجے میں کہا۔

میڈم صفورا کے ہاتھ میں دریائے چناب اور جہلم کے پلوں پر لیے گئے ٹول ٹیکس کی دو پرچیاں نظر آ رہی تھیں۔

''کیوں گئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''دراصل میں ایک آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔ آرٹیکل کا موضوع یہ ہے کہ سوہنی اصل میں دریائے چناب میں نہیں ڈوبی تھی بلکہ دریائے جہلم میں ڈوب کر فوت ہوئی تھی۔''

''ونڈر فل...... زبردست...... بڑے اونچے خیالات ہیں لیکن تمہارے یہ خیالات پڑھے گا کون؟'' میڈم صفورا نے استفسار کیا۔

''پڑھے گا نہیں تو دیکھے گا ضرور۔ یہ دور ہی دیکھنے کا ہے۔ دراصل میرے تایا صاحب جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، ایک نیوز چینل بھی چلا رہے ہیں۔ میرے اس آرٹیکل کے ٹکڑے نیوز چینل پر چلیں گے اور ہزاروں لاکھوں لوگ پڑھیں گے۔ دراصل بات یہ ہے میڈم کہ آج کل خبروں کا کام کچھ مندا چل رہا ہے۔ خبروں کی پیاس میں تایا جی کی زبان باہر لٹکی ہوئی ہے بلکہ سب چینلز کی زبانیں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اب ایسے میں یہ سوہنی والی اطلاع بریکنگ نیوز ثابت ہوگی۔''

''اس پر یقین کون کرے گا؟''

''نہ کرے یقین۔ بحث تو چھڑ جائے گی نا۔ گجرات والے ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے کہ اتنا بڑا اعزاز دریائے چناب سے چھن جائے۔ وہ ہر صورت یہ ثابت کریں گے کہ سوہنی کو دریائے چناب نے ہی نگلا تھا۔ دوسری طرف جہلم والے اپنے دریا کی مشہوری چاہیں گے۔ چینلز والے اپنے اپنے بمبوکاٹ بلائیں گے۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ ان میں سے ہر کوئی ارسطو اور افلاطون کے کان کاٹتا ہے۔ یہ لوگ میزوں پر مکے مار مار کر اور چلا چلا کر اپنے اپنے مؤقف کے حق میں دلیلیں دیں گے۔ چند ہی دنوں میں سوہنی کی غرقابی والا مسئلہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ چینلز پر مشتہر کیا جائے گا، ایس ایم ایس کے ذریعے اپنی رائے دیں۔ آپشن نمبر ایک...... سوہنی دریائے چناب میں غرق ہوئی۔ آپس نمبر دو...... سوہنی دریائے جہلم میں غرق ہوئی۔ آپشن نمبر تین...... سوہنی غرق ہی نہیں ہوئی۔

شاہراہوں پر گاڑیاں روک روک کر لوگوں سے پوچھا جائے گا کہ آپ کے خیال میں سوہنی کا رجحان دریائے چناب کی طرف زیادہ تھا یا دریائے جہلم کی طرف؟ اس کے علاوہ چینلز پر پٹیاں چل جائیں گی۔ اگر آپ کے پاس سوہنی کے غرق ہونے کی کوئی تصویر یا فوٹیج ہو تو ہمیں ارسال کریں اور ثواب دارین حاصل کریں۔ جی ہاں میڈم! آپ مسکرا رہی ہیں لیکن حقیقت یہی ہے۔ چند ہی دنوں میں یہ اہم ترین ایشو بن جائے گا اور عین ممکن ہے کہ دونوں صوبوں میں سوہنی کی موت کا کریڈٹ لینے کے لیے کھینچا تانی شروع ہو جائے گی۔''

''دونوں صوبے؟ یہ گجرات اور جہلم تو دونوں ایک ہی صوبے میں ہیں۔'' میڈم نے کہا۔

''میں لڑائی چھڑ جانے کے بعد کی بات کر رہا ہوں جی۔'' عمران نے روانی سے کہا۔

''زیادہ نہیں تو ڈھائی تین ماہ یہ بحث چلے گی۔ اس کے بعد سوہنی واپس دریائے چناب میں آ بھی گئی تو ہم ان شاء اللہ کوئی اور شوشہ چھوڑ دیں گے۔ مثلاً یہ کہ ہیر زہر کھانے سے نہیں مری تھی بلکہ اس کی جان ایک اور صدمے نے لی تھی۔ رانجھے نے اپنا نیٹ ورک تبدیل کر لیا تھا اور اپنے نئے نمبر سے ہیر کو بے خبر رکھا تھا۔''

''ہیر اور نیٹ ورک؟ یہ کیا بات ہوئی؟''

''میڈم! بحث ہی چھیڑنی ہے نا۔'' عمران نے کہا۔

''لیکن اطلاع کوئی ایسی ہونی چاہیے جس سے بحث چھڑ بھی سکے۔ میں تمہارے تایا کے نیوز چینل کے لیے تمہیں ایک بریکنگ نیوز دیتی ہوں۔'' میڈم صفورا نے عجیب لہجے میں کہا۔

اس کے بدلے ہوئے لہجے نے مجھ سمیت سارے حاضرین کو چونکا دیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے عمران کے قریب پہنچی اور بولی۔ ''میں ابھی پورچ میں تمہاری گاڑی دیکھ کر آ رہی ہوں۔ وہ ایک طرف سے پچکی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر کسی گاڑی کو سائیڈ ماری ہے تم نے یا کسی نے تمہیں ماری ہے۔''

''تو اس سے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہیں آپ؟''

وہ عمران کی بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے تیسرے ساتھی کو بھی دیکھ کر آ رہی ہوں۔ اس کی دونوں ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور زخم دو تین دن پرانے ہیں۔ کہتا ہے کہ کیروسین کے چولہے سے آگ لگ گئی تھی، چائے بنا رہا تھا۔''

''وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ حالانکہ یہ شرم کی بات ہے کہ ایک بندہ شادی شدہ ہونے کے باوجود خود چائے بنائے۔''

اس بار بھی میڈم نے عمران کے مزاحیہ جملے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ اور آنکھوں میں عجیب سنسنی تھی۔ وہ سب کی موجودگی میں بھی جیسے کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ اس کی پُرتفکر نگاہیں عمران پر جمی تھیں۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں چھوٹی بہن نادیہ کی طرف مڑی اور گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا نادو! کہ اس معاملے کو ایزی نہ لو۔ یہ صرف چوری چکاری کا چکر نہیں ہے۔ جمعرات کے دن جس وقت مجید کو حادثہ

پیش آیا، یہ لوگ جہلم میں موجود تھے۔ نہ صرف جہلم میں موجود تھے بلکہ مجھے لگتا ہے کہ موقعے پر بھی موجود تھے۔''

''موقعے پر؟'' نادیہ نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں...... ان کی گاڑی کا جو سائیڈ ایکسیڈنٹ ہے وہی سائیڈ مجید کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اس بات کا 95 فیصد امکان ہے کہ مجید کی گاڑی کو اسی گاڑی سے ٹکر مار کر کھائی میں گرایا گیا ہو۔'' صفورا نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اس کے جملے نے ہر چہرے پر سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ ان میں نادیہ کا چہرہ بھی تھا۔ صفورا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ان کے تیسرے ساتھی کی ٹانگیں جلی ہوئی ہیں اور میرا اندازہ ہے کہ ان ٹانگوں کو اسی آگ نے جلایا ہے جس نے مجید کو بھسم کیا ہے۔ کہو...... کیسی نیوز ہے۔''

کمرے میں کتنی ہی دیر تک خاموشی رہی پھر نادیہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھے بھروسہ نہیں ہو رہا سسٹر کہ انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہو گا۔''

''لگتا ہے تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا۔ تم بس ایک ہی رُخ پر سوچتی ہو۔'' میڈم صفورا جھنجھلا کر بولی۔ ''الکحل لینا کچھ کم کر دو۔''

پھر وہ تیزی سے شیرے کی طرف مڑی۔ ''شیرے! باندھو اس کو رسّی سے۔ یہ ابھی بتائیں گے سب کچھ۔''

شیرا تو جیسے حکم کا منتظر تھا۔ وہ میری طرف بڑھا۔ اس کے ساتھی نے نائلون کی رسّی اس کی طرف بڑھائی۔ دونوں گارڈز نے مجھے پھر بازوؤں سے دبوچ لیا۔ عمران گرج کر بولا۔ ''ٹھہرو۔''

دونوں بہنوں سمیت سب لوگ عمران کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کچھ دیر پہلے کے عمران سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ ''اگر میں کہوں میڈم صفورا کہ میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔ کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھوں گا تو پھر؟''

''تو پھر اس کو کھول دیں گے۔'' میڈم روانی سے بولی۔ پھر اس نے دوبارہ میرے بارے میں حکم صادر کیا۔ ''باندھو اس کو۔''

''ٹھہرو۔'' عمران بھی دوبارہ گرجا۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ گھن گرج کے ساتھ میڈم صفورا پر برس پڑے گا۔ تاہم اس نے اپنے لب و لہجے کو چیک کیا اور گہری سانس لے کر ہموار انداز میں بولا۔ ''میڈم صفورا! یہ میری اور تمہاری پہلی ملاقات ہے۔ تم میرے بارے میں جانتی نہیں ہو، اس لیے اعتبار نہیں کر رہی ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، وہ حرف بہ حرف درست

ہے۔ میں اس معاملے کے حوالے سے تم سے ایک لفظ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میری خواہش ہے کہ ہمارے درمیان جو بات ہو، اچھے ماحول میں ہو۔ اگر تم اسے باندھ دو گی یا مار پیٹ کرو گی تو پھر اچھا ماحول باقی نہیں رہے گا۔''

میڈم چند سیکنڈ تک گہری نظروں سے عمران کا جائزہ لیتی رہی، تب اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ رسّی بردار شیرا مجھ سے دور چلا گیا۔ مجھے دبوچنے والے دونوں گارڈز بھی پیچھے ہٹ گئے۔ میڈم کو بھی غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ اتنے افراد کی موجودگی میں مَیں کسی طرح کی مہم جوئی کا نہیں سوچ سکتا۔

عمران نے مجھے کسی بھی طرح کی سختی سے بچانے کے لیے بڑی تیزی سے فیصلہ کیا تھا۔ اس کی یہ تیزی میرے دل میں اس کا پیار کچھ اور بھی بڑھا گئی۔ میں نے خود کو اس کے اور زیادہ قریب محسوس کیا۔ میں نے گرل کے پار اس کی چوڑی چھاتی اور روشن آنکھیں دیکھیں اور مجھے فخر سا محسوس ہونے لگا کہ وہ میرا دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر ایک جوش سا بھر گیا۔ مجھے لگا کہ آئندہ گھڑیوں میں مجھے کہیں اس کے شانے سے شانہ ملا کر لڑنا پڑا تو میں لڑ جاؤں گا۔ اس پر ثابت کر دوں گا کہ میں لڑ سکتا ہوں۔

میڈم نادیہ یکسر خاموش کھڑی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سب کے سامنے اسے بڑی بہن سے جو ڈانٹ پڑی تھی، وہ اسے بدمزہ کر گئی تھی۔ احتجاج کے طور پر اس نے میٹھی شراب کا ایک اور جام چڑھایا اور اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

میڈم صفورا نے بھی صوفہ سنبھال لیا۔ اس کے بعد اس نے اشارے سے سب گارڈز کو باہر بھیج دیا۔ بس ایک گارڈ وہاں رہا، یہ شیرا تھا۔ میڈم صفورا کے ساتھ عمران کی بات چیت شروع ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عمران نے واقعی میڈم صفورا شیرازی کو الف سے یے تک ساری کہانی سنانی شروع کر دی۔ اس نے سچ مچ کچھ بھی میڈم سے نہیں چھپایا۔ اس نے تسلیم کیا کہ سیٹھ سراج کی گاڑی سے انہوں نے جان بوجھ کر گاڑی ٹکرائی تھی۔ پھر ہڑپہ اور لال کوٹھیوں کا کھوج۔ اس کے بعد سلیم کا ہمارے ہاں آنا اور ہمارا سلیم کا تعاقب کر کے مجید مٹھو تک پہنچنا۔ پھر مجید مٹھو کے ساتھ کار ریس لگاتے ہوئے مجید مٹھو کا کھائی میں گر جانا۔ سب کچھ عمران نے میڈم کے گوش گزار کر دیا۔ درمیان میں میڈم نے سوالات کیے جن کے جواب عمران نے وضاحت سے دیئے۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''میں نے آپ کو سچ اور صرف سچ بتایا ہے۔ میں آپ کو یہ بات بھی پوری سچائی کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا ارادہ مجید مٹھو کے بارے میں بُرا نہیں تھا۔ ہم صرف اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ بس تھوڑی سی پوچھ گچھ لیکن

جب وہ بھاگا تو ہمیں اس کا پیچھا کرنا پڑا۔ وہ بڑی بُری ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ہم نے اسے سائیڈ نہیں ماری، اس نے ہمیں ماری اور پھر خود ہی اپنی گاڑی پر کنٹرول نہیں رکھ سکا۔ وہ معمولی زخمی ہوا تھا۔ ہم نے وہیں پر اس سے سوال جواب کیے۔ اس پر کسی طرح کا تشدد نہیں کیا۔ مجید کو جو نقصان پہنچا وہ اس کی اپنی غلطی سے پہنچا۔ وہ اقبال پر جھپٹ پڑا۔ اقبال کے منہ میں سگار تھا۔ یہ سگار اُچھل کر اس پیٹرول پر جا گرا جو گاڑی سے بہہ رہا تھا۔ اقبال اور مجید دونوں آگ کی لپیٹ میں آئے۔ مجید چونکہ گاڑی سے زیادہ قریب تھا، اس لیے اس کا زیادہ نقصان ہو گیا۔''

یہ پوری روداد سننے کے بعد میڈم صفورا کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔

دوسری طرف میڈم نادیہ، عمران کے بیان سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جو ایک دو سوالات کیے، وہ بھی خاصے تیکھے تھے۔

میڈم صفورا نے گہری سانس لی تو ٹی شرٹ میں اس کے جسمانی نشیب و فراز اور بھی نمایاں نظر آنے لگے۔ وہ چھوٹی بہن کی طرف دیکھ کر حتمی لہجے میں بولی۔ ''نادو! میں ان تینوں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ میں نے ابھی تم سے کہا تھا نا کہ یہ پیچیدہ معاملہ ہے۔ اب دیکھو، بات کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ نہ صرف ان کی وجہ سے مجید مٹھو کی جان گئی ہے بلکہ قادر بھی اب وہاں نہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔'' یہ آخری فقرہ میڈم صفورا نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس ساری روداد میں اسے جس اطلاع نے سب سے زیادہ پریشان کیا ہے، وہ یہی ہے کہ قادر اب اس کی دسترس میں نہیں ہے۔ اس پریشانی کی وجہ بھی کافی حد تک ہماری سمجھ میں آ رہی تھی۔ قادرے کے اوجھل ہونے کا مطلب تھا کہ قادرے کی خوبرو بہن کنول بھی اب ہاتھ سے نکل چکی ہے اور کنول کے ہاتھ سے نکلنے کا مطلب تھا کہ میڈم صفورا کا صدیقی کے حوالے سے سارا پلان فلاپ ہو گیا ہے۔

میڈم صفورا نے عمران سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہارا دعویٰ ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔ تو کیا میں ہوپ رکھوں کہ تم قادرے کے موجودہ ٹھکانے کے بارے میں بھی سچ کہو گے۔''

عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ہاں میڈم! قادرے کے بارے میں بھی سچ کہوں گا اور قادرے کے بارے میں سچ یہ ہے کہ میں نے اسے اس کی فیملی سمیت یہاں سے

نکال دیا ہے۔"

"بہت خوب۔" میڈم صفورا نے اوپر نیچے سر ہلایا۔ اس کی ورمے جیسی نگاہیں عمران کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ چند سیکنڈ بعد وہ چھوٹی بہن کی طرف گھومی۔ "دیکھ رہی ہو نادو! یہ ہوتے ہیں جلیبی کی طرح سیدھے سادے معاملے۔"

نادو یعنی نادیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی صفورا نے گارڈز کو حکم دیا کہ وہ عمران کو کمرے سے نکالیں اور اس کی رہائش گاہ پر پہنچائیں۔

نادیہ نے کہا۔ "سسٹر! میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ ایک دم ہتھ چھٹ ہے۔ اس کے لیے احتیاط کرنی ہوگی۔"

"مجھے یہ اتنا بیوقوف نہیں لگتا کہ دو تین رائفلوں کے ہوتے ہوئے کوئی ایڈونچر کرے گا۔" پھر صفورا، عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ "کیوں مسٹر! ایسی بیوقوفی کا ارادہ ہے تمہارا؟"

"نو میڈم! ناٹ ایٹ آل۔" عمران نے سعادت مندی سے کہا۔

"لیکن پھر بھی سسٹر! بہتر ہے کہ اس سے یہیں پوچھ گچھ کرلو۔ ہم نے بڑا رسک لے کر اُسے یہاں تک پہنچایا ہے۔"

"او ہو نادو! اب اسے اتنا بھی ہوّا نہ بناؤ۔ اگر زیادہ ڈر ہے تو ہینڈ کف لگا لو دونوں کو۔"

اس کے ساتھ ہی صفورا نے موچھیل گارڈ کو اشارہ کیا۔ وہ بغلی دروازے میں داخل ہوا اور چند سیکنڈ بعد دو اسٹائلش ہینڈ کف لیے واپس آ گیا۔ یہ ہتھکڑی کی جدید اور ہلکی پھلکی قسم تھی۔ عمران نے خاص پس و پیش نہیں کیا۔

موچھیل گارڈ نے باہر کھڑے کھڑے ہینڈ کف کو گرل کے اندر سے گزارا اور پھر عمران کے ہاتھوں میں پہنا دیا۔ ایک ایسا ہی ہینڈ کف مجھے بھی پہنا دیا گیا۔ میں زندگی میں پہلی بار ہتھکڑی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ یہ توہین آمیز بے بسی کی عجیب سی کیفیت تھی۔

شیرے نے کمرے کا لاک کھول کر عمران کو باہر نکالا۔ عمران کو باہر نکالتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں عمران پر کوئی فقرہ کسا۔ جواب میں عمران نے بھی کچھ کہا۔ دونوں کے الفاظ مجھ تک نہیں پہنچے۔ تاہم میں نے شیرے کا چہرہ سرخ ہوتے دیکھا۔ وہ غضبناک ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر ایک زوردار دو ہتڑ عمران کی گردن پر مارا۔ عمران اس حملے کے لیے پوری طرح تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اس کے ہاتھ آگے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ پیچھے کی طرف بندھے ہوتے تو شاید چہرہ صوفے سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتا۔ عمران کے گرتے ہی شیرا اور اس کے دو ساتھی چیلوں کی طرح اس پر جھپٹے اور پیٹنے لگے۔ عمران نے اپنے بندھے

ہوئے ہاتھوں سے ایک گارڈ کے چہرے پر نیچے سے ضرب لگائی، وہ اُچھل کر میڈم صفورا کے پاس گرا اور ایک قیمتی ڈیکوریشن پیس چکنا چُور کر گیا۔ اس کے ساتھی نے جواباً عمران کے سر پر رائفل کا بٹ مارا۔

"رُک جاؤ...... رُک جاؤ۔" میڈم صفورا گرجی۔

پھر اس نے اپنے ہاتھ سے ایک گارڈ کے سر کے بال پکڑے اور اسے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ گارڈز میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میڈم صفورا کے حکم کو نظر انداز کر سکتے۔ وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ تاہم اب دو گارڈز نے اپنی رائفلیں عمران کی طرف سیدھی کر لی تھیں۔ عمران بھی صوفے کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میڈم صفورا، شیرے پر برسی۔ "میرے ہوتے ہوئے تم ایسا کر رہے ہو تو آگے پیچھے کیا کرتے ہو گے؟"

"میڈم! اس نے گالی دی ہے۔" شیرا بھاری آواز میں بولا۔

"کوئی گالی نہیں دی ہے اور پہل تم نے کی تھی۔" صفورا نے جواب دیا۔

"اس کے منہ میں کتے کی زبان ہے میڈم!" شیرا بولا۔

عمران نے کہا۔ "اور تم سرتاپا کتے ہو، وہ بھی گندی نسل کے۔ بندھے ہوئے پر حملہ کرتے ہو۔ آزاد کے سامنے پوشل ٹانگوں میں دبا کر بھاگتے ہو۔"

"میڈم! اس کو بڑی غلط فہمی ہو گئی ہے اپنے بارے میں۔ اس کے ہاتھ کھول دیں اور مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی اکڑفوں نکال سکوں۔"

"اچھا...... اچھا...... ابھی یہ ڈراما بند کرو۔" میڈم صفورا پھر گرجی۔ "ابھی اسے لے کر چلو میری طرف۔"

نادیہ کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے بالکل خوش نہیں ہے۔ بہرطور وہ سب کے سامنے خاموش تھی۔ گارڈز نے ہمیں دھکیل کر کمرے سے باہر نکالا اور ایک طویل راہداری میں لے آئے۔ ہم نے کوٹھی سے نکل کر ایک وسیع گراسی لان طے کیا۔ اس میں فوارے لگے تھے اور پھولوں کی کیاریاں تھیں، تب ہم دوسری کوٹھی کے پورچ میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک شاندار لینڈ کروزر اور ایک ولیز جیپ کھڑی تھی۔ رہائشی عمارت کے مین دروازے کے پاس ایک بہت بڑا السیشین کتا سنہری زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ گارڈز ہمیں لے کر اس دوسری کوٹھی کے اندر داخل ہوئے اور سیڑھیاں اُتار کر ایک کشادہ بیسمنٹ میں لے آئے۔ اس بیسمنٹ میں دو کمرے تھے اور ایک لاؤنج نما جگہ تھی جہاں ایک خوبصورت شیلف

پر ٹی وی اور آڈیو سسٹم وغیرہ موجود تھے۔ کمرے میں دائیں طرف ایک کھڑکی تھی جس میں ڈیزائن دار آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ یہ تقریباً ویسی ہی کھڑکی تھی جیسی میں اس سے پہلے نادیہ کی رہائش گاہ پر دیکھ چکا تھا۔

عمران مجھے دیکھ کر مسکرایا تو اس کی سوجی ہوئی آنکھیں کچھ اور بھی چھوٹی نظر آنے لگیں۔ چہرہ نیلو نیل تھا۔ دائیں ہاتھ کی پٹی میں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ وہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو حرکت دے کر بولا۔ ''جگر! یہ ہتھکڑیاں تو مردوں کا زیور ہوتی ہیں اور چوٹیں وغیرہ بناؤ سنگھار۔ ایسی باتوں کو دل سے نہیں لگانا چاہیے۔ بندہ دل کو لگا لے تو پھر گندم کی گولیاں ڈھونڈنا شروع کر دیتا ہے۔''

وہ اکثر گندم کی گولیوں کا حوالہ دیتا رہتا تھا اور یہ بات مجھے بہت بُری لگتی تھی مگر پہلی مرتبہ اس کی بات مجھے بُری نہیں لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس وقت جب میں مایوسی کی انتہا کو چھو کر زہریلی گولیاں ڈھونڈ رہا تھا، میں واقعی غلطی پر تھا۔ تب مجھے سرِعام زدوکوب کیا گیا تھا اور میں اس صورتِ حال کو اپنے لیے بے حد ذلت آمیز محسوس کر رہا تھا۔ آج عمران کو بھی تو زدو کوب کیا گیا تھا۔ اس کے جسم پر مجھ سے زیادہ چوٹیں آئی تھیں لیکن اس نے یہ سب کچھ ہنسی میں اُڑا دیا تھا۔ بالکل ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ شاید دُکھوں سے بھری ہوئی زندگی کا سامنا کرنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا۔

''کس سوچ میں کھو گئے جگر؟'' اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔

''تمہارے ساتھ کافی مار پیٹ ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس خبیث شیرے کا ہی کیا دھرا ہے۔''

''میں نے کہا تھا نا جگر! ہمارے ساتھ رہو گے تو آہستہ آہستہ باتیں تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائیں گی۔ یہ واقعی شیرے ہی کی والہانہ محبت ہے۔ اس نے مجھ پر پرانا غصہ نکالا ہے لیکن کوئی بات نہیں۔ اس کی باری آ گئی ہے تو ہماری بھی آ جائے گی مگر جب ہماری آئے گی تو ہم اسے باندھ کر نہیں ماریں گے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بتاؤ تم اس دعوتِ شیراز میں کیسے شریک ہو گئے ہو؟''

''دعوتِ شیراز میں؟''

''او یار! میں ذرا ادبی بات کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ تم یہاں کیسے آ پھنسے؟''

''تمہارا یار سلیم! تمہارے یہاں پکڑے جانے کی اطلاع لے کر ہمارے پاس آیا تھا، وہاں راوی روڈ۔''

''پھر؟''

''پھر ہم گھر سے نکلے اور نکلتے ہی پکڑے گئے۔ سلیم کی نگرانی ہو رہی تھی۔''

میں نے اپنے پھنسنے کی ساری تفصیل عمران کے گوش گزار کر دی۔ وہ پریشانی کے بجائے دلچسپی سے سنتا رہا۔

اس دوران میں تہ خانے کا دروازہ کھلا اور ہمیں اقبال کی صورت نظر آئی۔ دو گارڈز اسے لے کر سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ اقبال نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ تاہم گارڈز اسے ہمارے کمرے میں لانے کے بجائے ساتھ والے کمرے میں لے گئے اور دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔

''کیا حال ہے شہزادے؟'' عمران نے بلند آواز میں اقبال سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں......اور تم؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں یار! لیکن اب میری بات پر یقین کون کرے گا؟'' عمران نے دُکھی لہجے میں کہا۔ ''پوری رات میڈم صفورا کی ڈاکو بہن کے پاس رہا ہوں۔ بے شک میری عزت بچی رہی ہے مگر لوگوں کی زبانیں تو بند نہیں کی جا سکتیں نا۔ پتا نہیں کیا کیا باتیں بنیں گی؟ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ پتا نہیں کہ اب شاہین مجھے قبول بھی کرے گی یا نہیں؟''

''چلو قبول نہیں کرے گی تو میں شادی کر لوں گا۔''

''مجھ سے؟''

''نہیں یار! شاہین سے۔''

''لعنت ہے تیری دوستی پر۔ میرے دُکھ میں شریک ہونے کے بجائے زخموں پر مرچیں چھڑک رہا ہے۔ کم از کم تجھے تو میرا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں بالکل پاک ہوں۔ میڈم نادیہ نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ تیرے سر کی قسم، میری عزت محفوظ ہے۔ تُو تو مجھے جانتا ہے میرے پیارے سہیلے! اگر میرے ساتھ کچھ ہوا ہوتا تو میں نے اب تک پنکھے سے لٹک کر آتما ہتھیا کر لی ہوتی۔''

ایک سینئر گارڈ دھاڑا۔ ''تم اپنی بکواس بند کر دو تو اچھا ہے۔''

''دیکھ لو دنیا والو! یہ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ اب اگر ان کی ہمشیرہ کی شکل میری بچپن کی محبوبہ سے مل گئی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' عمران نے فریاد بلند کی۔

''تمہاری تو......'' سینئر گارڈ نے نازیبا الفاظ استعمال کیے اور کھڑکی کو زور سے بند کر

دیا۔اس کے بعداس نے اقبال کے کمرے والی کھڑکی بھی بند کردی۔

یہی وقت تھا جب ایک بار پھراونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ ہم نے کھڑکی کی جھری میں سے جھانکا۔میڈم صفورا بارعب چال چلتی ہوئی تہ خانے میں آ رہی تھی۔اس کے پیچھے ایک گنجا شخص تھا جس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ میڈم صفورا ہماری طرف آئے گی۔ وہ اقبال والے کمرے کی طرف چلی گئی۔میڈیکل باکس والا ڈاکٹر نما شخص بھی ادھر ہی گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اقبال کی زخمی ٹانگوں کو دیکھنے گیا تھا۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزرے۔ پھر گنجا شخص اپنے باکس سمیت ہمارے کمرے میں آ گیا تاہم میڈم صفورا، اقبال کے پاس ہی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پولیس والوں والا حربہ استعمال کر رہی ہے۔ ہمارے بیانات کی تصدیق کے لیے اقبال کو علیحدہ سے کرید رہی ہے۔عمران کو پتا تھا کہ اقبال سے میڈم کا اہم ترین سوال یہی ہونا ہے کہ قادر اور اس کی بہن کہاں ہیں۔اس حوالے سے عمران کو تسلی تھی۔ دراصل اقبال کو بھی صرف اتنا ہی پتا تھا کہ عمران نے قادر اور اس کی فیملی کو ملتان بھیجا ہے۔کس کے پاس بھیجا ہے۔کہاں بھیجا ہے، اس کے بارے میں وہ بھی نہیں جانتا تھا۔

گنجا شخص واقعی ڈاکٹر تھا۔لگتا تھا کہ وہ گونگا ہے۔ جتنی دیر ہمارے پاس رہا، اس نے ''ہوں ہاں'' کے سوا کوئی بات نہیں کی۔ اس نے عمران کے چہرے کی مرہم پٹی کی۔ ہاتھ کی بینڈیج بھی کھول کر دیکھی۔ ہاتھ پشت کی طرف سے بُری طرح سوج گیا تھا۔ڈاکٹر نے روئی وغیرہ رکھ کر دوبارہ پٹی باندھ دی۔ مسلح گارڈز بدستور دروازے پر موجود رہے۔اسی دوران میں میڈم صفورا کی شکل بھی نظر آ گئی۔ وہ کمرے میں نہیں آئی تھی بلکہ اس نے کھڑکی کھول کر ہمیں اپنی صورت دکھائی تھی۔

''ہاں ڈوک! تمہارا کام مکمل ہوگیا؟'' میڈم نے پوچھا۔

''یس میڈم۔'' ڈاکٹر نے کہا تو ہمیں پتا چلا کہ وہ بھی منہ میں زبان رکھتا ہے۔ ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔میڈم صفورا کھڑکی کے عین سامنے کرسی ڈلوا کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کی نسبت زیادہ سنجیدہ اور دانا نظر آتی تھی۔ وہ ذرا سی ''اوور ویٹ'' ضرور تھی تاہم نادیہ سے خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ تک اپنی عقابی نگاہیں عمران کے چہرے پر گاڑے رکھیں پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔''تو تم قادر اور اس کی بہن کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟''

''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں نے انہیں ان کی مرضی سے جانے دیا ہے۔ وہ کہاں

گئے، مجھے خود پتا نہیں۔''

''تمہارے نہ بتانے سے ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ یہ ہمارے لیے بڑا نازک معاملہ ہے۔صدیقی ایک بڑے خبطی شخص کا نام ہے۔اس نے ایک بار ''نہ'' کہہ دی تو پھر کوئی طاقت اسے ہاں میں نہیں بدل سکے گی۔ ہم بڑی مشکل سے اسے اپنے راستے پر لائے ہیں۔ سراج کے ساتھ صدیقی کی ''کمٹمنٹ'' ہو چکی ہے۔ اگر وہ لڑکی کنول، ابرار صدیقی سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے تو وہ بھی ہماری بات مان لے گا اور وہ بہت حد تک راضی ہو بھی چکی تھی۔ تم لوگوں نے بیچ میں کود کر سارا معاملہ اپ سیٹ کیا ہے۔''

عمران بولا۔''میڈم! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس لڑکی کو کس طرح رضامند کیا جا رہا تھا۔خیر آپ یہ باتیں چھوڑیں۔آپ مجھے صرف ایک بات بتائیں۔ وہ ایسی کیا خاص شے ہے جس کو صدیقی سے حاصل کرنے کے لیے آپ اس قدر ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں؟ آپ کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک نادر شے موجود ہے۔پھر کسی ایک شے کی خاطر اتنی زیادہ بے قراری؟''

''یہ تم نہیں سمجھ سکتے اور نہ میں سمجھا سکتی ہوں۔ ہاں......کوئی میرا ہم ذوق ہو تو اور بات ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی ''ارج'' ہوتی ہے۔ایک ایسی پیاس جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔'' اس کی بادامی آنکھوں میں واقعی ایک عجیب طرح کی پیاس اُمڈ آئی۔ وہ جیسے تصور میں اس نادر پیس آف آرٹ کو دیکھ رہی تھی جو اس کے کاروباری رقیب ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جس کو پانے کے لیے وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

''کیا وہ گندھارا آرٹ کا کوئی نمونہ ہے؟''

''تم یہی سمجھ لو۔'' میڈم نے مختصر جواب دیا۔

عمران نے بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلائیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ میڈم صفورا کھڑکی کے دوسری طرف تھی اور عمران کو گھور رہی تھی۔ اس بے بسی کی حالت میں بھی عمران کا اعتماد اور بے پناہ اطمینان اسے اُلجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا پالا کسی معمولی شخص سے نہیں پڑا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اب سختی کے بجائے نرمی اور حکمت سے کام لینا چاہ رہی تھی۔ اس میں مردم شناسی کی خاص صلاحیتیں نظر آتی تھیں۔

عمران پُر سوچ لہجے میں بولا۔''میڈم! آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو قادرے اور اس کی بہن کی ضرورت ہے یا اس پیس آف آرٹ کی؟''

''ظاہر ہے، مجھے اس پیس آف آرٹ کی ضرورت ہے لیکن میں صدیقی سے بھی اپنا

تعلق خراب نہیں کرنا چاہتی۔"

"اگر میں کہوں کہ صدیقی سے آپ کا تعلق خراب نہیں ہوگا اور وہ پیس آف آرٹ بھی آپ کو مل جائے گا تو پھر؟"

"تمہارے پاس جادو کی چھڑی ہے؟"

"جادو کا ڈنڈا ہے اور ان شاء اللہ آپ خود بھی ڈنڈے کی معترف ہو جائیں گی۔ میڈم! گستاخی معاف، میں نے دیکھ لیا ہے۔ آپ کے پاس بندے ضرور ہیں اور وہ باصلاحیت بھی ہیں لیکن ان کا کیلیبر اتنا نہیں ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی بڑا کام کرسکیں۔ سیٹھ سراج اور عارف خان جیسے لوگ بس گزارہ کر سکتے ہیں، کوئی چمتکار نہیں دکھا سکتے۔ میں ایک مسکین بندہ ہوں لیکن...... معافی چاہتا ہوں...... آپ کے ان کرائے کے ٹٹوؤں سے بہت بہتر ہوں۔ اس کے علاوہ مار دھاڑ بھی میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی جھلک میڈم نادیہ دیکھ چکی ہیں۔ ان کا ہیڈ گارڈ شیرا میرے ہاتھوں جس طرح ناک آؤٹ ہوا تھا، وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"اچھا تو اس واقعے کی وجہ سے تم یہ بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو؟ لیکن شیرے کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ ہوا اتفاقاً ہوا ورنہ وہ تم جیسے دو تین بندوں کا بہ یک وقت بھرتا بنا سکتا ہے اور سچ پوچھو تو میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ اس روز اتفاقاً ہی اس کے ساتھ کچھ ہوا تھا۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ میں اب بھی بلکہ اسی وقت اس سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ لوگوں کی تھوڑی سی تفریح بھی ہو جائے گی۔"

میڈم کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اسے جیسے اب بھی بھروسہ نہیں ہو رہا تھا کہ عمران جیسا عام قد کاٹھ کا شخص شیرے جیسے نہایت خطرناک اور پہلوان نما فائٹر کو صرف دو تین سیکنڈ میں زمین چٹوا سکتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اگر میں نے بھی اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو اس بات پر یقین نہیں کرسکتا تھا۔ عمران کا قد بمشکل چھ فٹ تھا۔ شانے چوڑے لیکن جسم چھریرا تھا۔ خاص طور سے اپنی صورت کے اعتبار سے تو وہ بالکل بھی کرخت اور مار دھاڑ والا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شوخ سی معصومیت چھائی رہتی تھی۔ میڈم نے کھڑکی کے پاس آکر عمران کو بغور دیکھا اور بولی۔

"تجویز تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن اگر اس کھیل میں تم دونوں میں سے کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو کیا ہوگا؟"

"اگر آپ چاہتی ہیں تو ہڈی پسلی بھی نہیں ٹوٹے گی اور آپ کا پہلوان چت بھی ہو

جائے گا۔"

"خود پر اتنا بھروسہ ہے؟"

"بھروسہ تو اللہ پر ہے۔ میرا کام کوشش کرنا ہے۔" اسی دوران میں میڈم کی نظر کا زاویہ تبدیل ہوا۔ غالباً اس کا دھیان عمران کے زخمی ہاتھ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ بولی۔ "لیکن تمہارا ہاتھ تو زخمی ہے۔ کیا اسی طرح لڑنا پسند کرو گے؟"

"میرے دونوں ہاتھ زخمی ہوتے تو بھی میں پسند کرتا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"سوچ لو۔"

"سوچ لیا۔"

میڈم صفورا کی آنکھوں میں دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے موبائل فون نکالا اور ایک نمبر پریس کرنے کے بعد بولی۔ "شیرا! یہاں آجاؤ میرے پاس۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں بھی جان گیا کہ اب یہاں ہلچل ہو گی۔ میری دھڑکن بڑھ گئی۔ قریباً دو منٹ بعد شیرا تہ خانے میں موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ شاید وہ جان گیا تھا کہ اسے کس لیے بلایا گیا ہے۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے میڈم نادیہ بھی وہاں آدھمکی۔ اس کے ساتھ دو باوردی گارڈز بھی تھے۔ گارڈز کی "اے کے 56" رائفلیں خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے نادیہ کی شکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بالکل ناقابلِ اعتبار تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ عمران پر "کاٹھی ڈالنے" کے لیے میرے ساتھ بدسلوکی نہیں کرے گی لیکن اس وعدے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ مجھے کرسی سے باندھنے پر تل گئی تھی۔

دو گارڈز نے عمران کو کمرے سے باہر نکالا اور اس کے ہاتھ کھول دیئے۔ شیرے نے اپنی جیکٹ میں سے تمام اشیاء نکال کر اپنے ایک ساتھی کو پکڑا دیں۔ ان میں ایک عدد ماؤزر بھی شامل تھا۔ اس کے بعد اس نے گھڑی اُتاری اور وہ بھی ساتھی کے حوالے کر دی۔ عمران کی تلاشی تو پہلے بھی کئی بار ہو چکی تھی۔

"کوئی ہتھیار استعمال نہیں ہوگا۔" میڈم صفورا نے شیرے اور عمران دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کسی بھی چیز سے کوئی ضرب نہیں لگائی جائے گی۔" اس نے آخر میں اضافہ کیا۔

احتیاط کے طور پر میڈم نے وہاں سے ہر شے ہٹوا دی جسے ضرب لگانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ سب کے چہرے پر سنسنی نظر آ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید شیرا،

عمران کے زخمی ہاتھ کو دیکھے گا اور اس حوالے سے کوئی بات کرے گا لیکن وہ یہ اخلاقی جرأت نہیں کر سکا اور ایک طرح سے یوں اس نے خود کو اخلاقی طور پر کمزور ثابت کیا۔

باکسنگ گلوز وغیرہ پہن کر لڑنا اور بات ہوتی ہے۔ جب دو مشتعل افراد خالی مکوں سے لڑتے ہیں تو اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ چہرے پر گہرے زخم آئیں۔ میں نے تصور کی نگاہ سے عمران کے زخمی چہرے کو مزید زخمی دیکھا اور میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ یہ دو بدو لڑائی کسی طرح ٹل جائے۔

بہر حال ایسا نہیں ہوا۔ بیسمنٹ کے خالی حصے نے ''فائٹنگ رنگ'' کی شکل اختیار کر لی۔

عمران اور شیرا ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ شیرے کی آنکھوں میں نفرت کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ یقیناً وہ اس رات والی ہزیمت کا پورا پورا بدلہ عمران سے لینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف عمران کو بھی ایک مناسب موقع ملا تھا۔ اسے یہاں لا کر باندھا گیا تھا اور شیرے نے اس کے ساتھ ''مکا، لات'' کی تھی۔ اب اس مکا، لات کا جواب دیا جا سکتا تھا۔

پہلا وار شیرے نے ہی کیا۔ اس نے عمران پر مکا چلایا۔ یہ مکان عمران کی ٹھوڑی کو چھوتا ہوا گیا۔ شیرے کا دوسرا مکا بھی اچٹتا ہوا سا پڑا۔ تاہم وہ اتنے جوش سے آگے آیا تھا کہ عمران اسے سنبھالتے سنبھالتے لڑکھڑا گیا اور گر پڑا۔ شیرا اس کے اوپر گرا اور مکے برسانے لگا۔

عمران نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ وہ اس کی پسلیوں کو نشانے بنانے لگا۔ عمران نے بھی ایک دو ضربیں اس کے چہرے پر لگائیں۔

میڈم صفورا کے حکم پر دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک بار پھر ایک دوسرے پر جھپٹے۔

اس بار شیرے کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو کچھ عرصہ پہلے میڈم نادیہ کی رہائش گاہ پر ہو چکا تھا۔ وہ عالم جوش میں پچھلا سبق بھلا بیٹھا۔ اس نے اپنا چہرہ عمران کے سر کی خوفناک ٹکر کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ مجھے تو یہی لگا جیسے یہ اس پہلے سین کا ری پلے ہے۔ عمران کے سر کی دھواں دھار ضرب شیرے کے ماتھے پر لگی۔ ناریل چٹخنے کی سی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا، اس کے کھوپڑے کو عمران کے سر کی دوسری ضرب سہنا پڑی۔ اس ضرب نے اسے کئی فٹ پیچھے اُچھالا اور وہ میڈم صفورا کے قدموں میں جا گرا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے پوری ہمت مجتمع کر کے اُٹھنے کی کوشش کی مگر تیورائے ہوئے باکسر کی طرح ڈگمگا کر گھٹنوں کے اوپر گر گیا۔

''اسٹاپ...... اسٹاپ اِٹ......'' میڈم صفورا چلائی۔

دو گارڈز عمران اور شیرے کے بیچ آ گئے۔ توہین اور تکلیف کے شدید اثر کے تحت شیرا

اُٹھا اور عمران کی طرف بڑھنا چاہا تاہم اب میڈم صفورا نے باقاعدہ اس کے سامنے آ کر اسے روک دیا۔

یہ لڑائی بمشکل دو تین منٹ جاری رہ سکی تھی۔ شاید حاضرین میں سے کسی کو بھی ایسے تیز رفتار اختتام کی توقع نہیں تھی۔

شیرا رک گیا مگر بدستور احتجاج کرتا رہا۔ اس کے احتجاج میں کوئی جان نہیں تھی۔ وہاں موجود ہر فرد نے یہ دیکھ لیا تھا کہ میڈم صفورا نے عقلمندی کا ثبوت دے کر شیرے کو بچا لیا ہے۔ وہ ایک بار پھر عمران کے سامنے آتا تو شاید بہت زیادہ نقصان اُٹھا لیتا۔ شیرے کے علاوہ شیرے کے دو تین قریبی ساتھی بھی عمران کو خونخوار نظروں سے گھور رہے تھے۔ تاہم ان نظروں میں خوف کی جھلکیاں بھی تھیں۔

میں کوئی مارشل آرٹ کا ماہر نہیں تھا کہ اس کی باریکیوں پر بہت زیادہ غور کر سکتا۔ تاہم میں نے کافی عرصے تک جوڈو کراٹے کی کلاسیں لی تھیں۔ میں دو بدو لڑائی کے بنیادی اصول جانتا تھا۔ میں نے بہترین لڑاکوں کو رنگ میں لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن میں نے عمران کے انداز میں جو حیران کن جھپٹ دیکھی، وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑائی میں اس کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کے سر کی ضرب تھی۔ یہ وار وہ اس قدر اچانک اور اتنے بھرپور طریقے سے کرتا تھا کہ مدِمقابل بھونچکا رہ جاتا تھا۔ یہ وار کرتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں کی انگلیوں تک عمران کا جسم ایک ایسا زاویہ اختیار کر جاتا تھا جس سے بے پناہ توانائی پیدا ہوتی تھی۔ اس توانائی کو پیدا کرنے میں اس کے پاؤں کی انگلیاں شاید سب سے اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ پھر یہ توانائی ایک شوریدہ لہر کی طرح اس کے سر تک جاتی تھی اور ایک خوفناک ضرب کی شکل اختیار کر جاتی تھی۔

تہ خانے میں سب ہکا بکا تھے۔ جسمانی لحاظ سے عمران اور شیرے کا مقابلہ گھوڑے اور ہاتھی کا مقابلہ تھا۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے اقبال نے بھی اس تیز رفتار مقابلے کو دیکھا تھا اور اندر سے ہی غالباً تالیاں بھی بجائی تھیں۔

میڈم صفورا کے اشارے پر شیرے کو باہر جانا پڑا۔ اس مقابلے کے بعد نادیہ کا منہ بھی بند ہو گیا تھا۔ وہ گم صم کھڑی تھی۔ میڈم صفورا نے اپنے گارڈز کو اشارہ کیا۔ انہوں نے عمران کو واپس کمرے میں چلنے کو کہا۔ عمران، میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اگر آپ کی تفریح ادھوری رہی ہے تو میں مزید تفریح مہیا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ اگر شیرا صاحب کے ایک دو ساتھی اکٹھے میرے ساتھ کشتی لڑنا چاہیں تو بھی میں حاضر ہوں۔''

''اس بارے میں پھر بات کریں گے۔'' میڈم صفورا سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''ابھی تم کمرے میں جاؤ۔''

میں نے شکر کیا کہ عمران کمرے میں واپس آ گیا۔ ورنہ ایک موقعے پر تو میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی بڑے ایڈونچر کی کوشش نہ کرے۔ اس کے اردگرد رائفل بردار گارڈز موجود تھے اور وہ ان میں سے کسی پر جھپٹنے کا سوچ سکتا تھا یا پھر ایسی ہی کوئی حرکت۔ کمرے میں واپس آنے سے پہلے عمران کو پھر ہینڈ کف پہنا دیئے گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہمارے اردگرد سکون ہو گیا۔ بس تہ خانے کے دروازے پر دو باوردی گارڈز کھڑے رہے۔ ہم اپنے راوی روڈ والے گھر سے شام سات بجے کے قریب نکلے تھے، اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا تھا اور جن حالات سے گزر رہے تھے، اس کے نتیجے میں بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

بہرطور تھوڑی دیر بعد کھانے کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ایک جواں سال ملازمہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ چکن بریانی، قورمہ، فرائی فش اور نان وغیرہ بہت سے لوازمات ٹرالی میں موجود تھے۔ اس میں سے کچھ کھانا اقبال کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ باقی ہمارے کمرے میں آ گیا۔ میڈم نے جاتے جاتے ہم پر واضح کر دیا تھا کہ اقبال ابھی دوسرے کمرے میں ہی رہے گا۔ اس نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ فی الحال ہم اس سے بات چیت کی کوشش نہ کریں ورنہ گارڈز کو مداخلت کرنا پڑے گی۔

''کھاؤ یار!'' عمران نے بائیں ہاتھ سے ایک بڑا لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں......بھوک نہیں۔'' میرا لہجہ آزردہ تھا۔

عمران نے بھی ہاتھ روک لیا۔ ''کیوں بھوک نہیں ہے۔''

''عمران! میں اسی وقت سے ڈرتا تھا۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنس چکے ہیں اور اگر صرف ہماری ہی بات ہوتی تو بھی خیر تھی۔ مگر اب میرے گھر والے بھی زد میں آ رہے ہیں۔''

''تم نے اپنے بارے میں چھوٹی میڈم کو کچھ بتایا ہے؟''

''سب کچھ بتایا ہے۔''

''کیا ضرورت تھی؟''

''نہ بتاتا تو چند گھنٹے بعد اسے خود ہی معلوم ہو جانا تھا۔ وہ میرے سامنے فون پر سیٹھ سراج سے بات کر رہی تھی۔ سیٹھ نے صبح دس بجے یہاں آنا ہے۔''

عمران کے ہونٹ سکڑ گئے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر منرل واٹر کے چند گھونٹ لے کر بولا۔ ''پریشانی کی بات نہیں یار! میں سنبھال لوں گا سب کچھ۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ بڑی میڈم میرے ہاتھ پر بیعت ہونے والی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''یار! مریدنی بننے والی ہے اپنی۔ جو کچھ کہیں گے، مانے گی۔ نہ مانے گی تو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیں گے۔''

''ہر وقت پہیلیوں میں بات نہ کیا کرو۔'' میں نے منہ بنایا۔

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نے چھوٹی میڈم کو اپنی سوانح حیات نہ سنائی ہوتی تو زیادہ آسانی ہوتی۔ ہم بڑی میڈم سے کہہ دیتے کہ وہ تمہیں سیٹھ سراج کے سامنے آنے ہی نہ دے لیکن اب اس سے فائدہ نہیں۔ اب دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ میڈم سے کہنا ہو گا کہ وہ تمہارے گھر والوں کی حفاظت کا انتظام کرے تاکہ نادیہ یا سیٹھ سراج وغیرہ انہیں پریشان نہ کر سکیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ بڑی میڈم انہیں پناہ دے...... بالکل بوگس خیال ہے تمہارا۔ یہ لوگ جس طرح کی پناہ دیتے ہیں، وہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ قادرے کو بھی تو بڑی میڈم نے پناہ دی تھی نا......پھر کیا کیا اس کے ساتھ۔''

''کیا تمہیں قادرے اور مجھ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟''

''مجھے صرف ایک بات کا پتا ہے۔ تم مجھے اس لعنتی معاملے میں پھنساتے چلے جا رہے ہو۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اس سے بہتر تھا کہ تم مجھے مر جانے دیتے اسی دن۔ قصہ پاک ہوتا۔ میری وجہ سے میرے گھر والوں پر تو آفت نہ آتی لیکن تم نے میری ایک نہیں سنی۔ بس اپنے شغل میلوں میں لگے رہے ہو۔ تم بس اپنے ہی ڈھنگ سے چلنا جانتے ہو۔ تمہیں کسی کی کوئی پروا نہیں۔'' میں بھنایا ہوا کھانے کے سامنے سے اُٹھا اور دوسری دیوار کے ساتھ جا بیٹھا۔

عمران نے بھی کھانا ایک طرف ہٹایا اور اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دو منٹ بعد وہ میرے پاس بیٹھا۔ اس نے اپنا زخمی ہاتھ بڑی ملائمت سے میرے ہاتھ پر رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جو میں دیکھ رہا ہوں تابی! وہ تم نہیں دیکھ رہے۔ اگر مجھ پر تھوڑا سا بھی بھروسہ ہے۔ تو اس بات پر یقین رکھو کہ تمہارے گھر والوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ میں تمہیں حلف دیتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ میری بے قراری اچانک کم ہوگئی۔ جیسے کسی بھڑکتی ہوئی آگ پر بہت سارا ٹھنڈا پانی پھینک دیا گیا ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بولا۔ ''بس یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام۔''

اور پتا نہیں کیا ہوا، میں واقعی ایک دم پُرسکون ہوگیا۔

''چلو...... اُٹھو اب کھانا کھاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں میرے لیے بلاوا آ جائے۔''

''کہاں سے؟''

''کہیں سے بھی آ سکتا ہے یار!'' اس نے کہا اور مجھے اُٹھا کر دسترخوان تک لے گیا۔ ہم بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ لقمے لینے لگے۔ یہ میری زندگی کا عجیب تجربہ تھا۔ لقمہ ایک ہاتھ سے لیا جاتا ہے لیکن جب ہاتھ بندھے ہوں تو خالی ہاتھ کو بھی نیچے اوپر حرکت دینا پڑتی ہے۔ کسی سے ہاتھ ملانا ہو، کہیں کھجلی کرنی ہو، کچھ لکھنا ہو تو بھی خالی ہاتھ بڑی بیچارگی سے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے۔ جیسے وہ کوئی ایسا بچہ ہو جو پیدائشی طور پر اپنے بھائی بہن سے جڑا ہوا ہو۔ کھانے کے دوران میں ہی میرے ایک سوال کے جواب میں عمران نے سرگوشی میں بتایا کہ ریلوے اسٹیشن پر میڈم کے بندوں کے ہتھے چڑھتے ہی اس نے اپنا موبائل کچرے کے ایک ڈبے میں پھینک دیا تھا۔ یہ کام بڑی صفائی سے اس وقت ہوا تھا جب میڈم کے بندے اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ عمران کے پاس موبائل کی غیر موجودگی نے قادرے اور کنول وغیرہ کو زیادہ محفوظ کر دیا تھا۔

اسی دوران میں لمبی ناک اور تیکھے نقوش والا ایک آرٹسٹ ٹائپ شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سفید لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کر گارڈ سے بولا۔ ''مجاہد علی! کھولو اسے۔ میڈم نے بلایا ہے۔'' لمبی ناک والے کا اشارہ عمران کی طرف تھا۔

''تمہیں کہا تھا نا بلاوا آئے گا۔'' عمران نے سرگوشی کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟'' میں کہے بغیر نہیں رہ سکا۔

''مسئلہ ہوگا تو میں سرتاپا حل بن جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔'' اس نے کہا اور نو وارد کے ساتھ باہر چلا گیا۔ دو گارڈز بھی اس کے عقب میں گئے۔

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ مختلف اندیشے بے پناہ رفتار سے میرے ذہن میں آتے اور

جاتے رہے۔ دیو ہیکل السیشین کتے کی آواز پورچ کی طرف سے اُبھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میں، اقبال اور سلیم کو دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں میری نظر سے دور تھے۔

عمران کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ایک گارڈ کے ساتھ گپیں لگاتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ اس کی اُڑتی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''میری بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ آسیہ واقعی میری منگیتر کی ہم شکل ہے۔ میرے سارے زخم ہرے ہو گئے ہیں شیر فتح۔''

''شیر فتح نہیں جی! فتح شیر۔'' گارڈز نے اپنے نام کی تصحیح کی۔

''شیر آگے ہو یا پیچھے، شیر ہی رہتا ہے یار۔'' عمران نے کہا۔ ''بلکہ پیچھے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔''

اب میں نے غور کیا تو عمران کے ہاتھوں میں ہینڈ کف بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

گارڈ نے میرے کمرے کو ان لاک کیا اور بڑی عزت سے مجھے باہر آنے کے لیے کہا۔ میرے ہینڈ کف بھی ایک لمبی چابی کے ذریعے کھول دیئے گئے۔ اس کے بعد اقبال کی باری آئی۔ اسے کمرے سے نکالا گیا۔ اس کے ہاتھ پہلے ہی آزاد تھے۔ بہرحال ٹانگوں کی تکلیف کے سبب وہ بڑی مشکل سے چل پا رہا تھا۔ میں نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے ساتھ مار پیٹ نہ کی گئی ہو مگر ایسے کوئی آثار نہیں تھے۔

ہمیں ایک راہداری میں لایا گیا۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ گارڈز کا رویہ بدل چکا ہے۔ ان کی رائفلیں ایزی موڈ میں کندھوں سے جھول رہی تھیں۔ ''کہاں لے جا رہے ہیں؟'' میں نے مدھم آواز میں عمران سے پوچھا۔

''اس وقت بستر سے اچھی جگہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ بول بول کر میری تو ٹانگیں دُکھنے لگی ہیں۔''

''ٹانگیں؟''

''ہاں جگر! یہ مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ بولنے سے ٹانگیں دُکھتی ہیں۔ زیادہ چلوں تو زبان کا مسل پل ہو جاتا ہے۔'' اس نے بے پَر کی اُڑائی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خود بھی ٹھیک سے پتا نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس چھوٹی عمارت میں داخل ہو رہے تھے جو دونوں لال کوٹھیوں کے سنگم پر واقع تھی۔ یہ یہاں کی انیکسی تھی۔ اسے چاروں طرف سے کچنار اور نیم کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اندر سے یہ جگہ خوب سجی سنوری تھی۔ ہمیں ایک نہایت آرام دہ بیڈ روم میں

پہنچا دیا گیا۔ اس عالی شان کمرے میں تین لگژری بیڈ تھے۔ باتھ روم بس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہر جدید آسائش باتھ روم میں موجود تھی۔

جب ہم یہاں داخل ہو رہے تھے، ہم نے ایک ساتھ والے کمرے سے ایک ملازم کو کچھ سامان وغیرہ نکالتے دیکھا۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ انچارج گارڈ شیرے کا سامان ہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ یہاں رہائش رکھے ہوئے تھا، اب اسے یہاں سے شفٹ کیا جا رہا تھا۔ جلد ہی ہمیں شیرا بھی نظر آ گیا۔ عمران کی دو دھواں دھار ضربوں کی وجہ سے اس کا چہرہ متورم تھا۔ وہ اپنا بیگ اُٹھائے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ اس نے عجیب زہریلی نظروں سے ہمیں گھورا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

جلد ہی دو خوبرو ملازمائیں ہماری خدمت کے لیے حاضر ہو گئیں۔ ان کی عمریں بیس بائیس سال کے درمیان رہی ہوں گی۔ ان کی مسکراہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر ہم چاہیں تو وہ ہر قسم کی خدمت کے لیے تیار ہیں۔ وہ دونوں شلوار قمیص میں تھیں۔ سویٹرز بغیر آستین کے تھے اور قمیص آدھی آستین کی تھی۔ ان کی سڈول باہیں اور صراحی دار گردنیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ انہوں نے ایک وسیع وارڈ روب کھولی اور قریباً دو درجن مردانہ لباس، سویٹر، کوٹ وغیرہ ہینگرز پر لٹکا دیے۔ ان میں سلیپنگ گاؤن وغیرہ بھی تھے۔ نفیس چپلیں اور جوتے وغیرہ پہلے ہی قطار اندر قطار اس وسیع وارڈ روب میں موجود تھے۔

قد آدم ریفریجریٹر پر کھانے پینے کے بہت سے لوازمات رکھے تھے۔ ان میں امپورٹڈ وہسکی کی چمکیلی بوتلیں نمایاں تھیں۔ بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹیلی ویژن پر کوئی انگریزی فلم دھیمی آواز میں چل رہی تھی۔ یہ غیر معمولی حد تک شاندار رہائش گاہ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صفورا ہمیں مرعوب کر دینا چاہتی ہے۔

''کوئی خدمت سر؟'' ایک لڑکی نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''نو تھینک یو۔ فی الحال ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔''

''لیکن یار! آرام کرنے کے لیے تھکنا ضروری ہوتا ہے۔'' اقبال نے بھی معنی خیز لہجے میں کہا۔

''ابھی تم اپنی ٹانگوں کو سنبھالو۔'' عمران نے سرزنش کی۔

''چلو پھر تھوڑا سا مساج ہی کرا دو۔ ہمیں کچھ تو فائدہ ہو ان مہربان میزبانوں کا۔'' اقبال چہکا۔

عمران نے ایک لڑکی کو مساج کے لیے کہا۔ وہ تو پہلے سے اشارے کی منتظر تھی۔ اس

نے جھٹ ایک الماری میں سے دو تین امپورٹڈ آئلز نکال لیے۔ ''چلو جی چلیں۔'' اقبال اُٹھ کر بغلی کمرے کی طرف بڑھا۔

عمران نے اسے گردن سے دبوچ کر دوبارہ بستر پر ڈال دیا۔ ''جو کچھ کرانا ہے، یہیں پر کراؤ...... ہمارے سامنے۔ ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

''پھر کیا فائدہ؟'' اقبال نے ٹھنڈی سانس لی اور فلم اسٹار ندیم کی آواز میں بولا۔ ''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے ٹیلی فون پر شادی کرنے کے بعد ٹیلی فون پر ہی سہاگ رات منانا۔ ٹھیک ہے بی بی! جاؤ تم۔ ابھی ہمارے ستارے آپس میں نہیں مل رہے۔'' اس نے آخری فقرہ لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ لڑکی اس کی آواز اور اسٹائل پر ششدر رہ گئی۔

عمران نے بڑی احتیاط سے ایک وسیع بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ پھر ایک کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا۔ لکھا تھا۔ ''ہمیں بات کرتے ہوئے بہت احتیاط کرنی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں ہمیں دیکھا اور سنا جا رہا ہو۔''

اس کے بعد یہی چٹ اس نے اقبال کو دکھائی۔

میں عمران سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میڈم صفورا سے اس کی کیا بات چیت ہوئی ہے اور میرے گھر والوں کے حوالے سے اس نے میڈم سے کیا تحفظ حاصل کیا ہے۔ عمران نے میرے تاثرات سے میرا ارادہ بھانپ لیا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا۔ ''ایک دم بے فکر ہو جاؤ۔ میڈم جی سے ساری بات ہو گئی ہے۔ نو پرابلم ایٹ آل۔''

اس رات میں بہت تھوڑی دیر کے لیے سویا۔ دوسری طرف عمران اور اقبال بے فکری سے پڑے رہے۔ وہ جیسے اپنے ہی گھر میں سو رہے تھے۔ عجیب مزاج تھے ان کے۔ چند گھنٹے پہلے پیش آنے والے واقعات کی فلم سی بار بار تصور کے پردے پر چلتی رہی اور میں بے قرار ہوتا رہا۔ سب سے اہم سوال میرے ذہن میں یہی اُبھر رہا تھا کہ صبح جب سیٹھ سراج کو میری یہاں موجودگی کا علم ہو گا تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا؟

اگلے روز ہم دونوں نے بہترین باتھ رومز میں غسل کیا اور وارڈ روب میں سے اپنی پسند اور اپنے ناپ کے کپڑے نکال کر پہنے۔ اقبال اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے ان سہولتوں سے محروم رہا۔ ابھی ہم ایک پُرتعیش ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ سیٹھ سراج، شیرا اور ایک دراز قد شخص اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، دراز قد شخص سیٹھ سراج کا ساتھی عارف خان تھا۔

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ آخر میرا اور سیٹھ کا سامنا ہو ہی گیا تھا۔ شیرا بھی

ساتھ تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن عمران یہاں موجود تھا اور اس کے ہوتے مجھے کیا فکر ہو سکتی تھی۔ حیرت انگیز طور پر سیٹھ سراج نے آگے بڑھ کر عمران اور اقبال سے ہاتھ ملایا اور پھر میری طرف بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے سراج سے مصافحہ کیا۔ سب لوگ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں میڈم صفورا بھی تیز قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔ اس نے بھی سب سے ہاتھ ملایا۔ پھر سیٹھ سراج سے مخاطب ہو کر بولی۔

"سراج! یہ بات اب کلیئر ہے کہ عمران اور اس کے دونوں ساتھی اب ہمارے ساتھ شامل ہیں اور ہمارا ہی ایک حصہ ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ مجھے اپنے ہی ساتھیوں کا ایک دوسرے سے اختلاف رکھنا بالکل پسند نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے، اسے آپ سب لوگ بالکل بھول جائیں اور ایک نئے تعلق کی شروعات کریں۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی میڈم......لیکن......"

"لیکن نہیں سراج! یہ لفظ "لیکن" مجھے زہر لگتا ہے۔ جو کچھ میں نے تم سے کہہ دیا ہے، اس میں "لیکن" کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"ٹھیک ہے میڈم!" سیٹھ نے مدھم لہجے میں کہا۔ "تہاڈے سامنے ہن کیسے بولاں۔"

"تم نے بھی سن لیا ہے شیرے؟"

"ہاں جی میڈم۔"

"چلو اٹھو......پھر ایک دوسرے سے گلے ملو۔"

سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا لیکن رسمی طور پر تو کشیدگی کم ہوتی نظر آتی تھی۔

سیٹھ سراج جب مجھ سے گلے مل کر پیچھے ہٹا تو ایک لمحے کے لیے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے میری آنکھیں ملیں۔ ایک بار پھر وہی چنگاری اس کی نگاہوں میں نظر آئی جو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی اور جس کی دید نے میرے دل میں اتھاہ خوف پیدا کیا تھا۔ کیا یہ چنگاری واقعی دوبارہ نظر آئی تھی یا بس میرا وہم تھا؟

کچھ ہی دیر بعد سیٹھ سراج، شیرا اور عارف خان واپس چلے گئے۔ سیٹھ سراج کا کیم شیم ڈولتا ہوا جسم میری نگاہوں سے اوجھل ہوا تو مجھے ایک گونا گوں اطمینان محسوس ہوا۔

صلح صفائی کی اس کارروائی سے عمران بھی کچھ زیادہ مطمئن دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کی وجہ عیاں تھی۔ چھوٹی میڈم نادیہ اس کارروائی میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میڈم صفورا نے اسے بلایا ہو لیکن وہ کسی بہانے سے کنی کترا گئی ہو۔ وہ ہر لحاظ سے من موجی اور

من مانی کرنے والی دکھائی دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے ہینڈل کرنے میں میڈم صفورا کو بھی دشواری محسوس ہوتی ہے۔

کل رات میں نے نادیہ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ میڈم صفورا کی مداخلت کے بعد نادیہ، عمران کو ایسی نظروں سے گھورتی رہی تھی جن میں حرص کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی گہری مایوسی بھی شامل تھی۔ جیسے کوئی بھوکا شکاری اپنے ہاتھ سے نکلنے والے لذیذ شکار کو دیکھتا ہے۔

رات کو عمران نے مزاحیہ لہجے میں مجھ سے کہا تھا کہ میڈم صفورا عنقریب اس کی مریدنی بننے والی ہے اور لگتا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی گرویدہ نظر آنے لگی تھی اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں ہوا تھا۔

ہم انیکسی کے لان میں آ بیٹھے۔ یہ بڑی سرسبز جگہ تھی۔ اسے چاروں طرف سے گارڈینا کی سات آٹھ فٹ اونچی باڑ نے گھیر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں کسی قسم کے ڈکٹا فون یا ریکارڈنگ ڈیوائس کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "میرے گھر والوں کے بارے میں میڈم نے کیا کہا ہے؟"

"میڈم نے ہر طرح کی تسلی بلکہ گارنٹی دی ہے کہ سیٹھ سراج وغیرہ کی طرف سے تمہاری فیملی کو کسی طرح کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوگا۔ میڈم نے سیٹھ سراج اور عارف خان وغیرہ سے ساری بات کر لی ہے۔ اس کے باوجود میں نے مزید احتیاط کے طور پر انہیں کچھ روز کے لیے ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے۔"

"کہاں؟"

"ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں۔ یہ میرے ایک دوست کی ملکیت ہے۔ میڈم اور اس کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ یہاں دو گارڈز بھی موجود رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے ایک گاڑی بھی ہے۔"

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہاں ہمارے عزیز رشتے دار اور جاننے والے ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے کہ ہم اچانک ناصر بھائی کی طرح گھر چھوڑ کر کیوں چلے گئے؟"

"اچانک نہیں گئے یار! سب کچھ طریقے سے ہوا ہے۔ میں نے کل فون پر تمہاری والدہ سے کافی دیر بات کی تھی۔ میں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ حفاظت کی غرض سے انہیں چند دن گھر سے دور رہنا ہوگا۔ اس دوران میں تمہارے سارے گھر کا رنگ روغن ہوگا اور مرمتیں وغیرہ

ہوں گی۔ کم از کم ایک ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جائے گا ان کاموں پر۔ یہ گھر سے باہر رہنے کی ایک معقول وجہ ہو گی اور ویسے بھی یار! عنقریب ثروت بی بی کے ساتھ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ گھر کا حلیہ تو ٹھیک کرنا ہی ہے نا۔'' اس نے آنکھ ماری۔

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور میرے خیال میں تمہیں بھی اس معاملے کو سنجیدگی سے لینا چاہیے۔

''یار! اس میں غیر سنجیدگی والی کون سی بات ہے؟ تمہاری شادی ہونی ہے ثروت سے ہونی ہے، عنقریب ہونی ہے اور میں نے گواہوں کے خانے میں اپنا نام لکھوانا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ میں بھول گیا ہوں۔ ہر گھڑی تمہارے ماتھے پر سجنے والے سہرے کا خیال میرے ذہن میں رہتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میری اور میرے گھر والوں کی جمی جمائی زندگی تہس نہس ہو رہی ہے۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ لوگ واقعی ڈیفنس چلے گئے ہیں تو پھر بھی انہوں نے رہنا تو یہیں لاہور میں ہے نا۔ میری بہن فرح کو کالج جانا ہوتا ہے۔ عاطف کو بھی جانا ہوتا ہے۔ وہ کیا گھر میں چھپ کر بیٹھے رہیں گے اور پڑھائی کا حرج کریں گے؟''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عاطف کے امتحان ہو چکے ہیں اور وہ آج کل فارغ ہے۔ سسٹر فرح کی کلاس بھی آج کل ہفتے میں بس دو روز ہوتی ہے۔ اگر اسے جانا بھی ہوا تو وہ گاڑی میں پوری حفاظت کے ساتھ جائے گی۔ تمہیں بتایا ہے نا، یہ ساری میری درد سری ہے۔ باقی والدہ اور گھر والے پوری طرح مطمئن ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں ان سے فون پر تمہاری بات بھی کرا دیتا ہوں۔''

ابھی ہماری بات جاری تھی کہ میڈم صفورا پھر وارد ہو گئی۔ اس کے ساتھ وہی کل والا گنجا ڈاکٹر تھا۔ میڈم صفورا نے اپنی نگرانی میں اقبال کی زخمی ٹانگیں چیک کروائیں۔ گنجے ڈاکٹر نے موبائل فون پر کسی دوسرے سینئر ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا۔ اس نے اپنے جدید موبائل کے ساتھ اقبال کی زخمی ٹانگوں کی کلرڈ تصویریں لیں اور انہیں سینئر ڈاکٹر کو ایم ایم ایس کیا۔ سینئر ڈاکٹر نے فون پر اقبال سے بات کی اور دوائیں تجویز کیں۔

اندازہ ہوتا تھا کہ میڈم صفورا ہماری دیکھ بھال میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ میڈم صفورا اور ڈاکٹر کے جانے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر گراسی لان میں آ کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ جاتی سردیوں کی نرم دھوپ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ایک خوبرو ملازمہ

ہمارے سامنے چھوٹی تپائی پر مالٹے اور سرخ انار کا جوس رکھ گئی۔ میں نے عمران سے پوچھا کہ یہ سارا کیا گورکھ دھندا ہے اور وہ میڈم صفورا جیسی دبنگ عورت کو کس طرح رام کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟

عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے میڈم کو قائل کیا کہ اسے ہماری ضرورت ہے۔ جب وہ مان گئی تو اس نے ہمارے لیے اپنے دل میں نرم رویہ ''ایجاد'' کر لیا۔''

''ہم اس کی کیا ضرورت پوری کر سکتے ہیں؟''

''وہی جو اس وقت اس کے دل کا روگ بنی ہوئی ہے۔ وہ نوادر کا کاروبار کرتی ہے۔ اس حوالے سے ہر طرح کے نوادر میں اس کی بے حد دلچسپی ہے۔ کوئی اچھا پیس آف آرٹ دیکھ کر اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو پانچ روز کے بھوکے کی گرما گرم روٹی اور چکن کڑاہی دیکھ کر ہو سکتی ہے۔ اب یہ چکن کڑاہی اس سے دور ہے اور اس کی بھوک روز بروز اور لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔''

''وہ ہے کیا شے جس کے لیے اتنے لوگ دیوانے بنے ہوئے ہیں؟''

''بدھا کا ایک دو فٹ اونچا مجسمہ...... یہ فاقے کی حالت میں ہے۔ اسے ''فاسٹنگ بدھا'' کہا جاتا ہے۔ اس کی تخلیق میں بے پناہ فنکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ فاقہ زدہ بدھا کے پنجر اور اس کے رگ پٹھوں اور دھنسی ہوئی آنکھوں کو نمایاں کرنا ایک نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ اس طرح کے جتنے بھی مجسمے مختلف جگہوں سے برآمد ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، ان میں عموماً کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے۔ صدیوں کا سفر طے کر کے جو شے ہم تک پہنچتی ہے، اس میں کچھ نہ کچھ ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوتی ہے۔ کہیں انگلیاں نہیں ہوتیں، کہیں ناک نہیں ہوتی اور کہیں سر علیحدہ اور دھڑ علیحدہ پایا جاتا ہے۔ ایسے مجسموں اور چھوٹی مورتیوں کو ماہرین بعد میں جوڑ کر مکمل کرتے ہیں۔ بہت کم پیس آف آرٹ ایسے ہوتے ہیں جو شاندار ہونے کے علاوہ مکمل بھی ہوتے ہیں۔ بدھا کا یہ مجسمہ ان میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈم اسے حاصل کرنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہے اور میڈم کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی یہی کیفیت ہے۔''

''وہ اس کا کیا کرے گی؟''

''اس کا اپنا ایک پرائیویٹ میوزیم بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے لیے خریدنا چاہتی ہو۔ یا پھر اس کا خیال ہو کہ وہ اپنے ذرائع سے اسے زیادہ مہنگے داموں فروخت کر سکتی ہے۔

آج کل جاپان اور تھائی لینڈ وغیرہ میں یہ کام زوروں پر ہے۔"

"تو کیا تم نے اس سے کہا ہے کہ تم وہ مجسمہ اسے لا دو گے؟"

"ہاں...... کچھ ایسی ہی حماقت کی ہے میں نے۔" وہ مسکرایا۔

"اس حماقت کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم اس کی ڈیمانڈ پوری کر دیں گے اور وہ خوشی سے نہال ہو کر ہم تینوں کی...... نہیں نہیں...... ہم میں سے کسی ایک کی زوجیت میں آ جائے گی۔" وہ پھر پٹری سے اُترنے لگا۔

"یعنی تم وہ پیس آف آرٹ حاصل کر لو گے لیکن کیسے؟ یہ کام تو اتنا آسان تھا تو پھر یہ لوگ خود کیوں نہ کر سکتے؟"

"یہ لوگ اس لیے نہیں کر سکے کیونکہ یہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل نہیں چلا سکتے، نہ ہی پچاس ساٹھ فٹ کی بلندی پر بغیر جال کے ہوا میں کرتب دکھا سکتے ہیں اور نہ پستول کے چیمبر میں تین گولیاں رکھ کر خود پر فائر کر سکتے ہیں۔" وہ عجیب انداز میں بولا۔ اس کے اندر کی بے پناہ توانائی اس کی مسکراتی آنکھوں میں جھلک رہی تھی اور معصوم چہرے پر لہریں مار رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہم اس معاملے کو خطرناک سے خطرناک بناتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم جو بھی کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک بندے کی جان ہماری وجہ سے جا چکی ہے۔ اب یہ نہ ہو کہ کوئی اور جان چلی جائے۔"

"میں نے کہا ہے نا...... جو اندیشہ سب سے آخر میں ذہن میں آنا چاہیے وہ سب سے پہلے تمہارے ذہن میں آتا ہے۔"

"مگر کرو گے کیا؟"

"بس دیکھتے جاؤ، جو کام ان کو پہاڑ نظر آ رہا ہے وہ ہم چٹکی بجاتے کریں گے۔ اس طرح سے......" اس نے باقاعدہ چٹکی بجانے کی کوشش کی مگر ہاتھ زخمی تھا اس لیے کراہ کر رہ گیا۔

اسی دوران میں میڈم صفورا پھر آ گئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی تھی۔ پینٹ شرٹ اور اونچی ایڑی والی جوتی کے ساتھ وہ خاصی اسمارٹ نظر آتی تھی۔ شولڈر بیگ اس کے کندھے سے جھول رہا تھا۔ اس نے بیگ میں سے پانچ سو کے کرنسی نوٹوں والی چار گڈیاں نکالیں اور عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ خرچے وغیرہ کے لیے رکھ لو۔ شام تک ایک کریڈٹ کارڈ

بھی تمہیں مل جائے گا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے میڈم! جب ضرورت پڑے گی آپ سے خود مانگ لوں گا۔"

"نہیں...... نہیں یہ رکھو۔ اس سے مجھے تسلی رہے گی۔ بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ......"

وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"جی فرمائیں۔ آپ رُک کیوں گئیں؟"

"میں تو چاہتی ہوں کہ چھوڑ دو یہ سرکس وغیرہ۔ جو وہاں سے کماتے ہو، اس سے چار پانچ گنا تم کہیں بھی کما سکتے ہو۔"

"میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے میڈم کہ سرکس میرا روزگار نہیں بلکہ شوق ہے اور میرے لیے اسے فی الحال چھوڑنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں...... آپ کے حکم کے مطابق میں دس پندرہ روز کی چھٹی لے لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اس بارے میں مزید سوچ بچار کر لو۔ میری طرف سے تمہارے لیے ہر طرح کی آفر موجود ہے۔"

ہمارے پاس کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد اور اپنایت کا اظہار کرنے کے بعد میڈم صفورا واپس چلی گئی۔ یہ ملاقات مکمل رازداری سے ہوئی تھی اور بات چیت کے دوران میں ہمارے ارد گرد کوئی ملازم یا گارڈ وغیرہ موجود نہیں تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے مختصر وقت میں میڈم صفورا، عمران کو اپنے باقی تنخواہ داروں پر فوقیت دینے لگی ہے۔

اقبال نے کہا۔ "یار ہیرو! میڈم کی یہ "محبت" ہمیں کہیں لے نہ ڈوبے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں سراج اور شیرے جیسے بہت سے رقیب پیدا ہونے والے ہیں۔"

"جو پیدا ہونے والا ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ نیچر کا اصول ہے۔"

"نیچر کے اور بھی بہت سے اصول ہیں۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔ "آگ سے کھیلیں گے تو وہ ہمیں ضرور جلائے گی اور تم آگ سے کھیل رہے ہو۔ نہ صرف کھیل رہے ہو بلکہ آگے بڑھتے جا رہے ہو۔ میں اس معاملے میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اگر تم مجھے معافی دے دو تو بہتر ہے۔"

"ارے...... تم تو سنجیدہ ہو گئے ہو۔ بالکل اس بیٹسمین کی طرح لگ رہے ہو جو ڈپریشن میں اُلٹی سیدھی ہٹ لگا کر آؤٹ ہو جاتا ہے۔ پتا ہے اپنے آخری میچ میں ہمارے انضمام الحق نے بھی......"

"خدا کے لیے عمران! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔" میں نے ترخ کر کہا۔ "میں اب اور

تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔''

عمران نے ایک دم میرا ہاتھ دبا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور یاد دلایا کہ یہاں کیمرے اور مائیکروفون وغیرہ موجود ہیں۔

میں اُٹھا اور بھنایا ہوا باہر لان میں آ گیا۔ گفتگو کے لیے یہ لان ہی مناسب تھا۔ عمران بھی میرے پیچھے پیچھے آیا۔ ہم زرد گلاب کی کیاریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

میں نے عمران سے دوٹوک لہجے میں کہا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اور جو کچھ کرنے جا رہا ہے وہ بالکل میرے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ مجھے اپنے گھر والوں کی عزت اور سلامتی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے لہٰذا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ سمجھے۔ میں اب ایک قدم بھی اس کے ساتھ چلنے کو تیار نہیں ہوں اور اگر وہ مجھے چلنے پر مجبور کرے گا تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔

عمران نے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں مجھے سمجھانے بجھانے اور قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر پتا نہیں آج کیا بات تھی کہ میں نے اس کی ہر دلیل کو رد کر دیا اور کہا کہ میں اپنا راستہ ابھی اور اسی وقت اس سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ میری آنکھوں میں بار بار آنسوؤں کی نمی آ رہی تھی اور اپنے اہلِ خانہ کی پریشانیوں کا خیال میرا خون جلا رہا تھا۔ میں نے عمران سے بس ایک بات ہی کہی۔ میں نے کہا کہ وہ میڈم سے کہہ کر مجھے اس سارے چکر سے الگ کر دے۔ میں واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ میرے اہلِ خانہ بھی گھر واپس آ جائیں۔

''مگر تابی! سمجھنے کی کوشش کرو۔'' عمران بولا۔ ''جو بھی ہوا اور جس طرح بھی ہوا لیکن حقیقت اب یہی ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث ہو چکے ہو۔ یہ لوگ اب کسی صورت تمہیں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔''

''نہ رہنے دیں لیکن اگر ہمیں مرنا ہے تو اپنی مرضی سے مریں گے، تمہاری مرضی سے نہیں۔ تم جس طرح مجھے اس دلدل میں دھنساتے جا رہے ہو، مجھے تو لگ رہا ہے کہ ہماری موت بھی بدترین قسم کی ہو جائے گی۔'' میرا لہجہ حتمی تھا۔

کافی دیر بعد عمران نے ایک گہری سانس لی اور ہارے ہوئے انداز میں بولا۔ ''تم پر میرا کوئی زور نہیں ہے جگر! میں نے تو اس پہلی رات کو ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تم موٹر سائیکل سے اُتر کر جہاں چاہے جا سکتے ہو۔ تم اس وقت اُتر جاتے تو بہتر ہوتا۔ بہر حال اب بھی میں تمہیں زبردستی نہیں روکوں گا۔ ہاں...... اتنا ضرور چاہوں گا کہ میری وجہ سے تمہارے اور

تمہارے گھر والوں کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو۔ مجھے بس تین چار دن کا وقت دو۔ میں سراج کے حوالے سے میڈم سے بات کروں گا۔ مجھے میڈم سے اس بات کی مکمل گارنٹی چاہیے کہ سراج یا مجید مٹھو کے چیلے چانٹے تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔''

''لیکن میں دو تین دن سے زیادہ کسی صورت یہاں نہیں رُکوں گا۔'' میرا لہجہ ایک بار پھر دوٹوک ہوتھا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔'' عمران نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''جہاں تک ثروت والا مسئلہ ہے اس میں مَیں نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ ابھی پرسوں بھی حاجی صاحب سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مکان کی رقم مل گئی ہے۔ دو چار دن میں ناصر جرمنی سے وہ اکاؤنٹ نمبر بھیج دے گا جس میں ڈرافٹ جمع ہونا ہے۔ جیسے ہی اس کا سراغ لگا، میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے جو میری قسمت میں ہے، وہ ہو جائے گا۔ میں اپنے گھر والوں کی سلامتی داؤ پر لگا کر ثروت کو تلاش نہیں کر سکتا۔''

اس طویل گفتگو کے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ سہ پہر کو عمران مجھے بتائے بغیر ایک سرخ کار میں کہیں چلا گیا اور دو ڈھائی گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ وہ کار خود ڈرائیو کر کے گیا تھا۔ رات کو میں لگژری بیڈ پر لیٹا دیر تک سوچ بچار کرتا رہا۔ مجھے عمران اور میڈم کی گارنٹی کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ میرا مستقبل بھی ثروت اور ناصر بھائی کے مستقبل سے ملتا جلتا ہے۔ مجھے بھی اب ہجرت کرنا تھی۔ ہجرت جو صدیوں سے ظلم و جبر کے ردِعمل میں کی جاتی ہے۔ اس کے بہت سے درجے ہیں۔ کچھ عظیم ہجرتیں، عظیم مقاصد کے لیے کی گئیں۔ کچھ معمولی ہجرتیں، مجھ جیسے معمولی لوگوں نے معمولی مقاصد کے لیے کیں۔ اب یہ بات تو طے تھی کہ سیٹھ سراج کے ہاتھوں میرے زد و کوب ہونے والا واقعہ اب کبھی لوگوں کے ذہنوں سے مٹے گا اور نہ میرے اپنے ذہن سے۔ اس لیے اپنے گھر واپس جانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اپنے ذہن میں جو منصوبہ بندی کر رہا تھا، وہ یہ تھی کہ عمران اور اس کی خطرناک مصروفیات سے پیچھا چھڑانے کے بعد میں اپنے گھر والوں کے ساتھ جنوبی پنجاب یا پھر سندھ کے کسی شہر میں منتقل ہو جاؤں گا۔ چار چھ ماہ تک خاموشی سے حالات کا جائزہ لوں گا اور اگر صورتِ حال سازگار نظر نہیں آئی تو مکان وغیرہ فروخت کر دوں گا۔ کرائے کا مکان کہیں بھی لیا جا سکتا تھا۔ عاطف اور فرح کی پڑھائی بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں تعلیمی ادارہ تبدیل کرنے میں دشواری ہوتی۔

دو دن میں اسی ڈگر پر سوچتا رہا اور مجھے اپنی منصوبہ بندی میں خاصا وزن محسوس ہوا مگر تیسری صبح ایک بار پھر اندیشے دل میں گھر بنانے لگے۔ عمران نے یہ بات تو ٹھیک ہی کہی تھی کہ میں اس سارے چکر میں ملوث ہو چکا ہوں۔ تو کیا میں ملوث ہونے کے باوجود ان خطرناک لوگوں سے دور رہنے میں کامیاب ہو سکوں گا؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ کیا میں عمران کے بغیر تحفظ محسوس کر سکوں گا؟

میں اس شخص پر لاشعوری طور پر بے پناہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ کسی وقت مجھے یوں لگتا تھا کہ یہ شخص ہر وہ کام کر سکتا ہے جسے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے۔ تو کیا ''کن فیکون'' جیسی خداداد صلاحیت رکھنے والے شخص کی پُر خلوص دوستی سے محروم ہونا دانشمندی تھی؟

صبح ناشتے پر میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اُداسی کی دھندلاہٹ تھی۔ اس نے ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا اور خلافِ معمول پھر سو گیا۔ عجیب جادو تھا اس شخص میں۔ وہ ہر کس و ناکس کو اپنے دائرہ اثر میں لے لیتا تھا۔ شاید میں بھی اس کے دائرہ اثر میں آ چکا تھا۔ اس کی پُر خلوص محبت سے محروم ہونے کا سوچ کر مجھے اپنے دل کی رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ کیا تھا؟ کون تھا؟ کہاں سے آ دھمکا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

رات کو میں نے فون پر والدہ، فرح اور عاطف سے بھی بات کی۔ میرے اندیشوں کے برخلاف والدہ اور فرح وغیرہ پریشان نہیں تھے بلکہ میں نے پہلی بار ان کے لب و لہجے میں طمانیت محسوس کی۔ والدہ نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ تین روز پہلے عمران خود انہیں نئے گھر میں چھوڑ کر گیا ہے۔ والدہ نے کہا کہ وہ یہاں زیادہ تحفظ اور اطمینان محسوس کر رہی ہیں۔ انہوں نے عمران کی بہت تعریف کی اور کہا۔ ''ایسے دوست قسمت سے ملتے ہیں تابی! عمران کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ تمہیں تمہاری پریشانیوں سے نکال لے گا۔ بڑا اعتماد ہے اس کے اندر۔ تم تو مجھے کچھ بتاتے نہیں ہو لیکن اس نے کچھ باتیں بتائی ہیں۔''

اتنے میں فرح نے والدہ سے فون لے لیا اور بولی۔ ''تابش بھائی! امی ٹھیک کہہ رہی ہیں، عمران بھائی بڑے اچھے ہیں۔ انہوں نے یہاں ہماری ہر سہولت کا خیال رکھا ہے۔ سگے بھائیوں کی طرح میرا ماتھا چوم رہے تھے۔ لگتا ہے کہ ان کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔ ایسے لوگ سیٹھ سراج اور تھانیدار اشرف جیسے لوگوں سے اچھی طرح نمٹ سکتے ہیں۔ ویسے وہ بتا رہے تھے کہ ان کا تعلق ''خفیہ پولیس'' سے ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عمران نے خفیہ پولیس والا شوشہ یہاں بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کی کوئی بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہوتی تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری کلاسز کا کیا ہو گا؟''

''میں کل گئی تھی بھائی! اب اگلے ہفتے جاؤں گی۔''

''کیسے گئی تھیں؟''

''جانا تو ڈرائیور کے ساتھ تھا مگر اس وقت اتفاق سے عمران بھائی خود آ گئے۔ کہنے لگے چلو آج میں جاؤں گا اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ۔ راستے میں ''بگ اسٹور'' سے ڈیڑھ دو ہزار کی چاکلیٹس لے دیں۔ کہنے لگے کہ واپسی پر ڈرائیور لینے آئے گا، ساتھ میں گارڈ بھی ہو گا مگر ان گارڈز کو دیکھ کر پریشان نہیں ہونا۔ یہ صرف تمہاری شان و شوکت بڑھانے کے لیے ہیں۔ تسلی دے رہے تھے کہ چھوٹی چھوٹی پریشانیاں ہیں۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر ان گارڈز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ بہت اچھے ہیں۔ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے عجیب سی سیکیورٹی محسوس ہوتی ہے۔''

فرح نے عمران کے زخمی ہاتھ کے بارے میں بھی پوچھا کہ انہیں کیسے چوٹ لگی ہے؟ کیا انہوں نے کسی سے مار پٹائی کی ہے؟ میں نے بس گول مول جواب دیا۔ میں اسے کیا کیا بتاتا؟

اس موقعے پر والدہ نے ایک بار پھر میری بہن فرح سے فون لے لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''میں نے تیرے لیے بڑی دعائیں مانگی ہیں تابی! رو رو کر اللہ سے کہا ہے کہ وہ تیری مشکلیں آسان کرے۔ تیری مدد کرے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میری دعائیں قبول ہوئی ہیں۔ تیرے اس دوست کی شکل میں اللہ نے تیرے لیے مدد بھیجی ہے۔ تم اس کی دوستی سے منہ نہ موڑنا۔ وہ تیرے بارے میں کچھ دُکھی سا لگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، تابی مجھ سے کچھ ناراض ہے۔ کیا تمہارے درمیان کوئی بات ہو گئی تھی؟'' والدہ نے بڑے درد سے پوچھا۔

''نن...... نہیں امی! بس یونہی کہہ دیا ہو گا اس نے۔''

''دیکھ تابی!'' والدہ نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''تیرے بارے میں میرے دل سے جو آواز آتی ہے نا، وہ کبھی جھوٹی نہیں ہوتی۔ میں نے بہت دفعہ آزمایا ہے۔ اب بھی میرے دل سے آواز آ رہی ہے کہ تیرا یہ دوست تیرے اور ہم سب کے لیے نیک شگون ثابت ہو گا۔ اس کی دوستی پر شک نہ کرنا۔''

میں حیران رہ گیا۔ والدہ نے ایک مختصر سی رفاقت کے بعد عمران کے بارے میں ایسا بیان دے دیا تھا۔ مجھے والدہ کے وجدان پر یقین تھا۔ وہ اس خاص لب و لہجے میں جب بھی کچھ کہا کرتی تھیں، وہ کسی نہ کسی شکل میں پورا ہو جاتا تھا۔

ٹیلی فون پر بات ختم کرنے کے بعد بھی میں دیر تک والدہ کے لہجے پر غور کرتا رہا۔ میرے اپنے اندر سے اُٹھنے والی آواز بھی والدہ کے خیال کی تائید کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب عمران کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی بے لوث و بے لاگ دوستی ایک تیز اثر نشے کی طرح تھی اور یہ نشہ کچھ ہی عرصے میں میرے رگ و پے میں سرایت کر کے میری ''نا قابلِ مزاحمت ضرورت'' بن گیا تھا۔ بے لوث دوستی کا لفظ ہم ہزار ہا بار استعمال کرتے ہیں مگر اس لفظ کو اصل معنی عمران نے دیئے تھے۔ مجھے لگا کہ میں اس پہلی رات کی طرح آج بھی اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوں اور اب اس موٹر سائیکل سے کبھی اُتر نہیں سکوں گا۔

O......❖......O

اگلے روز میڈم نے لال کوٹھی کے شاندار بیسمنٹ میں ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس میں سیٹھ سراج، عارف خان، شیر محمد شیرا اور شیرے کا ساتھی بختیار بھی شامل تھا۔ یہ پارٹی ایک طرح سے اہم ملازمین کے درمیان ''کوآرڈی نیشن'' قائم کرنے کے لیے تھی۔ غیر متوقع طور پر اس میں چھوٹی میڈم یعنی نادیہ نے بھی شرکت کی۔ اس پارٹی میں میڈم صفورا نے پھر اپنی بات دہرائی۔ اس نے کہا کہ اب عمران اور اس کے دونوں ساتھی ہمارے اسکواڈ کا حصہ ہیں۔ ہمیں اب اپنی ساری پرانی رنجشیں بھلا کر اور مل کر کام کرنا ہے۔ ہمیں اپنے گلے شکوے دور کر کے اپنے دل صاف کر لینے چاہئیں۔

میڈم نے خاص طور سے مجھے اور سیٹھ سراج کو ساتھ ساتھ بٹھایا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھو تابش! جب نیا تعلق بنانا ہو تو پُرانی باتیں بھلانا پڑتی ہیں۔ مجید مٹھو، سراج کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کی موت جس طرح ہوئی، وہ ہم سب جان گئے ہیں۔ سراج کے لیے یہ ایک بڑا صدمہ ہے، بالکل اسی طرح جس طرح تمہارے لیے تمہاری منگیتر کا اغوا تھا۔ بے شک سراج کے صاحبزادے کی وہ ایک سنگین غلطی تھی اور اس غلطی کے اثرات دور تک گئے۔ بہر حال اب یہ غلطیوں کو کھلے دل سے معاف کر دینے کا وقت ہے۔''

میڈم نے اس طرح کی اور بھی کئی باتیں کیں۔ اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ سراج کا بیٹا واجی پاکستان سے باہر جا چکا ہے اور وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ بھی ہے۔ آخر میں میڈم نے مجھے مجبور کیا کہ میں سیٹھ سراج سے ایک بار پھر خلوص دل سے گلے ملوں۔

میں نے ایسا کرنے سے پہلے ایک نگاہ عمران پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر مؤافق تاثرات تھے۔ میں نے سیٹھ سراج سے معانقہ کیا لیکن ایک بار پھر لگا کہ صرف سینے سے سینہ ملا ہے، دل سے دل نہیں۔

تین چار ملازم لڑکیاں تتلیوں کی طرح ہمارے اردگرد چکرا رہی تھیں۔ ان میں سے دو وہ بھی تھیں جو خاص ہماری خدمت پر مامور تھیں۔ ان میں سے ایک ملیح چہرے والی لڑکی کا نام سارہ تھا۔ وہ زیادہ تر عمران کے اردگرد ہی منڈلاتی رہتی تھی۔ اب بھی اس کم عمر لڑکی نے جسم کو نمایاں کرنے والا ہوش رُبا لباس پہنا ہوا تھا اور ہمارے اطراف میں چکرا رہی تھی۔ بیسمنٹ میں دبیز قالین بچھے تھے۔ ایک طرف بار تھا۔ چمکیلی بوتلیں اور شفاف گلاس گردش کر رہے تھے۔ بار کے سامنے رقص گاہ تھی۔ پس پردہ مدھم آواز میں میوزک چل رہا تھا اور فلور پر ایک لڑکی مسلسل اپنے پُر شباب جسم کو تھرکا رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے وہ تھرکتی تھرکتی نشست گاہ میں بھی آجاتی تھی اور حاضرین کو گلاس، سوڈا اور سگریٹ وغیرہ سرو کرتی تھی۔

یہ فائیو اسٹار سے کہیں اوپر کا ماحول تھا۔ میڈم نادیہ کچھ خاموش سی تھی۔ بہرحال تقریب میں حصہ لے رہی تھی۔ دیگر حاضرین کی طرح وہ بھی مسلسل پیگ لے رہی تھی۔ بلکہ اس معاملے میں وہ سب سے آگے دکھائی دیتی تھی۔ عمران نے اس خوشگوار ماحول سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے میڈم صفورا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔''

''بولو...... بولو۔ بغیر اجازت کے بول سکتے ہو۔'' صفورا نے بیئر کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''یہ خوشی کا موقع ہے میڈم! ہم نے ایک دوسرے کی غلطیوں کو درگزر کر کے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ کیوں نہ اس موقعے کی مناسبت سے سلیم کو بھی معاف کر دیا جائے۔''

میڈم صفورا نے نادیہ کی طرف دیکھا۔ وہ فوراً تنک کر بولی۔ ''دشمن اور غدار میں فرق ہوتا ہے اور سلیم لنگڑا غدار ہے۔''

''مگر میرے خیال میں اس کو کافی سزا مل چکی ہے میڈم نادیہ! ہم پرسوں بھی پورا ایک گھنٹہ اس کے چلّانے کی آواز سنتے رہے ہیں۔''

''تم اپنے طور پر کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ کافی سزا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ کچھ بھی نہ ہو۔'' نادیہ مخمور انداز میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔

میڈم صفورا نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... اس بارے میں پھر بات کریں گے مگر جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا، سلیم سے کوئی مار پیٹ نہیں ہو گی۔ ٹھیک ہے نادو؟'' میڈم نے نادیہ سے تصدیق چاہی۔

وہ جز بز نظر آ رہی تھی تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کھانا شاندار تھا۔ میں نے سیٹھ سراج کو ایک دفعہ پہلے بھی کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ جیسے کھانے پر باقاعدہ حملہ کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ویسی ہی حریص چمک اُبھرتی تھی جیسی لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر شراب کا دور چلا۔ اس دور میں عمران نے بھی بیئر کے ایک دو چھوٹے پیگ لیے۔ میڈم نادیہ بلانوشی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اندرونی اضطراب کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ اول فول بھی بول رہی تھی۔ بڑی بہن میڈم صفورا کسی کام کے لیے باہر گئی تو نادیہ اور بھی کھل گئی۔ وہ تھرکنے لگی اور گاہے بہ گاہے شرابیوں کے انداز میں ہاتھ لہرا لہرا کر بات کرنے لگی۔

اس نے میڈونا کے ایک جذبات انگیز انگلش گانے کے چند بول سنائے پھر ایک جوک سنایا جس کا تعلق سرکس کی گہما گہمی سے تھا۔ وہ عمران کے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور اپنے سگریٹ کا دھواں جان بوجھ کر اس کی طرف چھوڑ رہی تھی۔ پھر وہ اپنا گلاس بھرنے کے لیے خود ہی اُٹھی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ گرتے ہوئے اس کا ہاتھ عمران کے کندھے سے ٹکرایا اور اس کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ عمران کی گردن پر بجھ گیا۔ عمران تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ عارف خان نے نادیہ کو سنبھال کر اُٹھایا۔

نادیہ نشے کی حالت میں افسوس کا اظہار کرنے لگی۔ ''اوہ سوری...... ویری ویری سوری۔ اوہ...... تمہاری تو گردن جل گئی۔'' وہ اس کی گردن پر پھونکیں مارنے لگی۔ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے یا تفاقاً ہو گیا ہے۔

عمران کی گردن پر سرخ داغ نظر آ رہا تھا۔ نادیہ نے بہکے ہوئے انداز میں اپنے ٹشو پیپر سے اس داغ کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ''میں معافی مانگتی ہوں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اوہ نو...... نہیں ہونا چاہیے تھا۔ واٹ کین آئی ڈو ناؤ؟ اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو بھی میں تیار ہوں۔ یہ لو...... یہ لو سگریٹ...... تم بھی مجھے سگریٹ لگا سکتے ہو۔ جہاں چاہے لگا سکتے ہو۔'' اس نے اپنی گردن آگے کر دی اور سگریٹ عمران کے ہاتھوں میں تھمانے کی ناکام کوشش کی۔

''اوہو...... پکڑو نا...... پلیز ہولڈ اٹ۔'' وہ بہکی آواز میں بولی۔ ''اچھا گردن پر نہیں لگانا چاہتے تو جہاں جی چاہے لگا لو۔'' اس نے اپنی ٹی شرٹ کے بٹن تیزی سے کھول دیئے۔ وہ واقعی دھت ہو رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ادھ بجھا سگریٹ زبردستی عمران کے ہاتھ میں تھمانے اور اسے اپنے عریاں جسم سے لگانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ لگتا تھا کہ تقریب کے دیگر حاضرین نادیہ کی ایسی حرکتوں کے عادی تھے۔ ان میں سے اکثر کے لبوں

پر دھیمی مسکراہٹ تھی۔

پتا نہیں کہ یہ قضیہ کیا رنگ اختیار کرتا کہ اسی دوران میں میڈم صفورا لمبے ڈگ بھرتی اندر آ گئی۔ اس وقت نادیہ شرابی لہجے میں عمران کو مخاطب کر کے بول رہی تھی۔ ''بڑے مغرور ہو تم۔ کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو...... کیا میں تمہارا احسان اپنی طرف رکھ لوں گی؟ ہرگز نہیں، ناٹ ایٹ آل...... تم بھی مجھے سگریٹ لگاؤ۔ ابھی لگاؤ...... نہیں تو...... نہیں تو میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔ اس طرح...... لائیک دیٹ۔'' اس نے شیمپین کی بڑی بوتل تڑاخ سے دیوار پر توڑ دی۔

''نادو! کیا کر رہی ہو؟ ہوش کرو۔'' میڈم صفورا چلائی۔

نادو جواب دوسری بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی، ذرا ٹھٹک کر رُک گئی۔ اس نے سرخ آنکھوں سے بڑی بہن کو دیکھا۔ تند و تیز لہجے میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ بولنے سے پہلے ہی بند کر لیا۔ میڈم دوبارہ گرجی۔ ''ختم کرو یہ تماشہ۔ کیوں اتنی شراب اُنڈیلتی ہو اپنے اندر...... کیوں بیڑا غرق کر رہی ہو اپنا؟''

نادیہ نے باغی نظروں سے بڑی بہن کی طرف دیکھا۔ تاہم کچھ کہے بغیر ہی پاؤں پٹختی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی آدھ پون گھنٹے تک پارٹی چلتی رہی۔ سیٹھ سراج کی موجودگی مجھے سخت بے چین کر رہی تھی۔ بہر حال میں نے جیسے تیسے وقت گزار لیا۔ میرا ذہن مسلسل اُلجھا ہوا تھا۔ رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ ایک بے نام تذبذب نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔ عمران کا ساتھ چھوڑنے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا، دوسری طرف اس کی خطرناک مصروفیات کا ساتھ دینا بھی دشوار محسوس ہوتا تھا۔ رات دو ڈھائی بجے کے لگ بھگ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ میں بستر پر لیٹا تھا۔ عمران اُٹھ کر میرے پاس آ گیا اور قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دو دن سے کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

سگریٹ سلگا کر بولا۔ ''تابی! لگتا ہے ابھی تک اُلجھن میں ہو؟''

مجھے لگا جیسے اس نے میرے دل میں جھانک لیا ہے۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''کیسی اُلجھن؟''

''یہی اُلجھن کہ چلا جاؤں یا نہ جاؤں۔ میری حماقتوں کا ساتھ دینا مشکل نظر آ رہا ہے۔ دوسری طرف مجھ پر ترس بھی آ رہا ہے۔ ہے نا یہی بات؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں میری طرف جھک کر بولا۔ لبوں پر اُداس لیکن وہی مقناطیسی مسکراہٹ تھی۔

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

اس نے دو لمبے کش لے کر کہا۔ ''اچھا ایسا کرتے ہیں کہ فال نکالتے ہیں۔ دیکھتے ہیں

کہ تمہارے چلے جانے کے حق میں فیصلہ آتا ہے یا نہ جانے کے حق میں۔"

"کیسی فال؟"

"بھئی ہم جس طرح کے ہیں، ہماری فال بھی ویسی ہی ہوگی۔ میں اکثر ریوالور سے ہی فال نکالا کرتا ہوں اور میری فال اکثر ٹھیک نکلتی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بول رہا تھا۔ دس پندرہ فٹ کی دوری پر اقبال اپنے بیڈ پر درد کی دو گولیاں کھا کر سویا پڑا تھا۔

"یار! تمہاری پہیلیوں جیسی باتوں سے مجھے اُلجھن ہونے لگتی ہے۔"

"اس میں پہیلی والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔" اس نے کہا اور کھلنڈرے انداز میں قمیص کے نیچے سے ریوالور نکال لیا۔ یہ عمران کا اپنا ہی ریوالور تھا۔ کل ہی میڈم نے اسے واپس کیا تھا۔ ساتھ میں ایک موبائل بھی دیا تھا۔

عمران نے بڑے اطمینان سے ریوالور کے چیمبر میں ایک گولی ڈالی اور مسکراتے ہوئے ریوالور کی نال اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لی۔ ایسا کرنے سے پہلے اس نے ریوالور کی چرخی کو دو تین بار گھما دیا تھا۔ "گولی چل گئی تو چلے جانا۔ نہ چلی تو اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کرنا۔" عمران نے عجیب وجدانی لہجے میں کہا۔

پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبا دیا۔ میری رگوں میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بہرحال گولی نہیں چلی اور عمران کا ہاتھ جو گولی چلنے کی صورت میں نہایت شدید طور پر زخمی ہو سکتا تھا محفوظ رہا۔

اس نے جادوئی نظر سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

میں خاموش رہا۔ اس نے سگریٹ کے دو تین گہرے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور ریوالور میری گود میں ڈال دیا۔ ہولے سے بولا۔ "ویسے...... میں نے ریوالور میں جو گولی ڈالی، وہ اکیلی نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟"

وہ جواب دینے کے بجائے مسکراتا رہا اور نیا سگریٹ سلگا لیا۔ میں نے ریوالور کا چیمبر کھول کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ چرخی میں چار گولیاں موجود تھیں، بس دو خانے خالی تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ تین گولیاں پہلے سے ریوالور میں موجود تھیں۔

"کبھی کبھی مجھے تمہاری ذہنی حالت پر شک ہوتا ہے۔" میں نے لرزاں آواز میں کہا۔

"عقل اور عشق دو متضاد چیزیں ہیں جگر! جب غیبی اشارے لینے ہوں تو پھر عقل کے بجائے جنون سے کام لینا پڑتا ہے۔"

میں حیرت سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ رات کے ان خاموش لمحوں میں لگژری بیڈروم میں کھڑکیوں سے باہر تیز ہوا چل رہی تھی، کبھی کبھی بجلی بھی چمکتی تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھا کسی داستانی کردار کی طرح مسکرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وجدان کی روشنی تھی۔ ایسا وجدان جو بے حد پختہ یقین کے بطن سے پھوٹتا ہے۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں میرے لیے فیصلہ کرنا بہت آسان ہو گیا اور میرا فیصلہ تھا کہ میں عمران کے ساتھ رہوں گا اور دیکھوں گا کہ پردۂ غیب سے میرے لیے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بہرحال اپنے اس فیصلے کے بارے میں مَیں نے عمران کو اگلی صبح ہی بتایا۔

وہ میرے فیصلے سے بہت خوش تھا۔ پتا نہیں کیوں؟ اگر معروضی انداز سے دیکھا جاتا تو وہ میرے لیے ہر طرح سودمند تھا جبکہ میں اس کے لیے ہر طرح بے سود۔ پھر بھی وہ مجھے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

"یار عمران! اگر تم چاہتے ہو کہ میرا دماغ ٹھیک کام کرتا رہے اور میں نفسیاتی مریض نہ بن جاؤں تو پھر مجھے پہیلیوں میں نہ اُلجھایا کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو اور میڈم سے تمہاری کیا باتیں طے ہوئی ہیں؟"

ہم دونوں گراسی لان میں بیٹھے تھے۔ اقبال کو ہلکا بخار تھا اور وہ بیڈروم میں ہی لیٹا ہوا تھا۔

"تمہیں کس بات کا کنفیوژن ہے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ بس کنفیوژن ہی کنفیوژن ہے۔ کوئی بات بھی ٹھیک سے میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ تم نے معاملات کو بہت اُلجھا دیا ہے۔"

"اچھا...... ایسے کرتے ہیں کہ تم مجھ سے ایک ایک بات پوچھتے جاؤ، میں بتاتا جاتا ہوں۔"

میں نے کہنیوں کے بل نرم گھاس پر نیم دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔ "مجید مٹھو اگر میڈم صفورا کا بندہ تھا تو وہاں جہلم میں کیا کر رہا تھا؟"

"بے شک وہ میڈم کا بندہ تھا مگر اس نے بتایا ہی تھا کہ ابرار صدیقی سے بھی اس کی علیک سلیک ہو چکی ہے اور ابرار صدیقی اسے کبھی کبھار اپنے ساتھ ٹیکسلا اور مردان وغیرہ بھی لے کر جاتا تھا۔"

"وہاں جہلم میں مجید کیا کر رہا تھا؟"

"ابرار صدیقی آج کل جہلم میں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ وہیں پر صدیقی کا کوئی پیر طریقت

بھی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو پیر صاحب کے ہاں کوئی محفل ہوتی ہے جو ساری رات جاری رہتی ہے اور کبھی کبھی دوسری رات تک بھی چلتی ہے۔ ابرار صدیقی کو اس محفل میں شریک ہونا تھا۔ اس کا خاص ملازم سلطان فلیٹ کی حفاظت کرتا تھا۔ صدیقی کو اس بندے پر بے پناہ بھروسہ ہے مگر ہوا یہ کہ جس رات صدیقی کو محفل میں شریک ہونا تھا، اسی روز سلطان کو اپنے ایک ضروری کام کے لیے واپس لاہور آنا پڑ گیا۔ دراصل سلطان کی کمی پوری کرنے کے لیے ابرار صدیقی نے مجید مٹھو کو جہلم بلایا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ فردوس پلازا کے اس فلیٹ میں وہ خاص ''پیس'' موجود ہے اس لیے صدیقی فلیٹ کی خاص حفاظت کر رہا ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے لیکن یہاں ایک ڈبل گیم ہوا اور اس گیم کا پتا میڈم اور اس کے ایک دو خاص بندوں کے سوا اور کسی کو نہیں۔ مجید مٹھو نے اس فلیٹ میں تقریباً چھتیس گھنٹے گزارے اور اس دوران میں وہ فلیٹ میں مسلسل اس ''پیس'' کو تلاش کرتا رہا۔''

''کیوں؟''

''میڈم نے اسے ایسا کرنے کے لیے کہا تھا۔ دراصل میڈم اس پیس کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ بے شک وہ ساتھ ساتھ قادرے کی بہن کنول کا چکر بھی چلا رہی تھی مگر اسے اس چکر کے ناکام ہونے کا خدشہ بھی رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے طور پر فلیٹ میں پیس تلاش کرانے کی کوشش کی مگر اس بھرپور کوشش میں ناکام ہوئی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پیس اس فلیٹ میں موجود نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نوے فیصد سے زیادہ امکان ہے کہ اسی فلیٹ میں موجود ہے مگر ابرار صدیقی نے اسے اپنے ڈھنگ سے کہیں چھپا رکھا ہے۔ مجید مٹھو سر توڑ کوشش کر کے بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکا۔''

''تو تم اسے کیسے ڈھونڈو گے؟''

''جادو کی چھڑی سے۔ اپنا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے شہزادے۔''

''پھر وہی بجھارتیں۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''دراصل ابھی خود میرے ذہن میں بھی بات واضح نہیں ہے۔ ایک آزمودہ طریقے کو پھر سے آزمانا چاہ رہا ہوں۔ یہ جو اپنا آئن فلیمنگ ہے نا جیمز بانڈ کا رائٹر، شاید اس نے اپنے کسی ناول میں اس طرح کا کام کیا تھا یا پھر شرلاک ہومز کی کوئی کہانی تھی۔ ہاں یاد آیا، یہ جو آئن فلیمنگ ہے نا یہ تایا جی کا بڑا گہرا یار رہا ہے۔ دونوں نے اکٹھے ہی فلمیں دیکھنی شروع کی

تھیں۔ پھر جب دونوں افغانستان میں تھے تو اکٹھے ہی روزانہ ساحل پر چہل قدمی کیا کرتے تھے۔''

''افغانستان میں سمندر؟'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں ہے؟ اوہ...... شاید پھر کسی اور ملک کی بات کی ہوگی انہوں نے یا پھر ہم سے چھپایا ہوگا۔ دراصل تائی جی کو تایا کا آئن فلیمنگ اور الفریڈ ہچکاک وغیرہ سے ملنا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ تو دیوانی تھیں اپنے شوکت صدیقی اور ابن صفی کی۔ بلکہ ابن صفی کو تو انہوں نے اپنا منہ بولا بھائی بنایا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔ نہیں بتانا تو نہ بتاؤ۔ خوامخواہ دماغ مت کھاؤ۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ ایک بار پھر مسکرا کر پٹڑی پر واپس آ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''سوری یار! بات کرتے ہوئے زبان پھسل جاتی ہے۔ اصل میں ابھی خود میرے ذہن میں بھی کوئی واضح نقشہ نہیں بنا۔ میں کل تک تمہیں پوری تفصیل بتا دوں گا۔ پوری تفصیل بتانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لے جانا تو اقبال کو تھا لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو، وہ جہلم میں باؤنسر کھا کر ریٹائرڈ ہرٹ ہو چکا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دے سکو تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، یہ کوئی ایسا خطرناک کام نہیں ہے۔ جو کچھ ہوگا بڑے ہموار اور پُرامن طریقے سے ہوگا۔ میڈم نے پہلی شرط ہی یہ رکھی ہے کہ انہیں کسی طرح کا خون خرابا نہیں چاہیے۔ وہ اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنا چاہتی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم بھی ہاتھ بالکل صاف رکھ کر ہی کام کرتے ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تم مجید مٹھو کی بات کر رہے ہو یار! کم از کم تم تو ایسی بات نہ کہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو کچھ ہوا، اس کی اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوا۔ اس نے ہماری گاڑی کو سائیڈ ماری اور خود کھائی میں گرا پھر آگ بھی اس کی غلطی سے لگی۔''

''اچھا...... اب اس بحث کو چھیڑنے سے کیا فائدہ۔ میری سمجھ میں ایک اور بات نہیں آ رہی۔ ایک طرف تو میڈم یہ چاہتی ہے کہ ابرار صدیقی سے اس کا تعلق خراب نہ ہونے پائے، دوسری طرف ''پیس'' کے لیے بھرپور ٹرائیاں بھی مار رہی ہے؟''

''اسی کو تو لالچ کہتے ہیں جگر! بہرحال یہ کوشش جو ہم کرنے والے ہیں، اس سے میڈم کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہم اپنے طور پر کریں گے۔ میں نے اپنی طرف سے میڈم کو ضمانت دی

ہے کہ کوشش کامیاب ہو یا ناکام، دونوں صورتوں میں اس معاملے میں اس کا نام نہیں آئے گا۔"

"یہ ضمانت تم کیسے دے سکتے ہو؟ اگر اپنی کوشش کے دوران میں تم پکڑے گئے اور ابرار صدیقی کے لوگوں نے تمہیں مار مار کر دنبہ بنا دیا تو تمہیں سب کچھ بتانا ہی پڑے گا اور اگر تم نہ بتاؤ گے تو میں بتا دوں گا۔"

اس نے فوراً میرے دونوں گال کھینچ کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ "چلو...... کم از کم ایک بات تو ثابت ہوئی کہ تم میرے ساتھ جاؤ گے۔ دوسری بات پکڑے جانے والی اور دنبہ بننے والی تو اس پر میں ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم دنیا کے جدید اور نہایت پیچیدہ قسم کے ڈپریشن کا شکار ہو۔ تمہارے ذہن میں یہ خداداد صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ تم معمولی قسم کے کاموں میں سے نہایت غیر معمولی قسم کے خطرات ڈھونڈ نکالتے ہو لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بالکل صحت مند ہو جاؤ گے۔"

"میں اب بھی صحت مند ہوں، تمہاری ذہنی حالت کا مسئلہ ہے۔ تم آگ میں چھلانگ لگاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔"

"میرے جگر! یہاں کوئی آگ ہے اور نہ ہم اس میں چھلانگ لگا رہے ہیں۔ دیکھنا یہ "پیں" والا معاملہ بالکل سیدھے سادے طریقے سے حل ہو جانا ہے۔"

"تمہارے سارے معاملے سیدھے سادے طریقے سے ہی حل ہوتے ہیں۔ تم بالکل سیدھے سادے طریقے سے لال کوٹھی میں گھسے...... بالکل سیدھے سادے طریقے سے مٹھو کا پیچھا کیا اور اب اسی سیدھے سادے طریقے سے یہاں پھنسے ہوئے ہو۔"

"جگر! تم کہانی کو درمیان سے دیکھ رہے ہو۔ جب تک کہانی مکمل نہیں ہو جاتی اس پر تبصرہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ دیکھ لیتے ہیں تمہاری کہانی کا اینڈ بھی۔" میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا اور گھاس پر چت لیٹ گیا۔ دھوپ میں نرمی تھی۔ دور اوپر گہرے نیلے آسمان پر چیلیں تیر رہی تھیں اور بلند پرواز کبوتر اپنی سفید جھلک دکھا کر غائب ہو رہے تھے۔ ایک بار میں نے ثروت سے پوچھا تھا۔ "اگر خدانخواستہ ہمیں وقت نے جدا کر دیا تو کیا کرو گی؟" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔ "کسی سنسان چھت پر چت لیٹ کر نیلے آسمان کو دیکھا کروں گی اور سوچا کروں گی کہ تم کہیں بھی ہو لیکن ہو تو اسی آسمان کے نیچے۔ اسی نیلی چھتری تلے کہیں موجود ہو

اور ایک دن مجھ سے آن ملو گے۔"

کیا وہ واقعی کہیں دور دیس میں اس آسمان کو دیکھتی تھی اور میرے بارے میں سوچتی تھی؟ میرے دل کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ میں اپنے اردگرد سے کٹ کر بہت دور، بہت اوپر چلا گیا۔ میں نے آسمان کی نیلاہٹ کو مخاطب کیا، پرندوں کو اور مغرب کی طرف بہنے والی ہوا کو پکارا اور کہا۔ میرا پیغام اس تک پہنچا دینا۔ میں اس کو بھولا نہیں ہوں۔ ہر پل یاد کرتا ہوں۔ ملن کی آس میرے دل میں مری نہیں ہے۔ اس سے کہنا کہ میرا انتظار کرے۔

O......❖......O

رات تاریک اور سرد تھی۔ میں اور عمران مہران گاڑی پر جہلم شہر کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ ہماری دائیں جانب جہلم کے پل کی روشنیاں تھیں جبکہ بائیں طرف جہلم شہر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ یہ رات کے نو ساڑھے نو بجے کا عمل تھا۔ تاہم تیز سرد ہوا اور بارش کے چھینٹوں کی وجہ سے سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نظر نہیں آتا تھا۔

بے شک عمران کئی بار کہہ چکا تھا کہ ہم جس کام کے لیے جا رہے ہیں اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر میں جانتا تھا کہ عمران کے ہر کام میں خطرہ موجود ہوتا ہے۔ شاید وہ اور اقبال کوئی ایسا کام کرتے ہی نہیں تھے جس میں خطرہ نہ ہو۔

"کیا محسوس ہو رہا ہے؟" عمران نے کار ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو تم چاہتے ہو۔ دل کی دھڑکن تیز ہے۔ ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا ہے۔"

"جس کام میں دل کی دھڑکن تیز نہ ہو۔ ہتھیلیوں پر پسینہ نہ آئے اور خون جوش نہ مارے وہ بھی کوئی کام ہوتا ہے یار! یہ خطرے...... رسک اور مصائب ہی ہوتے ہیں جو رد عمل کے طور پر بندے کی زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ بے عمل زندگی روکھی پھیکی ہوتی ہے۔ وہ کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ ایسی زندگی کے بارے میں ہی اپنے معظم علی صاحب فرما گئے ہیں نا کہ اس سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوتی ہے۔"

"معظم علی کون؟"

"یار! وہی اپنے ٹیپو سلطان صاحب۔"

"ٹھیک ہے اب اپنے تایا جی کا شجرۂ نسب ٹیپو سلطان سے جوڑ دو۔"

"دیکھا نا اب تم ایک دم فائیو اسٹار ہوتے جا رہے ہو۔ باتیں تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے اس نے ایک دم گاڑی کو بائیں طرف نیم پختہ راستے پر موڑا اور

گاڑی شہر کی ایک نواحی بستی کی طرف بڑھنے لگی۔ جلد ہی ہم ایک متوسط درجے کی بستی میں داخل ہوئے۔ درختوں میں گھرے ہوئے ایک کشادہ مکان کے قریب جا کر عمران نے گاڑی روک لی۔ دروازے پر عنایت علی کے نام کی بوسیدہ نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ عمران اور میں گاڑی سے اُتر آئے۔ ہم دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر گول ٹوپیاں تھیں اور پاؤں میں پشاوری چپل۔ میں نے کوٹ پہن رکھا تھا جبکہ عمران نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔

عمران نے کال بیل بجائی۔ تھوڑی دیر بعد پکی عمر کا ایک کوتاہ قد شخص برآمد ہوا۔ وہ اپنے حلیے سے پوٹھوہاری لگتا تھا۔ اس نے ہمیں سرتاپا گھورا اور محتاط لہجے میں بولا۔ ''ہاں بھئی کیا بات ہے؟''

''آپ ہی کا نام عنایت علی ہے؟'' عمران نے جہلمی لب و لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... میں ہی ہوں۔''

''آپ سے کچھ کام ہے جی۔''

''پر پتا تو چلے آپ آئے کہاں سے ہیں اور کس نے بھیجا ہے آپ کو؟''

''ایسا ہی سمجھ لیں جی! ایک دو بار لاہور کے مجید مٹھو نے آپ کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ ......گٹا وغیرہ خریدتے ہیں۔''

گٹا کا لفظ سن کر عنایت علی چونک گیا۔ اس نے ایک بار پھر عمران کو سرتاپا گھورا پھر ہم دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ عمران راستے میں ہی مجھے بتا چکا تھا کہ گٹا اور گڈی وغیرہ کے الفاظ یہ لوگ نوادر کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ عنایت علی کے گھر کا صحن کافی وسیع تھا۔ یہاں شہد کی مکھیوں کے بوسیدہ ڈبے پڑے تھے۔ ایک طرف دو تین سال پُرانے ماڈل کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ عنایت علی ہمیں کمرے میں لے آیا۔ بلب کی روشنی میں ایک شیشے کی الماری سب سے نمایاں دکھائی دی۔ اس میں بہت سی نایاب چیزیں پڑی تھیں۔ پُرانے سکے، بدھا کے سوکھے ہوئے ہیڈ، مہریں اور کچھ برتن وغیرہ۔ لگتا تھا کہ عنایت علی یہاں تنہا رہتا ہے۔ ابھی رات کے صرف دس ہی بجے تھے مگر اس چار دیواری میں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عنایت علی نے دہکی ہوئی انگیٹھی ہمارے قریب کھسکا دی اور ہم سے سوال جواب شروع کر دیئے۔ اس انٹرویو کے لیے عمران پہلے ہی تیار ہو کر آیا تھا۔ اس نے اپنا تعلق روہتاس کی ایک قریبی بستی ماگھی پورا سے بتایا۔ اس نے میرے بارے میں بتایا کہ میں اس کا

پھوپھی زاد شراکت احمد ہوں۔ مجھے دمے اور شدید سر درد کی شکایت ہے۔ مجھے سول ہسپتال میں دکھانے کے لیے جہلم شہر آیا تھا۔ اس نے سوچا کہ شہر تو جانا ہی ہے، کیوں نہ کسی معقول بندے سے گٹے کی فروخت کی بات بھی کر لی جائے۔ اس کے پاس مجید مٹھو کا دیا ہوا ایڈریس موجود تھا اس لیے یہاں چلا آیا۔

پتا نہیں کہ یہ عنایت نامی بندہ عمران کی باتوں سے کس حد تک قائل ہوا؟ بہرحال اس کے لب و لہجے میں کچھ نرمی ضرور آ گئی۔ اس نے عمران سے کہا۔ ''مجید مٹھو کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟''

عمران نے چہرے پر سوگواری طاری کر لی۔ ''ہاں جی...... بڑا دُکھ ہوا ہے۔ ہمارے علاقے میں اخبار وغیرہ تو جاتا نہیں، مجھے تیسرے چوتھے روز ایک بندے سے خبر ملی تھی۔ پتا نہیں کہ کیا ہوا مجید بھائی کے ساتھ۔ بہرحال یہ بات تو پکی ہے کہ وہ حادثہ شادثہ نہیں تھا۔ ان کو مارا ہے جی کسی نے......''

کچھ دیر مجید کے بارے میں بات ہوتی رہی۔ اس دوران میں ایک لڑکا چائے لے کر آ گیا۔ عنایت نے بتایا کہ یہ اس کا بھتیجا ہے۔ اُبلے ہوئے انڈے کا نصف حصہ منہ میں رکھنے کے بعد عنایت علی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''کیا چیز ہے تمہارے پاس؟''

عمران نے بھی ''سڑڑڑ'' کی نامعقول آواز کے ساتھ چائے کی ایک طویل چسکی لی اور بڑی دھیمی آواز میں بولا۔ ''عنایت بھائی! میری بات کا غصہ نہ کرنا۔ دراصل میں چاہتا تھا اگر میری ملاقات بڑے بھائی صیب! میرا مطلب ہے کہ صدیقی صیب سے ہو جاتی تو اچھا تھا۔''

عنایت علی کی پیشانی پر ناگواری کی شکن اُبھری تاہم اس نے اپنا کاروباری لہجہ برقرار رکھا اور بولا۔ ''تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں میرے بارے میں مجید مٹھو نے بتایا تھا۔ اگر اس نے بتایا ہے تو پھر یہ بھی بتایا ہوگا کہ صدیقی صاحب کے لیے جو کچھ خریدتا ہوں، میں ہی خریدتا ہوں۔ وہ خود اتنے زیادہ مصروف ہیں کہ ایسے کاموں میں نہیں پڑ سکتے۔''

''دراصل مجھے پتا چلا تھا کہ وہ آج کل جہلم میں ہی رہ رہے ہیں اس لیے......''

''یار! تمہیں اپنی چیز بیچنی ہے یا صدیقی صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر فوٹو اُتروانی ہے۔'' اس بار عنایت علی کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ فوٹو اُتروانے پر بھی تیار ہو جائیں۔'' عمران نے بتیسی نکالی۔ اس کے انداز میں غیر معمولی اعتماد تھا۔

اس انداز کی وجہ سے عنایت علی نے اپنی بڑی بڑی پُراسرار آنکھوں سے ایک بار پھر

عمران کا تنقیدی جائزہ لیا اور قدرے چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن پتا تو چلے تمہارے پاس مال کیا ہے؟''

''میں تو چاہتا تھا کہ مال بھی بڑے بھائی صیب کو ہی دکھاؤں لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ آپ بھی تو بھائی صیب ہی ہیں۔'' وہ دیہاتی انداز میں بولا۔

اس نے اپنی گرم چادر کے اندر ہی اندر رازداری سے ہاتھ گھمایا اور بغلی جیب میں سے ایک چیز نکال کر باہر رکھ دی۔ یہ بڑی احتیاط سے ایک فلالین کے کپڑے میں لپیٹی گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک آرٹ پیس تھا۔

دراصل یہاں آنے سے پہلے عمران نے جو تھوڑی سی تیاری کی تھی، اس میں دو تین چیزوں کا حصول بھی تھا۔ ایک تو یہی پیس آف گندھارا آرٹ تھا۔ یہ تقریباً نو انچ لمبا شیر کا خوبصورت مجسمہ تھا۔ اس پر سونے کا پانی پھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پتلیوں کی جگہ دو چھوٹے نگینے تھے۔ شیر کی دُم کا آخری حصہ ''امتدادِ زمانہ'' نے توڑ ڈالا تھا پھر بھی یہ ایک خوبصورت پیس تھا۔ کل میڈم صفورا نے ہی یہ پیس عمران کو کہیں سے لا کر دیا تھا۔

عمران نے بڑی آہستگی سے فلالین کا نیلا کپڑا شیا کے مجسمے پر سے کھسکایا۔ جیسے شائقین کا اشتیاق بڑھانے کے لیے اسٹیج پر سے آہستہ آہستہ پردہ اُٹھایا جاتا ہے۔ بلب کی زرد روشنی میں شیر کا مجسمہ عیاں ہوا تو میں نے عنایت علی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اُبھرتے دیکھی۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش نمودار ہوئی اور میں نے اس کی انگلیوں کو بے ساختہ مجسمے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ایک قدر شناس نرمی کے ساتھ اس نے نو انچ لمبے مجسمے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ میں نے صاف دیکھا کہ اس کی سانس کی لے چڑھ گئی ہے اور آنکھوں میں دبی دبی بیتابی کروٹ لے رہی ہے۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر قریب رکھا ٹیبل لیمپ آن کیا اور اس کی تیز روشنی میں ماہرانہ انداز میں پیس کا جائزہ لینے لگا۔

''کہاں کا ہے؟'' عنایت علی نے پوچھا۔

''تخت بائی کا۔ ایک مقامی بندے سے خریدا ہے۔'' عمران نے جواب دیا۔

''کتنے میں چھوڑو گے؟''

''آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں جی۔ ایسا گٹا (پیس) بار بار سامنے نہیں آتا۔ آپ انصاف سے جو دیں گے، ہم لے لیں گے۔''

''پھر بھی کوئی آئیڈیا تو ہوتا ہے ناہر بندے کا۔''

''پچھلے سال ایسا ہی ایک گٹا میرے چاچے کے پتر ہاشم نواز نے بیچا تھا، لاہور کے ایک خاں صیب کو وہ پورے چالیس ہزار روپے میں گیا تھا۔''

''چالیس ہزار...... یہ تو بہت ہے یار!'' عنایت علی نے کاروباری لہجہ اختیار کیا۔

''بہت تو نہیں ہے جی! مسئلہ بس اتنا ہے کہ ہم اَن پڑھ لوگ ہیں۔ آگے تک نہیں جا سکتے۔ ہماری پہنچ بس آپ لوگوں تک ہوتی ہے۔ ورنہ اتنا تو ہمیں بھی پتا ہے کہ جو سودا آپ ہزاروں میں اُٹھاتے ہیں، وہ آگے جا کر لاکھوں میں بلکہ کبھی کبھی کروڑوں تک بھی چلا جاتا ہے۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری صادق محمد۔'' عمران نے اسے اپنا نام یہی بتایا تھا۔ ''اب اتنی بھی لوٹ نہیں مچی ہوئی۔ ہمیں سو طرح کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پولیس...... کسٹم اور ٹاؤٹ وغیرہ، پتا نہیں کس کس کی جیب گرم کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر چار پیسے ہاتھ آتے ہیں اور اگر کہیں پکڑ دھکڑ ہو جائے تو ساری اگلی پچھلی کمائی نکل جاتی ہے۔ تم لوگ تو گرم چادر لپیٹ کر آتے ہو اور جیب گرم کر کے نکل جاتے ہو۔ باقی ساری مصیبتیں تو ہماری ہوتی ہیں۔''

عنایت کے لہجے نے عمران کو بھی لہجہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ''ٹھیک ہے صیب جی! یہ تو من مرضی کا سودہ ہے۔ اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو رہنے دیں۔ ہم پھر بھی آپ کے خادم رہیں گے۔ جب کوئی شے ہاتھ لگے گی، آپ کو سلام کرنے آ جائیں گے۔''

''لیکن یار! اس اتنے سے گٹے کے لیے چالیس ہزار تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''میں نے چالیس ہزار کب کہا ہے صیب جی! میں نے تو آپ کو بتایا ہے کہ ایسا گٹا پچھلے سال چالیس میں بکا تھا۔ اب اگر آپ انصاف کی بات کریں تو اس کی قیمت پچاس سے کم نہیں ہے اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں، یہ ایک گٹا نہیں ہے۔ بالکل اسی سائز اور شکل کے آٹھ گٹے اور ہیں۔''

''آٹھ گٹے؟'' عنایت علی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''اسی لیے تو سرکار! آپ سے کہا تھا کہ بڑی سرکاری سے بات کرا دیں۔ یہ ساڑھے چار پانچ لاکھ کا سودا ہے۔ اگر ہم خوش ہو کر جائیں گے تو پھر بھی آپ کی خدمت کرتے رہیں گے۔''

''باقی گٹے کہاں ہیں؟'' عنایت نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''وہ تو پاس نہیں ہیں۔ یہ سیمپل آپ کے سامنے ہے۔ باقی بھی بالکل اسی طرح کے ہیں۔ بس چھوٹی موٹی ٹوٹ پھوٹ ہے سب میں۔''

عنایت علی چند سیکنڈ تک پُرسوچ انداز میں اپنا گھڑا سا سر ہلاتا رہا۔ وہ اب اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ”بڑی سرکار“ سے رابطہ کرنا ضروری ہے۔

اس نے عمران سے دو تین سوال مزید پوچھے پھر موبائل فون نکالا اور ابرار صدیقی کا نمبر ملایا۔ وہ ابرار سے بات کرنے لگا۔ اس نے ابرار کو ہماری آمد کے بارے میں بتایا۔ ہمارے نام بتائے اور ہمارے مال کی تفصیل بتائی۔ ”جی ہاں...... جی جی...... کہتے ہیں آٹھ پیس اور ہیں۔ بالکل یہی سائز ہے ایک ہی ”سورس“ سے ملے ہیں...... جی جی...... قیمت زیادہ بتا رہے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

عنایت علی نے پندرہ بیس منٹ خاموش رہ کر دوسری طرف سے دی جانے والی ہدایات سنیں پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے جناب! میں لے آتا ہوں ان کو۔ ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاتے ہیں۔ اوکے جی۔“

فون بند کر کے وہ بولا۔ ”صدیقی صاحب عام طور پر اس وقت ملتے نہیں ہیں لیکن آج جلدی گھر آ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔ ٹیکسی پکڑنے اور وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹہ تو لگ ہی جانا ہے۔“

کچھ ہی دیر بعد ہم عنایت علی کے گھر سے روانہ ہو رہے تھے۔ ہماری کار عنایت علی کے دروازے سے بس پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی مگر ہم اس کے پاس سے بیگانوں کی طرح گزر گئے۔ عمران کیا کرنے جا رہا تھا؟ اس بارے میں اس نے کچھ تو مجھے بتایا تھا اور کچھ ابھی تک نہیں بتایا تھا۔ میں اس کے بیمار پھوپھی زاد شراکت کی حیثیت سے اس کے ساتھ تھا۔ میری بیماری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اس نے میری ایک کلائی کی ورید میں ”کینولا“ بھی لگوا رکھا تھا۔ اسے ٹیپوں سے میری کلائی کے ساتھ چپکایا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مجھے ہسپتال میں انجکشن وغیرہ لگتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عمران کے پاس ایک تقریباً پانچ انچ لمبا اسٹائلش سا سگریٹ لائٹر بھی تھا۔ مجھے پتا تھا کہ عمران بہت کم سگریٹ پیتا ہے اور مستقل طور پر لائٹر وغیرہ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔ اب اگر یہ لائٹر اس کی جیب میں موجود تھا تو اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔

ہم تقریباً دو فرلانگ تک پیدل ہی چل کر شہر کی اس نواحی بستی سے نکل آئے اور سڑک پر سے ٹیکسی لے لی۔ اس ٹیکسی نے آدھ گھنٹے میں ہمیں ہمارے جانے پہچانے علاقے میں پہنچا دیا۔ یہ وہی فردوس پلازہ والا علاقہ تھا۔ ابرار صدیقی کا لگژری فلیٹ اسی پلازہ میں تھا۔ یہیں سے ہم نے صدیقی چند روز پہلے مجید مٹھو کا پیچھا کیا تھا۔ اس وقت ہم نے اس پلازہ کو صرف

دیکھا تھا، آج ہم اس کے اندر داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔

اب رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ کڑکتی سرد میں سڑکیں سنسان نظر آ رہی تھیں۔

عنایت علی ہمیں لے کر اس شاندار عمارت میں داخل ہوا اور بذریعہ لفٹ چوتھی منزل پر آ گیا۔ ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کا فلیٹ اسی فلور پر تھا۔

اس فلور پر داخل ہوتے ہی ہمیں ایک سیکیورٹی گارڈ کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے گارڈ سے فلیٹ کے آبنوسی دروازے کے سامنے ملاقات ہوئی۔ عنایت علی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اس کے باوجود ”میٹل ڈی ٹیکٹر“ کے ذریعے ہمیں چیک کیا گیا اور جیبیں وغیرہ ٹٹولی گئیں۔ آخر ہم تین بیڈ رومز والے اس وسیع فلیٹ میں داخل ہو گئے۔ کھڑی ناک اور عقابی آنکھوں والے ایک خطرناک صورت شخص نے ہمیں نشست گاہ میں بٹھایا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ یہی صدیقی کا خاص کارندہ سلطاناں ہے۔ وہ بے حد چوکس اور تیز طرار شخص دکھائی دیتا تھا۔ مجھے اس کے جسم سے عجیب طرح کی بُو نکلتی محسوس ہوئی، جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی جانور ہو۔ ہمارے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے ابرار صدیقی کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ہم اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ابرار صدیقی ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے ایک طرف مانگ نکال کر بال بنائے ہوئے تھے۔ تاہم ڈاڑھی خودرو دکھائی دیتی تھی اور خاصی لمبی تھی۔ وہ پتلون قمیص میں تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس سال رہی ہو گی۔ اس کے ہاتھ میں نہایت چمکیلے دانوں والی ایک چھوٹی سی تسبیح بھی تھی جو اس نے ہم سے مصافحہ کرنے کے بعد سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ دی۔

عنایت علی نے بڑے مؤدب انداز میں ابرار صدیقی سے ہمارا مختصر تعارف کرایا۔ اس دوران میں ابرار صدیقی بس اپنا سر ہلاتا رہا۔ وہ کچھ چپ چپ دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں بھی سرخی مائل تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی یہ کیفیت موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے ہے۔ وہ کنول پر فریفتہ تھا اور اس سے شادی کرنے کی پوری پلاننگ کر چکا تھا مگر اب اس کی یہ ساری پلاننگ ملیامیٹ ہو چکی تھی۔ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا تھا۔ کنول اپنی والدہ سمیت روپوش ہو چکی تھی اور تو اور کنول کا بھائی قادر بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

تعارف ختم ہوا تو ابرار صدیقی نے اپنی گونج دار آواز میں ہم سے دو چار سوال پوچھے۔ عمران ان سوالوں کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ابرار کا اہم سوال یہی تھا کہ مجید مٹھو سے ہمارا رابطہ کب اور کہاں ہوا تھا؟ عمران نے اس کا تسلی بخش جواب دیا۔ ابرار نے ہمیں ”پیس“ دکھانے کے لیے کہا۔

عمران نے ایک بار پھر دبے دبے جوش کے ساتھ گرم چادر کے اندر اپنے ہاتھ کو حرکت

دی اور جڑاؤ شیر کا مجسمہ، فلالین کے کپڑے سے نکال کر ابرار صدیقی کے سامنے کر دیا۔

ابرار نے بظاہر عام نظروں سے مجسمے کو دیکھا مگر اس کے چہرے پر شوق کی ایک چمک اُبھری تھی، وہ پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ وہ ماہرانہ انداز میں ''پیس'' کے زیر و بم پر اپنی انگلیاں چلا کر دیکھتا رہا، تب جیب سے عینک نکالی اور اپنا رُخ روشنی کی طرف کر کے مزید باریک بینی سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ ہمارے لیے کسی طرح کا تکلف کرے گا۔ لٰہذا جب اس نے ملازم کو چائے کا کہا تو مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوا کہ اس گٹے یا ''پیس'' کی اصل قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ عین ممکن تھا کہ جس چیز کا سودا ہم سے چالیس پینتالیس ہزار میں کیا جا رہا تھا، وہ آگے چل کر دس پندرہ لاکھ یا اس سے بھی زیادہ کی قیمت پاتی۔

اسی دوران میں ابرار صدیقی کے بیش قیمت موبائل فون پر کال آ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور مدھم آواز میں بولا۔ ''جی حضرت......'' اس کا انداز مؤدبانہ تھا۔ قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ دوسری طرف ابرار صدیقی کا وہی پیر و مرشد ہے جس کا تذکرہ مجید مٹھو نے اپنی موت سے قبل کیا تھا۔

ابرار صدیقی کہہ رہا تھا۔ ''جی حضرت! تلاش تو ہو رہی ہے جی...... پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بس آپ خصوصی دعا کیجیے گا۔ جی ہاں...... جی ہاں...... بھائی کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔ وہ سب اکٹھے ہی نکلے ہیں کہیں۔ نہیں حضرت! سراج یا میڈم خود تو ایسا نہیں کر سکتے۔ کم از کم میری عقل تو یہی کہتی ہے یہ کوئی تیسری پارٹی ہے جی!'' پھر ابرار صدیقی بات کرتے کرتے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بولنے کی بس مدھم آواز ہم تک پہنچتی رہی۔ الفاظ اب سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ایڈووکیٹ مولانا ابرار صدیقی صاحب اپنی گم گشتہ محبوبہ کا تذکرہ فرما رہے تھے اور دوسری طرف ان کے پیر و مرشد صاحب تھے۔ لگتا تھا کہ اس پیر و مرشد صاحب کو ابرار صدیقی کی زندگی میں خاص الخاص اہمیت حاصل ہے۔ نشست گاہ کی دیوار پر نہایت قیمتی فریم میں ایک بڑی تصویر لگی ہوئی تھی۔ یہ ایک پچاس پچپن سالہ شخص تھا۔ لمبی ڈاڑھی تھی لیکن ساتھ ٹائی پن بھی لگا رکھی تھی۔ اس کی بھنویں غیر معمولی طور پر گھنی تھیں اور ان بھنوؤں کے نیچے لمبوتری آنکھوں میں خاص چمک تھی۔

میں نے نہایت مدھم آواز میں عنایت علی سے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''حضرت صاحب ہیں۔ بڑے صاحب کے مرشد۔'' اس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

حضرت صاحب کے ہاتھ میں چاندی کا ایک نفیس سا کڑا نظر آ رہا تھا۔ ایسا ہی کڑا ابھی میں نے ابرار صدیقی کی کلائی میں بھی دیکھا تھا۔

دو چار منٹ بعد ابرار صدیقی واپس آ گیا۔ وہ اب قدرے پُرسکون نظر آتا تھا۔ اس نے پوری توجہ کے ساتھ نو عدد گٹوں کے بارے میں ہم سے بات چیت شروع کی۔ عمران نے یہ کہہ کر ابرار صدیقی کی دلچسپی میں اضافہ کیا کہ اس کے پاس ایک قدیم اسٹوپا کا ٹوٹا ہوا حصہ بھی ہے۔ اس قریباً چار مربع فٹ کے ٹکڑے پر تصویریں کندہ ہیں اور وہ یہ ٹکڑا بھی نہایت مناسب قیمت پر اس کے حوالے کر سکتا ہے۔

چائے کے بعد ابرار صدیقی نے عنایت علی کو تو واپس روانہ کر دیا تاہم عمران کے ساتھ اس کی بے تکلف گفتگو جاری رہی۔ ابرار صدیقی جیسے نہایت گھاگ شخص کو مطمئن کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا مگر عمران یہ کام بخوبی کر رہا تھا۔ نو عدد گٹوں کی قیمت کے بارے میں بھی عمران نے تکرار کا انداز اختیار نہیں کیا اور بڑے کھلے دل سے یہ معاملہ ابرار صدیقی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اس نے کہا۔ ''صیب جی! ہم غریب لوگ تو بس عزت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ آپ نے جو عزت دی ہے، اس سے پیسے پورے ہو گئے ہیں۔ باقی سودے میں چالیس پچاس ہزار اوپر نیچے ہو جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

فرق پڑنا بھی کیا تھا؟ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ نو گٹے موجود ہی نہیں ہیں۔ بس یہ ایک ہی گٹا تھا جو عمران نمونے کے طور پر یہاں لے کر آیا تھا اور یہ بھی ابرار صدیقی کو شیشے میں اُتارنے کا ایک حربہ تھا۔

جو پروگرام ہم طے کر کے نکلے تھے، اس کے مطابق ہمیں یہاں ابرار صدیقی کے شاندار اپارٹمنٹ میں رات گزارنے کی کوشش کرنا تھی۔ مجھے ایک مریض کی حیثیت سے اپنے ساتھ لانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ میرے لیے عمران کی ہدایت تھی کہ جب ہم یہاں سے جانے والے ہوں گے تو میری طبیعت اچانک خراب ہو جائے گی۔ سر شدت سے چکرانے لگے گا۔ مجھے کچھ دیر آرام کی ضرورت پڑے گی۔ اُمید تھی کہ اس موقعے پر ابرار صدیقی اخلاق کا مظاہرہ کرے گا اور ہمیں اتنی رات گئے جانے سے روک لے گا لیکن بیماری کے بہانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ باتوں میں رات کے دو بج گئے۔ باہر موسم بھی سخت سرد اور ابر آلود تھا۔ گاہے بہ گاہے چھینٹے پڑنے لگتے تھے۔ ابرار صدیقی کو گوارا نہیں ہوا کہ ہم اتنے قیمتی گٹے کے ساتھ اتنی رات گئے واپس جائیں۔ اس نے رات کا باقی حصہ ہمیں فلیٹ میں ہی گزارنے کی آفر کی جو

عمران نے دوبارا انکار کرنے کے بعد بڑی انکساری سے قبول کر لی۔

نشست گاہ کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ اس اپارٹمنٹ کے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہو سکتا تھا۔ یہاں بھی قالین موجود تھا۔ ٹی وی، گیس ہیٹر، اٹیچ باتھ اور دیگر سہولتیں بھی مہیا تھیں۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر بھی حضرت جی کی بڑی سی پورٹریٹ آویزاں تھی۔ ایک ملازم نے ہمارے سونے کا انتظام کر دیا۔

ہم ڈبل بیڈ پر ایرانی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے مگر سونا کس کافر کو تھا۔ ہم یہاں جاگنے کے لیے آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اب اس مشن کا اہم ترین مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ وہ نایاب ''فاسٹنگ بدھا'' اسی اپارٹمنٹ میں کہیں موجود تھا جس کے لیے بہت سے لوگ دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ دوفٹ طویل گٹا انہی درودیوار میں کہیں چھپایا گیا تھا اور ایسے اچھے طریقے سے چھپایا گیا تھا کہ مجید مٹھو دوبار بھرپور کوشش کرنے کے باوجود ناکام رہا تھا۔ مجید مٹھو ایسے معاملوں میں نہایت ماہر سمجھا جاتا تھا۔ عمران کو میڈم سے معلوم ہوا تھا کہ مجید ایک خاندانی نقب زن تھا۔ کسی چار دیواری میں گھس کر وہاں سے کسی شے کو نکال لانے میں اسے ملکہ حاصل تھ۔ اس نے اس اپارٹمنٹ میں خوب تگ و دو کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

رات آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر سرد ہوا کا شور تھا۔ اس اپارٹمنٹ کا نہایت خطرناک رکھوالا سلطاناں ہمارے کمرے سے باہر موجود تھا اور جاگ رہا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ بوقتِ ضرورت وہ ہر بڑے سے بڑا قدم اُٹھا سکتا ہے۔ فضا میں سنسنی سی تیرنے لگی۔

میں نے مدھم آواز میں پوچھا۔ ''اب تو بتا دو کہ کیا کرنا ہے؟''

''بس تیار ہو جاؤ۔'' وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں مقامی فائر بریگیڈ کو فون کرنا ہے کہ فردوس پلازہ کے ٹاپ فلور پر رہائشی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔''

''یہ جھوٹ بولنے کا مقصد؟''

''یار! جھوٹ کون بول رہا ہے؟ سچی سچی بات کریں گے۔''

''مگر آگ کہاں ہے؟''

''آگ بھی لگ جائے گی یار! اتنے بیتاب کیوں ہو رہے ہو؟ اور یہ بھی کوئی ضروری تو نہیں ہوتا نا کہ آگ لگنے کے بعد ہی فائر بریگیڈ کو اطلاع دی جائے۔ اکثر فائر بریگیڈ والے لیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے سیانے لوگ پہلے ہی فائر بریگیڈ کو کال کر لیتے ہیں۔''

عمران کی باتوں پر ہنسی تو نہیں آ سکتی تھی تاہم مجھے اس بے پناہ اعتماد کا احساس ضرور ہوا

جو وہ نہایت پُر خطر لمحات میں بھی اپنے اندر موجود رکھتا تھا اور اس کا یہی غیر معمولی اعتماد تھا جو مجھ جیسے ماٹھے شخص کو بھی اب بتدریج ایک نئے سانچے میں ڈھال رہا تھا۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اب مجھے بھی اس سنسنی خیزی میں کچھ لطف آنے لگا تھا۔

اس نے مجھے سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دیں۔ یہ ہدایات سن کر میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ بوقتِ ضرورت واقعی شاطر ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہ ایک نہایت بولڈ قدم اُٹھانے جا رہا تھا۔ میں نے پُراندیش لہجے میں سرگوشی کی۔ ''لیکن عمران! یہاں اردگرد بھی تو اپارٹمنٹ ہیں اگر کسی دوسرے اپارٹمنٹ کو نقصان پہنچا تو؟''

''یار! فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کے لیے آتے ہیں، کوئی لڈی ڈانس تو پیش نہیں کرنا ہوتا انہوں نے۔ پھر بھی اگر تھوڑا بہت نقصان ہو بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ اٹ از پارٹ آف دی گیم۔ ہاں...... کوئی جانی نقصان نہیں ہونا چاہیے اور ان شاء اللہ ہم ہونے بھی نہیں دیں گے۔''

قریباً تین چار منٹ بعد ہم حرکت میں آ گئے۔ سب سے پہلے عمران نے اپنے موبائل پہ مقامی فائر بریگیڈ کا نمبر ملایا اور انہیں گھبرائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی کہ فردوس پلازہ کے بالائی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ تاہم یہ اطلاع دیتے ہوئے عمران نے اپنا لہجہ اتنا بلند نہیں ہونے دیا تھا کہ آواز کمرے سے باہر جاتی۔

اس کے فوراً بعد اس نے دوسرا اسٹیپ لیا۔ گیس ہیٹر بند کر دیا لیکن گیس دوبارہ کھول دی۔ گیس کی بُو تیزی سے کمرے میں پھیلنے لگی۔ جب کافی گیس پھیل گئی تو ہم دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل آئے۔ باہر نکلتے نکلتے عمران نے ایک اور کام کیا۔ اس نے اپنے لائٹر سے کھڑکی کے پردوں کو شعلہ دکھا دیا۔ بھک بھک کی آواز سے بیڈروم نے آگ پکڑ لی۔ یہ ایک ہلا دینے والا منظر تھا۔

''آگ...... آگ۔'' ایک ملازم کے چلّانے کی آواز سنائی دی۔

پھر میں نے سلطان کا دھواں دھار چہرہ دیکھا۔ وہ پھٹی نظروں سے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ تب وہ عجیب خوفزدہ انداز میں دھاڑا اور اس نے تڑپ کر ایک قریبی دیوار سے آگ بجھانے والا گیس سلنڈر اُتار لیا۔

''کیا ہوا سلطاناں؟'' کسی قریبی کمرے سے ابرار صدیقی کی چلّاتی ہوئی گونج دار آواز اُبھری۔

''آگ صاحب جی!'' سلطاناں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

اس نے بڑی دلیری سے آگے بڑھ کر آگ پر گیس پھینکی تاہم آگ کا پھیلاؤ اس سلنڈر کی کارکردگی سے کہیں زیادہ تھا۔

اسی دوران میں مَیں نے دیکھا کہ عمران نے اپنے پانچ انچ لمبے لائٹر کو اس خاص انداز سے استعمال کیا جس کے بارے میں وہ مجھے بتا چکا تھا۔ ایک بٹن پش کر کے اس نے لائٹر کو کامن روم میں پھینک دیا۔ کامن روم میں آگ نہیں لگی مگر وہاں اتنی تیزی سے دھواں پھیلا کہ یہی لگا جیسے پورا اپارٹمنٹ آگ کی زد میں آ گیا ہے۔ یہ دھواں اس خاص قسم کے لائٹر سے برآمد ہو رہا تھا جیسا کہ عمران نے مجھے بتایا تھا، ایسے لائٹر سرکس میں شعبدے بازی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ پورے اپارٹمنٹ میں ایک دم تہلکہ مچ گیا۔

پلاننگ کے مطابق میں اور عمران ابرار صدیقی کی طرف بڑھے۔ وہ یقیناً سوتے میں اُٹھا تھا۔ اس کے بدن پر صرف شلوار اور بنیان تھی۔ بنیان میں اس کی موٹی لیکن ٹھوس توند نمایاں نظر آتی تھی۔ افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے یہ توند بُری طرح دہل رہی تھی۔

''آگ لگ گئی ہے صیب جی! آگ......'' عمران دہشت زدہ آواز میں چلاّیا۔

عمران کا یہ بے معنی فقرہ صرف دہشت بڑھانے کے لیے تھا، ورنہ اندھے کو بھی دکھائی دیتا تھا کہ اپارٹمنٹ آگ کی لپیٹ میں ہے۔

ابرار صدیقی عالمِ وحشت میں ناچ کر رہ گیا۔ پہلے اس نے موبائل پر غالباً فائر بریگیڈ کو کال کرنے کی کوشش کی پھر اس کو ادھورا چھوڑ کر اپنے بیڈ روم کی طرف گیا۔ اب شعلے اس بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ابرار صدیقی بُری طرح کھانستا ہوا اپنے بیڈ پر چڑھ گیا۔ وہ دو بڑے کشن اوپر نیچے رکھ کر بیڈ پر کھڑا ہوا تو اس کا ہاتھ چھت کی اندرونی سیلنگ تک پہنچنے لگا۔ یہاں خانے دار ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ صدیقی نے ایک دو سیکنڈ تک ان خانوں کا جائزہ لیا جیسے مطلوبہ خانہ گن کر ڈھونڈ رہا ہو۔ تب اس نے ایک خانے کے ایک کونے کو مخصوص جھٹکے سے اوپر کی طرف دبایا۔ یہ تقریباً دو فٹ مربع کا خانہ باقی چھت سے علیحدہ ہو کر اوپر چلا گیا۔ صدیقی نے کھانستے ہوئے اندھا دھند اس خانے میں ہاتھ چلایا۔ کوئی چیز اس نے زور لگا کر باہر کھینچ لی، یہ پولیتھین میں لپٹی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ وہی دو فٹ اونچا فاسٹنگ بدھا تھا۔ میڈم صفورا اور مجید مٹھو وغیرہ کے بقول ایک نایاب اور بے داغ پیس آف آرٹ۔

ابرار صدیقی نے اس نادر اینٹیک کو ہر آنکھ سے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کسی کو اس کی ہوا

تک نہیں لگنے دے رہا تھا لیکن آج وہ ہمارے سامنے اس ''پیس'' کو اس کے خفیہ ٹھکانے سے نکال رہا تھا۔ وہ اور اس کا پیس بُری طرح دھوئیں میں لپٹے ہوئے تھے۔ بستر پر سے اُترنے سے پہلے اس نے یہ پیس بدست خود عمران کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

''لایئے...... لایئے۔'' عمران نے خلوص دل سے کہا۔

صدیقی سے پیس لینے کے بعد عمران نے مجھے تھما دیا۔ وہ وزنی تھا مگر اتنا بھی نہیں جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بدھا کے اس مجسمے نے شاید آلتی پالتی مار رکھی تھی۔ نیچے سے اس کا پھیلاؤ کافی زیادہ تھا۔

عمران نے صدیقی کو بیڈ سے اُترنے میں مدد دی۔ کھانس کھانس کر صدیقی کا بُرا حال تھا۔ ہم نے اپنے چہرے کپڑے میں لپیٹ رکھے تھے اس کے باوجود ہم بھی کھانس رہے تھے۔ میں نے ابرار صدیقی کو عمران کے سہارے ڈبل بیڈ سے اُترتے دیکھا۔ اس کے بعد مجھے پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔ بظاہر یہی لگا کہ ابرار صدیقی تیورا کر اوندھے منہ گر گیا ہے شاید اسے ٹھوکر وغیرہ لگی ہے۔ تاہم یہ امکان بھی تھا کہ عمران نے اسے ضرب لگائی ہو اور مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق اسے لمبا لٹا دیا ہو۔ اس بات کا اعتراف عمران نے پانچ چھ دن بعد کیا کہ اس نے ابرار صدیقی کی گردن پر ضرب لگائی تھی۔

''چلو۔'' صدیقی کے گرتے ہی عمران نے تیز سرگوشی کی اور پولیتھین میں لپٹا مجسمہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ دو ملازم کھانستے ہوئے ہماری طرف لپک رہے تھے۔

''صیب جی کو دیکھو وہ گر گئے ہیں۔'' عمران نے بھرائی ہوئی آواز میں اور بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ آگ اب مہمان خانے سے نکل کر کامن روم تک پہنچ گئی تھی۔ فرنیچر دھڑا دھڑ جلنا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت جی کی تصویر آگ کی زد میں آنے کے بعد اوندھے منہ سلگتے ایرانی قالین پر گری۔ سلطاناں Extiguisher کے ذریعے آگ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کسی قاسم نامی ساتھی کو مخاطب کر کے دھاڑ رہا تھا۔ ''قاسو...... قاسو! فون کر فائر بریگیڈ کو۔'' اس کی آواز خوف سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس کا رُخ دوسری طرف تھا۔

ہم اپارٹمنٹ سے باہر نکلے۔ پورے پلازہ میں ہلچل مچ چکی تھی۔ بوکھلائے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ دو چوکیدار Extinguisher لیے متاثرہ اپارٹمنٹ کی طرف لپک رہے تھے۔ ہم ان کے پہلو سے گزر کر سیڑھیوں پر آ گئے۔ بکھرے بالوں والی ایک نوجوان لڑکی جو شاید کچھ دیر پہلے اپنے شوہر کے ساتھ بستر میں اچھا

وقت گزار رہی تھی، بستر کی چادر میں لپٹی سیڑھیوں پر موجود تھی۔ چادر سیڑھیوں کے جنگلے میں پھنس گئی تھی۔ وہ جھٹکے دے کر چادر کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے چادر پھٹ گئی اور لڑکی آزاد ہو کر قلانچیں بھرتی ہوئی نیچے اُتر گئی۔

اردگرد سے لوگوں کے چلانے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ سیکنڈ فلور پر ہم نے ایک موٹی تازی خاتون کو دیکھا۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں تھی اور دو چھوٹے بچوں کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر سیڑھیاں اُترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ آگ سے بہت دور تھی مگر لگتا تھا کہ سب سے زیادہ خطرہ اسی کو ہے۔

''آپا جی کی مدد کرو یار!'' عمران نے کہا۔

میں نے خاتون کا ایک بچہ اُٹھا لیا۔ چند سیکنڈ بعد ہم گراؤنڈ فلور پر تھے۔ یہی وقت تھا جب فائر بریگیڈ والوں کی گھنٹیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گئے تھے۔ ہم فردوس پلازہ سے باہر نکلے۔ بہت سی راہ چلتی گاڑیاں سڑک کے کناروں پر رُک چکی تھیں۔ اردگرد کی عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازہ کھل رہے تھے۔ ٹاپ فلور کے اپارٹمنٹ میں لگی ہوئی آگ کی جھلکیاں سڑک سے بھی نظر آتی تھیں۔

ہم نے ہلکی ہلکی پھوار میں تیزی سے دو سڑکیں کراس کیں اور پھر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ عمران پچھلی نشست پر تھا اور فاسٹنگ بدھا کا نادر مجسمہ اس کی گود میں تھا۔ ایک بھی گولی چلائے بغیر، کسی بھی شخص کو شدید زخمی کیے بغیر، بلا کسی بڑے جھگڑے کے یہ فاسٹنگ بدھا عمران نے حاصل کر لیا تھا اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ مسائل کو الگ طریقے سے دیکھنے اور انہیں حل کرنے کی صلاحیت اس میں موجود تھی۔ اس صلاحیت کو اس کی غیر معمولی بے خوفی سے مزید تقویت ملتی تھی۔

ٹیکسی نے ہمیں بیس منٹ میں واپس اسی رہائشی کالونی میں پہنچا دیا جہاں عنایت کے گھر کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ اسے ابھی فردوس پلازہ کی آتشزدگی کی خبر ہوئی تھی یا نہیں؟

عمران نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بدھا کو بڑے احترام سے پچھلی نشست پر بٹھا کر اس پر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ وہ جیسے ساڑھے چار ہزار سال پہلے خاموش تھا، آج بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔ ابدی خاموشی...... جس میں زندگی، نروان اور کائنات کے ہزار ہا راز پوشیدہ تھے۔ بدھا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ آگے کو نہ گرے، عمران نے اس کے آگے دو کشن رکھ دیئے تھے۔

''ایک تو تمہاری چمڑی میں ڈر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گاڑی اس گھر سے اتنا قریب کھڑی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''آئندہ جب بھی مولانا ابرار صدیقی صاحب کے اپارٹمنٹ میں آگ لگانے کا پروگرام بنے گا، میں گاڑی ساتھ والی گلی میں کھڑی کیا کروں گا۔ اب خوش؟''

میں منہ بنا کر رہ گیا۔

ہمارے گوجرانوالہ تک پہنچتے پہنچتے اُجالا ہو گیا۔ یہ ایک ابر آلود صبح تھی۔ ہم نے کامونکی قصبے کے پاس ایک چھپر ہوٹل پر رُک کر ایک کڑک چائے پی اور بسکٹ وغیرہ کھائے، یہاں رُکنے کا ہمیں ایک اور فائدہ ہو گیا۔ فردوس پلازہ میں ہونے والی آتشزدگی کی مختصر خبر بھی ایک نیوز چینل پر مل گئی۔ اسکرین پر چلنے والی ایک پٹی کچھ یوں تھی۔

''جہلم شہر کے ایک پلازہ میں آتشزدگی...... ایک فلیٹ جل گیا۔ دوسرے کو جزوی نقصان پہنچا۔ فائر بریگیڈ نے وقت پر پہنچ کر آگ پر قابو پا لیا۔ کسی جانی نقصان کی اطلاع نہیں ملی۔''

عمران نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''یار! یہ ہمارے فائر بریگیڈ والوں کی کارکردگی کچھ اچھی نہیں ہوتی جا رہی؟''

میں سر ہلا کر رہ گیا۔ قریب بیٹھے ایک پٹھان ٹرک ڈرائیور نے کہا۔ ''خود ام نے تو یہ دیکھا ہے کہ فائر بریگیڈ کی اپنی گاڑی کو بھی آگ لگ جائے تو گاڑی والے آگ بجھانے میں پانچ دس منٹ کا دیری ضرور کرتا ہے۔ خو، یہ پلازے کا مالک کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہوگا۔''

سب ہنسنے لگے۔ عمران نے بھی اس ہنسی میں شرکت کی۔

ہم صبح نو بجے کے لگ بھگ سیکیورٹی کے دو مرحلوں سے گزر کر لال کوٹھی میں داخل ہو گئے۔ ہم ابھی تک اسی دیہاتی لباس میں تھے۔ کوٹھی میں میڈم صفورا بہت بے قراری سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ عمران نے راستے میں ہی موبائل پر اسے اپنی آمد اور کامیابی کی اطلاع دے دی تھی۔

جب ہماری گاڑی پورچ میں رُکی تو میڈم صفورا وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس کی بیتاب نگاہ سب سے پہلے گاڑی کی پچھلی نشست کی طرف گئی جہاں کمبل نما کپڑے کے نیچے بدھا موجود تھا۔ اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ بدھا پر جھپٹے گی اور بیتاب ہو کر اسے اپنی گود میں اُٹھا لے گی لیکن پھر اس نے سنبھالا لیا اور اپنا رکھ رکھاؤ برقرار

رکھنے میں کامیاب رہی۔

اس نے دبے دبے جوشیلے انداز میں ہماری خیر خیریت دریافت کی۔ پھر اس کے اشارے پر دو ملازمین نے کمال احتیاط کے ساتھ بدھا کا دو فٹ اونچا مجسمہ کار میں سے نکالا اور اندرونی کمروں کی طرف بڑھے۔ ہم بھی ساتھ ہی تھے۔ مجسمے کو لال کوٹھی کے ایک خاص کمرے میں پہنچایا گیا۔ یہاں دو بڑی بڑی میزیں تھیں، ان پر کچھ بصری آلات پڑے تھے۔ ایک ایکسرے مشین جیسی چیز تھی۔ دو تین جدید اسٹل کیمرے تھے۔ فرش پر آسٹروٹرف جیسی شے بچھی تھی۔ بدھا کے مجسمے کو بے حد احتیاط کے ساتھ ایک میز پر رکھ دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ملازمین باہر چلے گئے۔ اب وہاں ہمارے اور میڈم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ''ویل ڈن عمران!'' میڈم نے ایک بار پھر دبے دبے جوش سے کہا۔ ''تم نے خوش کر دیا۔''

''تھینک یو میڈیم! اور دیکھ لیں، وعدے کے مطابق کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اگر ہوا ہوگا تو تھوڑا بہت مالی نقصان ہوا ہوگا۔''

''ہاں...... میں نے ابھی نیوز دیکھی ہے۔ ایک دوست سے بھی بات ہوئی ہے۔ فلیٹ کے دو کمرے ہی زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ صدیقی کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا تھا مگر طبی امداد کے بعد فارغ کر دیا گیا ہے۔ گرنے سے اس کے چہرے پر تھوڑی بہت چوٹ آئی ہے۔''

''صدیقی وغیرہ کا عام تاثر کیا ہے؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''ابھی یہ تو معلوم نہیں ہو سکا مگر سنا ہے کہ وہ مقامی تھانے میں نامعلوم افراد کے خلاف ڈکیتی یا چوری وغیرہ کا پرچہ درج کرانے کا سوچ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ صدیقی کا دھیان اسی پارٹی کی طرف جا رہا ہے جن کی وجہ سے اسے اس مجسمے کو لاہور سے جہلم لے جانا پڑا تھا۔ یہ غنڈا ٹائپ لوگ ہیں۔ لاہور میں بھی یہ صدیقی کے گھر کے گرد منڈلاتے رہے ہیں۔'' میڈم کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک تھی۔

بات کرتے ہوئے بھی میڈم کی نظریں مسلسل بدھا کا طواف کر رہی تھیں۔ تب اس کے ہاتھ پُرشوق انداز میں پولیتھین کے کور کی طرف بڑھے۔ کور کو بڑے سلیقے سے پن وغیرہ لگائی گئی تھیں۔ میڈم نے ان پنوں کو خود اُتارا۔ نیچے سیلوفین کی کورنگ تھی۔ کورنگ کو قینچی سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا۔ نیچے بدھا تھا۔ میں فائن آرٹ کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ فنِ سنگ تراشی و مجسمہ سازی سے بھی کوئی خصوصی لگاؤ نہیں ہے مگر پتا نہیں کیا بات تھی، بدھا کے اس زبردست مجسمے نے مجھے بھی غیر معمولی طاقت سے اپنی طرف کشش کیا۔ وہ فاقہ زدہ بدھا

کی تصویر کشی کرتا ہوا، آرٹ کا ایک نہایت اعلیٰ و نفیس نمونہ تھا۔ جسم کا ہر نشیب و فراز، ہر رگ پٹھا اور ہڈی۔ ایک ایک تفصیل اپنی جگہ باکمال تھی۔ بے شک وہ ماہر ترین ہاتھوں کا بنا ہوا تھا۔ اس کی اضافی خوبی یہ تھی کہ اس میں کہیں ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی۔ یہ ایک دھاتی مجسمہ تھا۔

''ونڈرفل...... واٹ اے بیوٹی۔'' میڈم نے مسحور کن انداز میں اسے چھوا۔ اس کی آنکھوں میں پُراشتیاق چمک تھی۔

پھر اس نے ٹیبل کے گرد موجود چند روشنیاں آن کیں اور جدید کیمرے سے مجسمے کی کئی تصویریں کھٹا کھٹ اُتار لیں۔ وہ خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

تب وہ شاہانہ انداز سے ایک لگژری صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک ایک بیش قیمت سلیپنگ گاؤن میں تھی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال پیشانی پر بھی جھول رہے تھے اور خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً ایک بھرپور عورت تھی۔ اپنی جسمانی کشش اور پُروقار انداز کے سبب وہ نادیہ سے بڑی ہونے کے باوجود کسی بھی مرد کو بآسانی اپنی طرف کشش کر سکتی تھی۔ نادیہ ایک شور مچاتی پھلجھڑی کی طرح تھی۔ آنکھوں میں چبھنے والے عجیب و غریب رنگ چھوڑتی ہوئی لیکن میڈم صفورا ٹرمینل پر جلتی ہوئی ایک خاموش شمع کی طرح تھی۔ بہت دیر تک روشن رہنے والی گہری اور پُرسکون اس کے بے حرکت شعلے میں بھید پوشیدہ تھے۔

فرطِ جذبات سے میڈم صفورا کا چمکیلا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ کسی شہزادی کے سے انداز میں بولی۔ ''اس خوشی کے موقعے پر مانگو عمران! کیا مانگتے ہو؟''

میڈم صفورا کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ عمران سے کسی ایسی خواہش کی توقع کر رہی ہے جس سے کوئی مالی فائدہ حاصل ہو سکتا ہو مگر عمران نے جو کہا، وہ شاید میڈم صفورا کے گمان میں نہیں تھا۔ وہ انکساری سے بولا۔ ''آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کس چیز کی کمی ہے میڈم! لیکن آپ کی پیشکش سے فائدہ نہ اُٹھانا بھی بے ادبی ہوگی۔ میں آپ سے سلیم کے بارے میں گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ بے شک اس کی غلطی بڑی ہے لیکن آپ اس کی جان بخشی کر دیجیے۔''

میڈم صفورا نے حیران کن نظروں سے عمران کو دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لگتا ہے کہ تمہیں بہت خیال ہے اپنے دوست کا؟''

''مجھے اپنے ہر دوست کا بہت خیال رہتا ہے میڈم!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''اچھی عادت ہے۔'' میڈم نے کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ بے خیالی میں عمران کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک طویل سانس لے کر مسکرائی اور بولی۔ ''ٹھیک ہے مین! سلیم

کو معاف کر دیا جائے گا......اور کچھ؟"

"بہت بہت شکریہ میڈم۔"

"اب ایک خواہش ہماری بھی ہے۔" میڈم نے کہا۔

"جی فرمائیں۔"

"ٹھیک ہے، جمناسٹک اور سرکس وغیرہ تمہارا شوق ہے۔ تم اس شوق کو پورا کرو لیکن تمہارا باقی کا وقت ہمارا ہونا چاہیے۔ آج میں بہت خوش ہوئی ہوں تمہاری پرفارمنس سے۔"

"او کے......آپ کے بارے میں تفصیل سوچ لیں پھر جیسا آپ کہیں گی، ویسا کر لیں گے۔"

"سوچنا کیا ہے؟ شام کو سرکس میں تین گھنٹے تمہارے باقی سب ہمارے......اور یہ ڈیل تمہاری ہی شرائط پر۔"

"ہمارا کنکشن اوپن تو نہیں ہو سکتا۔"

"ظاہر ہے کہ فی الحال نہیں ہو سکتا۔ براہ راست ہمارا تعلق نظر نہیں آئے گا لیکن ہم ہر وقت رابطے میں رہیں گے۔ جس طرح کی سہولتیں تمہیں درکار ہیں، مجھے بتا دو۔ یہاں کسی قریبی آبادی میں اچھی رہائش گاہ، ایک دو گاڑیاں، ملازم وغیرہ جو کچھ چاہو مہیا ہو سکتا ہے۔ ویسے تو میں مارا ماری اور لڑائی جھگڑے کی قائل نہیں ہوں مگر اپنا دفاع بھی تو ضروری ہوتا ہے۔ چھوٹے اسلحے کے دو تین لائسنس میں تمہیں دو چار دن میں دلا سکتی ہوں۔"

اسی دوران میں میڈم صفورا کا موبائل جاگ اُٹھا۔ دوسری طرف کوئی ایسا شخص تھا جو عمر میں میڈم سے بڑا تھا اور وہ کسی حد تک اس کی عزت کرتی تھی۔ شاید وہ کوئی آرکیالوجسٹ تھا۔ میڈم اس سے بات کرتے کرتے اس خاص کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو کافی جلدی میں تھی۔ اس نے ہم سے کہا کہ اب ہم جا کر آرام کر سکتے ہیں، وہ شام کی چائے پر پھر ہم سے ملاقات کرے گی۔

O......❖......O

ہم اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ خاصی تھکاوٹ ہو رہی تھی لیکن جن حالات سے گزر کر ہم واپس لاہور پہنچے تھے، وہ مسلسل ذہن میں اودھم مچا رہے تھے۔ ہم نے ایک پُر ہنگام رات گزاری تھی۔ اپارٹمنٹ میں آگ کا بھڑکنا اور پھر صدیقی کا افراتفری میں "فاسٹنگ بدھا" کو چھت کے خفیہ خانے سے نکالنا، اس کے بعد اس کا قالین پر بے دم ہو کر گر جانا۔ یہ مناظر ترتیب وار ذہن کے پردے پر حرکت کر رہے تھے۔

ہم نے اقبال کو کارگزاری سنائی۔ بہت مدھم لہجے میں بات کر رہے تھے ہم۔ بلکہ اس گفتگو کو سرگوشیاں کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بے شک بجا طور پر ہمارے ذہنوں میں موجود تھا کہ اس مہمان خانے میں ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میں نے عمران سے کہا۔ "بے شک سلیم کی رہائی بھی اہم ہے لیکن میڈم بڑی فراخ دلی سے آفر کر رہی تھی۔ شاید وہ تمہیں کوئی اس سے بھی بڑا انعام دینا چاہتی تھی۔"

"یہ لوگ ہمیں کیا دے سکتے ہیں جگر! یہ تو خود بھیک منگے ہیں۔ لالچ کا کشکول لے کر در بدر پھر رہے ہیں۔" عمران نے سرگوشی کی۔ "میں نے وہی مانگا جو میرے دل نے کہا۔ بس یہی کافی ہے اور ویسے بھی آج میں اتنا خوش ہوں کہ خود ہزاروں لاکھوں لٹا سکتا ہوں۔ مجھے کسی سے کچھ مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کس بات کی خوشی ہے؟"

"بتاؤں؟"

"تو کیا اس کے لیے ہمیں کوئی پرمٹ وغیرہ دکھانا پڑے گا؟" اقبال نے کہا۔

"اس کا تعلق تم سے نہیں، لہٰذا تم اپنی چونچ بند رکھو۔" عمران نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چلو آؤ باہر۔"

اقبال کو جز بز چھوڑ کر ہم باہر لان میں آ گئے اور گیندے کے پھولوں سے گھری ہوئی ایک روش پر پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ دل میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ ایک دم ڈرامائی انداز میں بولا۔ ”تمہاری ثروت بی بی کا پتا چل گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے حاجی صاحب کا فون آیا ہے۔ میں نے انہیں اپنا نیا نمبر دیا ہوا تھا۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں بھونچکا رہ گیا۔

”وہی جو تم سن رہے ہو اور لال گلابی ہو رہے ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”تمہاری ثروت بی بی اب کوئی لاپتا شے نہیں ہے تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم اس کے شہر اور اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے سکتے ہیں۔“

میرے سینے میں جیسے ایک دم ہزاروں گلاب کھل اُٹھے۔ دل کے اُفق سے اُمید کی سنہری کرنیں پھوٹیں اور ان پھولوں کو منور کر گئیں لیکن ابھی ذہن سے شکوک کے بادل پوری طرح چھٹے نہیں تھے۔ میں نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ ”کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے؟“

وہ فلمی انداز میں بولا۔ ”اگر تمہاری محبت مذاق ہے تو میں مذاق کر رہا ہوں۔ اگر رات کو سرہانے پر گرنے والے تمہارے آنسو مذاق ہیں تو میں مذاق کر رہا ہوں اور اگر تمہارا یہ سوکھے پتے جیسا چہرہ مذاق ہے تو ہاں...... میں مذاق کر رہا ہوں۔“

”کہاں رہتے ہیں وہ لوگ؟“ میں نے بیتابی سے پوچھا۔

”یہاں...... میرے دماغ میں۔“ اس نے انگلی سے اپنے سر کی طرف اشارہ کی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”یار! تم نے فلم ”سونے کی تلاش“ نہیں دیکھی۔ اس میں گریگوری پیک نے یہی ڈائیلاگ بولا تھا تو اس کی جان بچی تھی۔ اس نے بدمعاشوں کو بتایا تھا کہ سونے تک پہنچنے کا نقشہ یہاں اس کے دماغ میں ہے۔ اسی طرح تمہاری ثروت بی بی تک پہنچنے کا نقشہ بھی یہاں میرے دماغ میں ہے۔ گریگوری پیک نے اپنی جان بچائی تھی اور میں اپنا اور تمہارا یارانہ بچانا چاہتا ہوں۔ تمہیں سب کچھ بتا دیا تو تم مجھے لات مار کر اکیلے ہی نکل جاؤ گے جرمنی اور چھاپ لو گے ثروت بی بی کو۔ تمہارا فائیو اسٹار ولیمہ کھانے کی حسرت مجھ بدنصیب کے دل میں ہی رہ جائے گی۔“

”یار عمران! بے پر کی نہ اُڑاؤ۔ مجھے بتاؤ کیا واقعی ہم اب ثروت اور ناصر بھائی تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”ایک سو ایک فیصد۔“ وہ جادوئی انداز میں مسکرایا۔ ”بس یہاں جو تھوڑا سا کام رہ گیا

ہے، وہ کر لیں پھر نکل چلیں گے۔ ان لال کوٹھیوں کو ”بائی بائی“ اور بہن بہن کر کے۔“

”تھوڑا سا کام کیا؟“

”یار! بڑے بے مروت ہو۔ جو بندہ ہماری دوستی اور محبت کی وجہ سے یہاں پھنسا ہوا ہے، اسے نکالنا نہیں ہے یہاں سے؟“

”ہاں...... وہ تو ضروری ہے۔“

”تو بس...... اس کے بعد یہ دونوں میڈمیں جانیں اور پولیس جانے اور میرا تایا جانے۔“

”کیا مطلب؟“

”بھئی ہم تینوں نے کوئی ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ان دونوں بہنوں کو جیل وغیرہ پہنچانے کا۔ ہمارے پاس جو ثبوت شبوت ہیں، وہ پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ مزید چھان بین کرنا ان لوگوں کا کام ہوگا۔ اگر یہ دونوں میڈمیں اور صدیقی وغیرہ واقعی غیر قانونی کاموں میں ملوث ہیں تو پھر بچ نہیں سکیں گے۔“

”تمہارا مطلب ہے پولیس بڑی دیانتداری سے ان لوگوں کو پکڑ کر جیلوں میں ڈال دے گی؟“

”نہیں...... نہیں صرف پولیس یہ کام نہیں کر سکتی، ساتھ میں تایا جی بھی تو ہوں گے۔ تایا جی کا مطلب ہے میڈیا۔ تمہیں پتا ہے نا کہ تایا جی ایک نیوز چینل بھی چلاتے ہیں اور آج کل خبروں کی تلاش میں ان کی بُری حالت ہو رہی ہے۔“

عجب درویشانہ سوچ تھی اس کی۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے پیسے وغیرہ کا ذرہ بھر لالچ نہیں ہے۔ میڈم صفورا جس طرح اس کی مداح ہو رہی تھی، وہ اس سے کوئی بڑے سے بڑا فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ بلکہ صرف ”فاسٹنگ بدھا“ کو صدیقی کے قبضے سے نکال کر یہاں لانے کے عوض بھی وہ کافی موٹی رقم لے سکتا تھا۔ میڈم جب صدیقی سے فاسٹنگ بدھا کا سودا کر رہی تھی تو یقیناً خطیر رقم اسے آفر کر رہی ہوگی۔ یہ خطیر رقم اب عمران کی جیب میں بھی آ سکتی تھی مگر اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ شاید اس نے یہ سب کچھ خوبرو کنول اور نیاض کی جان کا صدقہ سمجھ کر کر دیا تھا۔

رات گئے تک سلیم کی رہائی کے سلسلے میں کشمکش چلتی رہی۔ قرائن سے لگتا تھا کہ چھوٹی میڈم اپنی بات پر اڑی ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سلیم اس کا ملازم ہے اور اس کے ساتھ غداری کا مرتکب ہوا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں جو فیصلہ کرے گی وہ خود کرے گی۔ دوسری

طرف میڈم صفورا کو اپنے وعدے کا پاس تھا اور وہ چھوٹی بہن کو قائل کر رہی تھی۔ شاید وہ اسے بتا رہی تھی کہ بڑے فائدے حاصل کرنے کے لیے چھوٹے موٹے کمپرومائز کرنے پڑتے ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق سلیم کی حالت خاصی پتلی تھی۔ وہ لال کوٹھی کے تہ خانے میں تھا۔ اسے بُری طرح ٹارچر کیا گیا تھا۔ تفصیل کے مطابق چھوٹی میڈم نادیہ نے اسے عریاں کر کے بدست خود ربڑ کے ایک ایسے پائپ کے ذریعے پیٹا تھا جس کے گرد لوہے کا باریک تار لپٹا ہوا تھا۔ اس مار نے سلیم کا گوشت کئی جگہ سے ادھیڑ ڈالا تھا۔ گرنے سے اس کی کنپٹی پر بھی چوٹ لگی تھی جس کے سبب اسے اپنا جسمانی توازن قائم رکھنا مشکل محسوس ہوتا تھا۔ بس ہمیں اتنا ہی معلوم ہوا تھا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ یہ معاملہ کسی حد تک طے ہو گیا۔ میڈم صفورا نے انٹرکام پر عمران کو اطلاع دی کہ صبح سلیم ان کے پاس آ جائے گا۔

عمران کی خواہش تھی کہ سلیم ناشتے پر ہمارے ساتھ ہو لیکن نو دس بجے تک وہ انیکسی میں نہیں آیا۔ عمران نے میڈم صفورا کے فون پر رابطہ کر کے اس سے پوچھا۔ صفورا نے جواب دیا۔

''میں تو اس وقت ایک پراپرٹی کے لیے رائے ونڈ روڈ پر آئی ہوئی ہوں۔ بہرحال سلیم ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔''

ہم نے ناشتہ سلیم کے بغیر ہی کیا تاہم اس کے فوراً بعد وہ پہنچ گیا۔ اس کی حالت خاصی ابتر تھی۔ وہ پہلے ہی لنگڑا کر چلتا تھا، اب کچھ اور بھی ڈگمگا رہا تھا۔ دو گارڈز نے اسے دونوں طرف سے تھاما ہوا تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ ہم تینوں نے اسے بڑی آہستگی کے ساتھ گلے لگایا۔ گرم جوشی سے گلے لگاتے تو وہ یقیناً تکلیف سے کراہنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔

''میں جانتا ہوں کہ مجھے آپ کی کوششوں کی وجہ سے چھوڑا گیا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔'' وہ بولا۔

''یوں جوتے مارتے ہو یارا!'' عمران بولا۔ ''تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، ہماری وجہ سے ہوا۔ ہم تمہاری طرح آنکھوں میں آنسو لے کر ایک ہزار بار بھی تمہارا شکریہ ادا کریں تو یہ کم ہے۔ خیر...... ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب سب اچھا ہو گا۔''

ابھی عمران کی بات منہ میں تھی کہ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک سنائی دی۔ پھر چھوٹی میڈم نادیہ کسی بگولے کی طرح انیکسی میں داخل ہوئی۔ پانچ گارڈز اس کے ہمراہ تھے۔ وہ نشے میں

دھت نظر آ رہی تھی۔

آتے ساتھ ہی اس نے چلا کر پوچھا۔ ''یہ کس کی اجازت سے یہاں آیا ہے؟''

جو دو گارڈز سلیم کو لے کر آئے تھے، ان میں سے ایک بولا۔ ''بڑی میڈم نے فون پر بولا تھا جی۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' وہ گرجی۔ ''بڑی میڈم نے بولنا ہوتا تو مجھ سے بولتی۔''

''بڑی میڈم کہتی تھیں جی کہ بات ہو گئی ہے۔ اس لیے......''

''کوئی بات نہیں ہوئی ابھی۔'' وہ پھر دھاڑی۔ ''کیا سمجھتے ہو تم لوگ...... اس باسٹرڈ کو میں ایسے ہی چھوڑ دوں گی؟ اس نے غداری کی ہے۔ ہماری پیٹھ میں چھرا مارا ہے۔'' پھر وہ پلٹ کر اپنے گارڈز سے بولی۔ ''لے چلو اس کتے کو۔''

''ٹھہرو۔'' عمران مشتعل گارڈز اور سلیم کے درمیان آ گیا۔

''تم پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ تمہیں بھی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جاؤ تم۔'' نادیہ چلائی اور اس نے شرابی انداز میں عمران کو پیچھے دھکیلا۔

نادیہ کے گارڈز نے سلیم کو کھینچا۔ عمران نے سلیم کا دوسرا بازو پکڑ لیا۔ وہ بیچارہ عمران اور گارڈز کے درمیان بے بسی کی تصویر نظر آنے لگا۔ گارڈز نے اپنی رائفلیں ہاتھوں میں لے لی تھیں۔ ان میں انچارج گارڈ شیرا بھی شامل تھا۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

عمران نے جیب سے موبائل نکالا اور بولا۔ ''اس طرح زور آزمائی کرو گے تو سب کا نقصان ہو گا۔ میں میڈم صفورا کو کال ملاتا ہوں۔''

''میڈم سے کال ملا کر بتا دینا اسے سب کچھ۔'' نادیہ زہریلے انداز میں پھنکاری۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے گارڈز کو اشارہ کیا۔ وہ سلیم کو بیدردی سے کھینچتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ اس موقعے پر میں نے دیکھا کہ اقبال کا بھی پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ وہ آگے بڑھا مگر عمران نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔ غالباً وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے میڈم صفورا سے بات کرنا چاہتا تھا اور یہ عین دانشمندی تھی۔

گارڈز سلیم کو کھینچتے ہوئے لے گئے۔ سلیم کا چہرہ زرد تھا اور وہ بیچارگی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران نے پکار کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں سلیم! یہ ابھی چھوڑ دیں گے تمہیں۔'' وہ میڈم صفورا کو کال ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا اور ہم دونوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہم سلیم کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ اب ہم اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ عمران کال ملا

رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ سرخی اسے ایک بالکل مختلف روپ دے رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد میڈم صفورا سے کال مل گئی۔ ''ہیلو میڈم! آپ اب کہاں ہیں؟'' عمران نے پوچھا۔ دوسری طرف سے میڈم نے جواب میں کچھ کہا۔ عمران گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میڈم! یہاں بہت زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ کی اجازت سے گارڈز، سلیم کو تھوڑی دیر پہلے ہمارے پاس لائے تھے۔ میڈم نادیہ اس کے پیچھے ہی پیچھے یہاں آ گئی ہیں۔ ان کے ساتھ چھ سات گارڈز بھی تھے۔ وہ سلیم کو زبردستی اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ انہوں نے بدزبانی بھی کی ہے۔''

جواب میں کچھ کہا گیا جو عمران نے خاموشی سے سنا پھر بولا ''ٹھیک ہے میڈم! لیکن ایک بات آپ بھی ذہن میں رکھیے گا۔ میں نے آپ سے سلیم کے سوا اور کچھ نہیں مانگا تھا اور اس کی جو حالت ہو چکی ہے، وہ بھی میں نے دیکھ لی ہے۔ اس سے ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا۔ لگتا ہے کہ میڈم نادیہ اپنے دل کی ساری بھڑاس اس پر نکال چکی ہیں۔ اب وہ اسے معاف کر دیں تو یہی بہتر ہے۔''

عمران کی آنکھیں سرخ تھیں اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت کوشش کر کے اپنے لہجے کو نارمل رکھے ہوئے ہے۔

اس نے فون بند کیا تو اقبال نے بے قراری سے پوچھا۔ ''کیا کہا میڈم نے؟''

''کہتی ہیں، میں دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں پھر بات کرتی ہوں نادیہ سے۔''

میڈم صفورا کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سیدھی نادیہ والے پورشن میں پہنچی۔ دونوں بہنوں کی یہ ملاقات ہماری توقع سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ ہم بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔

قریباً دو گھنٹے بعد میڈم صفورا ہماری انیکسی کی طرف آئی۔ اس کا چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس کا ذاتی گارڈ اس کے ہمراہ تھا تاہم اس نے اسے باہر ہی چھوڑ دیا۔ وہ ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا پھر سگریٹ سلگایا اور بولی۔ ''مسٹر عمران! ایک بات کی بالکل تسلی رکھو۔ جو پرامس میں نے تم سے کیا ہے، وہ ضرور پورا کروں گی۔ سلیم کو کچھ نہیں ہو گا اور وہ یہاں تمہارے پاس بھی پہنچے گا۔ اس میں تھوڑا سا ٹائم ضرور لگ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل تک معاملہ نمٹ جائے۔ میرے آنے سے پہلے نادو کا دماغ بہت گھوما ہوا تھا لیکن اب وہ میرے سمجھانے سے کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔ اصل میں یہ بہت اُلجھی ہوئی

لڑکی ہے۔ بچپن سے ضدی ہے اور کسی وقت اس کی یہ عادت خطرناک حدوں کو چھو لیتی ہے۔''

''وہ آپ کی بہن ہے۔ آپ اس کے بارے میں زیادہ جانتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جب ڈھائی تین گھنٹے پہلے سلیم یہاں آیا تو آپ کی اجازت سے ہی تو آیا تھا۔'' عمران نے کہا۔

''میری بات ہوئی تھی نادو سے اور اس نے نیم رضامندی بھی ظاہر کی تھی۔ میں سمجھی کہ وہ مان گئی ہے لیکن کچھ کسر ابھی باقی تھی۔ خیر پریشان ہونے کی بات نہیں۔ میں ایک آدھ دن میں سنبھال لوں گی اسے۔''

''گستاخی معاف۔'' عمران نے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ آپ بھی ان کے سامنے بے بسی محسوس کر رہی ہیں۔''

''نہیں...... ایسی بات نہیں۔ بس اس کی طبیعت سے ڈر لگتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا رویہ نفسیاتی مریضہ جیسا ہو جاتا ہے۔ بہت زیادہ ڈرنک کر لیتی ہے۔ ساتھ میں نشہ آور گولیاں کھا لیتی ہے۔ ایسے میں شور مچاتی ہے اور توڑ پھوڑ کرتی ہے۔ ایک دو مرتبہ زخمی حالت میں اسے ہسپتال لے جانا پڑا ہے۔''

''مگر میڈم! گستاخی معاف اس ڈر سے کہ وہ شور مچائیں گی اور توڑ پھوڑ کریں گی، ہم کسی جیتے جاگتے انسان کی زندگی تو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ ہم نے دیکھا ہے اور آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ سلیم کو کس بُری طرح مارا گیا ہے۔ ربڑ کے پائپ پر تار لپٹا ہوا تھا اور اس نے کئی جگہ سے سلیم کی چمڑی ادھیڑ دی ہے۔ اسے تو ہسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی مگر وہ اسے پھر اپنے ٹارچر سیل میں لے گئی ہیں۔''

''اس سے اب اور مار پیٹ نہیں ہو گی۔ میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔ باقی میں نے ابھی خود اس کی بینڈیج وغیرہ کرائی ہے۔ وہ اس وقت سو رہا ہے۔''

میڈم نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولی۔ ''دراصل بندہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ تم لوگوں کی بھی ایسی کوئی نہ کوئی مجبوری ضرور ہو گی۔ میری اور نادو کی عمر میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں ہے لیکن میں نے اسے ہمیشہ بچوں کی طرح ہی سمجھا ہے۔ وہ سب سے چھوٹی تھی اور لاڈلی تھی۔ والدین ایک حادثے میں ہم سے بچھڑ گئے، اس وقت نادو کی عمر بس آٹھ نو سال تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہو، اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ خود

سر ہوتی چلی گئی۔ وہ میرے لیے ایک پرابلم چائلڈ بن گئی اور کسی حد تک اب بھی پرابلم چائلڈ ہی ہے۔ مگر کچھ بھی ہے، میرے اوپر بہت سی ذمے داریاں ہیں اور میں ان ذمے داریوں کو ''اون'' بھی کرتی ہوں۔ جب معاملہ کچھ ایسا ہو جائے کہ ایک طرف بہن کی محبت اور دوسری طرف ذمے داری ہو تو میرا جھکاؤ اپنی ذمے داری کی طرف ہی رہتا ہے۔ لہٰذا مائی ڈیئر! تم بےفکر رہو۔ تم نے میرے لیے ایک بڑا اہم کام بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اس کام کے بدلے تم نے جو کچھ مانگا ہے، وہ تمہیں ضرور ملے گا۔''

''آپ کی تعریف اور تسلی کا شکریہ۔'' عمران نے کہا۔

''صدیقی آج کل بہت پریشان ہے۔'' میڈم صفورا زیرلب مسکرائی۔ ''یقیناً اسے زیادہ دُکھ اس بات کا ہوگا کہ اس نے جو کچھ کیا اپنے ہاتھوں سے کیا۔ خود ہی مجسمے کو چھت کے خفیہ خانے سے نکالا اور خود ہی تمہارے حوالے کیا۔ اس نے وہاں قلعہ روہتاس کے اردگرد کافی تہلکہ مچایا ہے۔ جس بستی کا تم نے نام لیا تھا، وہاں سے پولیس نے کئی افراد کو پکڑا ہے اور پوچھ گچھ کی ہے۔ ایک دو لاکھ روپیہ پولیس والوں کو کھلایا ہے صدیقی نے۔ وہ ہر اس گاؤں پر چھاپہ مار رہا ہے جس پر صدیقی اور اس کے بندے تھوڑا سا بھی شک ظاہر کر رہے ہیں۔ کئی علاقوں میں لُٹا بیچنے والوں کی شامت آئی ہوئی ہے۔''

''آپ کی طرف تو دھیان نہیں گیا اس کا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''لگتا تو نہیں ہے اور اگر گیا بھی تو اس کے لیے ثبوت چاہیے ہوگا۔''

''وہ یہاں تو نہیں آ دھمکے گا؟'' عمران نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے اپنی بپتا سنانے کے لیے آ ہی دھمکے۔ مگر انیکسی کی طرف اس کا کوئی کام نہیں ہوگا۔ ہاں...... اگر وہ میرے پاس آیا تو میں تم لوگوں کو اطلاع کر دوں گی۔ وہ زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے ہی رُکے گا۔ اس دوران میں تم لوگ انیکسی کے اندر ہی رہنا۔''

عمران بولا۔ ''میں تو چاہتا تھا کہ آج سلیم آ جائے تو کل ہم کسی وقت یہاں سے شفٹ ہو جائیں۔ یہاں کی نسبت کوئی بھی دوسری جگہ ہمارے لیے زیادہ محفوظ ہوگی۔''

''سوری! میں تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتی۔ تمہیں یہاں لال کوٹھی میں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اس بارے میں بھی تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔ ابھی چند روز تم سکون سے یہاں رہو۔ اس کے بعد دیکھ لیں گے کہ کیا سیٹ اپ بنانا ہے۔ میں تمہارے اس ساتھی اقبال کی ٹانگوں کے بارے میں بھی فکرمند ہوں۔ اس کا علاج جلدی اور اچھے طریقے سے ہونا چاہیے۔''

اقبال بولا۔ ''میڈم! ہمیں زیادہ پریشانی سلیم کے حوالے سے ہے۔ آپ یہ پریشانی ختم کر دیں۔ باقی پریشانیاں خود ہی ختم ہو جائیں گی۔''

''ڈونٹ وری۔'' میڈم صفورا اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

رات گیارہ بارہ بجے کا وقت تھا۔ اقبال سو چکا تھا، ہم اونگھ رہے تھے۔ اچانک عمران تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بھی کوشش کی۔ نادیہ والی لال کوٹھی کی طرف سے مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ میں لرز گیا۔ یہ سلیم کی آوازیں تھیں۔ دو تین بار زور سے چلّایا پھر شاید کراہنے والے انداز میں باآواز بلند کچھ بولنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک اور مردانہ آواز اس کی آواز میں گڈمڈ ہوئی۔ کسی شے کے ٹوٹنے کی آواز اُبھری اور خاموشی چھا گئی۔

عمران بےچینی سے بیڈروم میں ٹہلنے لگا۔ اس کی چوڑی پیشانی پر تفکرات کی لکیریں تھیں۔ اس نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا اور میڈم صفورا کو کال کرنے لگا۔ تیسری یا چوتھی کوشش پر رابطہ ہوا۔

دوسری طرف سے میڈم کی بھاری لیکن پُرکشش آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''میڈم! ابھی کوٹھی کی طرف سے سلیم کے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس پر پھر تشدد کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کیا ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ چھوٹی میڈم ہمارے صبر کا امتحان لے رہی ہے۔''

''نہیں...... نہیں۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ابھی فون کر کے پوچھتی ہوں بلکہ خود جاتی ہوں میں...... تم فون آن رکھنا۔ میں کال کروں گی۔''

تقریباً دس منٹ انتظار میں گزرے۔ اس دوران میں کوٹھی کی طرف سے کوئی مزید آواز بلند نہیں ہوئی۔ آخر میڈم صفورا کی کال آ گئی۔ ''ہیلو! میڈم صفورا اسپیکنگ'' اس نے اپنے مخصوص بارعب لہجے میں کہا۔

''جی میڈم۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ میں ابھی خود دیکھ کر آئی ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ بس تیز بخار کی وجہ سے ہذیان بول رہا تھا۔ ایک چھوٹا فریج بھی نیچے گرا دیا ہے۔ اس کے اٹینڈنٹ نے دوا کھلائی ہے۔ اب سو رہا ہے۔ ڈونٹ وری۔ ہی از کوائٹ او کے۔'' میڈم نے کہا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ میڈم ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ بخار والی بات بھی درست تھی۔ کل جب

سلیم ہمارے پاس آیا تھا تو اس کا چہرہ بخار سے تمتما رہا تھا۔ یہ بخار شاید ان زخموں کی وجہ سے تھا۔ جو تشدد کا نتیجہ تھے اور کئی دنوں سے اس کے جسم پر موجود تھے۔

رات کا باقی حصہ ہم نے سوتے جاگتے ہی گزارا۔ یہ صبح تقریباً دس بجے کا وقت تھا۔ انیکسی کی طویل کھڑکیوں سے باہر وہ دونوں عمارتیں نظر آ رہی تھیں جنہیں لال کوٹھیاں کہا جاتا تھا۔ عمارتوں کا درمیانی سبزہ زار اور ہماری انیکسی کا چھوٹا سا باغیچہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ گاہے بہ گاہے دیوہیکل السیشن کتے کی آواز فضا میں اُبھرتی تھی اور پھر خاموشی چھا جاتی تھی۔ اس کتے کی آواز میں ایک عجیب طرح کی ہولناک کیفیت موجود رہتی تھی۔ یہ آواز اس طرز کے دیگر کتوں سے مختلف تھی۔

یکلخت میں بُری طرح چونک گیا۔ مجھے لگا کہ نادیہ کی رہائش گاہ کی بالائی منزل سے کوئی پرچھائیں سی اُڑتی ہوئی زمین پر گری ہے۔ یہ ہرگز وہم نہیں تھا۔ پرچھائیں کے زمین سے ٹکرانے کی پُرزور آواز صبح کے سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ میرے ساتھ عمران نے بھی یہ منظر دیکھا تھا۔

''اوہ گاڈ!'' اس کے منہ سے تحیر کے عالم میں نکلا۔

وہ ایک دم پلٹا اور باہر کی طرف دوڑا۔ میں اس کے عقب میں گیا۔ ہم باغیچے میں سے بھاگتے ہوئے گزرے۔ اسی دوران میں پہریداروں کی بلند آوازیں بھی سنائی دیں۔ اردگرد ایک دم بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ سب سے پہلے میں اور عمران ہی موقع پر پہنچے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں اپنے سامنے دیکھتا چلا گیا۔ بالائی منزل کی کھڑکی سے پختہ فرش پر گرنے والا شخص سلیم تھا۔ لگتا تھا کہ وہ سر کے بل گرا ہے۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری تھا اور پورا جسم جان کنی کے عالم میں لرز رہا تھا۔ عمران نے جھپٹ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھا۔ ''سلیم...... سلیم۔'' اس نے کربناک آواز میں پکارا۔

سلیم غالباً سننے اور جواب دینے کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔

ایک پٹھان گارڈ نے لرزاں لہجے میں کہا۔ ''او خدایا! یہ کیا قیامت ہو گیا؟''

''گاڑی لاؤ۔'' عمران دھاڑا اور سلیم کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔

ہم اسی حالت میں پورچ کی طرف بڑھے۔ ایک ڈرائیور بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف گیا اور اس کے دروازے کھولنے لگا۔ عمران نے سلیم کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نشست کا سفید غلاف خون سے سرخ ہو گیا۔

پھر میں نے دیکھا کہ عمران ایک دم ساکت ہو گیا۔ وہ بے پناہ بے چینی جو اس کے

ہاتھ پاؤں میں دوڑ رہی تھی، یکلخت معدوم ہو گئی اور تب اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ ہمارا دوست و خیر خواہ سلیم آخری ہچکی لے چکا تھا۔ وہ اب ہم میں نہیں تھا۔

''لگتا ہے کہ ختم ہو گیا۔'' ایک گارڈ نے تاسف بھری آواز میں کہا۔

دوسرے نے تائید کی۔ میں نے عمران کا چہرہ دیکھا، وہ کسی سنگلاخ پتھر کی طرح سپاٹ اور بے حس نظر آ رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب نادیہ، سیٹھ سراج اور شیرا وغیرہ تیز قدموں سے پورچ کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ سیٹھ سراج کے ہاتھ میں کسی پلازے وغیرہ کا رول کیا ہوا نقشہ تھا۔ میڈم نادیہ نے سلیم کی خونچکاں لاش دیکھی اور کراہ کر بولی۔ ''اوہ گاڈ! یہ کیا ہو گیا ہے؟ کیسے ہوا یہ سب کچھ؟''

''خو، ام کو لگتا ہے جی! کہ یہ اوپر والا کھڑکی سے گرا ہے۔ وہ دیکھیں، کھڑکی اب بھی کھلا ہے۔'' پٹھان گارڈ نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ گرا نہیں...... اس نے چھلانگ لگائی ہے۔'' سراج نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''یہ رات کو بھی ایسی ہی باتیں کر رہا تھا۔''

''بکواس بند کرو۔'' اچانک عمران چنگھاڑا۔ وہ بے انتہا تیزی سے پلٹا اور چوڑے چکلے سراج پر جا پڑا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سیٹھ سراج کا کلف دار گریبان پکڑا پھر اسے دھکیلتا، رگیدتا اور گھسیٹتا چلا گیا۔ دونوں ایک دیوہیکل موٹر سائیکل پر گرے اور پھر پورچ کے فرش پر آ رہے۔ شیرا عقب سے آیا اور عمران سے لپٹ گیا۔ وہ شاید کسی ایسی صورتِ حال کے لیے پہلے سے چوکس تھا۔ اس نے عمران کو پیچھے سے پوری قوت کے ساتھ اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ایک دم بہت سے افراد عمران پر پل پڑے۔ وہ شہد کی مکھیوں کی طرح عمران سے چمٹ گئے۔ اسی دوران میں سراج بھی عمران سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا گریبان ناف تک پھٹ چکا تھا۔ وہ بھی عمران کو مارنے والوں میں شامل ہو گیا۔ اب مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں عقب سے سیٹھ سراج پر جھپٹا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس کے سر کے بال کسی جنگلی گھوڑے کے بالوں کی طرح سخت اور موٹے تھے۔ میں نے اسے اتنے زور سے کھینچا کہ وہ نہ صرف عمران سے جدا ہوا بلکہ پشت کے بل فرش پر گر بھی گیا۔

تاہم اسی دوران گارڈز نے مجھے بھی جکڑ لیا اور اوندھے منہ یخ بستہ فرش پر گرا دیا۔ نادیہ کی چلاتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ گارڈ بختیار کو ہینڈ کف لانے کے لیے

کہہ رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے اور عمران کو اُلٹی ہتھکڑی لگائی جا چکی تھی۔ عمران کو ہتھکڑی لگانے کے لیے ان لوگوں کو بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ پانچ چھ تنومند گارڈ اس وقت تک عمران سے چمٹے رہے تھے جب تک ہینڈ کف لاک نہیں ہو گئے۔ یہ کارنامہ انجام دینے کے دوران میں گارڈز اور میڈم کے پسینے چھوٹ گئے اور ان کی آنکھوں سے اُمڈتا خوف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اگر عمران اس چار دیواری میں اکیلا ہوتا تو اسے بے بس کرنا ان لوگوں کے لیے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک ثابت ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ عمران کسی گارڈ سے رائفل چھین لیتا اور یہاں خون خرابا ہو جاتا۔ یقیناً یہ صرف میرا اور زخمی اقبال کا خیال تھا کہ عمران اس معاملے کو آخری حد تک نہیں لے گیا تھا۔

ہمیں رائفلوں سے دھکیل کر دوبارہ اسی تہ خانے میں لایا گیا جہاں ہم اس سے پہلے بند تھے۔ یعنی ہماری مہمانوں کی حیثیت ایک بار پھر ختم ہو چکی تھی۔ یہ میڈم صفورا کی رہائش گاہ والا وہی تہ خانہ تھا جہاں بیرکوں کی طرز پر دو تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے سامنے تھوڑی سی کشادہ جگہ تھی۔ اسی جگہ میڈم صفورا نے عمران اور شیرے کی زور آزمائی بھی کرائی تھی۔

اس ساری مار دھاڑ اور دھینگا مشتی کے دوران میں عمران نے فقط ایک جملہ بولا تھا۔ جب اسے اوندھے منہ پورچ کے فرش پر گرایا گیا تو اس نے آتش فشاں لہجے میں کہا۔ ''تم نے سلیم کو مارا ہے۔ تمہیں اس کا حساب دینا پڑے گا۔'' اس کے بعد وہ خاموش تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس کی خاموشی اس کے بولنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ کسی بھی وقت کوئی ایسا قدم اُٹھا سکتا تھا جو سب کو حیران کر ڈالے۔

سلیم کا مُردہ چہرہ مسلسل میری نگاہوں میں بھی گھوم رہا تھا۔ کل تقریباً اسی وقت وہ ہم سے ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ چہرے پر اُمید کی روشنی لیے اس نے عمران کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ موت کے کتنا قریب پہنچ چکا ہے اور آج وہ مر چکا تھا۔ ابھی آٹھ دس گھنٹے بعد شاید اسے دفنا بھی دیا جانا تھا۔ کتنی ناپائیدار ہے زندگی اور کتنے غیر متوقع ہوتے ہیں راہِ حیات کے اندھے موڑ۔

کچھ ہی دیر بعد میڈم صفورا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ اس سارے ہنگامے کے دوران میں نظر نہیں آئی تھی۔ یقیناً وہ کہیں باہر سے آ رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اس کے ملازمین نے اسے یہاں پیش آنے والے خونی واقعے کی اطلاع دی ہو۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ دندناتی

ہوئی اس تہ خانے میں گھس آئی۔ اس کے ساتھ اس کے ایک درجن باوردی گارڈز بھی تھے۔ یہ سب لوگ مسلح اور الرٹ نظر آ رہے تھے۔ سیٹھ سراج اور شیرا بھی ساتھ تھے۔ سراج نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص چھپانے کے لیے ایک گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔

میڈم نے ہم دونوں کو بیرک نما کمرے میں دیکھا اور ہمارے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی دیکھیں۔ وہ گرج کر شیرے سے بولی۔ ''کیا ہو رہا ہے یہ سب؟ ان کے ہاتھ کیوں باندھے ہیں تم نے؟ کس سے اجازت لی ہے تم نے؟''

سیٹھ سراج مؤدب انداز میں بولا۔ ''میڈم! انہوں نے بڑی تڑتھلی مچائی ہے جی۔ یہ دیکھیں جی میرا گریبان۔ اس نے میرے سارے کپڑے پھاڑ کر رکھ دتے ہیں۔'' اس نے میڈم کو دکھانے کے لیے گرم چادر آگے سے کھول دی۔

شیرا بولا۔ ''ہم مجبور ہو گئے تھے میڈم! اگر ان کو پکڑا نہ جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

سیٹھ سراج نے تائید کی۔ ''اس عمران صیب کا میٹر تو بالکل گھم گیا تھا جی! ذرا ڈھیل ملتی تو اس نے کسی گارڈ سے رائفل کھو لینی تھی۔ پھر جو کچھ بھی ہو جاندا، گھٹ تھا۔''

میڈم نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ وہ کوئی صفائی پیش کرے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ جیسے ایک پُرشور طوفان گزر جانے کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔ میڈم نے سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ کے لیے سرزنش کا انداز جاری رکھا۔ وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے کہ ان کو صدمہ ہوا ہے اور وقتی طور پر انہوں نے ''ری ایکٹ'' بھی کیا ہو گا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ انہیں دوبارہ اس طرح سے باندھ کر یہاں بیسمنٹ میں ڈال دیا جائے۔ چابی کہاں ہے؟'' اس نے آخر میں تحکم کے ساتھ پوچھا۔

شیرا آگے بڑھا اور اس نے کمرے کی چابی میڈم کی طرف بڑھا دی۔

''دوسری چابیاں بھی دو۔'' وہ پھر غصے سے بولی۔

شیرے نے ہینڈ کف کی دونوں چابیاں بھی میڈم کے سپرد کر دیں۔

وہ اندر آئی اور اس نے خود اپنے ہاتھوں سے ہمارے ہینڈ کف کھولے۔

''ویری سوری عمران! ویری سوری۔'' وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے میرا دل دُکھ سے بھر گیا ہے۔''

عمران اب بھی کچھ نہیں بولا۔ میڈم نے تمام گارڈز کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے۔ سیٹھ سراج تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا رہا۔ ''آپ بھی سراج صاحب!'' میڈم

نے نہایت خشک لہجے میں کہا۔

سیٹھ باہر چلا گیا۔ عمران نہایت گمبھیر آواز میں بولا۔ ''میڈم! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ ایسا ہونے دیں گی۔ میں نے آپ کے قول پر بھروسہ کیا اور آپ کے حکم کے مطابق عمل کیا۔ نادیہ اور اس کے گارڈز، سلیم کو ہمارے پاس سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ ہم صرف اس لیے خاموش رہے کہ آپ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔ کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گی۔''

''مگر عمران! جو کچھ ہوا ہے بالکل حادثاتی ہے۔ یہ کسی کے گمان میں نہیں تھا کہ سلیم اس طرح اپنی جان لے لے گا۔ گارڈز نے خود دیکھا ہے کہ اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی ہے۔''

''یہ بالکل غلط ہے میڈم!'' عمران نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ ''گستاخی معاف...... سلیم کو آپ کی جنونی بہن نے کھڑکی سے دھکا دے کر مروایا ہے۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

میڈم کے چہرے کا رنگ بدلا تاہم وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ ''اس وقت تم شاک میں ہو عمران! ویسے بھی اتنی جلدی کسی فائنل نتیجے پر پہنچنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر تمہارے دماغ میں کسی طرح کا کوئی شک ہے تو ہم اس پر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو اس کو سزا ملے گی اور ملنی بھی چاہیے۔''

''کیا آپ اپنی لاڈلی بہن کو وہ سزا دے سکتی ہیں جس کی وہ حق دار ٹھہرے گی۔'' عمران نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

میڈم نے چند لمحے توقف کر کے کہا۔ ''ہاں...... میں دے سکتی ہوں مگر پہلے یہ تو کلیئر ہو جائے کہ ذمے داری کس پر آتی ہے۔ مجھے تھوڑا سا ٹائم دو۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں، کچھ بھی تم سے چھپاؤں گی نہیں۔''

میڈم نے تسلی تشفی کی کچھ اور باتیں کیں۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اس معاملے کو وقتی طور پر ٹالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

ہمیں تہ خانے سے واپس انیکسی میں پہنچا دیا گیا۔ تاہم ہم اندازہ لگا سکتے تھے کہ اب انیکسی کے اردگرد گارڈز موجود ہیں اور وہ پوری طرح چوکس بھی ہیں۔ دیوہیکل السیشین کتا بھی انیکسی کے سامنے چکرا رہا تھا۔

سلیم کی موت نے اقبال کو بھی بہت دکھی کیا تھا۔ اس کی ٹانگوں کی تکلیف اس دکھ میں جیسے دب کر رہ گئی تھی۔

وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے سلیم کی میت دیکھی ہے یار! وہ سر کے بل گرا ہے۔ اوپر سے خود چھلانگ لگانے والا کبھی ایسے نہیں گرتا۔ اس حرامزادی نے اسے قتل کیا ہے۔''

عمران نے اشارے سے اسے یاد دلایا کہ یہاں ان کی گفتگو سنی جاتی ہے۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''اقبال ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے کھڑکی سے نیچے کی طرف آنے والی پرچھائیں دیکھی تھی۔ وہ کسی بے جان شے کی طرح نیچے آیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ گرتے وقت وہ ہوش میں ہی نہ ہو۔''

''ان باتوں کا پتا تو پوسٹ مارٹم سے ہی چل سکتا ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''لیکن اس کا پوسٹ مارٹم کس نے ہونے دینا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میڈم صفورا، سلیم کے وارثوں کی طرف ہی گئی ہے۔ وہ ہمدردی جتا کر اور رقم وغیرہ دے کر ان کے منہ بند کر دے گی اور ہو سکتا ہے کہ اسے جلد سے جلد دفنانے کے لیے بھی دباؤ ڈالا جائے۔''

عمران کا اندازہ درست تھا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد میڈم صفورا، کالی عینک پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ سفید کپڑوں میں ایک دراز قد شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ شکل وصورت سے کوئی پولیس افسر یا ایجنسی کا آدمی لگتا تھا۔ وہ تو برآمدے کی طرف چلا گیا، میڈم سیدھی ہماری طرف آ گئی۔ اس نے عمران سے کہا۔ ''اگر تم سلیم کے جنازے میں شریک ہونا چاہو تو گاڑی اور ڈرائیور باہر پورچ میں موجود ہیں۔ شام سات بجے اس کی آخری رسوم ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' عمران نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم جائیں گے۔''

''لیکن اقبال کو نہ ہی لے جاؤ تو بہتر ہے۔ اسے چلنے میں دشواری ہو گی۔'' میڈم نے مشورہ دیا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''اس معاملے کو سنبھالنے کے لیے کافی کوشش کرنا پڑی ہے۔ میں خود سلیم کے گھر گئی تھی۔ اس کی بیوی اور بھائی وغیرہ کو یہی بتایا ہے کہ چند دن پہلے کچھ لوگ سلیم کو زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے تھے۔ ان سے اس کا کوئی لین دین کا تنازع تھا۔ ہم اپنے طور پر اسے ڈھونڈنے میں لگے رہے، آپ لوگوں کو بھی نہیں بتایا کہ آپ پریشان ہوں گے۔ کل وہ لوگ اسے خود ہی بس اڈے پر چھوڑ گئے۔ انہوں نے سلیم پر تشدد کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے سر پر ضرب آئی۔ وہ ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ آج کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگا تھا کہ توازن کھو کر گر گیا۔''

عمران خاموش رہا۔ میڈم بھی ''گائیڈ لائن'' دے کر خاموش رہی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں ہمیں ہدایت دے رہی تھی کہ ہمیں اپنی زبانیں بند رکھنی ہیں اور سلیم کے وارثوں

سے وہی کچھ کہنا ہے جو وہ بتا رہی ہے۔

ہم مسلم ٹاؤن میں واقع سلیم کے گھر پہنچے۔ سلیم کی لمبی چوڑی رشتے داری نہیں تھی۔ لاہور میں ایک بھائی کے علاوہ بس اس کے دو چار عزیز ہی تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں عرفِ عام میں ''معمولی'' کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سلیم کی پُراسرار موت کے حوالے سے کسی طرح کا کوئی سوال اُٹھاتا۔

اندر سے رونے دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سلیم سرکس میں ملازمت کرتا رہا تھا۔ لہٰذا سرکس سے تعلق رکھنے والے دو چار افراد بھی یہاں موجود تھے۔ یہ لوگ تعزیتی انداز میں عمران سے گلے ملے۔ ہم اندر گئے تو سلیم کی بیوی دھاڑیں مارتی ہوئی عمران سے لپٹ گئی۔

''ہیرو بھائی! میں برباد ہوگئی۔ میرا سب کچھ چھن گیا۔ میں کس کے سہارے زندہ رہوں گی؟''

سلیم کا چھ سات سالہ معصوم صورت بچہ بھی آنکھوں میں آنسو لیے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''میرا ابو کئی کئی دن گھر نہیں آتا تھا مگر جب بھی آتا تھا تو خوش باش ہوتا تھا۔ آج وہ چپ چاپ کیوں لیٹا ہے؟''

عمران نے اس سہمے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے ساتھ لگایا۔

بیوہ نے عمران کی قمیص اپنی مٹھیوں میں لی اور اسے ہلاتے ہوئے بلکی۔ ''ہیرو بھائی! وہ آج کل آپ سے ملتے تھے، آپ کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے آپ کو کچھ تو بتایا ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ان کو کس کی طرف سے ڈر تھا؟ وہ بہت پریشان تھے۔ اب ان کے مالک کہہ رہے ہیں کہ ان کا کسی سے لین دین کا جھگڑا تھا۔ کیا یہ بات سچ ہے۔ یا کچھ اور ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے؟''

پھر روتے روتے اس پر بے ہوشی سی طاری ہوگئی۔ عمران نے اسے سہارا دے کر نیچے چٹائی پر بٹھا دیا۔ عورتیں اسے پانی پلانے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک فریاد کناں عورت جو شاید سلیم کی بہن تھی، سلیم کا زخمی ماتھا چوم رہی تھی اور بین کر رہی تھی۔ ''تیرے ساتھ کیا ہوگیا بھائی! تجھے کس کی نظر کھا گئی؟ تیری تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔''

میں نے دل میں سوچا۔ تیرا بھائی دشمنی کی وجہ سے نہیں، دوستی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔ ایک سیاہ رات کو اس نے لال کوٹھیوں میں اپنے پُرانے دوستوں کو دیکھا اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ بس اس کی یہی خطا اسے دھیرے دھیرے قبر کی تاریکی کی طرف لے گئی۔

موقع پر موجود سلیم کے رشتے دار چہ میگوئیاں کر رہے تھے مگر ڈرے ہوئے بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سلیم جن لوگوں کے لیے کام کرتا تھا، وہ بہت زور والے ہیں اور ممکن ہے کہ سلیم

ان کے لیے کوئی غیر قانونی ڈیوٹی بھی انجام دیتا ہو۔ اس معاملے کو کھنگال کر وہ اپنے لیے اور مرنے والے کے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کیا تھا؟ یہ وہی ناانصافی تھی جو ہمارے معاشرے میں ہر جگہ روا رکھی جا رہی ہے۔ طاقتور کمزور کو دباتا ہے، اس کے لیے جینے کے راستے بند کرتا ہے۔ وہ ظلم کرتا ہے اور مظلوم کا مضحکہ بھی اُڑاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہاں ''کامن مین'' کے لیے انصاف تک پہنچنے کا راستہ جوئے شیر لانے سے ہزار گنا زیادہ دشوار ہے۔ میری ثروت اور اس کے ہنستے بستے گھرانے کے ساتھ بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ نے انصاف کے حصول کی معمولی سی کوشش کی اور انہیں موت وجلاوطنی کی کڑی سزائیں سنادی گئیں۔

ثروت کے اہلِ خانہ کا المیہ کوئی چھوٹا المیہ نہیں تھا۔ یہ المیہ ایک بڑے گھاؤ کی صورت میرے سینے میں مستقل جگہ بنا چکا تھا۔ یہ تو عمران کا سیلانی مزاج تھا اور اس کی طوفانی رفتار تھی کہ میں اس کے ساتھ بہا چلا جا رہا تھا کہ مجھے دنوں میں ہلاک کر دیتا۔ اب بھی میں جس وقت سیٹھ سراج اور اس کے ساتھی عارف خان وغیرہ کو دیکھتا تھا، میرے اندر ایسی سخت ٹوٹ پھوٹ مچتی تھی کہ خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں نے سلیم کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ دیکھا۔ حالات کا سفر کتنا غیر متوقع ہوتا ہے۔ جس رات سلیم نے لال کوٹھی میں عمران کو پہچانا تھا اور اسے میڈم نادیہ کے خطرناک جنسی رویے سے بچا کر باہر نکال دیا تھا، اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کی یہ حرکت دراصل اس کی موت کے سفر کا آغاز بننے والی ہے۔

ہم سلیم کو مسلم ٹاؤن کے ایک نیم تاریک قبرستان میں دفنا کر اور اس کی قبر کا چھڑکاؤ کر کے واپس آ گئے لیکن وہ جیسے بدستور ہمارے پیچھے رہا۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا وہ ایک سوالیہ نشان کی طرح ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ ہم سے پوچھتا رہا۔ ''کیا تم میرے خون کا حساب نہیں لو گے؟ کیا تم بھی میری اذیت ناک موت کو بھول جاؤ گے؟ میرے دوستو! مجھے تمہارے ہاتھوں سے چھینا گیا اور بیدردی سے مارا گیا ہے۔ اس جنونی عورت نے بڑی سفاکی سے میری ایک ایک رگ سے جان کشید کی ہے۔ میری بدقسمتی کہ تم مجھے بچا نہیں سکے لیکن کیا اب تم میرے لیے انصاف بھی حاصل نہیں کر سکو گے؟''

تیسرے روز میڈم صفورا نے اس معاملے پر ہم دونوں سے لمبی چوڑی میٹنگ کی۔ وہ اکیلے میں عمران سے بات کرنا چاہتی تھی مگر عمران نے مجھے بھی اپنے ساتھ رکھا۔ بظاہر میرے ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن وہ جان بوجھ کر مجھے ساتھ رکھتا تھا۔ جیسے ہر معاملے میں

میری تربیت کا خواہاں ہو۔ کم از کم میری سمجھ میں تو یہی بات آتی تھی۔

آج میڈم کا رویہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی کہ سلیم کی موت کیسے واقع ہوئی۔ وہ اس پر بھی اصرار نہیں کر رہی تھی کہ اس نے خود ہی چھلانگ لگائی ہے۔ وہ اس قضیے کو ایک طرف رکھ کر ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب اس کی گہرائی میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بین السطور وہ ہمیں یہ بھی بتا رہی تھی کہ اسے نادیہ سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں ہے اور وہ اسے کسی بھی سچے یا جھوٹے الزام سے بچانے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قیمت دے سکتی ہے۔

اس نے کہا۔ ''عمران! جو کچھ بھی ہوا بہت بُرا ہوا۔ اگر ہم چاہیں تو بال کی کھال بھی اُتار سکتے ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ اس کے باوجود ہمیں کچھ بھی نہ ملے۔ میں نے اپنے طور پر پوری انویسٹی گیشن کی ہے۔ یہاں کسی چیز کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ یہ بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ سر کی چوٹ کے سبب سلیم ٹھیک طور سے کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اپنی جان نہ لی ہو، وہ کھڑکی کے پاس گیا ہو۔ کسی کو پکارنا چاہتا ہو مگر توازن کھو کر گر گیا ہو۔ میں ''بریفلی'' یہ کہوں گی کہ کیوں نہ ہم ایک ایسا راستہ اختیار کریں جو سب کے لیے بہتر ہو۔ بے شک زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی لیکن مادی نقصانات کا مداوا تو کسی نہ کسی حد تک کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اپنی نئی اسکیم میں کنال کنال کے دو پلاٹ سلیم کی بیوہ کے نام کر دیئے ہیں۔ مارکیٹ میں ان کی قیمت اب بھی ڈیڑھ کروڑ سے کم نہیں۔ اسے 25 لاکھ روپیہ نقد دیا ہے اور ہاں...... کسی طرح کا شک ذہن میں نہ رکھنا۔ یہ سب کچھ حق حلال کی کمائی سے ہے۔ میں اور میرے مرحوم شوہر نے رئیل اسٹیٹ کے کام میں اپنا بہت سا خون پسینہ ایک کیا ہے۔''

عمران اب بھی خاموش تھا۔ اس کے بعد میڈم نے ایک اور کام کیا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ کھولا اور بولی۔ ''دیکھو عمران! تمہارے دوست سلیم کی موت سے تم تینوں کا نقصان بھی تو ہوا ہے۔ میں ایک بار پھر کہتی ہوں کہ زندگی کا کوئی نعم البدل نہیں ہے مگر Compenation تو ہوتی ہے نا اور میں یہ کرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے چیک بک نکالی۔ اس میں سے ایک چیک سائن کیا اور یہ بلینک چیک عمران کے سامنے تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ اُٹھی اور خاموشی سے چلی۔

عمران اور میں خالی خالی نظروں سے چیک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت مالدار عورت تھی۔ ہم اس چیک پر کوئی رقم بھی بھر لیتے، اُمید تھی کہ وہ کیش ہو جائے گی۔ ایک طرح

سے یہ چیک اس نہایت مشکل کام کا معاوضہ بھی تھا جو عمران نے میڈم صفورا کے لیے کیا تھا۔ یعنی فاسٹنگ بدھا کو صدیقی کی تحویل سے نکالنا۔

یہ چیک اگلے روز تک یونہی شیشے کی تپائی پر پڑا رہا۔ پھر میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے اُسے اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ عمران نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی غم و غصے کی کیفیت ماند پڑنے لگی۔ اگلے روز اس نے کھانا بھی کھایا اور ہلکے پھلکے انداز میں دو چار باتیں بھی کیں لیکن کیا وہ اندر سے واقعی سنبھل رہا تھا؟ یہ سوال خاصا اہم تھا۔ اس کی ظاہری حالت سے اس کی دلی کیفیت کے بارے میں جاننا اس کے نہایت قریبی ساتھیوں کے لیے بھی دشوار ہوتا تھا اور میرا تو اس کے ساتھ تعلق بھی بہت پُرانا نہیں تھا۔

میں نے اقبال سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، کیا عمران نے واقعی یہ صدمہ سہہ لیا ہے؟''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔'' اقبال نے بھی گول مول جواب دیا۔

میں اور اقبال باہر لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اقبال کی ٹانگوں کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ ایک اسپیشلسٹ ڈاکٹر روزانہ اسے دیکھنے کے لیے آ رہا تھا۔

''کہیں وہ کوئی انتقامی کارروائی تو نہیں کرے گا؟'' میں نے اقبال سے پوچھا۔

''میرے خیال میں نہیں اور اس کی وجہ تم ہو۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''میں؟''

''ہاں...... تم اس وقت ہمارے ساتھ ہو۔ عمران ہرگز نہیں چاہے گا کہ وہ اس کشیدہ معاملے کو اور زیادہ کشیدہ کر دے۔ کیونکہ ایسا ہوگا تو اس کا اثر تم پر اور تمہاری فیملی پر بھی پڑے گا۔ اس لحاظ سے میں تو سمجھتا ہوں کہ نادیہ اُلو کی پٹھی کی قسمت اچھی ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو۔ ورنہ ہم لنڈورے تو کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ہاں...... ایک بات کا امکان اب بھی ہے۔'' اقبال مدھم آواز میں بولا۔

''وہ کیا؟''

''وہ کسی اور طریقے سے اس کو قرار واقعی سزا دلا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔'' اقبال کا لہجہ معنی خیز تھا۔

اقبال کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس سے پہلے سیٹھ سراج کے ایکسیڈنٹ والی مثال میرے سامنے تھی۔ وہ ایک چھوٹے پیمانے کی کارروائی تھی مگر عمران نے اس طرح کی تھی کہ نہایت خوفزدہ و پریشان ہونے کے باوجود میں نے بھی دلچسپی محسوس کی تھی۔ کیا اب بھی وہ

ایسا ہی کچھ کرسکتا ہے؟ کیا واقعی اس کے پاس قابلِ اعتماد دوستوں کا کوئی ایسا سیٹ اپ موجود ہے جن کے ذریعے وہ بوقتِ ضرورت کسی بھی شخص کو مصیبت میں ڈال سکتا ہے؟ کیا وہ یہاں بھی اس سیٹ اپ کو حرکت میں لانے کی ہمت کرے گا؟

اس آخری سوال کا جواب خاصا مشکل تھا۔ سیٹھ سراج کے خلاف ایک معمولی نوعیت کی کارروائی کی گئی تھی مگر یہاں لال کوٹھیوں میں ایک گمبھیر صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ چھوٹی میڈم نادیہ سفاکانہ طریقے سے ایک قتل کی مرتکب ہو چکی ہے۔ اب اگر نادیہ کو سزا دینے کی بات ہوتی تو پھر اس معاملے کو بہت آگے تک چلے جانا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ عمران اس موقعے پر اس طرح کا بڑا رسک لے گا۔

وہ آج صبح سے میڈم کی فراہم کردہ ٹویوٹا کار لے کر نکلا ہوا تھا۔ اس نے بتایا بھی نہیں تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ بس میرا اندازہ تھا کہ وہ ثروت اور ناصر بھائی کے ایڈریس کے سلسلے میں حاجی صاحب سے ملنے بھی جائے گا۔

شام کو میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ واپس آیا تو اس کے پاس وہ اکاؤنٹ نمبر اور ایڈریس موجود تھا جہاں حاجی صاحب نے قریباً ایک لاکھ یورو کا پے آرڈر ارسال کرنا تھا۔ یہ فرینکفرٹ جرمنی کا ایڈریس تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس بینک اکاؤنٹ سے ناصر بھائی کی قیام گاہ کا سراغ بھی لگایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ طویل عرصے بعد یہ پہلی حقیقی مسرت تھی جو مجھے حاصل ہوئی۔ حاجی صاحب کے ساتھ عمران کی جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے معلوم ہوا تھا کہ ثروت کی منگنی تو ہو چکی ہے مگر شادی کا پروگرام ابھی طے نہیں ہوا۔

عمران کا پاسپورٹ تو موجود تھا مگر مجھے پاسپورٹ کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، تقریباً ہر چھوٹے بڑے محکمے میں عمران کی کوئی نہ کوئی واقفیت نکل ہی آتی تھی۔ وہ پاسپورٹ کے دفتر سے بھی ہوتا ہوا آیا تھا۔ اس نے بتایا۔ ”کل ہم جائیں گے۔ ہمیں لائن میں لگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہمارے جانے تک فارم تقریباً تیار ہوگا اور پاسپورٹ فیس بھی جمع ہو چکی ہوگی۔ بس تمہارے شناختی کارڈ کی ضرورت ہے۔“

”مگر شناختی کارڈ تو گھر میں ہے۔“

”وہ بھی میں لیتا آیا ہوں یار! والدہ کی خیر خیریت بھی پوچھ آیا ہوں۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہیں بلکہ پورا گھر بیتاب ہے۔ کل پاسپورٹ آفس سے واپسی پر ان سے تمہاری ملاقات طے ہے۔ اس کے علاوہ تمہاری پسندیدہ ڈش قیمہ کریلے اور بریانی وغیرہ کا لنچ بھی فائنل ہے۔“ اس نے شناختی کارڈ میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کا ہر کام طوفانی انداز کا ہوتا تھا۔ برق رفتار اور اندھا دھند جیسے یہ دنیا ایک بہت بڑا کنواں تھی اور وہ ہر وقت اس میں موٹر سائیکل چلاتا تھا۔

اگلے روز ہم نے ارجنٹ پاسپورٹ اپلائی کیا ہے۔ خرچے کے لیے میرے پاس وافر پیسے موجود تھے یہ وہی ”دو...... چھ“ کے کھیل والی انعامی رقم تھی۔ پاسپورٹ آفس سے فارغ ہو کر ہم اس رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں عمران نے میرے اہلِ خانہ کو ٹھہرایا ہوا تھا۔ یہ عمارت ڈیفنس میں واقع تھی۔ میری سانس تیز چل رہی تھی اور دھڑکنیں زیروزبر ہونے لگی تھیں۔ آج کئی ماہ بعد آخر وہ دن آ گیا تھا جب میں اپنے گھر والوں کے رُوبرو ہونے لگا تھا۔ محبت، خوشی، ندامت، دُکھ بہت سے جذبات میرے اندر گڈمڈ ہو رہے تھے۔ راستے بھر عمران نے مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں زیادہ ٹینس ہو جاؤں۔

ایک پُرسکون جگہ پر درختوں اور پھولوں میں گھری وہ ایک خوبصورت کوٹھی تھی۔ گیٹ پر باوردی گارڈ نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی ریٹائرڈ فوجی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔ عمران گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔ پورچ میں بھی ایک سادہ پوش گارڈ موجود تھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ میں نے ذرا دھیان سے دیکھا تو یہ عمران کا وہی آصف نامی ساتھی تھا جس نے عمران کے گھر ہماری غیر موجودگی میں قادر لمبے کی حفاظت و نگرانی کی تھی۔

والدہ، فرح اور عاطف بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے میرا ملاپ ناقابلِ فراموش اور نہایت رقت آمیز تھا۔ اس ملاپ کی کیفیت میں شاید لفظوں میں بیان نہ کر سکوں۔ فرح مجھ سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ والدہ مسلسل میری پیشانی پر بوسے دیتی جا رہی تھیں۔

اگلا ایک ڈیڑھ گھنٹہ جیسے پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ بہت سی باتیں ہوئیں پھر بھی بہت سی ادھوری رہ گئیں۔ والدہ مجھے اور عمران کو ایک ساتھ دیکھ کر جیسے نہال ہو رہی تھیں۔ عمران چند ہی دنوں میں جیسے اس گھر کا ایک فرد نظر آنے لگا تھا۔ والدہ اسے بڑی روانی سے بیٹا اور فرح ...... بھائی عمران کہہ کر پکار رہی تھی۔ یہ سب لوگ جیسے عمران کے سحر میں گرفتار تھے۔ مجھے ایک طرح کا حسد محسوس ہوا لیکن سچی بات ہے کہ اس حسد کے اندر خوشی بھی پوشیدہ تھی۔

عاطف، عمران کی چوٹوں کے بارے میں بار بار پوچھ رہا تھا۔ عاطف کے سوال کے جواب میں عمران نے کہا۔ ”یار! میرا تو کام ہی چوٹوں کا ہے۔ تمہیں کہا تو ہے کہ کسی دن سرکس آؤ اور تماشہ دیکھو۔ تمہیں پتا چلے گا کہ وہاں ہمارے لیے کیسی کیسی کلاسیکل چوٹوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔ کوئی بھی فنکار اس سہولت سے محروم نہیں ہے۔ کوئی موت کے کنوئیں میں اوندھے منہ

کر مزے لے سکتا ہے، کسی کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے آنے کی آس ہوتی ہے۔ کسی کو بپھرے ہوئے شیر سے چھچھی ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔''

''مگر بھائی! آپ کو اتنی سخت چھچھی کس نے ڈالی ہے؟'' فرح نے عمران کے چہرے کی خراشوں اور نیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ساری باتیں تمہیں یہیں بتا دوں گا تو پھر تم شو دیکھنے کیسے آؤ گی؟'' عمران نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بزرگانہ انداز میں کہا۔

والدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ مجھے علیحدہ کمرے میں لے گئیں۔ انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھامے۔ ''امی! کیوں گناہگار کر رہی ہیں۔''

''میں ہوں نا گناہگار مجھے پتا ہے کہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ شاید انہی غلطیوں کی سزا مجھے اور ہم سب کو ملی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ تُو ثروت کو بھول سکتا ہے۔ وہ بھی اپنی علیحدہ زندگی شروع کر سکتی ہے۔ یہ میری غلطی تھی۔ کاش میں نے اس وقت تمہاری بات سمجھ لی ہوتی۔ پر اب بھی کوشش ہو سکتی ہے۔ عمران بیٹے نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ناصر جرمنی میں ہے۔ اس کا ایڈریس بھی پتا چل گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں ثروت کی بات وغیرہ تو طے ہو گئی ہے لیکن شادی کے بارے میں ابھی کوئی تاریخ طے نہیں ہو سکی۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی تین چار مہینے اور لگ جائیں۔ تم مجھے کسی طرح ایک بار صرف ایک بار ناصر اور ثروت سے ملا دو۔ تیری خوشی کے لیے میں ان کے سامنے اپنی جھولی پھیلا دوں گی۔'' وہ بول رہی تھیں اور روتی چلی جا رہی تھیں۔

میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ ''امی! آپ بس دعا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مگر اب اس کام میں زیادہ دیر نہ کرو۔ میں نے عمران سے بھی یہی کہا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا بنتے ہی یہاں سے چلے جاؤ۔ بس کسی طرح ایک بار فون پر ہی ناصر سے میری بات کروا دو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔ سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔''

میں نے والدہ کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ بھائی بہن کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیں۔ مجھے یوں لگا کہ دل کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ عمران مختصر طور پر میرے اہلِ خانہ کو بتا چکا تھا کہ سیٹھ سراج کے ساتھ میری کس طرح کی ٹینشن شروع ہوئی تھی اور اس ٹینشن کی وجہ سے میرا کچھ عرصہ گھر سے دور رہنا کیوں ضروری ہے۔ اہلِ خانہ عمران کی ہر وضاحت سے مطمئن نظر آتے تھے۔ وہ واقعی ہر کسی کو قائل کر لیتا تھا۔

رخصت ہونے سے پہلے میری بہن فرح نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور نم ناک آنکھوں سے بولی۔ ''بھائی! پچھلے ماہ باجی ثروت کا ایک خط آیا تھا۔ اس لفافے پر بھیجنے والے کا ادھورا سا ایڈریس لکھا ہوا تھا اور یقیناً وہ بھی فرضی تھا۔ باجی نے اپنی مجبوریاں لکھی تھیں اور وہ حالات لکھے تھے جن کی وجہ سے انہیں اچانک جانا پڑا۔ اس لفافے میں ایک خط آپ کے نام بھی تھا۔'' فرح نے مٹھی میں دبا ہوا ایک تہ شدہ کاغذ مجھے تھما دیا۔ میری رگوں میں لہو سنسنا اُٹھا۔ میں نے کھول کر دیکھا، یہ ثروت کی جانی پہچانی تحریر تھی۔ بے ساختہ میری نگاہیں الفاظ پر پھسلنے لگیں۔ ثروت نے لکھا تھا۔

''السلام علیکم...... تابی! میں جانتی ہوں کہ تمہیں بہت بڑا دُکھ دے کر گئی ہوں۔ بغیر تمہیں بتائے، بغیر الوداع کہے ہمیشہ کے لیے تمہیں چھوڑ گئی ہوں۔ اس دُکھ کے لیے تم سے معافی مانگتی ہوں۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی محبت ہے تو اس محبت کے صلے میں مجھے معاف کر دینا۔ میرے بس میں کچھ نہیں تھا تابش! میں وہی کر سکتی تھی جو میں نے کیا اور ناصر بھائی بھی وہی کر سکتے تھے جو انہوں نے کیا۔ میری بدنامی کے اشتہاروں نے ہم سب کے لیے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔

یہاں بھائی نے میرے لیے لڑکا ڈھونڈ لیا ہے۔ اس کا نام یوسف ہے۔ راولپنڈی کا رہنے والا ہے۔ ہماری انگیجمنٹ ہو گئی ہے۔ وہ بہت سادہ مزاج اور دل کا صاف ہے میں ڈرتی ہوں کہ مجھے اس کے ساتھ جھوٹ کی زندگی نہ گزارنا پڑے۔ لیکن میں جن حالات سے گزری ہوں وہ اتنے سنگین ہیں کہ میں ان کے بارے میں یوسف کو بتا بھی نہیں سکتی۔ بہرحال کوئی اچھا وقت آیا تو ہو سکتا ہے کہ تھوڑا بہت بتا بھی دوں۔ فی الوقت خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے نئے راستے پر چلنے کا حوصلہ اور ہمت بخشے۔

میں جانتی ہوں تابی! ابھی تمہارے زخم ہرے ہیں۔ بہت تکلیف ہو رہی ہو گی لیکن وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ جلد ہی دُکھ کی یہ شدت برقرار نہیں رہے گی اور پھر دیکھنا زندگی خود ہی جینے کا راستہ ڈھونڈ لے گی۔ مجھے پورا یقین ہے، تمہاری زندگی میں کوئی بہت...... بہت اچھی لڑکی آئے گی۔ وہ مجھ سے کہیں بڑھ کر تمہارا خیال رکھے گی۔ تمہارے سارے دُکھ اپنی پلکوں سے چن لے گی۔ میں نے تمہارے لیے اللہ سے رو رو کر مانگا ہے اور سب کہتے ہیں کہ وہ ٹوٹے

ہوئے دلوں کی دعا سنتا ہے۔
جو کچھ ہوا ہے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تابش! میری واپسی کی آس نہ رکھنا اور نہ مجھ بدقسمت کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنا کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے کو بس اپنی نیک تمناؤں میں یاد رکھیں گے۔ خدا حافظ۔"

○......❖......○

ہم لال کوٹھیوں میں تین دن مزید رہے۔ اس دوران میں عمران کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سلیم کی موت کا دُکھ وہ پی گیا ہے۔ میڈم صفورا نے نادیہ سے بھی ہم تینوں کی ملاقات کرا دی تھی۔ اس ملاقات میں نادیہ نے یہ تو ہرگز تسلیم نہیں کیا کہ وہ سلیم کے قتل کی ذمے دار ہے تاہم اس نے اس بات پر معذرت ضرور کی تھی کہ اس کی وجہ سے سلیم ناگہانی موت کا شکار ہوا۔ ایک موقع پر اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ عمران اسے سلیم کی موت کا ذمے دار سمجھتا ہے تو اس کے خلاف کیس درج کرا دے۔ وہ پولیس تفتیش میں پورا پورا تعاون کرے گی اور اس سلسلے میں ذرا سا رنج بھی دل میں نہیں رکھے گی۔

ظاہر تھا کہ یہ سب منہ زبانی باتیں تھیں اور یہ باتیں بھی وہ یقیناً میڈم صفورا کی ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔ آخر میں وہ بولی۔ "جو غلطی مجھ سے ہوئی ہے، میں اس کو بالکل تسلیم کرتی ہوں اور اس کے لیے آپ لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگتی ہوں۔ میرے کہنے پر سلیم کو مارا پیٹا گیا تھا اور یہ خاصی سخت مار پیٹ تھی۔ دراصل میرا رویہ سلیم کے ساتھ کوئی خاص نہیں تھا۔ میں اپنے ملازموں کو ویسے تو خوش رکھتی ہوں مگر ان کی دھوکا دہی سے مجھے ہمیشہ بہت چڑ رہی ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر یہ نہیں۔ بس جو کچھ ہوا اسی وجہ سے ہوا۔"

اس ملاقات میں عمران کا رویہ خاصا نرم رہا۔ اس نے نارمل انداز میں دونوں بہنوں سے باتیں کیں۔ اگلے تین روز میں حالات کافی حد تک معمول پر آ گئے۔

میڈم صفورا کو اندیشہ تھا کہ اس دوران میں شاید صدیقی بھی لال کوٹھیوں کا چکر لگائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ قدرتی طور پر حالات ایسے ہوئے تھے کہ صدیقی کا دھیان "فاسٹنگ بدھا" کی چوری کے سلسلے میں مکمل طور پر ایک دوسری پارٹی کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو لاہور میں بھی اسے پریشان کرتے رہے تھے۔ یہ کون تھے؟ ان کی تعداد کیا تھی اور ان کا رویہ کیسا تھا؟ اس بارے میں ابھی میڈم اور عمران کو بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔

اقبال کے زخموں کی حالت اب کافی اچھی تھی۔ میڈم چاہتی تھی کہ اب ہم لال کوٹھیوں سے کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ وہ ہمیں رہائش وغیرہ کی بہترین سہولتیں فراہم کرنے کے لیے تیار تھی مگر عمران کا ارادہ واپس اپنے دس مرلے کے مکان میں جانے کا تھا جو راوی روڈ پر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے وہاں زیادہ اطمینان و سکون کے لمحات میسر ہوں گے۔

اس روز رات کو ہم لال کوٹھیوں سے واپس راوی روڈ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ جانے سے پہلے میڈم صفورا نے بڑی گرم جوشی سے ہمیں الوداعی ڈنر دیا۔ اس میں نادیہ اور سیٹھ سراج بھی موجود تھے۔ سیٹھ سراج کی صورت مجھے ہمیشہ اعصابی تناؤ میں مبتلا کر دیتی تھی۔ وہ ایک عیاش نو دولتیا تھا۔ ہڑپہ میں زلیخا کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق اب ہمارے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی اور یہ تو فقط ایک مثال تھی۔ ایسی نہ جانے کتنی مثالیں اس کے کھاتے میں موجود تھیں۔ ایسے باپ کا بیٹا واجی جیسا ہی ہو سکتا تھا۔ اس الوداعی ڈنر میں مَیں نے پہلی بار نادیہ کو ہوش و حواس میں دیکھا۔ اس نے ڈرنک نہیں کی تھی۔ اس کا لباس بھی بیہودہ نہیں تھا۔ وہ عمران کے ساتھ لگاوٹ سے باتیں کرتی رہی۔

ہم راوی روڈ واپس آ گئے۔ میں عمران کو ثروت کے خط کے بارے میں تین روز پہلے ہی بتا چکا تھا۔ عمران نے بھی یہ خط پڑھا تھا اور اس کی سطروں میں کروٹ لیتے ہوئے بے پناہ درد کو محسوس کیا تھا۔ درحقیقت اس خط کو پڑھنے کے بعد میرے اندر ثروت کو ڈھونڈنے اور اس تک پہنچنے کا ارادہ مزید مضبوط ہوا تھا۔ عمران کے احساسات بھی ایسے ہی تھے۔ میں ثروت کے خط کو درجنوں بار پڑھ چکا تھا اور ہر بار خط مجھے ماضی کے دھندلکے میں لے گیا تھا۔ جب لاہور کے گلی کوچے، سبزہ زار اور ریستوران ہماری محبت کے گواہ تھے۔ ہم ایک دوسرے کی دید کی گھڑیاں گن گن کر گزارتے تھے۔ محبت کا موسم، خوش رنگ تہوار اور ملن کے دیگر مواقع محبت کے زینوں جیسے تھے۔ ہم ان زینوں پر پاؤں دھرتے اوپر اُٹھتے جا رہے تھے۔ ہماری باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی مگر ایک عید کے موقع پر بات پکی ہو گئی تھی۔ نشانی کے طور پر انگوٹھی وغیرہ بھی پہنائی گئی تھی۔ اندازاً ڈھائی سال بعد شادی طے ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے ثروت کو گن کر بتایا تھا کہ ڈھائی سال میں تقریباً 128 ہفتے ہوتے ہیں۔ یعنی ہماری شادی قریباً 128 ہفتے بعد ہو گی۔ اب یہ "ہفتوں کی بات" ہے۔ یہ بات ثروت کو دلچسپ لگی تھی۔ پھر ایک موقع پر میں نے اس کی ایک فائل دیکھی تو اس میں ایک صفحے پر بہت سی سرخ لکیریں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ سرخ لکیروں کو سبز بال پوائنٹ سے کاٹا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔
'یہ کیا ہے؟"

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ یہ 128 ہفتوں کی لکیریں ہیں۔ ہر ہفتہ گزرنے کے بعد میں ایک لکیر کاٹ دیتی ہوں۔ اب صرف 55 لکیریں باقی رہ گئی ہیں۔

ہاں...... وہ ایسی ہی محبت بھری دیوانگی کے دن تھے۔ ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہماری شادی کا درمیانی وقت ایک دم بھاپ بن کر اُڑ جائے اور ہم ملن کی گھڑی کو اپنے رُوبرو دیکھیں۔ وقت بھاپ بن کر تو نہیں اُڑا تھا مگر پل پل سرکتا رہا تھا اور ہم اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ پھر وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ چند اوباشوں نے اپنے شر کی چنگاریوں سے ایک ہنستی بستی خوشبودار بستی کو جلا کر راکھ کر ڈالا۔ سرخ لکیریں جو کوئی بڑے شوق کے ساتھ سبز روشنائی سے کاٹتا تھا، کینسر کے جرثوموں کی طرح ایک دم بڑھتی چلی گئیں اور اب انتظار کے کاغذ پر جدائی کی سرخی کے سوا کچھ باقی ہی نہیں بچا تھا۔

اب تک کا وقت میں نے پتا نہیں کیسے گزار لیا تھا مگر اب جبکہ میں نے پاسپورٹ کے لیے اپلائی کر دیا تھا اور عمران ویزے کے حصول کی تیاری کر رہا تھا، ایک دم ہی میری اندرونی بےقراری بڑھنے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ درمیانی مراحل جلد سے جلد طے ہوں اور میں ثروت کی تلاش میں فرینکفرٹ پہنچ جاؤں۔

عمران کے ہاتھ کی چوٹ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود وہ شام کو سرکس چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ عمران نے موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے کا مظاہرہ کیا اور سینکڑوں افراد سے داد وصول کی۔ شاہین کے ساتھ عمران کی ملاقات بھی دلچسپ تھی۔ دونوں میں زبردست نوک جھوک ہوئی۔ شاہین کو شکوہ تھا کہ عمران اتنے روز اسے بتائے بغیر غائب رہا ہے اور اس کا سیل فون بھی بند رہا ہے۔ عمران نے ایک بار پھر بے پَر کی اُڑائی۔ ”تمہیں بتایا تو تھا ڈارلنگ کہ ریما جی کی پیشکش کو ٹھکرانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ انہوں نے اتنی محبت سے اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر کی تھی کہ اگر میری عمر اسّی نوے سال بھی ہوتی تو بھی ایک بار تو میں ضرور سرگرم بلکہ سراسر گرم ہو جاتا۔“

”اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”بھئی...... وہی فلم کا کام۔ فلم اندھی لڑکی میں میرا رول کافی اہم ہے۔ ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی کام کر رہا ہوں۔ ایبٹ آباد میں سات آٹھ روز شوٹنگ ہوئی ہے۔ اب لاہور میں ریما جی کے گھر پر آٹھ دس روز کا ایک اسپیشل ہے۔ ریما جی تو کہتی ہیں کہ میں شوٹنگ کے دوران میں ان کے گھر ہی رہ لوں۔ آنے جانے میں جو وقت خرچ ہوتا ہے وہ بچے گا لیکن مجھے

یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔“ عمران نے مشورہ طلب نظروں سے شاہین کو دیکھا۔

”کیوں اچھا نہیں لگ رہا؟“ شاہین نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”فلم کے ہیرو صاحب جو کافی بزرگ ہیں، پہلے ہی مجھ سے کچھ خار کھا رہے ہیں۔ اگر میں مستقل طور پر ریما جی کا فائیو اسٹار مہمان بن گیا تو وہ غصے میں فلم ہی چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد مجھے پتا ہے کہ کیا ہوگا۔ ریما جی کہیں گی کہ میں ہی ہیرو کی جگہ لے لوں۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اسکرپٹ کے مطابق آدھی فلم میں تو ریما جی کو موٹر سائیکل پر ہیرو کے پیچھے بیٹھے رہنا ہے اور وہ جس طرح سے چپک کر بیٹھتی ہیں۔ اللہ معافی...... اوپر سے بریکیں لگانے کی مصیبت۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ بریکیں لگانے سے میری بات سمجھ رہی ہو نا تم...... میں تو پرسوں ایبٹ آباد میں اسی وجہ سے ایکسیڈنٹ کر بیٹھا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ اسسٹنٹ عباس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ شاہین شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

”میں ہیرو صاحب کے ڈپلی کیٹ کے طور پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ ریما جی میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم سڑک پر جا رہے تھے کہ اچانک آگے ایک گدھی آ گئی۔ میں نے اس ڈر سے بریک نہیں لگائے کہ ریما جی عقب سے میرے ساتھ چمٹ جائیں گی مگر جو کچھ ہوا وہ زیادہ بُرا تھا۔ موٹر سائیکل گدھی کی پچھلی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ ہم دونوں کچی زمین پر گرے۔ ریما جی نیچے میں اوپر۔ بالکل فلمی پوز تھا۔ میرے سر پر تھوڑی سی چوٹ بھی لگی۔ ریما جی تو ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ ویسے بھی بڑی بے باک ہیں۔ کہنے لگیں۔ عمران! اس سے تو اچھا تھا کہ تم بریک ہی لگا لیتے۔“

”زبردست...... بہت فنی۔“ شاہین نے زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اور شاہین ڈیئر! یہ بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں کہ سر پر چوٹ لگنے سے کبھی کبھی بندے کا حافظہ وقتی طور پر ختم شد ہو جاتا ہے۔ ایک دو منٹ کے لیے تو مجھے بھی یاد نہیں رہا کہ ریما جی کے اوپر سے اُٹھنا ہے۔ ریما جی کو بھی شاید یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ تو ڈائریکٹر صاحب بھاگے ہوئے آئے اور انہوں نے ہمیں یاد دلایا کہ ہم موٹر سائیکل پر سے گر چکے ہیں۔“

شاہین تنک کر بولی۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے کہ تمہارا حافظہ ابھی تک متاثر ہے۔ ریما وغیرہ تمہارے ساتھ تھی ہی نہیں، تم اکیلے ہی گدھی سے ٹکرائے اور گدھی کے اوپر ہی گرے اور اس گدھی کی بُو ابھی تک تمہارے کپڑوں سے اور تمہاری بیہودہ باتوں سے آ رہی ہے۔“

پھر وہ اسسٹنٹ منیجر عباس سے مخاطب ہوئی۔ ”عباس صاحب! کل سے میں ان کے

ساتھ موٹر سائیکل پر انٹری نہیں دوں گی۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔''

اس کے بعد وہ گھومی اور پاؤں پٹختی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی۔ ''او بات تو سنو یار..... ہیلو.....ہیلو۔'' عمران اسے پکارتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔

عباس بولا۔ ''اب منانے اور ماننے میں آدھ پون گھنٹہ تو لگے گا ہی۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ روٹھنے کا جرمانہ بھی شاہین ہی دے گی۔ اسے کسی ریسٹورنٹ میں آئس کریم کھلائے گی یا کافی شافی پلائے گی۔''

''یہ تو واقعی زیادتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''روٹھو تو جیب بھی اپنی ہلکی کرو۔''

''بس یہ ان دونوں کا اسٹائل ہے لیکن ویسے فراخ دل ہے ہیرو بھائی! شاہین کے گھر والوں کا پورا خیال رکھتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں اس کے چھوٹے بھائی کی موٹر سائیکل ''جم'' سے چوری ہوگئی۔ عمران نے گھر میں خبر ہونے سے پہلے پہلے اسے نئی موٹر سائیکل لے دی۔''

شاہین اور عمران کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ شاہین کی آنکھیں سرخ تھیں۔ غالباً وہ روئی ہوئی تھی اور اب پہلے سے زیادہ نکھری ہوئی تھی۔ عباس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عمران نے آتے ساتھ ہی اعلان کیا۔ ''اُٹھو بھائی تابی! آج ڈنر گھر میں ہی کرنا ہے۔ شاہین ہمیں کھانا خود بنا کر کھلانے والی ہے۔ یہ دیکھو چکن بھی لے آئی ہے۔'' اس نے شاہین کے پھولے ہوئے شولڈر بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

گھر پہنچتے ہی شاہین نے کچن یوں سنبھالا جیسے وہ اس کا اپنا کچن ہو۔ اندازہ ہوا کہ وہ دو چار بار پہلے بھی یہ کچن استعمال کر چکی ہے۔ اس نے اپنے بال سمیٹ کر ایپرن باندھ لیا اور آستینیں اڑس لیں۔ عمران اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ تیزی سے کام کرتی ہوئی وہ دلکش نظر آتی تھی۔ یہ بات تو عیاں تھی کہ وہ عمران کو چاہتی ہے مگر عمران کی اندرونی پوزیشن کیا ہے، یہ وہ خود ہی بتا سکتا تھا۔

کھانا پکانے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کو بھی سنبھال رہی تھی۔ بستروں کی چادریں درست کر رہی تھی۔ بکھرے ہوئے برتن کچن میں پہنچا رہی تھی اور باقی اُکھاڑ پچھاڑ کو درست کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ عمران کی گھریلو ملازمہ کو بھی سخت سُست کہتی جا رہی تھی۔

کھانا شاندار تھا۔ اس نے بلیک پیپر اور شاشلک بنایا تھا۔ ساتھ میں کنگ سائز کوک تھی۔ ریستوران کا سا مزہ آ گیا۔ جب ہم کھانا کھا رہے تھے، دروازے پر دستک ہوئی۔ ''یہ کون بلا آ ٹپکی؟'' عمران بڑبڑایا۔

آنے والی بلا ہی تھی۔ عمران نے دروازہ کھولا تو سامنے چھوٹی میڈم نادیہ کھڑی تھی۔

ایک سادہ پوش گارڈ اس کے ہمراہ تھا جو اسے دروازے تک چھوڑ کر اور سیلیوٹ کر کے گاڑی میں واپس چلا گیا۔ ہم نادیہ کو یہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گئے۔ بہر حال وہ معقول حالت میں تھی۔ یعنی نشہ نہیں کیا ہوا تھا اور لباس بھی سلجھا ہوا تھا۔ اس نے ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی۔ کانوں میں ڈائمنڈ کے جھمکے تھے۔

''دیکھو عمران! کیسے شاندار وقت میں تمہیں پکڑا ہے۔'' وہ چہکی اور ناک سکیڑ کر کھانے کی خوشبو لی۔ پھر بولی۔ ''لگتا ہے کہ ہنرمند ہاتھوں نے کھانا بنایا ہے۔''

''ہاں......اس سے ملو، یہ ہے شاہین! میرے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔''

''اوہو......تو یہ ہے شاہین۔'' نادیہ نے ہونٹوں کو سکوڑ کر ''اوہو'' کی طویل آواز نکالی۔

''بھئی...... بڑی تعریف سنی ہے تمہاری۔'' اس نے مصافحے کے لیے شاہین کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''آیئے۔ آپ بھی کھانا کھایئے۔'' شاہین نے مصافحہ کر کے دعوت دی۔

''دعوت تم کس حیثیت سے دے رہی ہو؟ گھر والی کی حیثیت سے یا پھر......گھر آئی ہوئی کی حیثیت سے؟''

عمران چہکا۔ ''ابھی تو گھر آئی ہوئی ہے۔ آگے کا پتا نہیں۔ دراصل کرکٹ کے میچ کی طرح، رومانس کے میچ میں بھی آخری بال تک......یعنی شادی تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''جوڑی تو اچھی ہے۔'' نادیہ مسکرائی۔ تاہم اس مسکراہٹ کے پیچھے میں نے زہر کی لہر محسوس کی۔

''چائنیز پسند کرتی ہیں آپ؟'' شاہین نے جلدی سے پوچھا۔

''بھئی تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر تو مجھے کچھ بھی کھانا اچھا لگے گا۔ ویسے جو آپ کھا رہے ہو یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''یہ چائنیز ہی تو ہے۔'' عمران نے کہا۔

''اچھا...... یہ چائنیز ہے۔'' نادیہ کے لہجے کی تہ میں گہرا طنز تھا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا۔ اس جیسی عام لڑکی ایسا ہی چائنیز بنا سکتی ہے۔

شاہین کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ پلیٹ لینے کے بہانے جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

نادیہ کی آمد سب کو ہی ناگوار گزری تھی۔ ایک بے تکلف محفل کچھ کھچے کھچے ماحول میں بدل گئی۔ نادیہ جتنی دیر موجود رہی، اس کی زہر میں بجھی ہوئی نگاہیں شاہین کا طواف کر رہی تھیں

لیکن لب و لہجے کے نیچے گہرائی میں تیز نشتر کی سی چبھن تھی۔

شاہین کو جلدی جانا تھا اس لیے وہ چلی گئی۔ نادیہ بھی قریباً ایک گھنٹہ وہاں موجود رہی۔ اس نے عمران سے کہا کہ وہ راستے میں مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کی رنگ برنگی روشنیاں دیکھ کر آئی ہے۔ وہ شہر کے اس حصے کی طرف کبھی نہیں آئی۔ وہ ان جگہوں کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہے۔

عمران نے کہا۔ ''اب تو بہت دیر ہو چکی ہے پھر کسی دن سہی۔''

''پھر کسی دن کیوں؟ کل کیوں نہیں؟''

''چلو ٹھیک ہے۔'' عمران نے ٹالنے کے لیے کہا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ آنے سے پہلے فون کرے گی اور وہ کوئی بہانہ بنا دے گا۔

مگر ہوا یہ کہ اگلے روز وہ بغیر اطلاع کے ہی آ دھمکی۔ عمران ابھی شو سے واپس آیا ہی تھا اور نہا رہا تھا۔ آج بھی نادیہ نے نہایت قیمتی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہاف سلیوز میں سے اس کی بانہیں جگمگا رہی تھیں۔ عمران نے پس و پیش کیا لیکن وہ اڑی رہی۔ عمران کو جانا پڑا۔ اس کی واپسی رات کو قریباً ڈھائی بجے ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ کھانا وغیرہ بھی کھا کر آئے تھے۔ کچھ کھانا وہ پیک کروا کر بھی لائی۔ وہ کسی اونچے چائنیز ہوٹل کا کھانا تھا۔ شاید وہ ہمیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ ہوتا ہے چائنیز۔ وہ بازار کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی اور عمران سے کہہ رہی تھی کہ وہ لوگ اس گھٹن زدہ گرد آلود ماحول میں کیسے رہتے ہیں؟

تیسرے روز جب میں اور عمران پاسپورٹ لینے کے لیے مہران گاڑی پر نکلے تو بازار میں پہنچ کر ٹھٹک گئے۔ بازار کی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بڑی تیزی سے کام ہو رہا تھا۔ عمران نے ایک تھڑے کے قریب جا کر کار آہستہ کی۔ یہاں چاچا نذیر، تایا رحمت، ماسٹر تاج دین اور اس عمر کے دیگر حضرات بیٹھے تھے۔

عمران نے ماسٹر تاج دین سے پوچھا۔ ''ماسٹر جی! مبارک ہو۔ سڑک شروع ہو گئی۔''

ماسٹر جی نے کہا۔ ''تمہاری ہی مہربانی ہے بیٹا! پرسوں تمہاری سیکرٹری نے بتا دیا تھا سب کچھ۔ وہ تمہاری ہی سیکرٹری ہے نا؟''

''کون سیکرٹری؟'' عمران نے کار سے اُترتے ہوئے پوچھا۔

''بھئی...... وہی لال کار والی۔ مس نادیہ۔''

عمران ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''وہی جو تم نے کہا تھا۔ بول رہی تھی کہ عمران صاحب کی طرف سے خوشخبری ہے۔

پرسوں سے سڑک کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس وقت تو پورا یقین نہیں آیا تھا مگر اب آ گیا ہے۔ تمہارے بڑے احسان ہیں بیٹا ہم سب پر۔ اب کس کس کا شکریہ ادا کریں۔ ویسے تم نے کوئی دفتر وغیرہ کھولا ہے۔ میرا مطلب ہے یہ سیکرٹری؟''

''ہاں جی...... کچھ ایسا ہی ہے۔'' عمران نے گول مول جواب دیا۔

''ہماری کالونی میں سیوریج کا کام کب شروع کراؤ گے پتر جی؟'' چاچے نذیر نے کہا۔

''بب...... بس جلد ہی۔'' عمران گڑبڑایا۔

''دو ہفتے کا وعدہ کیا ہے تیری سیکرٹری صاحبہ نے۔ پوری کالونی کا گندا پانی گلیوں میں چلتا ہے۔ تیرا یہ احسان تو ہم مرتے دم تک نہیں بھولیں گے۔ اللہ لمبی عمر کرے تیری اور تیری سیکرٹری شادیہ کی۔''

''نذیرے! شادیہ نہیں نادیہ! ایک تو تُو ہر لفظ کا حلیہ تباہ کر دیتا ہے۔'' رحمت نے کہا۔

''کون بیاہ کر لیتا ہے؟'' بہرے نذیر نے کان پر ہاتھ دھرا۔

ایک نوجوان نے ہنس کر کہا۔ ''پاؤں قبر میں چلے گئے مگر چاچے کو آواز ''بیاہ'' اور ''شادیہ'' وغیرہ ہی کی آئے گی۔''

سب ہنس پڑے۔ عمران بھی اس ہنسی میں شریک ہوا اور پھر اُلجھا اُلجھا سا گاڑی میں بیٹھ گیا چند اور افراد بھی موقع پر آ گئے اور عمران کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کیا چکر چلا رہی ہے یہ اُلو کی پٹھی؟'' عمران مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''لگتا ہے کہ تمہیں متاثر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ کل کلاں وہ علاقے کے لوگوں میں نقد پیسے بانٹنا بھی شروع کر دے۔''

عمران نے گہری سانس لی اور ایک دم پُرسکون ہو گیا۔ ''چلو خلقِ خدا کا بھلا ہونا چاہیے۔ چاہے کسی طرح بھی ہو۔'' وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولا۔

''مگر اس کے بدلے جب وہ تم سے بلا کی طرح چمٹ جائے گی تو پھر......''

''چلو...... یہ بھی ایک نیا تجربہ ہوگا کہ بلا کیسے چمٹتی ہے۔''

''اتنی خوش فہمی میں بھی نہ رہو۔ ایسی عورتیں جب کسی مرد کو جیتنے کے چکر میں پڑ جاتی ہیں تو بہت آگے نکل جاتی ہیں۔''

''کتنا آگے نکلے گی۔ بارڈر پار کر جائے گی؟''

''ایسی عورتوں کے نزدیک کوئی بارڈر شارڈر نہیں ہوتا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''خوشی بس اس بات کی ہے کہ میرے گونگے یار نے اب تھوڑا تھوڑا چہکنا شروع کر دیا

ہے۔ باقی...... نادیہ کے بارے میں پریشان ہونے کی کوشش نہ کر جگر! ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا۔ آگے آگے دیکھ ہوتا ہے کیا۔''

اسی دوران میں عمران کے فون کی بیل ہوئی اور نادیہ کا فون آ گیا۔ عمران نے مجھے سنانے کے لیے موبائل کا اسپیکر آن کر دیا۔ ''ہیلو ڈیئر! کیسے ہو؟'' نادیہ نے شیریں آواز میں پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔''

''کہاں جا رہے ہو؟''

''بس ذرا مارکیٹ تک۔''

''اور کون ہے ساتھ؟''

''کوئی نہیں۔''

''چائنیز فوڈ والی ہے تو بتا دو پھر فون کر لوں گی۔''

''اس سے صرف سرکس میں ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت مجھ سے چمٹی نہیں رہتی۔''

''تمہارے دماغ سے تو چمٹی رہتی ہے۔'' عمران نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''ارے...... ناراض نہ ہو جانا سویٹ ہارٹ! میں تمہاری ناراضگی مول نہیں لے سکتی۔''

''تو پھر ایسی باتیں کیوں کرتی ہو؟''

''ویری سوری! کان پکڑتی ہوں بھئی اور ہاں آج اپنے گھر کے باہر کوئی تبدیلی محسوس کی تم نے؟''

''سڑک بن رہی ہے اور لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ کام میں نے شروع کروایا ہے۔''

''تم نے ہی تو کروایا ہے ڈارلنگ! اور ابھی اور بہت کچھ کراؤ گے۔ تم میں سچ مچ میجک ہے۔ میرا بس چلے نا تو پتا ہے کیا کروں؟''

''کیا کرو؟''

''تمہاری ہر مسکراہٹ کا صدقہ اُتارنا شروع کر دوں۔ مسکراہٹ کا صدقہ ایک لاکھ روپیہ، لافٹر کا نذرانہ دو لاکھ۔ یوں دو چار ہفتوں میں ہی اپنی ساری پونجی تم پر لگا دوں۔ تم جو بات بات پر مجھے امیر کبیر ہونے کا طعنہ دیتے ہو تو یہ طعنے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ اس کے بعد میں عام سے کپڑے پہن کر تمہارے پیچھے تمہاری پھٹیچر موٹر سائیکل پر بیٹھوں۔ گول گپے، آلو چنے اور سموسے کھاؤں۔ پورے شہر میں تمہارے ساتھ لور لور پھروں۔''

''ایسے شوق بڑی جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی بیوقوفی کا احساس ہوتا ہے۔''

''جب تم ایسی باتیں کرتے ہو تو مجھے لگتا ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا ہے۔ سلیم کی موت ابھی تک تمہارے ذہن پر سوار ہے۔ میں اس کے لیے تمہارا دل کیسے صاف کر سکتی ہوں؟ مجھے بتاؤ پلیز مجھے بتاؤ۔ میں ہر کام کے لیے تیار ہوں۔''

''تمہاری ان باتوں سے جانے والا لوٹ تو نہیں آ جائے گا۔ بہرحال جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس کا ذکر نہ ہی چھیڑیں تو اچھا ہے۔''

''اچھا نہیں چھیڑتی۔ بتاؤ آج شام کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ خاص نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں دس بجے تمہیں فون کروں گی۔''

''اوکے۔'' عمران نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

''دو چہروں والی عورت۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

اسی دوران میں ایک اور کال آ گئی۔ اس مرتبہ دوسری طرف بڑی میڈم صفورا تھی۔ ''ہیلو عمران! کیسے ہو؟'' وہ باوقار انداز میں بولی۔

''بالکل ٹھیک میڈم! کوئی خدمت؟''

''نہیں...... ابھی چند دن آرام کرو۔ کھاؤ پیو اور توانائی بحال کرو۔ خاص طور سے اقبال کی صحت بہتر ہونی چاہیے۔''

''آپ کیسی ہیں میڈم؟'' عمران نے پوچھا۔

''بالکل خیریت سے اور آج کل خوش بھی ہوں۔ میں نادیہ میں کافی چینج محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ میل جول اس کے مزاج پر اچھا اثر ڈال رہا ہے۔ الکحل بھی کم لے رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم تھوڑا تھوڑا وقت اس کے لیے نکالتے رہو۔''

''جیسے آپ کا حکم میڈم؟''

''نہیں بھئی...... یہ حکم نہیں۔ یہ تو ایک دوستانہ درخواست ہے۔ مجھے مارچ میں ایک نمائش دیکھنے جاپان جانا ہے۔ ایک ہفتے کا ٹور ہوگا۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم اور نادیہ بھی پروگرام بناؤ اور میرے ساتھ چلو۔'' عمران نے خاموشی اختیار کی تو وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ بھی حکم نہیں ہے، درخواست ہے بھئی...... آرام سے سوچ لینا۔ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔''

رسمی گفتگو کے بعد میڈم نے عمران کو خدا حافظ کہا۔ عمران گم صم تھا۔ اس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اس سے اگلی رات میں نے اور اقبال نے ایک عجیب تماشہ دیکھا۔ میڈم نادیہ شام

سات بجے ہی آ گئی تھی۔ اس روز عمران کی سرکس سے چھٹی تھی۔ نادیہ کا پروگرام تھا کہ وہ عمران کو کہیں باہر لے کر جائے گی لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ بارش شروع ہو گئی۔ نادیہ وہیں گھر میں ہی ہمارے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس کا ڈرائیور اور گارڈ ایک سرخ ہنڈا کار میں تھے۔ یہ گاڑی بازار سے باہر بڑی سڑک پر کھڑی تھی۔ ان دونوں ''حکم کے غلاموں'' کو ساری رات بھی گاڑی میں گزارنا پڑتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

نادیہ بے تکلفی سے ہمارے ساتھ گپ شپ کرتی رہی۔ وہ اپنا خاص تکبرانہ انداز چھوڑ کر ہم سے گھل مل جانے کی خواہش رکھتی تھی۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ ہمارے درمیان شاہین کی جگہ لے سکے مگر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ نادیہ لاکھ کوشش کرتی مگر اس کی باتوں سے تصنع کی بُو آتی تھی۔

اپنے اور عمران کے رومانس کے حوالے سے اب وہ ہم سے کھل کر بات کر رہی تھی۔ اس نئے بولڈ انداز میں بتایا کہ اس نے عمران کو اس پہلی رات میں ہی پسند کر لیا تھا جب وہ کوٹھی میں داخل ہوا اور شیرے کے ساتھ اس کی طوفانی جھڑپ ہوئی۔ وہ اس سارے واقعے کی تفصیل مزے لے کر بیان کرتی رہی اور بتاتی رہی کہ وہ کس طرح کلوز سرکٹ ٹی وی پر وہ سارے منظر دیکھتی رہی تھی۔

بارش زور پکڑ گئی تو نادیہ نے آئیڈیا دیا کہ کارڈ کھیلے جائیں۔ ہم عمران کے کمرے میں کارڈ کھیلنے لگے۔ کارڈ کھیلنے کے دوران میں ہی انکشاف ہوا کہ آج اقبال کی سالگرہ ہے۔ نادیہ نے فوراً ڈرائیور کو اس کے سیل فون پر کال کی اور اسے کیک وغیرہ لانے کو کہا۔ آدھ پون گھنٹے بعد بارش میں بھیگا ہوا ڈرائیور بہت بڑا کیک اور بہت سارا باربی کیو لے کر پہنچ گیا۔ ہم نے اقبال کی 26 ویں سالگرہ کا کیک کاٹا اور ہلا گلا کیا۔ اس دوران میں نادیہ نے ایک چابی نکالی اور اقبال کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ میری طرف سے تمہارے لیے سالگرہ کا تحفہ۔''

''یہ کیا ہے جی؟''

''نئی سوزوکی کار۔'' وہ اطمینان سے بولی۔ ''دراصل یہ عمران کے لیے تھی۔ تمہاری اور تابش کی باری بعد میں آتی مگر اپنی برتھ ڈے کی وجہ سے تم نمبر لے گئے۔ اب عمران کے لیے اور آ جائے گی۔''

اس پانچ لاکھ کے تحفے پر ہم واقعی حیران ہوئے۔ اقبال نے رسمی احتجاج کیا مگر وہ تو ہم سب پر بالکل ریشہ خطمی ہو رہی تھی اور اس کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ ہر قیمت پر عمران

کو متاثر کرنا چاہ رہی تھی۔ عمران کا حصول جیسے اس کے طوفانی مزاج کے لیے ایک چیلنج بنا ہوا تھا۔

دس بجے کے قریب بارش ایک دم شدت اختیار کر گئی۔ کھڑکیوں پر پانی کی تابڑ توڑ بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔ اس صورتِ حال میں نادیہ کا پیدل چل کر دو فرلانگ دور کھڑی گاڑی تک جانا ممکن نہیں تھا اور وہ تو شاید خود بھی یہی چاہتی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت عمران کے ساتھ گزارنے کا موقع ملے۔

اقبال نے دو تین لمبی جماہیاں لیں پھر مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ میں اور اقبال اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ عمران اور نادیہ وہیں بیٹھے کارڈ کھیلتے رہے۔ بارش رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں بستر پر اونگھنے لگا۔ نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے اقبال نے ہی ہلا کر جگایا تھا۔ میری نظر وال کلاک پر گئی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ گرج چمک کے ساتھ بارش کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اقبال کا چہرہ دیکھا۔ اس نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

میں نے چپل پہنی اور اُٹھ کر دبے پاؤں اقبال کے پیچھے چل دیا۔ ہم بغلی دروازے سے نکلے اور گیراج میں آ گئے۔ وہاں گھوم کر گھر کی سائیڈ والی راہداری میں پہنچے اور بارش کی بوچھاڑوں سے بچتے ''بیک یارڈ'' میں پہنچ گئے۔ یہاں نیم تاریکی تھی اور اقبال کی آنکھوں میں شرارت کی چمک نظر آ رہی تھی۔ اس نے ایک کھڑکی کی باریک جھری سے آنکھ لگائی۔ کچھ دیر بعد وہ پیچھے ہٹ گیا اور مجھے جھری میں سے دیکھنے کا موقع دیا۔ اندر کا منظر توجہ طلب تھا۔

لمبے صوفے پر نادیہ، عمران کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ عمران کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور زبردست رومانی موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ صوفے سے پھسلی اور بڑی ادا سے قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے نیم دراز ہونے کے انداز میں صوفے کے نچلے حصے سے ٹیک لگا لی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟ اوپر بیٹھو۔'' عمران کی مدھم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''نہیں...... مجھے ایسے ہی اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ بڑے ناز سے عمران کے گھٹنے کے ساتھ لگ کر بولی۔

''یہ کیا ڈراما ہے بھئی؟''

''ڈراما نہیں۔ بس مجھے اچھا لگ رہا ہے۔''

"تو میں بھی نیچے بیٹھ جاتا ہوں۔"

"اب تم ڈراما کر رہے ہو۔" وہ اسے روکتے ہوئے بولی۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بڑے ہیجان خیز انداز میں اس کے گھٹنے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے تعلق میں سب سے نمایاں چیز "ہیجان" ہی نظر آتی تھی۔ وہ جدید تراش کی شلوار قمیص میں تھی۔ قمیص کا گریبان واہیات حد تک کشادہ تھا۔ وہ اپنے بیٹھنے کے انداز سے اس کشادگی میں اضافہ کر رہی تھی۔ عمران نے نگاہیں ٹی وی اسکرین پر جما رکھی تھیں۔ تب میں نے ایک اور دلچسپ منظر دیکھا۔ نادیہ نے بڑی آہستگی سے عمران کی سفید چپل اس کے پاؤں سے علیحدہ کر دی اور بڑے محبت بھرے انداز میں ہولے ہولے اس کے پاؤں پر انگلیاں چلانے لگی، اس کے تلووں کو سہلانے لگی۔ عمران نے ایک بار پھر منع کرنے کی کوشش کی مگر اس نے مصنوعی غصے سے ڈانٹ کر اسے چپ کرا دیا۔

اس کا یہ رویہ تعجب خیز تھا۔ یہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ لال کوٹھی کی چھوٹی میڈم تھی۔ درجنوں ملازم اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ کروڑوں کی مالک تھی اور بڑی بہن کی وجہ سے ہی سہی مگر اسے سوسائٹی میں ایک مقام حاصل تھا۔ آج اس بادو باراں کی شب میں وہ اس چھوٹے سے مکان میں بازی گر عمران دانش کے قدموں میں بیٹھی تھی اور فدویانہ انداز میں اس کے پاؤں سہلا رہی تھی۔ وہ کیا شے تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

میں نے کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر اقبال کے کان میں مدھم سرگوشی کی۔ "دیکھو تم بھی...... دیکھنے والا سین ہے۔"

اب اقبال نے اپنی آنکھ کھڑکی کی جھری سے ٹکا دی۔ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر پیچھے ہٹ کر بولا۔ "بہت بڑی ففے کٹنی ہے یہ...... باری تعالیٰ ہمیں اور ہمارے یار کو اس کے شر سے بچائے۔"

تب اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ اب دیکھنے کی باری میری ہے۔ میں نے جھری سے آنکھ لگائی۔ اندر کا منظر بدلا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اب پھر صوفے پر عمران کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کے بال منتشر تھے۔ چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اس نے قمیص کے اوپر سے ہی عمران کا کندھا چوما پھر اس کے گریبان کے بٹن کھول کر اپنی ناک اس کے سینے پر رگڑنے لگی لیکن یہ بات عیاں تھی کہ اسے عمران کی طرف سے مناسب رسپانس نہیں مل رہا۔

جب وہ مزید آگے بڑھی تو عمران اپنا سگریٹ کیس لینے کے بہانے اُٹھ گیا۔

وہ گہری سانس لے کر صوفے پر پھیل گئی اور ناقدانہ نظروں سے عمران کا جائزہ لینے

لگی۔ وہ دوسری کھڑکی کے پاس کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ "کیا بات ہے ڈیئر! کچھ اُکھڑے ہوئے لگ رہے ہو؟"

"نہیں...... ایسی بات تو نہیں۔"

"پھر کیسی بات ہے؟" اس نے ہوشربا انگڑائی لی۔ عمران نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ادا سے مسکرائی۔ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا۔ "لگتا ہے شرم آ رہی ہے۔" اس نے کہا اور ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ ایک دم کمرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے ٹیوب لائٹ کا بٹن آف کر دیا تھا۔

میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اقبال نے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا ہوا؟ قینچی چل گئی؟"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا قینچی؟"

"یار! سین سنسر ہو گیا ہے نا۔" اس نے کہا اور مجھے کھینچ کر واپس اپنے کمرے میں لے آیا۔ ہم وہاں اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ عمران، نادیہ سے گریز کر رہا ہے مگر وہ مکمل گریز نہیں کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ کچھ حوصلہ افزائی بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نادیہ کو اپنے آپ میں اُلجھا رہا ہے۔

صرف دو تین منٹ بعد عمران کے کمرے کی لائٹ دوبارہ آن ہو گئی۔ اقبال مسکرایا۔ "لگتا ہے کہ چھوٹی میڈم کی دال گلی نہیں۔" میں نے تائید کی۔

پانچ دس منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ نادیہ واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ عمران نے ایک پُرانی برساتی اس کے لیے مہیا کر دی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی تھی بلکہ ناراض لگتی تھی۔ اس نے ہم سے بھی مختصر سی بات کی۔ فون کر کے اس نے اپنے لحیم شحیم گارڈ کو بلا لیا۔ اس کے ساتھ وہ واپس چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اقبال بولا۔ "یار عمران! بڑے پرلے درجے کے کٹھور ہو تم۔ اس نے مجھے گاڑی کی چابی دی ہے۔ کم از کم آج تو اسے خوش کر کے بھیجنا تھا۔"

"کیسے خوش کرتا؟"

"کمرے کی بتی دو چار منٹ مزید بجھی رہنے دینی تھی۔"

"زیادہ دیر اندھیرے میں رہیں تو شیطان کھڑکی میں سے جھانکنے کے بجائے اندر کمرے میں آ جاتا ہے۔"

"بڑے پہنچے ہوئے ہو تم۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ شیطان کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا۔" اقبال نے پوچھا۔

"دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ دیکھ رہے تھے۔" وہ مسکرایا۔

"مجھے تو یہ جگا کر زبردستی لے گیا تھا یار۔" میں نے دفاع کیا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اتنی سی شیطانی تو تم دونوں کا حق ہے۔"

"اب کیا کرنے کا ارادہ ہے چھوٹی میڈم کے ساتھ؟ کوئی فلمی قسم کا انتقام تو نہیں لینا چاہتے؟" میں نے پوچھا۔

عمران کا موڈ اب قدرے بحال تھا۔ خوشگوار لہجے میں بولا۔ "ارادہ تو ایسا ہی ہے۔ اس کے ساتھ شادی کروں گا۔ جب یہ لال جوڑا پہن کر ہاتھوں میں مہندی لگا کر گہنوں سے لدی پھندی، گٹھڑی سی بن کر پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہوگی تو اندر آؤں گا اور کہوں گا...... نادیہ بیگم! یہ سہاگ رات نہیں ہے۔ یہ انتقام کی رات ہے۔ آج تمہارا گھونگھٹ کوئی نہیں اُٹھائے گا۔ تم اس کانٹوں کی سیج پر اکیلی ہی رات گزارو گی۔ آج کے بعد اس گھر میں تم صرف نام کی دلہن بن کر رہو گی۔ پل پل جیو گی، پل پل مرو گی۔"

اقبال بولا۔ "یار! ویسے اس مشہور فلمی سین میں جو بار بار فلمایا گیا ہے۔ کوئی لاجک نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو یہ مجبوری کا سین ہے۔ سنسر کا ڈر ہوتا ہے اس لیے دلہا صاحب اپنے انتقام کا رُخ موڑ کر تکیہ اُٹھاتے ہیں اور باہر صوفے پر جا کر لیٹ جاتے ہیں۔ تماشائی بیچارے اس روکھے پھیکے شریفانہ انتقام پر کڑھتے رہ جاتے ہیں۔"

"تمہارے خیال میں یہ سین کیسے ہونا چاہیے؟" عمران نے سگریٹ سلگایا۔

"میں ہوتا تو اس طرح بولتا۔" وہ ہو بہو فلم اسٹار وحید مراد کے لب و لہجے میں بولنے لگا۔ "شبانہ! یہ سہاگ کی رات نہیں ہے، انتقام کی رات ہے۔ ہم انتقام کا دور شروع کرنے والے ہیں لیکن جس طرح لمبی چھلانگ لگانے کے لیے پہلے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، اسی طرح میں بھی پیچھے ہٹ رہا ہوں۔ آج کی رات ہم محبت کے ساتھ گزاریں گے۔ صبح ساڑھے سات بجے سے انتقام شروع کریں گے وغیرہ وغیرہ۔"

○......❖......○

میرا پاسپورٹ مل گیا تھا۔ ویزے کے انٹرویو کے لیے ہمیں ایمبیسی سے دس دن بعد کی اپائنٹ منٹ ملی تھی۔ یہ بھی عمران کی کوشش سے ہوا تھا ورنہ بیس دن بعد باری آ رہی تھی۔ اب یہ دس دن ہمیں جیسے تیسے گزارنے تھے۔ انٹرویو کے بعد ویزا لگنے میں بھی دس پندرہ روز لگنے تھے۔

دو روز بعد رات کو ہم نے پھر ایک سین دیکھا۔ یہ سین پہلے والے سین سے زیادہ تہلکہ

خیز تھا۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ جس وقت نادیہ نے گھر کے دروازے پر دستک دی، صرف پانچ منٹ پہلے ہی شاہین ہمارے پاس سے اُٹھ کر گئی تھی۔ نادیہ کی آمد محسوس کر کے ہم نے فوراً شاہین کی موجودگی کے اہم آثار کمرے سے ختم کر دیئے۔ نادیہ آج بھی شاندار ساڑھی میں تھی۔ اس کا موڈ قدرے بہتر نظر آتا تھا مگر آج اس کے چہرے پر خاص قسم کی تمتماہٹ بھی موجود تھی۔ یہ تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے ایک دو پیگ لگا رکھے ہیں۔ اس نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ علاقے میں سڑک کی تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔

آج جو شولڈر بیگ نادیہ کے کندھے سے جھول رہا تھا، وہ نسبتاً بڑا تھا۔ کچھ پھولا ہوا بھی نظر آتا تھا۔ نادیہ نے اقبال سے پوچھا کہ اس نے اپنی نئی گاڑی ڈرائیو کر کے دیکھی ہے۔

"گاڑی میں بیٹھ کر تو دیکھا ہے مگر ابھی ڈرائیو نہیں کی۔" اقبال نے کہا۔

"تو پھر جاؤ۔ ایک چکر لگا کر آؤ تم اور تابش۔"

غالباً وہ عمران کے ساتھ تنہائی چاہتی تھی۔

"جیسے آپ کا حکم۔" اقبال نے کہا۔

میں اور اقبال باہر آ گئے۔ بلیو کلر کی نئی مہران باہر موجود تھی۔ ہم بازار سے نکل کر مارکیٹ کی طرف چلے گئے۔ میں نے کہا۔ "یار! مجھے تو اس گاڑی میں بیٹھ کر کراہیت سی ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ گاڑی نہیں ہے، کسی کی ہوس کاری کا پیشگی معاوضہ ہے اور اس کے علاوہ...... شاید سلیم کے خون کی قیمت بھی ہے۔"

"لگ تو مجھے بھی ایسے ہی رہا ہے مگر فی الحال مجبوری ہے۔" اقبال نے کہا۔

ہم نادیہ کے عجیب و غریب کردار، اس کی شعلہ صفتی اور آتش پائی پر بات کرتے رہے۔ وہ ایک بگڑی تگڑی امیرزادی سے بھی آگے کی چیز تھی۔

ہم نے آئس کریم وغیرہ کھائی پھر آدھ پون گھنٹے میں واپس آ گئے۔ اقبال نے گاڑی گھر سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر پرسوں والی شریر چمک موجود تھی۔ اس کی جیب میں ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی۔ اس چابی سے اس نے آواز پیدا کیے بغیر چھوٹا گیٹ کھولا اور میرے ساتھ اندر چلا گیا۔

ابھی ہم برآمدے میں ہی پہنچے تھے کہ اندر سے بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں نادیہ کی آواز نمایاں تھی۔ وہ کسی بات پر عمران سے جھگڑ رہی تھی۔

"آج معاملہ گرم ہے بھئی۔" اقبال نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

وہ مجھے ساتھ لے کر راہداری سے گزرا اور پھر اسی کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا جہاں سے

پرسوں رات بھی ہم نے اندرونی منظر دیکھا تھا۔ اس کھڑکی میں یہ جھری اقبال جان بوجھ کر رکھتا تھا، اس بات کا پتا مجھے دو روز بعد چلا۔

کمرے سے اُبھرنے والی آوازیں اب صاف سنائی دے رہی تھیں۔ نادیہ کہہ رہی تھی۔ ''تم مجھے ٹارچر کر رہے ہو۔ جان بوجھ کر کر رہے ہو۔ صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ ہمارے درمیان ریلیشن نہیں ہوسکتا۔''

''تمہارے لیے ریلیشن کا بس ایک ہی مطلب کیوں ہے؟ ضروری تو نہیں کہ ریلیشن کے لیے ہم اکٹھے ایک بستر پر سوئیں۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح بھی رہ سکتے ہیں۔''

''یہ سب کہنے سننے کی باتیں ہیں عمران۔'' وہ بھڑکے لہجے میں بولی۔ ''حقیقت یہ ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے سلیم کے لیے معاف نہیں کیا ہے۔ تمہارے دل میں وہی گرہ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا دُکھ سینے میں لے کر بیٹھے ہوئے ہو تم۔ میری طرف دیکھتے ہو تو تمہاری آنکھوں میں نفرت چمک اُٹھتی ہے۔''

نادیہ کی آواز بہکی ہوئی تھی۔ بنارسی ساڑھی کا چمکیلا پلو اس کے کندھے سے ڈھلک گیا تھا۔ مختصر بلاؤز اس کے جسم کو نمایاں کر رہا تھا۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔''

''میں غلط نہیں سمجھ رہی۔ تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو اور مجھے بھی۔ میں نے تمہاری منت کی ہے عمران! ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگی ہے لیکن تم نے اپنا دل پتھر کیا ہوا ہے۔ شاید تم مجھے سزا ہی دینا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، دے لو مجھے سزا۔ تمہاری محبت کے لیے میں سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں۔ ٹھیک ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی، میں نے سلیم کو مارا پیٹا۔ تو تم اس کا بدلہ لے لو مجھ سے...... میں دل سے کہتی ہوں مجھ سے بدلہ لے لو۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

وہ بڑے جذباتی انداز میں اپنے شولڈر بیگ کی طرف بڑھی۔ اس کی زپ کھول کر اس نے اندر سے ایک چیز نکالی۔ پہلے تو مجھے سمجھنے میں دشواری ہوئی۔ پھر پتا چلا کہ یہ موٹے ربڑ کے پائپ کا قریباً تین فٹ لمبا ٹکڑا ہے۔ اس پائپ کے گرد آہنی تار لپٹا ہوا تھا۔ اس نے یہ پائپ عمران کی گود میں پھینک دیا۔ اس نے اپنے بالائی جسم سے ساڑھی ہٹا دی۔ اب وہ مختصر بلاؤز میں تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل عمران کے سامنے گرگئی۔ ''لو...... مارلو مجھے۔ جس طرح میں نے اسے مارا تھا، تم مجھے مارلو۔ میں تمہیں دل سے اجازت دیتی ہوں۔ میں ہر تکلیف سہہ سکتی ہوں، پر تمہاری بے رُخی نہیں۔ پلیز...... پلیز......'' اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کے بالوں

نے آگے کو پھسل کر اس کا چہرہ چھپا لیا۔

عمران نے پائپ گود سے اُٹھایا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی مدھم آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ''اس پائپ کی دو چوٹیں تمہاری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گی نادیہ! کئی ہفتوں تک بستر سے اُٹھ نہ سکو گی۔ تم نے کتنی چوٹیں لگائیں اس کو...... کس طرح سے زخم زخم کیا؟ تمہیں ذرا ترس نہ آیا؟''

''مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں مانتی ہوں اور اب اس کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ اور کیا چاہتے ہو؟''

عمران نے پائپ ایک طرف پھینک دیا اور اُٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے اندر اتنی بے رحمی نہیں لا سکتا۔''

''کیوں نہیں لا سکتے؟ میں قسم کھاتی ہوں، تمہاری بے رُخی مجھے اس پائپ کی مار سے کہیں زیادہ تکلیف دے رہی ہے۔''

''تم مجھے جذباتی بلیک میل کر رہی ہو نادیہ! اس طرح دل نہیں جیتے جاتے۔''

''تو تم مجھے معاف نہیں کرو گے؟''

وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اچانک اس کے چہرے کی تمتماہٹ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں شراب کی سرخی بھی نمایاں تر ہو گئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں پھنکاری۔ ''عمران! تم...... تم اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے مجھے ٹھکرا رہے ہو، مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ وہ...... وہ حرامزادی! خناس بن کر گھسی ہوئی ہے تمہارے دماغ میں۔''

''نادیہ...... اس کو بیچ میں مت لاؤ۔''

''کیوں نہ لاؤں؟ وہی چڑیل ہے جس نے تمہیں اپنے پنجرے میں طوطا بنایا ہوا ہے۔ تمہاری اس بے رُخی کی ایک وجہ وہ بھی ہے۔''

''نادیہ!'' عمران گرجا۔ ''میں اس کے بارے میں بکواس نہیں سنوں گا۔''

''کیوں نہیں سنو گے تم! میں سناؤں گی۔ حرامزادی، کسبی، کتیا۔'' نادیہ جنونی انداز میں دھاڑی۔ ''میں تمہیں...... میں تمہیں اس کے قابل ہی نہیں رہنے دوں گی۔ میں برباد کر دوں گی تمہیں...... برباد کر دوں گی۔'' ایک دم ہی اس کا پارا ساتویں آسمان کو چھونے لگا تھا۔

وہ لپک کر ٹیبل کی طرف گئی۔ وہاں بیئر کی بڑی بوتل پڑی تھی۔ نادیہ نے ٹیبل پر مار کر ایک چھناکے سے بوتل توڑ دی۔ وہ ٹوٹ کر ایک تیز دھار ہتھیار کی طرح ہو گئی۔ اب یہ ہتھیار

نادیہ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہیجانی انداز میں چلاتی ہوئی عمران پر جھپٹی۔ اس نے بے دریغ عمران کے چہرے کو نشانہ بنایا۔ عمران نے بروقت پیچھے ہٹ کر چہرہ بچایا اور اس کی بوتل والی کلائی پکڑ لی۔ کمرے میں کہرام سا مچ گیا۔ اب ہم بھی کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر گھس گئے۔ نادیہ بالکل دیوانی ہو رہی تھی۔ وہ عمران پر گالیوں کی بوچھاڑ کر رہی تھی۔ اپنے لمبے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی، اس پر ٹانگیں چلا رہی تھی۔ اسے اپنے کپڑوں کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا بالائی جسم تو نیم عریاں ہو ہی چکا تھا، اب لگتا تھا کہ اس کی ساڑھی، زیریں جسم سے بھی اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔

ہم نے مل کر اسے بمشکل سنبھالا۔ عمران نے اس کے منہ پر دو زوردار تھپڑ رسید کیے۔ وہ چکرا کر دیوار سے ٹکرائی اور گر گئی۔ اس کے باوجود وہ پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلا رہی تھی۔ ہذیانی انداز میں پتا نہیں کیا کیا بول رہی تھی۔ اس کے نقوش بگڑ گئے تھے اور رنگت سیاہی مائل ہو گئی۔ وہ کراہنے لگی اور بڑبڑانے لگی۔ عمران نے اقبال کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے انجکشن لے آیا۔ یہ بے ہوشی کا وہی انجکشن تھا جو اس سے پہلے عمران اور اقبال نے سمن آباد میں کنول کے بھائی قادرے کو دیا تھا۔ میں نے اور اقبال نے نادیہ کو دبوچا۔ اس کا جسم نرم تھا اور منہ سے شراب کی بُو آ رہی تھی۔ وہ کسمسائی مگر عمران نے اس کے بازو میں دوا انجیکٹ کر دی۔

بے شک یہ گھر کا اندرونی کمرہ تھا مگر کچھ دیر پہلے نادیہ کے چلانے چنگھاڑنے کی آواز اتنی بلند تھی کہ قریبی گھروں تک بھی پہنچی تھی۔ پڑوسی زاہد دیوار پر سے آوازیں دے رہا تھا اور گھر کا بیرونی دروازہ بھی کھٹکھٹایا جانے لگا تھا۔ عمران کے اشارے پر اقبال باہر گیا اور پڑوسیوں کو مطمئن کر کے آیا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اس نے پڑوسیوں کو بتایا تھا کہ گھر میں کچھ مہمان آئے ہیں جن میں ایک لڑکی نفسیاتی مریضہ ہے۔

اقبال کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چھوٹی بہن کو اس حالت میں دیکھ کر میڈم صفورا کا پارا بھی چڑھ جائے گا اور وہ طوفان کھڑا کر دے گی۔ تاہم عمران مطمئن تھا۔ اس نے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں یار! میں خود ڈرائیور اور گارڈ کے ساتھ جاؤں گا اور اسے چھوڑ کر آؤں گا۔''

''جب تک تم واپس نہیں آؤ گے، ہماری جان سولی پر لٹکی رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی تمہارے ساتھ جانا چاہیے۔'' اقبال نے تجویز پیش کی۔

''پڑوسیوں کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں بلکہ آٹھ دس محلے دار بھی چلے جائیں تو بہتر ہے۔ میڈم صفورا کو بڑی مسرت ہوگی کہ اس کی بہن کو اتنے اہتمام کے ساتھ یہاں لایا گیا

ہے۔'' عمران کے لہجے میں طنز تھا۔

اقبال منہ بنا کر رہ گیا۔

عمران نے نادیہ ہی کے سیل فون سے اس کے ڈرائیور اور گارڈ کو کال کیا۔ وہ دونوں پہنچ گئے۔ بے ہوش نادیہ کو پہلے مہران گاڑی میں ڈال کر بڑی سڑک تک پہنچایا گیا پھر وہاں سے ہنڈا کارڈ میں ڈال کر لال کوٹھیوں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ عمران ساتھ ہی گیا تھا۔

میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ عمران، سلیم کی دردناک موت کو بھولا نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں بڑی میڈم صفورا کی منافقت و بدنیتی اسے ہضم ہوئی ہے۔ سلیم کی موت کے بعد میڈم صفورا نے جس طرح عمران کو وافر پیسے کی چمک دکھا کر مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بھی ایک نہایت ناخوشگوار تجربہ تھا۔

سلیم کی موت معمولی واقعہ نہیں تھی۔ کئی دن گزر گئے تھے مگر میں آج بھی محسوس کرتا تھا کہ جیسے اس رات سلیم قبرستان میں دفن ہونے کے باوجود ہمارے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ زخموں سے چُور، بے بسی کی تصویر بنا ہولے ہولے لنگڑاتا ہوا، ہم سے پوچھتا ہوا۔ ''تم مجھے بچا نہ سکے لیکن کیا تم میرا...... بے رحم قتل بھی بھول جاؤ گے؟'' وہ اب بھی اکثر مجھے اپنے عقب میں محسوس ہوتا تھا۔ اپنی نم آنکھوں میں یہی سوال لیے۔

○......❖......○

میرا اور اقبال کا خیال تھا کہ شاید اب نادیہ، عمران کے منہ نہیں لگے گی لیکن وہ عجیب فطرت کی لڑکی تھی۔ عمران کو تسخیر کرنا جیسے اس نے زندگی و موت کا مسئلہ بنا لیا تھا اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں ہوا تھا۔ تیسرے چوتھے دن ہم نے پھر عمران اور نادیہ کو اکٹھے دیکھا۔ نادیہ شام کا شو دیکھنا چاہتی تھی۔ دونوں نارمل ہی نظر آتے تھے۔ عمران نے ہم سے اصرار کیا کہ ہم بھی ساتھ چلیں۔ عمران، نادیہ والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور اور دو گارڈز بھی اس گاڑی میں موجود تھے۔ میں اور اقبال، عمران کی مہران میں روانہ ہوئے۔

آج میں کئی روز بعد پھر سرکس کا رُخ کر رہا تھا۔ سرکس تین دن پہلے لاہور کے نزدیکی قصبے شیخوپورہ میں ٹرانسفر ہوا تھا۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں قریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ سرکس کی دنیا عجیب ہوتی ہے۔ انسان، جنگلی جانور اور مختلف مشینیں...... سب مل جل کر کام کرتے ہیں اور لوگوں کو تفریح مہیا کرتے ہیں۔ سرکس کے کام میں سنسنی خیزی، تھرل اور رسک کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک پُرجوش کام ہے۔ سینکڑوں لوگوں کے سامنے لائیو کام کرنے والے لوگ بلند حوصلہ، ہنرمند اور جسمانی طور پر بھی نہایت فٹ ہوتے ہیں۔ ان کا

رہن سہن اور رویہ انہیں عام لوگوں سے مختلف بناتا ہے۔ جس سرکس کا یہاں ذکر ہے وہ ویسے بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔

عمران کا موت کے کنویں والا آئٹم شروع ہونے والا تھا۔ کنویں کے اوپر موجود تماشائیوں کا جوش وخروش دیدنی تھا۔ عمران کی پرفارمنس کے سلسلے میں اسپیشل اناؤنسمنٹ اور ہو رہی تھی۔ شاہین بھی آج بہت نکھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ چست لباس میں اس کا متناسب جسم دیکھنے والوں کو کشش کرتا تھا۔

وہ بڑی ادا سے عمران کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھی اور اسی لمحے میں نے نادیہ کی آنکھوں میں حسد کی لہر سی اُبھرتے دیکھی۔ بہرحال اس کے چہرے کی مسکراہٹ برقرار تھی۔ عمران کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے نادیہ اور اس کے باوردی گارڈز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے گئے۔ لوگ مڑ مڑ کر نادیہ کو دیکھ رہے تھے۔ نادیہ کا لباس اور اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی موجودگی لوگوں پر ظاہر کرتی تھی کہ وہ کوئی خاص شخصیت ہے۔

موت کے کنویں میں اپنی بے خوف پرفارمنس سے عمران نے ایک بار پھر تماشائیوں کے دل موہ لیے۔ تالیاں پیٹ پیٹ کر ان کے ہاتھ سرخ ہو گئے۔ شاہین بھی آج بڑی فارم میں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے لمبے بال موٹر سائیکل پر عمران کے پیچھے کسی پرچم کی طرح لہراتے تھے۔

موت کے کنویں کے بعد عمران کو پنڈال میں قریباً پچاس فٹ کی بلندی پر جمناسٹک وغیرہ کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس مظاہرے کے لیے عمران اور شاہین نے اپنے لباس تبدیل کر لیے۔ یہاں بھی عمران، شاہین اور سلمان عرف شہزادے وغیرہ نے حاضرین سے خوب خوب داد وصول کی۔ خاص طور سے عمران اور شاہین کی جوڑی کو سراہا گیا۔

یہی وقت تھا جب عمران پنڈال کے وسط سے نکل کر میرے قریب آیا اور میرے کان میں ایک سرگوشی کر کے سنسنی پھیلا دی۔ اس نے بس چھوٹا سا جملہ بولا۔ ”جگر! آج مہینے کا پہلا ہفتہ ہے۔“

میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ آج کافی عرصے بعد میں پھر سرکس کے اسپیشل شو کا نظارہ کرنے والا تھا۔ غالباً آج عمران اسی لیے اصرار کر کے ہمیں ساتھ لایا تھا۔

اور پھر رات بارہ بجے بعد اسپیشل شو کا آغاز ہوا۔ ایک بار پھر وہی اسرار انگیز منظر دیکھنے کو ملا۔ سرکس کا عام شو ختم ہو جانے کے قریباً آدھ گھنٹے بعد نئے ماڈل کی بڑی بڑی گاڑیوں کی آمد شروع ہوئی۔ کچھ منچلے نوجوان ہیوی موٹر سائیکل پر بھی آئے۔ یہ سب لوگ ہائی جینٹری سے

تعلق رکھتے تھے اور ان میں اکثریت جواں سال افراد کی تھی۔ ان میں چند ایک فیشن ایبل لڑکیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ کچھ گاڑیوں میں گارڈز وغیرہ بھی موجود تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر ان لوگوں کی تعداد ستّر اسّی تک پہنچ گئی سرکس کی ساری بیرونی لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ بس پنڈال کے اندر گہما گہمی موجود رہی۔ یہاں وی آئی پی انکلوژر میں انگلش میوزک کی گونج تھی اور بیئر کی بوتلیں گردش کر رہی تھیں۔ نادیہ سب سے اگلی قطار میں بیٹھی تھی۔ اس سے پچھلی اگلی قطار میں اس کے دونوں مسلح گارڈز اور ڈرائیور موجود تھے۔

نئے آنے والے تماشائیوں میں نادیہ کو ایک واقف کار فیملی بھی مل گئی تھی۔ یہ تین کزن تھے جن میں نہایت باریک و چست پتلون والی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ لوگ یہاں نادیہ کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے اور اب اس کے ساتھ بیٹھے گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔

مقررہ وقت پر حفاظتی جال، جھولوں کے نیچے سے ہٹا دیا گیا اور نہایت سنسنی خیز شو کا آغاز ہو گیا۔ پہلے ایک جانباز فنکار نے تنے ہوئے رسّے پر چند کرتب دکھائے اور سائیکل وغیرہ چلانے کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد جھولوں پر جمناسٹک شروع ہوئی۔ یہ دل کی دھڑکن روک دینے والا تماشہ تھا۔ فنکاروں کے چہروں پر بھی تناؤ کی کیفیت صاف محسوس ہوتی تھی۔ درحقیقت یہ اپنی ہنرمندی کا ایک جان لیوا دعویٰ تھا۔ ان حالات میں بھی اگر کسی فنکار کے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ باقی تھی تو وہ عمران کا چہرہ تھا۔ ایک دوسری لڑکی کے علاوہ شاہین بھی اس مظاہرے میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ غیر معمولی دلیری، مہارت اور اعتماد کے بغیر یہ سب کچھ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پچاس فٹ کی بلندی سے نیچے زمین پر گر جانے کا مطلب موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور یہ لڑکیاں...... موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی تھیں۔

شاہین نے کئی بار بڑی مہارت سے لہراتے ہوئے جھولے کو چھوڑ کر ہوا میں قلابازی کھائی اور عمران کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو پکڑا۔ ہر بار واہ...... زبردست...... ونڈرفل کے نعرے بلند ہوئے اور تالیوں کے شور سے پنڈال گونجا۔ عمران اور شہزادے نے بھی شاندار کوآرڈی نیشن کے ساتھ سانس روک دینے والی فارمیشنز بنائیں۔

ایک چودھری نما شخص نے جذبات میں آ کر نعرہ لگایا۔ ”اوئے قربان جانواں تہاڈیاں پھرتیاں تے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے سو کے نوٹوں کی ایک گڈی کھول کر ہوا میں اُچھال دی۔

ہر بار جب کسی خطرناک حرکت کا مظاہرہ ہوتا تھا، ہمارے آگے بیٹھی ہوئی ایک ماڈرن خاتون اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپتی اور چلاتی۔ ”اوہ گاڈ...... اوہ مائی گاڈ۔“

ہر بار اس کا گنجا شوہر زور سے ہنستا اور اس ہنسی کے پیچھے اپنا خوف چھپانے کی کوشش کرتا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد یہ شدید سنسنی خیزی اختتام کو پہنچی اور اس اسپیشل شو کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ دو تین جوکرز اسٹیج پر نمودار ہوئے، ان میں ایک بونا بھی تھا۔ انہوں نے مضحکہ خیز حرکات کے ذریعے لوگوں کا اعصابی تناؤ کم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے بعد ایک بڑی میز اور کرسی اسٹیج پر رکھ دی گئی۔ میز پر وہی منقش چوکور ڈبا موجود تھا جس میں ریوالور اور گولیاں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔ جب یہ انتظامات ہو رہے تھے، عمران اور شاہین ہمارے پاس آ گئے۔ وہ پسینے سے شرابور اور ہانپے ہوئے تھے۔ لوگ انہیں تھپکیاں دینے لگے۔ چند ایک نے عمران سے آٹو گراف لیے۔ میں نے کن انکھیوں سے نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے اندر کی شدید ہلچل کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔

چودھری نما شخص، عمران اور شاہین کے قریب آیا۔ اس نے ایک بار پھر پُرخلوص انداز میں شاہین کی تعریف کی۔ ''چنگی صورت تے دلیری کبھی کبھی ہی اکٹھن ہوندی ہیں جی۔ واہ واہ...... چنگی صورت تے دلیری...... شاباش بھئی ببر شیری، واہ واہ بھئی ببر شیری۔'' اس نے کچھ اور نوٹ شاہین پر وار کر ہوا میں اُچھال دیئے۔

نادیہ کھسیانے انداز میں بولی۔ ''بھئی واہ...... ویل ڈن شاہین! تمہاری اتنی عزت افزائی دیکھ کر تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ میں بازی گری سیکھنا شروع کر دوں۔''

شاہین مسکرائی۔ ''لیکن میم! اس کے لیے ایک خاص عمر درکار ہوتی ہے۔'' نادیہ کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شاہین جلدی سے بولی۔ ''ویسے اگر آپ اپنے اعصاب ٹیسٹ کرنا چاہیں تو یہاں اس کے کچھ اور طریقے بھی ہیں۔ ابھی کچھ لوگ وہاں اس کرسی پر بیٹھ کر بھی داد وصول کریں گے۔'' شاہین کا اشارہ اسٹیج کی طرف تھا۔

اسی دوران میں تین چار لڑکیاں آ گئیں۔ وہ عمران اور شاہین کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر اُتروانا چاہ رہی تھیں۔ یہ سب کچھ جیسے نادیہ کے سینے پر سانپ لوٹا رہا تھا۔ اندرونی تپش کی وجہ سے اس کے نقوش بگڑتے جا رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔

ایک مختصر وقفے کے بعد ریوالور والا خطرناک ترین کھیل شروع ہوا۔ منچلوں کی ٹولیاں گولی چلنے یا نہ چلنے کے حوالے سے بولی لگانے لگیں۔ دلوں کی دھڑکنیں بڑھ گئیں اور

پیشانیوں پر پسینہ چمکنے لگا۔ آج یہ کھیل اس طرح مزید سنسنی خیز ہو گیا کہ لطیف نامی سابقہ رِنگ ماسٹر نے کھیل کے آغاز میں ہی ''دو...... چھ'' کی بازی لگائی اور خود پر گولی چلائی۔ یہ گولی چل گئی اور وہ لہولہان ہو کر اسٹیج پر گر پڑا۔ اس کے تڑپتے ہوئے فربہ جسم کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کر بیک اسٹیج پر پہنچا دیا گیا۔

اگلی تین چار بازیوں میں خیر خیریت گزری۔ ان میں عمران نے بھی دو چھ کی ایک بازی کامیابی سے کھلی اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ جیتا۔ توقع تھی کہ پچھلی مرتبہ کی طرح اس بار بھی وہ اس میں سے بہت سا روپیہ مارکیٹوں کے برآمدوں میں سوئے ہوئے لوگوں میں بانٹ دے گا۔

ایک باوردی ویٹر ہاتھوں میں ٹرے لیے اگلی قطار کے سامنے گھوم رہا تھا۔ نادیہ ویٹر کی ٹرے میں سے دو تین بار وہسکی کا پیگ اُٹھا چکی تھی اور اب نشے میں دکھائی دیتی تھی۔ اسی دوران میں دستور کے مطابق اسسٹنٹ منیجر عباس نے اناؤنسمنٹ کی۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہمیشہ کی طرح ہم آج بھی حاضرین میں سے باہمت افراد کو اسٹیج پر آنے اور قسمت آزمانے کی دعوت دیتے ہیں۔ کھیل کے اصول اور ضابطے آپ کو معلوم ہی ہیں۔''

تین چار منٹ کی اناؤنسمنٹ ختم ہوئی تو ایک ہٹا کٹا کلین شیو نوجوان اپنے دونوں مکے لہراتا ہوا اسٹیج پر چڑھ آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ حاضرین نے پُرجوش تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ریفری اسے قاعدے کے مطابق شرائط سے آگاہ کرنے لگا۔ عمران بھی قریب ہی موجود تھا۔ یہی وقت تھا جب میں نے کن انکھیوں سے نادیہ کا چہرہ دیکھا اور میرے دل نے گواہی دی کہ آج نادیہ بھی ضرور اس کھیل میں شرکت کرے گی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد میرے دل کی گواہی حرف بہ حرف درست ثابت ہو گئی۔ جب حاضرین میں سے ایک نے ''ایک...... چھ'' اور دوسرے نے ''دو...... چھ'' کا کھیل کھیل لیا تو اس مرتبہ نادیہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ تالیوں کا بے پناہ شور اُمڈا اور اس شور میں وہ اسٹیج پر چڑھ آئی۔

عمران نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''وہی جو تم سب کو نظر آ رہا ہے۔'' وہ بولی۔

''نہیں...... نہیں...... تم صرف تماشائی ہو۔'' عمران نے اسے کرسی پر بیٹھنے سے روک دیا۔

''میں اپنی مرضی اور خوشی سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ تم مجھے روک نہیں سکتے۔'' وہ حتمی انداز

میں بولی۔

''بڑی میڈم ناراض ہوں گی۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' عمران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نادیہ کے گارڈز کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

گارڈز بھی اسٹیج پر پہنچ گئے مگر ان میں اتنی ہمت ہرگز نہیں تھی کہ وہ نادیہ کی مرضی کے بغیر اسے واپس لے جاسکتے۔

دو تین منٹ یہ تنازع جاری رہا مگر نادیہ نے ایک نہیں مانی۔ وہ کھیلنا چاہتی تھی۔ اسے ہلاشیری دینے والے تماشائی بھی مسلسل شور مچا رہے تھے۔ آخر گارڈز کو نیچے اُترنا پڑا۔ نادیہ نے چھپے ہوئے کاغذ پر دستخط کیے پھر اعلان کیا کہ وہ بھی ''دو...... چھ'' کھیلے گی۔ یعنی دو خانوں میں گولی، چار خانے خالی۔ عمران اور اسسٹنٹ عباس نے اسے ایک بار پھر منع کیا۔ عمران نے کہا کہ اگر وہ کھیلنا ہی چاہتی ہے تو ''ایک...... چھ'' کھیل لے۔ اس معاملے پر ایک بار پھر بحث ہوئی۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طور پر راضی ہوگئی۔ شاید ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد اب وہ خود بھی موت کا لمس محسوس کررہی تھی۔

بولی شروع ہوئی۔ پانچ دس منٹ کے شور شرابے کے بعد بولی ڈیڑھ چھ پر ختم ہوئی۔ گولی نہ چلنے کی صورت میں نادیہ کو ایک لاکھ بیس ہزار ملنے تھے، چلنے کی صورت میں مخالف گروپ کو چار لاکھ اسّی ہزار کی ادائیگی کی جاناتھی۔ عام طور پر یہ بولی ایک چھ کے ریشو پر ختم ہوتی تھی۔ مگر کچھ بھی تھا، نادیہ لڑکی تھی۔ اس لیے تماشائیوں نے اُسے رعایتی نمبر دے کر بولی کو ڈیڑھ چھ تک پہنچا دیا تھا۔

نادیہ نے ریوالور کا چیمبر کھولا اور اس میں اعشاریہ تین آٹھ کی چمکتی ہوئی گولی داخل کی۔ اس کے بعد چیمبر بند کر کے اس نے چرخی کو کئی بار گھمایا اور اپنے پہلو میں مقررہ جگہ پر رکھ لیا۔ ریفری نے حسبِ دستور آگے بڑھ کر ریوالور کی پوزیشن چیک کی اور تین چار قدم پیچھے ہٹ کر عمران کے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا۔ پنڈال میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ نادیہ نے اپنی انگلی لبلبی پر رکھی۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے، چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ یقیناً الکحل کی حرارت بھی اس کے اندر موجود تھی جو اسے نتائج سے بے پروا کررہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبایا۔ پانچ خانے خالی تھے۔ گولی چلنے کا امکان بہت کم تھا۔ مگر امکان تو آخر امکان ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی مکافاتِ عمل بھی بندے کو انوکھے انداز میں آواز دیتا ہے۔ کبھی کبھی مشکل آسانی میں ڈھل جاتی ہے اور آسانی نہایت سنگین مشکل میں بدل جاتی ہے۔ نادیہ نے ٹریگر دبایا تو دھماکے سے گولی چلی۔ میں نے نادیہ کو اُچھل کر کرسی سے گرتے دیکھا۔ سب

سے پہلے اس کا سر ہی زمین سے ٹکرایا تھا۔ پنڈال میں لوگ چلاّ اُٹھے اور اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے۔ وہ اوندھے منہ گری تھی۔ اس کا ریوالور مخالف سمت میں گرا تھا۔ عمران نے ریوالور اُٹھایا اور پھر نادیہ کی طرف لپکا۔ ''نادیہ...... نادیہ۔'' وہ زور سے چلاّیا۔

گارڈز بھی بھاگتے ہوئے اسٹیج پر چڑھ آئے۔ نادیہ کو اُٹھا کر اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ اس کے پہلو سے...... پسلیوں سے ذرا نیچے، خون کا اخراج بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں لوگ اسے لے کر اسٹیج کے عقب میں اوجھل ہوگئے۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔ میں بھی اقبال کے ساتھ اُٹھا اور پنڈال سے باہر آگیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ نادیہ کا اسٹریچر تیزی سے ایک اسٹیشن وین میں رکھا جا رہا تھا۔

O......❖......O

نادیہ مخدوش حالت میں تھی اور ایک بہت مہنگے پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ نادیہ کو گولی لگنے سے کچھ دیر پہلے جس سابقہ رِنگ ماسٹر کو ''دو...... چھ'' کے کھیل میں گولی لگی تھی، وہ رات پچھلے پہر چار بجے کے قریب جاں بحق ہوگیا تھا۔ اس کے بارے میں اگلے روز دوپہر کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر آئی اور یہی خبر متوقع تھی۔ ''رِنگ ماسٹر لطیف اپنے کام سے گھر واپس جا رہا تھا۔ مدینہ کالونی کی ایک تاریک گلی میں دو نامعلوم افراد نے اس سے موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش کی۔ ناکامی پر اس کے پیٹ میں گولی ماری اور فرار ہوگئے۔ لطیف کو ہسپتال پہنچایا گیا مگر وہ زخموں سے جانبر نہ ہوسکا۔''

ہم نے فون پر عمران سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا۔ ''نادیہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ اس کا آپریشن ہوگیا ہے اور آکسیجن لگی ہے۔''

اقبال نے پوچھا۔ ''کیا ہمیں ہسپتال آنا چاہیے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی نہیں۔ جب میں کہوں گا پھر آجانا۔''

''ہر طرح سے خیریت تو ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''خیریت ہے۔ میری طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

بے شک نادیہ نے اپنی مرضی اور بے حد اصرار کے ساتھ ریوالور والے کھیل میں حصہ لیا تھا اور اس کے کئی ایک گواہ بھی تھے۔ تاہم میں اور اقبال اچھی طرح جانتے تھے کہ نادیہ کی مرضی کے پیچھے کسی اور کی مرضی بھی تھی۔ ہاں...... کوئی اور تھا جس نے بڑی ہوشیاری سے نادیہ جیسی چوکس و چنڈال لڑکی کو اس کرسی تک پہنچایا گیا جہاں سے لڑھک کر وہ سیدھی اسٹریچر پر آئی۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سلیم کی دردناک موت کا جواب عمران نے کل رات دیا تھا اور ایسے انداز سے دیا تھا کہ کوئی کوشش کے باوجود اس پر انگلی نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ وہ بندے کی نفسیات میں گھسنا جانتا تھا اور یہاں وہ بڑی کامیابی سے نادیہ جیسی پیچیدہ عورت کی نفسیات میں گھسا تھا۔

میں نے اقبال سے پوچھا۔ ''تمہیں عمران نے اس بارے میں کچھ بتایا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''تمہیں پتا تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوگا؟''

''نہیں...... بس تمہاری طرح ایک اندازہ سا تھا کہ اگلے چند دن میں کچھ نہ کچھ ہوگا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ وہ سلیم کے قتل کو آسانی سے فراموش نہیں کرے گا۔''

''مگر کل رات جو کچھ ہوا، اس میں حکمتِ عملی کے ساتھ ساتھ اتفاق کو بھی تو دخل ہے۔''

''تم نادیہ کو گولی لگنے کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں...... وہ صرف ایک گولی ڈال کر کھیلی تھی اور وہی گولی اس کو لگ گئی۔''

''شاید اسی کو کرموں کا پھل کہتے ہیں۔ اس میں کسی طرح کے شک و شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نادیہ نے دوسرے کھلاڑیوں کی طرح اپنے ہاتھ سے ریوالور کھولا تھا۔ اپنے ہاتھ سے گولی ڈالی تھی۔'' اقبال نے کہا۔

''ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ جب بُری گھڑی آئی ہو تو سارے اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کل رات کوئی بیس خانوں والا ریوالور ہوتا تو بھی نادیہ کو گولی لگ جاتی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلیم کی بیوہ اور بچوں کی آہیں بہت اوپر تک گئی ہیں۔''

شام کو عمران کا فون آیا کہ نادیہ کی حالت بدستور خراب ہے۔ اس نے کہا کہ ہم عیادت کے لیے ہسپتال آئیں۔

ہم گلبرگ کے ایک شاندار پرائیویٹ ہسپتال پہنچے۔ یہاں لابی میں میڈم کے کئی جاننے والے موجود تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر صدیقی موجود ہوا تو وہ مجھے یا عمران کو پہچان سکتا ہے لیکن یقینی بات تھی کہ یہ اندیشہ عمران کے ذہن میں بھی ہوگا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ہمیں بلاتا ہی نہیں۔

میڈم صفورا کے تعلقات کافی وسیع تھے۔ ایم این اے گورایا کے علاوہ انتظامیہ کے چند افسر بھی ہسپتال کی لابی میں نظر آئے۔ میڈم صفورا کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کچھ میڈیکل رپورٹس تھیں اور وہ سیل فون پر مسلسل کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

اسی دوران ایک سرجن صاحب آپریشن تھیٹر کی طرف سے نمودار ہوئے۔ سرجن کو دیکھ کر میڈم صفورا نے سیل فون پر بات ختم کر دی اور سرجن کی طرف متوجہ ہوگئی۔ سینئر سرجن اور میڈم کے درمیان انگلش میں جو بات چیت ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔

''ہاں...... پروفیسر صاحب! اب کیا کہتے ہیں آپ؟''

''پیچیدگی بڑھ رہی ہے میڈم! گردے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ایک بڑے آپریشن کی ضرورت ہے لیکن......''

''بات پوری کیجیے پروفیسر!'' میڈم کی آواز میں گرج تھی۔

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسے وقت میں پروفیسر اشفاق شاہ سے بہتر کوئی سرجن مل سکتا ہے۔ میری بے لاگ رائے ہے کہ کم از کم پاکستان میں ایسے آپریشن کا رسک صرف وہی لے سکتے ہیں۔''

''تو کہاں ہیں وہ؟ کتنی دیر میں یہاں پہنچ سکتے ہیں؟''

''وہ...... وہ شاید ایک ہفتے میں بھی نہ پہنچ سکیں۔ وہ مانٹریال میں ہیں۔ ایک میڈیکل کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔''

''کیا تم سمجھتے ہو پروفیسر کہ وہ شخص بہترین ہے؟'' میڈم نے آپ سے تم پر اُترتے ہوئے کہا۔

''یس میڈم! وہ بہترین ہیں۔''

''تو پھر اسے یہاں بلاؤ پروفیسر! کسی بھی طرح۔ کسی بھی قیمت پر۔ مجھے اپنی بہن کی زندگی چاہیے۔'' میڈم کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

پروفیسر سرجن نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر میڈم کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ غالباً وہ اس نازک موضوع پر تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز رات نو بجے کے قریب ہمیں یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ سینئر پروفیسر سرجن اشفاق شاہ مانٹریال میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر پاکستان پہنچ گئے ہیں اور وہ آج رات نادیہ کا ایک بڑا آپریشن کریں گے۔

یہ پیسے کی اور تعلقات کی طاقت تھی۔ ایک مسیحا کو ہزاروں میل دور سے صرف ایک رات میں پاکستان بلا لیا گیا تھا۔ اتنا طویل سفر کر کے وہ یہاں آتے ساتھ ہی مسیحائی میں مصروف ہوگیا۔ میری اطلاع کے مطابق یہ نہایت مشکل آپریشن رات گیارہ بجے شروع ہوا اور صبح چار بجے تک جاری رہا۔ عمران بھی وہیں ہسپتال میں موجود تھا۔ اقبال گاہے بہ گاہے فون

کر کے معلومات حاصل کر لیتا تھا۔

آپریشن کامیابی سے ختم ہو گیا۔ سارا دن خیریت سے گزرا۔ تاہم اگلے روز شام کو پتا چلا کہ نادیہ کی حالت بدستور نازک ہے۔ اس کے نچلے دھڑ نے حرکت کرنا بند کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اس کے لیے پریشان تھے۔ رات گیارہ بجے کے لگ بھگ عمران اور اقبال خبر گیری کے لیے پھر ہسپتال چلے گئے، میں گھر میں ہی رہا۔

میں نادیہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس جیسی سفاک عورت کے لیے میرے دل میں ہمدردی کا کوئی گوشہ نہیں تھا۔ میں دوسرے زاویے سے سوچ رہا تھا۔ سرکس کے اسپیشل شو میں اسے جس طرح گولی لگی تھی، وہ واقعہ حیران کن تھا۔ اسے گولی لگنے کا امکان بہت کم تھا لیکن اسے گولی لگ گئی۔ یہ ایک اتفاق تھا جو ہو بھی سکتا تھا اور نہیں بھی...... بہر طور اس کے نہ ہونے کے امکان زیادہ تھے۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس میں کسی انوکھے پن کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ میں نے اس بارے میں اقبال سے بھی تبادلہ خیال کیا تھا۔ اس نے بھی فقط حیرانی ہی ظاہر کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات پر خوش بھی تھا کہ بہت کم چانس ہونے کے باوجود نادیہ کو قرار واقعی سزا ملی ہے۔

اقبال سے بات کر کے بھی مجھے یہی لگا کہ سب کچھ ویسا نہیں ہے جیسا اس رات نظر آیا ہے۔ اس میں کوئی چھوٹا موٹا پھیر ضرور ہے۔ شاید عمران اور اقبال وہ ''پھیر'' مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ میرا ذہن مختلف انداز میں اور مختلف اطراف میں سوچتا رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کھیل میں استعمال ہونے والے خاص ریوالور میں کوئی ٹمپرنگ کی گئی ہو یا ریوالور کی لوڈنگ میں کسی طرح کا کوئی چکر چلایا گیا ہو؟ مگر اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کھیل کے دوران میں عمران اور عباس سمیت اس ریوالور کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اسی ریوالور سے پہلے بھی چھ سات افراد کھیل چکے تھے۔ پھر نادیہ نے اپنے ہاتھ سے ریوالور میں گولی رکھی تھی۔ اسے خود چیک کیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ریوالور کی چرخی کئی مرتبہ گھمائی تھی۔ سراج کے سوا اس معاملے میں کسی شخص نے کسی طرح کے شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ صرف اس نے کہا تھا کہ جس ریوالور سے نادیہ کو گولی لگی، اسے چیک کرنا چاہیے۔ کہیں سرکس والوں نے اس میں تو کوئی گڑبڑ نہیں کی۔ وہ سرکس والوں کی بات کر رہا تھا لیکن ظاہر تھا کہ اس کی مراد عمران سے ہے۔ بہر حال اس کی بات پر ابھی تک کسی نے کان نہیں دھرے تھے۔

میں سوچتا رہا اور کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اسی دوران میں لائٹ چلی گئی۔ سائیڈ ٹیبل پر ایک بڑے سائز کی موم بتی موجود تھی۔ میں نے اسے روشن کرنا چاہا مگر ماچس نہیں ملی۔ عمران کی

جیبوں میں اکثر لائٹر موجود رہتا تھا۔ میں نے وارڈ روب میں ٹٹول کر اس کی جیکٹ تلاش کی یہ بہت سے کپڑوں کے نیچے پڑی تھی۔ لائٹر کے لیے اس کی جیبیں ٹٹولتے ہوئے اچانک میری اُنگلی ایک سوراخ کے اندر چلی گئی۔ یہ سوراخ اس کی قیمتی جیکٹ میں سامنے کی طرف موجود تھا۔ میں حیران ہوا۔ اسی دوران میں ایک جیب سے لائٹر اور سگریٹ کا پچکا ہوا پیکٹ بھی مل گیا۔ میں نے موم بتی روشن کی اور جیکٹ کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ جیکٹ جدید فیشن کی تھی۔ سامنے کی طرف چمکیلی اسٹیل کے چھوٹے چھوٹے RING سے لگے ہوئے تھے۔ یہ سوراخ ایسے ہی ایک RING میں موجود تھا اور بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں نے سیاہ جیکٹ کو موم بتی کے بالکل قریب کیا اور دھیان سے دیکھنے لگا۔ میری چھٹی حس نے کہا کہ یہ گولی کا سوراخ ہے۔ سوراخ کے کناروں پر جلنے کے آثار موجود تھے۔ یکا یک میری رگوں میں خون سنسنا اُٹھا۔ عمران آج کل یہی جیکٹ پہن رہا تھا مگر پچھلے دو دن سے یہ جیکٹ اس کے جسم پر نظر نہیں آئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے جیکٹ آخری بار اسی رات پہنی تھی جب ہم اس کے ساتھ سرکس گئے تھے اور اسپیشل شو ہوا تھا۔ ایک دم ایک منظر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ یہ وہی اسپیشل شو کا منظر تھا۔ اسٹیج پر ریوالور والا گیم ہو رہا تھا۔ نادیہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ ریفری اور عمران اس سے بس تین چار فٹ کے فاصلے پر موجود تھے۔ عمران نے یہی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ہاں یہی جیکٹ۔ عمران کے دونوں ہاتھ حسبِ عادت جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔

''اوہ مائی گاڈ'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ میری پھٹی پھٹی نظریں بدستور چرمی جیکٹ کی جیب کے سوراخ پر جمی تھیں۔ تو کیا۔ اس رات جیکٹ میں ریوالور موجود تھا اور اس ریوالور سے گولی چلائی گئی تھی؟ ایک ایسی گولی جس کا رُخ نادیہ کی طرف تھا۔

میرا گلا خشک ہو گیا۔ میں بے دم سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ عمران کی نظریں عقابی اور اس کا نشانہ بے خطا ہے۔ جو شخص چاقو سے بالکل ٹھیک ٹھیک نشانہ لگا سکتا تھا، اس کے لیے آتشیں اسلحے سے نشانہ لگانا کون سا مشکل تھا۔ تو کیا اس رات نادیہ کو اپنے ریوالور کی گولی نہیں لگی تھی؟

ایک بار پھر وہ سارے مناظر میرے تصور کے پردے پر نمایاں تر ہو گئے۔ دھماکے سے گولی چلی تھی۔ نادیہ اُلٹ کر فرش پر گری تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دوسری طرف گرا تھا۔ یہ ریوالور عمران نے ہی اُٹھایا تھا پھر وہ نادیہ کو سنبھالنے لپکا تھا۔

ایک دم واقعات کی کئی کڑیاں آپس میں ملنے لگیں۔ میرے دل نے پکار کر گواہی دی کہ ہاں...... اس رات ضرور کچھ انوکھا ہوا تھا۔ شاید ایک شعبدہ جس نے بہت سے لوگوں کی نظر بندی کر دی تھی۔ ٹریگر نادیہ نے دبایا تھا لیکن گولی کہیں اور سے چلی تھی اور اس کام کی ٹائمنگ اتنی درست تھی کہ کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔ شاید ٹریگر دبانے والی کو بھی نہیں۔

میری ہتھیلیاں پسینے سے نم ہونے لگیں۔ میں نے لائٹر واپس جیکٹ کی جیب میں رکھا اور جیکٹ کو کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔ اسی طرح جس طرح وہ پہلے پڑی تھی۔

میں بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اگر عمران نے واقعی ایسا کیا تھا تو بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میں مختلف زاویوں سے سوچنے لگا۔ ان میں سے ایک زاویہ یہ بھی تھا کہ اگر فرضِ محال نادیہ والے ریوالور کی گولی بھی چلتی تو کیا ہوتا؟ کیا دو گولیاں نادیہ کو لگتیں؟ میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اُلجھ رہا تھا لیکن میرا یہ شک بتدریج پختہ یقین میں بدل رہا تھا کہ اس رات ''ڈبل گیم'' ہوا تھا اور ایسا ڈبل گیم عمران جیسا شخص ہی کھیل سکتا تھا۔

دھیرے دھیرے ایک عجیب طرح کا ہراس میرے اعصاب پر سوار ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اگر کسی طرح میڈم صفورا بات کی تہ تک پہنچ گئی اور اسے پتا چل گیا کہ نادیہ کو موت کے منہ میں پہنچانے والے ہم ہیں تو وہ قیامت برپا کر دے گی۔ خود اقبال کا بھی یہی تجزیہ تھا کہ وہ اوپر سے جتنی دھیمی نظر آتی ہے، اندر سے اتنی ہی تلاطم خیز ہے۔ خاص طور سے اپنی چھوٹی بہن کے لیے تو وہ ہر حد تک جا سکتی ہے۔

نادیہ کی حالت بدستور نازک تھی۔ اس کے حوالے سے کسی بھی وقت کوئی اچھی بُری خبر آ سکتی تھی۔

مجھے اکیلے گھر میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ میں کمرے سے نکلا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چھت پر آ گیا۔ ہوا میں ہلکی خنکی موجود تھی۔ تاریک آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ یہ رات بارہ بجے کا عمل تھا۔ بستیاں اونگھ رہی تھیں اور سو رہی تھیں۔ دور فاصلے پر مینار پاکستان کی روشنی بھی جیسے کسی گمبھیر سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ عمران کو فون کروں مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں چھت پر ٹہلتا رہا۔ ذہن پر صرف اور صرف عمران کی سیاہ جیکٹ چھائی ہوئی تھی۔ اَن گنت اندیشے دل و دماغ میں سر اُبھارنے لگے۔

اچانک مجھے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ آہٹ گھر کی عقبی گلی سے اُبھری تھی۔ تب مجھے دو سائے دکھائی دیئے۔ وہ گھر کی بیرونی دیوار کے ساتھ حرکت کر کے اوجھل ہو گئے۔ یکا یک

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے سے پھٹنے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جو آہٹ سنائی دی، وہ گھر کے عقبی صحن سے اُبھری تھی اور یہ کسی کے صحن میں کودنے کی آواز تھی۔ کوئی گہری تاریکی کا فائدہ اُٹھا کر صحن میں کودا تھا۔ میں نے اس کودنے والے کو بڑی تیزی سے برآمدے میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ یہ گرانڈیل شخص کوئی اور نہیں شیرا ہے۔ تو کیا...... تو کیا وہی ہوا تھا جس کے بدترین اندیشے موجود تھے؟ میڈم اور اس کے ہرکاروں کو اصل معاملے کی ٹوہ لگ گئی تھی؟ دونوں طرف کی چھتیں کافی نیچی تھیں ورنہ میں ان میں سے کسی چھت پر کود جاتا۔ میں شدید خوف کے عالم میں خود کو بمشکل سنبھالتا ہوا زینوں سے اُترا اور پہلی منزل پر پہنچا۔ میرا گلا خشک ہو چکا تھا اور ہاتھ پاؤں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ نچلی منزل کے نصف زینے طے کر کے میں اس قابل ہو گیا کہ گراؤنڈ فلور کے دو کمروں میں جھانک سکوں۔ ان میں سے ایک کمرہ وہ تھا جہاں میں کچھ دیر پہلے موجود تھا۔ میری روشن کی ہوئی موم بتی ابھی تک سائیڈ ٹیبل پر روشن تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے مجھے لگا کہ شاید کمروں میں کوئی نہیں اور میرے اندیشوں نے مجھے کسی وہم کا شکار کیا ہے۔ تاہم کچھ دیر بعد یہ خوش فہمی مکمل طور پر دور ہو گئی۔ میں نے کمرے میں دو سائے دیکھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں یقیناً پسٹل تھا۔ وہ بڑے چوکس انداز میں دروازے کی طرف رُخ کیے کھڑا تھا۔ دوسرا سایہ الماری کی طرف متوجہ ہوتھا۔ مدھم روشنی میں مجھے اس کی حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ الماری میں سے کپڑے اور دیگر اشیاء اُٹھا اُٹھا کر قالین پر پھینک رہا تھا۔

اسی دوران میں گھر کے پہلو کی طرف سے بھی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ شاید ان کا تیسرا ساتھی گھر کی بغلی راہداری میں موجود تھا۔ مجھے اس کے بھاری قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے دوبارہ کمرے میں جھانکا تو ہر اندیشہ سچ کا روپ دھارنے لگا۔ اندر گھسنے والے ایک شخص کے ہاتھ میں وہی جیکٹ نظر آئی جو کچھ دیر پہلے میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ شخص جیکٹ کی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ تب شاید وہ جیب کے سوراخ تک پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر جیکٹ کو دیکھا اور پھر موم بتی کے بالکل پاس پہنچ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

میرے لیے وہاں مزید کھڑے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور سات آٹھ زینے چڑھ کر واپس پہلی منزل پر آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اس منزل کی ایک کھڑکی پڑوسی زاہد حسین کی چھت کی طرف کھلتی ہے۔ میں اس کھڑکی کے ذریعے اس چھت پر اُتر سکتا تھا۔

مجھے نہیں پتا میں کب کچن کے ساتھ والے کمرے میں پہنچا۔ کب میں نے کھڑکی کھولی اور کب میرے پاؤں ساتھ والے گھر کی چھت سے ٹکرائے۔ میں زینے اُتر کر زاہد کے گھر کی بغلی راہداری میں پہنچا۔ زاہد انڈین فلموں کا شوقین تھا۔ اندر کسی کمرے میں اس وقت بھی فلم لگی ہوئی تھی۔ ہیروئن کی آواز آرہی تھی۔ کتنا حسین موسم ہے۔ کتنا سکون...... کتنی خوبصورتی۔ جی چاہتا ہے کہ یہ سب کچھ یہیں پر ٹھہر جائے۔

جواب میں غالباً ہیرو کی آواز اُبھری۔ یہ رات ایک دلہن جیسی ہے۔ مجھے تو تمہارے ساتھ ساتھ اس رات سے بھی پیار ہو رہا ہے۔

کتنا تضاد تھا اس فلمی مکالمے میں اور موجودہ صورتِ حال میں۔ میرے لیے یہ رات اور اس رات کی یہ گھڑیاں قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھیں۔ اردگرد کی ہر شے مجھے اپنی نگاہوں میں گھومتی محسوس ہوتی تھی اور سانس سینے میں سما نہیں رہی تھی۔ چند ساعتوں کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ زاہد کو مدد کے لیے پکاروں مگر پھر میں نے یہ ارادہ بدل دیا۔ میں جانتا تھا کہ گھر میں زاہد، اس کی بیوی اور ایک چھوٹے بچے کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا اور یہ تینوں اس قابل نہیں تھے کہ شیرے اور اس کے گماشتوں کے خلاف میری فوری مدد کر سکتے۔

میں راہداری سے گزرا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جاؤں۔ کچھ فاصلے پر جا کر ہی میں کسی کو مدد کے لیے کہہ سکتا تھا یا پھر عمران اور اقبال وغیرہ کو فون کر سکتا تھا۔

دفعتاً میری نگاہ گلی میں کھڑے ایک شخص پر پڑی۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہو گیا کہ یہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو گھر میں گھسے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میری طرف دیکھتا اور کسی شک میں پڑتا، میں نے نیچے جھک کر خود کو ایک گاڑی کی اوٹ میں کر لیا۔ یہ سوزوکی کا ”ہائی روف“ ڈبا تھا۔ گلی سنسان تھی، چھپنے کے لیے اردگرد کوئی جگہ موجود نہیں تھی اور وہ شخص کسی بھی لمحے مجھے گھوم کر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ڈبے کے اگلے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس سوزوکی ڈبے کے اندر گھس گیا۔

تب میری نظر ایک اور شے پر پڑی اور میں حیران ہوا۔ سوزوکی ڈبے کی چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ یہی وقت تھا، جب گلی میں کھڑے سائے ایک سے دو ہو گئے۔ مجھے لگا کہ انہوں نے مجھے ڈبے میں گھستے دیکھ لیا ہے اور اگر نہیں دیکھا تو بھی شک میں ضرور مبتلا ہو گئے ہیں۔ میرے ذہن میں کچھ اور نہیں آیا۔ میں نے نیچے جھکے جھکے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ میری

توقع پوری ہوئی گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ مجھے یہ سب کچھ تائیدِ غیبی کی طرف لگ رہا تھا۔ گاڑی کے دروازے کا کھلا ملنا، اگنیشن میں چابی موجود ہونا اور پہلے ہی سیلف میں انجن کا اسٹارٹ ہو جانا۔ یہ سب کچھ میری ہنگامی ضرورت کے مطابق تھا۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گیئر لگا کر گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

مجھے اپنے پیچھے دونوں سایوں کی تیز حرکت دکھائی دی۔ وہ پہلے گاڑی کی طرف لپکے تھے پھر اسے پہنچ سے دور دیکھ کر رک گئے تھے۔ اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان کا تعلق گھر میں گھسنے والوں میں سے تھا۔ رات کے وقت یہ اندرونی سڑک سنسان تھی۔ میں گاڑی کو تیزی سے بڑی سڑک پر لے آیا اور یہی وقت تھا جب مجھے اپنے عقب میں ایک گاڑی کی تیز رفتار روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ گاڑی بھی اندرونی سڑک سے نکلی تھی اور اب بلا کی طرح میرے پیچھے آرہی تھی۔

میری زندگی میں اب تک جو سب سے بُرا واقعہ پیش آیا، وہ سیٹھ سراج والا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس سے بھی بُری صورتِ حال کا شکار ہونے والا ہوں۔ وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کے اندیشے اب تک میرے ذہن میں کلبلاتے رہے تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ عمران جوان سارے حالات کا ذمے دار تھا اور جس کی وجہ سے میں اس مشکل ترین سچویشن میں پھنسا تھا، وہ بھی میرے ساتھ نہیں تھا۔ ان لمحوں میں مجھے اس پر بہت طیش آیا۔ اس کی وہ دلیری و جرأت بھی قابلِ نفرت شے محسوس ہوئی جس کا میں اب تک معترف رہا تھا۔

گاڑی پوری رفتار سے میرے پیچھے آرہی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ گاڑی کسی پولیس اسٹیشن میں گھسا دوں؟ یا پھر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں بہت سے لوگ موجود ہوں؟ وہاں جا کر دہائی مچاؤں کہ میری مدد کی جائے یا پھر......

کئی خیالات برق رفتاری سے ذہن میں آ اور جا رہے تھے مگر عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر سوچا کہ عمران سے سیل فون پر رابطہ کروں۔ جیب پر ہاتھ مارا تو جیب خالی تھی۔ پتلون کی جیبیں بھی خالی تھیں۔ فون موجود ہی نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو شاید اس صورتِ حال میں مَیں گاڑی چلانے کے ساتھ ساتھ نمبر ڈائل نہ کر سکتا۔ پیچھے آنے والی گاڑی اب بہت قریب آ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے آنے والی کار بھی سوزوکی مہران تھی۔ اس میں وہی چادر پوش شخص نظر آیا جو گلی میں ٹہل رہا تھا۔ خوف کے باوجود میرے اندر تھوڑا تھوڑا طیش بھی جمع ہو رہا تھا۔ جی چاہا کہ پیچھے آنے والی گاڑی کو سائیڈ مار کر سڑک سے اُتارنے کی کوشش کروں۔ یہی وقت تھا جب ایک موڑ پر میری گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا۔ گو کہ موڑ پر اسپیڈ بہت

تیز نہیں تھی مگر جھٹکا شدید تھا۔ گاڑی سائیڈ کے پختہ کنارے سے ٹکرائی تھی۔ مجھے جو آخری احساس ہوا، وہ یہ تھا کہ گاڑی اُلٹ رہی ہے اور میرا دل دایاں کندھا کھڑکی سے ٹکرایا ہے۔ اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا۔ ایک گہرا اندھیرا تھا جس نے ہر طرف سے مجھے ڈھانپ لیا تھا۔ اس اندھیرے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے سامنے کمرے کی سفید ڈیزائن دار چھت دکھائی دے رہی تھی۔ میں کسی بستر پر چت لیٹا تھا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی۔ کسی نے مجھے اُٹھنے سے روک دیا لیکن ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ تب مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ میں ایک سنگل بیڈ کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ میرے جسم کے گرد نائیلون کی زرد رسّی نظر آ رہی تھی۔

میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے ایکسیڈنٹ سے پہلے پہنا ہوا تھا۔ میرا دایاں کندھا اور بازو عریاں تھا، یہاں سے قمیص پھاڑ دی گئی تھی۔ کندھے اور بازو پر سے جلد بہت بُری طرح چھلی ہوئی تھی۔ ان زخموں پر کوئی مرہم لگایا گیا تھا۔ گھڑی پانچ بجے کا وقت بتا رہی تھی اور کھڑکیوں سے باہر دھوپ کے آثار تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں سولہ سترہ گھنٹے بعد میں ہوش میں آیا ہوں۔ یہ ایک متوسط درجے کا گھر تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر چند دوائیں اور انجکشن وغیرہ رکھے تھے۔

"کوئی ہے؟" میں نے پکار کر کہا۔ میرا گلا بالکل خشک تھا۔

ایک جواں سال عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ عام سے لباس میں تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جو اس کا دودھ پی رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوتے عورت نے بچے کو خود سے پیچھے ہٹا کر اپنی قمیص برابر کر لی۔ وہ شکل سے شریف نظر نہیں آتی تھی۔ جیسے کہ بعد میں پتا چلا، اس کا نام تابندہ تھا اور وہ بازاری عورت تھی۔

"کیہہ گل ہے؟" اس نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں کون لایا ہے؟ مجھے باندھا کیوں گیا ہے؟"

"ان ساری باتوں کے جواب تو میرا بندہ ہی آ کر دے سکتا ہے۔ بس وہ آنے ہی والا ہے۔ باقی تُو نے کوئی پانی شانی پینا ہو تو مجھ کو بتا؟"

میں نے ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کی مگر رسّی کی بندشیں بڑی مضبوط تھیں۔ کئی جگہوں پر رسّی میرے جسم کے اندر گھس رہی تھی۔

"میرا قصور کیا ہے؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"تیرے قصوروں کا بھی میرے بندے کو ہی پتا ہے۔ مجھے تو بس ایک بات بتائی ہے انہوں نے تُو گاڑیاں شاڑیاں چوری کرتا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ کون چوری کرتا ہے گاڑیاں؟"

"پولیس جب چھتر مارے گی نا تو سب کچھ بتاؤ گے تم۔ ویسے شکل سے تو تم بھلے مانس لگتے ہو۔ پتلون بھی پہنی ہوئی ہے۔ عام بندہ دیکھے تو یقین نہ کرے کہ چور ہو۔"

میرا سر پہلے ہی بُری طرح چکرا رہا تھا۔ اس عورت کی باتوں سے بالکل ہی گھومنے لگا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پانی مانگا۔ وہ پانی لینے چلی گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کو رسّی کی بندشوں کے اندر ہی ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ ہل رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہڈیاں سلامت ہیں۔ بس کندھے، بازو اور گردن میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ یہ رگڑ کی چوٹیں تھیں۔ کل رات والے سارے مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے ایک موڑ پر سوزوکی ڈبے کو تیزی سے بائیں طرف کاٹا تھا پھر جھٹکا لگا تھا اور مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

وہ پانی لے آئی اور تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے پلایا۔ اس کے جسم سے پسینے کی بُو آ رہی تھی۔ اتنے میں کمرے سے باہر اس کا بچہ رونے لگا۔ اس نے محتاط نظروں سے میری رسّی کی بندشیں چیک کیں اور باہر چلی گئی۔ "سنو...... میری بات سنو۔" میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ تکلیف اور شدید پریشانی کے باوجود میرے ذہن پر غنودگی چھا رہی تھی۔ شاید یہ مجھے دی جانے والی دواؤں کا اثر تھا۔

میں نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ میں کہاں ہوں؟ مجھے یہاں باندھنے والے لوگ کون ہیں؟ عمران اور اقبال کو میرے حالات کا علم ہوا ہے یا نہیں؟ اگر مجھے شیرے وغیرہ نے ہی یہاں تک پہنچایا ہے تو پھر ابھی تک کوئی شناسا صورت کیوں دکھائی نہیں دی؟ میں ارد گرد کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ غالباً یہ گھر کسی گنجان آبادی میں نہیں تھا۔ ہاں...... اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ یہ شہری علاقہ ہی ہے۔ کچھ فاصلے سے والز آئس کریم والے سائیکل سوار کا میوزک سنائی دیا۔ اس بے جا شور پر کسی کتے نے آئس کریم والے کو ڈانٹ پلائی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میرے سر کے چکروں میں اضافہ ہوتا گیا، آنکھوں کے سامنے دھندلاہٹ چھانے لگی۔ مجھ پر ایک بار پھر شدید غنودگی کا غلبہ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا سارا جسم آگ میں پھنک رہا ہے۔

اگلا کافی سارا وقت عجیب بے ہوشی یا غشی کی کیفیت میں گزرا۔ مجھے بس یہ احساس تھا کہ میں اسی کمرے میں موجود ہوں، میرے بدن کے کچھ حصوں پر نائیلون کی رسّی بُری طرح چبھ رہی ہے۔ میرے اردگرد کچھ لوگ موجود ہیں۔ وہ کمرے میں آتے اور جاتے ہیں۔ ان میں ایک بہت بھاری آواز والا شخص بھی ہے۔ میں نے نیم بے ہوشی کے عالم میں اس بھاری آواز والے شخص سے کچھ کہا بھی۔ کیا کہا یہ خود مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ پھر شاید میں نے اپنی والدہ کو پکارا۔ فرح کو آواز دی۔ اس کے بعد مجھے بازو پر سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے انجکشن لگایا جا رہا ہے۔ مجھے شاید بہت تیز بخار ہو چکا تھا۔ کسی نے میرا سر بھگو دیا۔ میں نے زور لگا کر رسیاں توڑنے کی کوشش کی۔ میں نے کسی کو گالی دی۔ تب مجھے لگا کہ میں ایک بار پھر کسی گہرے تاریک کنویں میں اُترتا جا رہا ہوں۔ اس پُرخوف تاریکی میں اندیشوں کے دیو چنگھاڑ رہے تھے۔ مجھے اندر سے بُری طرح توڑ پھوڑ رہے تھے۔ میں پتا نہیں کہ کب تک اس کنویں کی گہرائی میں زماں و مکاں کی قید سے آزاد پڑا رہا۔ تب ایک بار پھر میرے حواسِ خمسہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیانی خلا میں چکرانے لگے۔ یہ شاید دن کا وقت تھا، آنکھوں کی بند پلکوں پر سرخ روشنی پڑ رہی تھی۔ تب اس روشنی میں سے میری بے باک کزن آرسہ کا سراپا نمودار ہوا۔ وہ اپنی جوبن بھری اداؤں سے مجھے رجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ تم اس دن گیارہ بجے آئے کیوں نہیں تھے؟ تم آ جاتے تو میں تمہیں زندگی کا مفہوم سمجھا دیتی۔ تمہیں سر سے پاؤں تک سیراب کر دیتی۔ میں نے اسے سخت ڈانٹ پلائی۔ میں نے کہا کہ تم دھوکے باز ہو۔ تم مجھے بیوقوف بنا رہی ہو۔ تم ثروت کے پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو۔ میں نے تمہاری وہ ساری باتیں سنی تھیں جو تم اپنی کسی سہیلی سے کر رہی تھیں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہارے کردار پر۔ وہ ایک دم اوجھل ہو گئی۔ میں نے اپنی پیاری بہن فرح کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''یہ کیا ہوا بھائی! آپ قاتل تو نہیں ہو سکتے۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔'' اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ''نہیں میری بہن! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں ان دونوں کے ساتھ تھا۔''

فرح نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی لیکن اپنے بھائی پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

تب ایک دم میں ہڑپہ کے کھنڈرات پہنچ گیا۔ وہاں گرما کی ایک نہایت گرم و سنسان دوپہر تھی۔ دھول اُڑ رہی تھی، بگولے چکرا رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں ثروت کا ہاتھ تھا۔ ہم

بھاگ رہے تھے۔ جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ گہرے سانولے چہروں اور سرخ آنکھوں والے کچھ قدیم لوگ ہمارے پیچھے تھے۔ پیاس سے میرے جسم میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ میری زبان خشک چمڑے کا ٹکڑا ہو کر رہ گئی تھی۔ میرے گلے میں زہریلے کانٹے چبھ رہے تھے۔ پھر میرے کانوں سے وہی بھاری آواز ٹکرائی جو اس بے ہوشی و نیم بے ہوشی میں گاہے بگاہے میری سماعت میں داخل ہوتی تھی۔ یہ بھاری آواز کرخت لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''منہ کھول...... منہ کھول۔''

میں نے لبوں کو حرکت دی۔ ٹھنڈا پانی...... آبِ حیات کی طرح میرے ہونٹوں، دانتوں اور زبان سے ٹکرایا۔ پھر گلے کے زہریلے کانٹوں کو اپنی ٹھنڈک سے ڈھانپنے لگا۔

''لگتا ہے کہ ہوش میں آ رہا ہے۔'' نسوانی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ شاید یہ وہی عورت تھی جس کے سینے سے میں نے شیر خوار بچے کو چمٹے دیکھا تھا۔

غنودگی اور بیداری کے ریلے سے آتے رہے۔ پھر میری بے ہوشی شاید نیند میں بدل گئی۔ میں اپنے اردگرد دیکھنے کے قابل ہوا تو کمرے میں ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ وال کلاک کی سوئیاں نو بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ میرے بازو پر گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ بڑی سُست رفتاری سے ایک ایک قطرہ گر رہا تھا۔ میرے گرد رسّیوں کی مضبوط بندشیں بدستور موجود تھیں۔ صرف وہ بازو آزاد تھا جس پر انجکشن وغیرہ دینے کے لیے ''کینولا'' لگایا گیا تھا۔

میں نے کسی کو پکارنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ٹھٹک گیا۔ مجھے ساتھ والے کمرے سے باتوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ یقیناً یہ وہی طوائف نما عورت تھی جس سے پہلے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ غالباً وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں سو رہا ہوں یا نیم بے ہوشی کے عالم میں ہوں۔ لگتا تھا کہ دوسری طرف اس کی کوئی بے تکلف سہیلی ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''ہائے...... ہائے اب میں تجھ سے بھی چھپاؤں گی۔ اگر چار پیسے ہتھ آئے ہوتے تو سب سے پہلے تیرا کرجا (قرضہ) اُتارتی۔ نئیں...... نئیں تیرے سر کی قسم۔ میں تجھ سے بھلا جھوٹ بول سکدی ہوں۔ نئیں نئیں یہ تو ٹھیک ہے کہ آبادی میں سب سے کھاتا پیتا گھر وہی تھا، پر اندر سے کچھ ملا نئیں ہے۔ اوپر سے وہ گڈی والا مسلہ ہو گیا۔ ہاں ہاں رشید، ماجھو اور کالا اندر وڑے ہوئے تھے۔ گلجار اور جیرا باہر پہرا دے رہے تھے۔ وہ خبیث شاید چھت پر تھا۔ اس نے اوپر سے ہی دیکھ لیا کہ گھر میں لوگ وڑ آئے ہیں۔ اس نے ساتھ والی چھت پر چھال ماری اور وہاں سے باہر سڑک پر آ گیا۔ اب دیکھو اللہ کی مرجی...... وہ رشید والی گڈی میں ہی وڑ گیا۔ گڈی کی چابی بھی گڈی کے اندر ہی تھی۔ اس نے اسٹارٹ

کی اور گڈی تو ردی (چلا دی) گلجار اور جیرے نے جب دیکھا کہ اپنی ہی گڈی ہتھ سے نکلنے لگی ہے تو دوسری گڈی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے دوڑے۔ بتی والے چوک سے تھوڑا پہلے وڈی باہچی کے پاس اس خبیث نے گڈی اُلٹا دی۔ اس کے سر اور مونڈھے پر سخت چوٹیں آئی ہیں۔ گلجار اور جیرے کے دماک نے ٹھیک کام کیا۔ انہوں نے اپنی گڈی روک دی اور دو چار راہ گیروں کے ساتھ مل کر اس خبیث کو اپنی گڈی میں ڈال لیا۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ اسے ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ وہ اسے یہاں لے آئے۔''

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔

تابندہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔''رشیدے اور ماجھو کا کیا بنتا تھا۔ جب انہوں نے اندر سے دیکھا کہ اپنی دونوں گڈیوں نے ایک دم آگے پیچھے دوڑ لگا دی ہے تو وہ ڈر گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ کوئی کھترا ہو گیا ہے۔ وہ بھی گھر سے نکل کر پچھلی آبادی کی طرف بھج (بھاگ) گئے۔''

تابندہ قریباً دس منٹ مزید باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ ان میں سے رشید نام کا بندہ اس عورت کا رسمی یا اصلی خاوند ہے۔ باقی اس کے رسمی دیور بنے ہوئے ہیں۔ اس چرب زبان عورت کی اسی نوے فیصد باتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان باتوں سے مجھ پر ایک حیران کن انکشاف ہوا اور وہ انکشاف یہ تھا میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہوا ہوں۔ اس رات ہمارے گھر میں گھسنے والے بندے صرف اور صرف وارداتیے تھے۔ ان کا میڈم صفورا یا سیٹھ سراج وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی ان میں شیرا یا بختیار وغیرہ شامل تھے۔ مجھے اپنے دل و دماغ میں درد کی ٹیسیں محسوس ہوئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ صرف میرے اندرونی اندیشے تھے جنہوں نے مجھے حالات کی ایک بالکل غلط تصویر دکھائی اور میں ان وارداتیوں کو میڈم کے ہرکارے سمجھ کر اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔ دوسرا غلط اتفاق یہ ہوا کہ میں نے موقع سے بھاگنے کے لیے انہی وارداتیوں کی گاڑی استعمال کر لی۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی گاڑی کا پیچھا تو کرنا ہی تھا۔ ان کے پاس Cover کے طور پر دوسری گاڑی بھی موجود تھی۔ وہ اس پر میرے پیچھے آئے اور نتیجے کے طور پر میں یہاں زخمی حالت میں اس چار دیواری میں آ پھنسا۔

مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ یہ سب کچھ اس طرح سے کیوں ہوا؟ کیوں میں نے اس سارے معاملے کو میڈم صفورا اور نادیہ وغیرہ سے نتھی کر دیا؟ اگر میں کچھ اور نہ بھی کرتا، بس پڑوسی زاہد حسین کو بتا دیتا اور وہ شور مچا کر محلے والوں کو جگا دیتا تو وارداتیوں نے راہِ فرار

اختیار کر لینی تھی اور ممکن تھا کہ ان میں سے ایک دو پکڑے بھی جاتے۔ مگر میری شدید غلط فہمی اور جلد بازی کی وجہ سے صورتِ حال کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ وہ مناظر میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کمرے میں ایک شخص کو عمران کی جیکٹ کا معائنہ کرتے دیکھا تھا اور میرے دماغ نے اس کے سوا اور کچھ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ میڈم صفورا کے لوگ ہیں اور انہیں نادیہ کے زخمی ہونے کی اصل وجوہات معلوم ہو چکی ہیں۔

تو عمران ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی اندرونی ناتوانیوں کے سبب حالات کا بدترین پہلو دیکھتے ہیں۔ دنیا جہاں کے اندیشے انتہائی برق رفتاری سے ان کے دماغ میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔

تابندہ سیل فون پر اپنی گفتگو ختم کر کے میرے والے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر تک ایک الماری میں سے کچھ تلاش کرتی رہی۔ میں آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑا رہا۔ وہ میری طرف آئی اور میرے پاؤں کے انگوٹھے کو ہلا کر بولی۔''اوئے اُٹھ جا اب کب تک مُردے کی طرح بے سدھ پڑا رہے گا۔ جو چن تُو نے چڑھانا تھا وہ تو چڑھا دیا ہے۔''

میں نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجھے ترس بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''پانی پیئے گا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شاید گلوکوز کی وجہ سے پیاس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''کچھ نہ کچھ پی لے۔ پھر تو شاید تیری قربانی ہو ہی جانی ہے۔'' وہ کھڑکی کا پردہ درست کرتے ہوئے بولی۔ اس کا رُخ دوسری طرف تھا۔

پتا نہیں کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ میری طرف مڑی تو میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیدے پاڑ پاڑ کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے کوئی گلت بات تو نئیں کہہ دی ہے۔ تُو نے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے۔ لگتا ہے کہ تجھے اور تیرے یاروں کو کسی پیر فقیر کی بددعا لگ گئی ہے۔''

''پپ..... پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔'' میں نے نہایت نحیف آواز میں کہا۔ اپنی آواز خود مجھے بھی اجنبی لگ رہی تھی۔

وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔''تُو شکل سے تو پڑھا لکھا لگتا ہے۔ پھر تُو ایسے کھترناک لوگوں کے چکر میں کیسے پڑ گیا؟''

''کون لوگ؟'' میں کراہا۔

”وہی جن کے تُو نام لے رہا تھا عمران اور پتا نہیں دوجا نام کیا تھا۔ کمال کہ اقبال۔“ میں چکرا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے کب ان کے نام لیے ہیں۔ اچانک مجھے لگا کہ شاید میں بخار کی بے ہوشی میں کچھ بڑبڑاتا رہا ہوں۔ تابندہ نامی یہ عورت بدستور مجھے ترحم آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے میں پھانسی کا مجرم ہوں اور مجھے پھانسی گھاٹ کی طرف لے جایا جانے والا ہے یا پھر میں ایک جاں بلب مریض ہوں اور کسی ایسے آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر کی طرف روانہ ہونے والا ہوں جس سے میرے بچنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تابندہ کے دیکھنے کے انداز نے مجھے انجانے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

اگلے دو چار منٹ میں میرے اور تابندہ کے درمیان جو بات ہوئی، اس نے مجھ پر ایک اور لرزہ خیز انکشاف کیا اور یہ انکشاف یہ تھا کہ میں شدید بخار کے دوران میں بڑبڑاتا رہا ہوں۔ میں نے بہت سارا ہذیان بولا ہے اور اس میں کچھ ایسی باتیں بھی شامل ہیں جو مجھے ہرگز ہرگز نہیں کہنی چاہیے تھیں۔ میرے جسم کے ہر مسام میں سے پسینہ بہہ نکلا۔ مجھے محسوس ہوا، شاید میں پھر بے ہوش ہو جاؤں گا۔

تابندہ کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ گمبھیر انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”تیرے بکھار (بخار) کی بے ہوشی نے تیرے بہت سے پردے کھول دیئے ہیں۔ تُو نے لال کوٹھیوں کی بات کی ہے اور کسی وڈی میڈم کی بات کی ہے۔ تُو نے قسمیں کھائی ہیں کہ تُو نے چھوٹی میڈم کو گولی نہیں ماری۔ تُو نے اس کا الجام اپنے یار عمران پر لگایا ہے اور کہا ہے کہ تجھے بھی اس گل کا پتا بعد میں چلا تھا۔ بس اسی طرح کی بکواس کی ہے تُو نے لگتا ہے کہ تُو نے رشید اور اس کے یاروں کو ”لال کوٹھیوں والے“ سمجھا ہے۔ انہیں دیکھ کر تُو جس طرح گھر سے نکلا ہے اور بھاگا ہے، اس سے بھی یہ شک پکا ہو گیا ہے کہ تُو نے اور تیرے یاروں نے ضرور کوئی کارنامہ کیا ہے اور کیا پتا قتل شتل ہی کر دیا ہو۔“ میرا سر چکرانے لگا۔ یہ عورت کیا کہہ رہی تھی؟ کیا میں واقعی یہ سب کچھ اپنی زبان سے کہہ چکا تھا؟ میرا دل چاہا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں اور پھر کبھی ہوش میں نہ آؤں۔ شاید اسی لیے کچھ دیر پہلے اس تابندہ نام کی عورت نے کہا تھا کہ جو چن تُو نے چڑھانا تھا وہ چڑھا دیا ہے۔

تابندہ کی دل ہلا دینے والی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”لگتا ہے کہ تیرے بھیڑے نصیبوں پر ٹھپا لگ گیا ہے۔ جو کچھ تُو نے بکھار کی حالت میں کہا ہے، اس پر شاید میرا بندہ اور اس کے یار جیادہ گور (غور) نہ کرتے۔ پر میرے بندے رشیدے کے یاروں میں سے گلیجا راس چھوٹی وڈی میڈم کو جانتا ہے جس کی تُو نے بات کی ہے۔ اسے

یہ بھی پتا ہے کہ ان میں سے ایک میڈم کو گولی لگی ہے اور وہ ہسپتال میں پڑی ہے۔ اب سمجھ لے کہ تیری کتنی بھیڑی کمبختی آنے والی ہے۔“ وہ مجھے ڈرا رہی تھی۔ اس کے انداز میں تھوڑا تھوڑا ترس تھا اور تھوڑا تھوڑا مزہ بھی۔

میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ بولی۔ ”ویسے یہ عمران اور کمال کون ہیں اور اب کہاں ہیں؟“ وہ اقبال کو کمال کہہ رہی تھی۔

”مجھے کچھ پتا نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ سر اور گردن کے پچھلے حصے میں شدید ٹیسیں اُٹھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں سے جلد بُری طرح چھلی ہوئی ہے۔

”دیکھ...... ابھی تھوڑی دیر میں سارا پتا تو چل ہی جانا ہے۔ اگر تُو اپنے منہ سے بتا دے گا تو شاید تیری کچھ بچت ہو جائے۔“

اسی دوران میں کسی ساتھ والے کمرے سے دھم کی آواز اور پھر ایک بچے نے یکبارگی رونا چلانا شروع کر دیا۔ یقیناً یہ تابندہ کا بچہ ہی تھا۔ وہ نیند میں بیڈ پر سے نیچے پکے فرش پر گر گیا تھا۔

”ہائے میں مری۔“ تابندہ نے کہا اور اُٹھ کر تیزی سے بچے کی طرف چلی گئی۔ اس کی گود سے موبائل اور ایک تڑا مڑا سا کاغذ نیچے دری پر گر پڑا لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ یہ وہی موبائل تھا جس پر وہ ابھی کچھ دیر پہلے اپنی کسی سہیلی سے بے تکان باتیں کر رہی تھی۔ بچے کو شاید زیادہ چوٹ لگی تھی۔ وہ پورے زور سے چلاتا جا رہا تھا۔ ”ہائے میں مرگئی۔ سارا ہوٹ (ہونٹ) پاٹ گیا ہے۔“ اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

پھر وہ بچے کو لے کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔ غالباً وہ اس کا خون بند کرنے کے چکر میں تھی۔ میری نظر نیچے دری پر پڑے سیل فون کی طرف گئی۔ میرا ایک بازو رسّی کی بے رحم بندشوں سے آزاد تھا۔ اگر میں کوشش کرتا تو میں اپنا ہاتھ اس سیل فون تک پہنچا سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کیے اور زور لگا کر اپنا ہاتھ نیچے دری تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ہاتھ موبائل تک تو نہیں پہنچا تاہم مڑا تڑا کاغذ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے سینے پر رکھ کر اسے کھولا۔ یہ شاید کوئی فون بل تھا۔ میں نے اسے ایک طرف رکھ دیا اور دوبارہ موبائل فون کے لیے کوشش کرنے لگا۔ بندشیں بڑی سخت تھیں۔ جہاں تک میرا ہاتھ پہنچتا تھا، وہاں تک کوئی گرہ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے پوری طاقت لگا کر جسم کو دائیں بائیں ہلایا اور رسّی کے بل ذرا ڈھیلے کرنے کی کوشش کی۔ اس میں بہت تھوڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک بار پھر بازو لمبا کر کے فون سیٹ تک پہنچانا چاہا۔ اس

بار کامیاب ہوا۔ فون سیٹ میری دو انگلیوں کے درمیان آ گیا۔ اس جان توڑ کوشش میں میری گردن اور کندھے کے زخموں پر جیسے قیامت گزر گئی تھی۔

برآمدے کی طرف سے جو آوازیں آ رہی تھیں، ان سے پتا چلتا تھا کہ تابندہ بچے کا منہ وغیرہ دھونے میں مصروف ہے۔ وہ مسلسل شور مچا رہا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے موبائل پر عمران کا نمبر پریس کیا۔ موبائل کان سے لگایا، دوسری بیل پر ہی کال ریسیو ہو گئی۔ عمران کی آواز آئی۔ ''ہیلو کون؟''

''عمران! میں تابش بول رہا ہوں۔'' میں نے تیز سرگوشی کی۔

''تابش! کہاں ہو تم... ت... تم نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ تم خیریت سے تو ہو۔''

''عمران! میں خیریت سے نہیں ہوں اور یہاں میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ یار! مجھے کچھ لوگ اُٹھا کر یہاں لے آئے ہیں۔ مجھے رسیوں سے باندھا گیا ہے۔ میرے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔''

''کون لوگ ہیں؟'' عمران کے لہجے میں یکلخت شدید فکرمندی در آئی۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ان کے نام رشید، جیرا اور گلزار وغیرہ ہیں۔ ایک بازاری عورت تابندہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ یہ کوئی عام سی رہائشی آبادی لگتی ہے۔''

''کچھ تھوڑا بہت اندازہ بھی نہیں کہ کون سی جگہ ہے؟''

اچانک میرا دھیان اس فون بل کی طرف چلا گیا جو زمین سے اُٹھایا تھا۔ میں نے جلدی جلدی بل کھول کر دیکھا اور عمران کو بتایا کہ مجھے ایک فون بل ملا ہے اس پر مختصر سا ایڈریس بھی لکھا ہوا ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ یہاں کا ایڈریس ہے یا کسی اور جگہ کا۔

''تم ایڈریس بتاؤ۔'' عمران تیزی سے بولا۔

''مستری بشیر۔ مکان نمبر 18۔ لالہ زار اسکیم۔ نظامی روڈ۔'' ساتھ ہی میں نے فون نمبر بھی لکھوا دیا۔

''وہاں اس وقت تمہارے آس پاس کتنے لوگ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس چار دیواری میں؟''

''ابھی تو صرف ایک عورت اور اس کا بچہ ہیں۔ کچھ دیر بعد کا پتا نہیں۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''تم بے فکر رہو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''کوئی آ رہا ہے۔ میں بند کر رہا ہوں۔'' قدموں کی چاپ سن کر میں نے فون بند کیا اور ہاتھ لمبا کر کے دوبارہ دری پر رکھ دیا۔

تابندہ اپنے جسم کو ہلکورے دیتی تیزی سے آئی۔ میری طرف دیکھے بغیر وہ الماری کی طرف متوجہ ہوئی اور ایک دراز کھول کر جلدی جلدی کچھ ڈھونڈنے لگی۔ قریبی کمرے میں بچے کے رونے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ تابندہ ایک دوائی اور روئی لے کر پھر باہر نکل گئی۔

میں اپنی جگہ چت لیٹا رہا اور دل کی دھڑکنیں گنتا رہا۔ آنے والے وقت میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عمران کو یہاں پہنچنے میں ناکامی ہو سکتی تھی۔ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی تابندہ کا شوہر اور اس کے ساتھی واپس آ سکتے تھے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جو ایڈریس میں نے عمران کو لکھوایا ہے، وہ کسی اور جگہ کا ہو۔

تابندہ بچے کے چکر میں پڑ کر وقتی طور پر مجھ سے غافل ہو گئی تھی۔ کمرے کے آخری گوشے میں لوہے کے ایک اسٹینڈ پر پی ٹی سی ایل کا فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ میں دور ہی سے دیکھ سکتا تھا کہ اس سیٹ پر سی آئی ایل لگی ہے۔ میں نے زور لگا کر اور بازو لمبا کر کے نیچے سے موبائل سیٹ دوبارہ اُٹھایا۔ فون بل پر لکھا ہوا فون نمبر مجھے یاد تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل پر وہی نمبر پریس کیا۔ میرا ''تجربہ'' کامیاب ثابت ہوا۔ کمرے کے گوشے میں رکھے ہوئے پی ٹی سی ایل کے فون پر بیل ہوئی۔ ابھی آدھی بیل ہی ہوئی تھی کہ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موبائل سیٹ اور فون کا بل پھر سے دری پر پھینک دیئے۔ اب مجھے اس بات کی تسلی ہو گئی تھی۔ ہاں...... کم از کم اس بات کی تسلی ہو گئی تھی کہ میں نے عمران کو جو ایڈریس دیا ہے وہ اسی چار دیواری کا ہے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں نے امید و بیم کی عجیب کیفیت میں گزارے۔ بخار ایک بار پھر بڑھ رہا تھا۔ پورا جسم چٹکنا شروع ہو گیا تھا۔ کیا میں ایک بار پھر بے ہوشی یا نیم بے ہوشی سے دوچار ہو جاؤں گا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ دل پر بہت بوجھ تھا جیسے کسی نے بڑے بھاری پتھر سینے پر رکھ دیئے ہوں اور یہ بوجھ انہی باتوں کا تھا جو ابھی تابندہ نے مجھے بتائی تھیں۔ تابندہ کے منہ سے چھوٹی اور بڑی میڈم کا ذکر سننے کے بعد اس کی باتوں پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور اس کا مطلب یہی تھا کہ میں اپنے ساتھ ساتھ عمران اور اقبال وغیرہ کے لیے بھی ایک بڑی مصیبت کھڑی کر چکا ہوں۔

عمران کی آمد میری توقع سے پہلے ہو گئی۔ گھر کی کال بیل سنائی دی، میرا دل ندی طرح

اُچھلا۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ تابندہ کا مبینہ شوہر اور گلزار وغیرہ آ گئے ہیں۔ مگر پھر مجھے اندازہ ہوا کہ تابندہ کسی کے لیے گھر کی بیٹھک کا دروازہ کھول رہی ہے۔ یہ دروازہ گلی کی طرف سے کھلتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ یہ عمران تھا اور اس نے خود کو رشید کا دوست ظاہر کیا تھا۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی عمران نے تابندہ کو دبوچ لیا۔ جب وہ دونوں میرے سامنے آئے تو یہ بڑا ڈرامائی منظر تھا۔ عمران نے تابدہ کو عقب سے جکڑا ہوا تھا۔ اس کی ایک ہتھیلی تابندہ کے ہونٹوں پر جمی تھی اور تابندہ کی آنکھیں خوف سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ وہ منہ سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکال پا رہی تھی۔ عمران کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔ کمرے کے اندر آنے تک تابندہ کی مزاحمت بس دس پندرہ فیصد ہی رہ گئی تھی۔

عمران اسے باتھ روم میں لے گیا۔ اسے دیوار کے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی پر پستول کی نال رکھی اور پھنکارا۔ ''اپنی اور بچے کی خیریت چاہتی ہو تو آواز نہ نکالنا۔''

اس کا رنگ سیاہی مائل ہو گیا۔ ساری تن فن جاتی رہی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑے اور گھگیائی۔ ''مجھے اور کاکے کو کچھ نہ کہنا۔ تم جو کہو گے میں کروں گی۔''

''تو چپ چاپ یہاں کھڑی رہو۔'' عمران کا لہجہ سفاک تھا۔

''مم...... میرے بچے کو یہاں لا دو، وہ رو رہا ہے۔''

بچہ واقعی اپنے سینے کی پوری طاقت سے چلا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی سانس رُک جائے گی۔

باتھ روم کو باہر سے کنڈی لگا کر عمران دوسرے کمرے میں چلا گیا اور روتے چلاتے بچے کو لے آیا۔ اس کا چہرہ زخمی تھا۔ عمران نے باتھ روم کی کنڈی کھول کر بچہ تابندہ کے حوالے کیا۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا۔ دہشت زدہ تابندہ نے ہمارے سامنے ہی قمیص اوپر کی اور بچے کو اپنے ساتھ لگا کر دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ پانچ دس سیکنڈ بعد دودھ اور بچے کا ملاپ ہو گیا اور اس کا رونا دھونا تھم گیا۔ عمران نے جیب سے چاقو نکالا اور بڑی پھرتی سے میری بندشیں کاٹ دیں۔ میں کھڑا ہوا تو مجھے چکر سے آنے لگے۔ عمران نے گلوکوز کی ڈرپ میرے جسم سے علیحدہ کی اور میرا جوتا ڈھونڈا۔

''جیبیں دیکھ لو۔ تمہارا کوئی سامان تو نہیں ہے یہاں؟''

میں نے پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ جیبیں بالکل خالی تھیں۔ میں نے باتھ روم میں کھڑی تابندہ سے پوچھا۔ ''میری چیزیں کدھر ہیں اور میرا موبائل؟''

''تت...... تمہاری جیب سے کچھ پیسے...... شناختی کارڈ اور ایک پین نکلا تھا، وہ ساری

چیزیں وہاں دراز میں پڑی ہیں۔'' اس نے سامنے الماری کی طرف اشارہ کیا۔

''اور موبائل؟''

''موبائل نہیں تھا تمہارے پاس۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

مجھے یاد آیا کہ موبائل واقعی میرے پاس نہیں تھا۔ راستے میں جب گلزار وغیرہ نے مہران کار پر میرا پیچھا شروع کیا تو میں نے عمران سے رابطہ کرنے کا سوچا تھا مگر پھر پتا چلا تھا کہ موبائل تو میں گھر پر ہی کہیں چھوڑ آیا ہوں۔

میں نے دراز میں سے اپنی باقی چیزیں سمیٹیں۔ عمران نے تابندہ کو ڈرا دھمکا کر خاموش رہنے کی تلقین کی اور باتھ روم کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میں قریباً 72 گھنٹے بستر پر رہا تھا۔ مثانے میں بہت سا پانی جمع ہو چکا تھا۔ میں ایک قریبی باتھ روم میں گیا۔ دو تین منٹ بعد ہم مکان سے باہر نکلے۔ یہ ایک درمیانے درجے کی زیر تعمیر آبادی تھی۔ اس مکان کے ارد گرد کئی پلاٹ خالی اور ویران پڑے تھے۔ عمران اپنی مہران کار میں آیا تھا۔ ہم کار میں بیٹھے اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔ یہ رات کے قریباً ساڑھے دس کا عمل تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے کراہتی آواز میں عمران سے پوچھا۔

''گھر۔''

''گھر نہیں...... کہیں اور چلو۔ کسی ریسٹورنٹ میں۔'' میرا لہجہ اندیشوں سے لبریز تھا۔

عمران نے گاڑی بائیں جانب موڑ دی۔ ہم وحدت روڈ پر سے گزرے اور پھر ایک ٹکا شاپ پر جا بیٹھے۔ ''کچھ کھاؤ گے؟'' عمران نے پوچھا۔

''نہیں...... مجھے بس کوئی جوس پلا دو۔'' میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

''تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔ چلو پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔'' عمران نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''نہیں...... عمران نہیں۔ ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔ معاملہ بہت خراب ہو چکا ہے۔'' میری آواز بیٹھ رہی تھی۔

''یار! کتنا بھی خراب ہے، ہم اسے ٹھیک کر لیں گے۔ تم پہلے خود کو ٹھیک کرو۔ مجھے تمہاری حالت اچھی نہیں لگ رہی۔''

میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ پھر عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بات سچ سچ بتاؤ نادیہ کی حالت اب کیسی ہے؟''

عمران کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''وہ ہسپتال میں ہی ہے۔ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ اس کا نچلا دھڑ کام نہیں کر رہا ہے۔ بے ہوشی بھی اسی طرح ہے۔''

''اس کی موت کا ذمے دار کون ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''کک...... کیا مطلب؟''

''دیکھو عمران! اگر میری اور اپنی دوستی کا دم بھرتے ہو تو مجھے ایک سوال کا جواب سچ سچ دینا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ کیا میں توقع رکھوں کہ تم ایسا کرو گے؟''

اس نے پھر ایک طویل سانس لی اور تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ''پوچھو۔''

''اسپیشل شو میں نادیہ کو گولی کیسے لگی تھی؟'' میں نے بہت دھیمی آواز میں دریافت کیا۔

اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔ ''تو تم نے میری وہ جیکٹ دیکھی ہے جس کی جیب میں سوراخ ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے سگریٹ کے دو گہرے کش لیے اور گمبھیر آواز میں بولا۔ ''تابش! اس سوراخ سے کچھ ثابت نہیں ہوسکتا۔ کچھ بھی نہیں اور اس سوراخ کے علاوہ بھی کچھ ثابت نہیں ہوسکتا۔ بہر حال تم نے جو اندازہ لگایا ہے وہ درست ہے۔''

میرے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ میں نے کہنیاں میز پر ٹیک کر اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''عمران! تمہیں کچھ پتا نہیں۔ ہم بُری طرح پھنس گئے ہیں۔'' میری آواز بھرا رہی تھی۔

اس نے میرا کندھا تھاما۔ ''اگر پھنس گئے ہیں تو نکل بھی جائیں گے لیکن پہلے تم خود کو سنبھالو اور مجھے آرام سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے۔ تم ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھے؟ تمہارے جسم پر اتنی زیادہ چوٹیں کیسے آئیں؟ کیا کہیں ایکسیڈنٹ ہوا ہے تمہارا؟''

میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور شروع سے ساری تفصیل عمران کے گوش گزار کر دی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں نے الماری میں اس کی جیکٹ دیکھی اور پھر پریشان ہو کر چھت پر چلا گیا۔ کیسے گھر میں وہ وارداتیے گھسے اور کس طرح ان سے بچنے کے لیے میں باہر گلی میں آ گیا۔ اس سے آگے کے سارے واقعات بھی میں نے عمران کے سامنے بیان کر دیئے۔ میں نے اپنی اس حماقت کا اعتراف کیا کہ میں رشید اور گلزار کو میڈم صفورا کے ساتھی سمجھا اور مجھے یہی لگا کہ وہ لوگ نادیہ کو گولی لگنے کے بارے میں سب

کچھ جان گئے ہیں۔ میں نے کہا۔

''جب وہ لوگ میرے پیچھے آئے تو میرا یہ یقین پکا ہوگیا کہ وہ عام وارداتیے نہیں بلکہ میڈم کے لوگ ہیں۔ اس وقت مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ میں ان کی گاڑی میں ہی فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے بعد بتی چوک کے قریب ایکسیڈنٹ ہوا اور مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں لالہ زار اسکیم کے اس گھر میں تھا۔''

عمران نے کہا۔ ''ٹھیک ہے تابش! یہ سب کچھ تمہاری غلط فہمی کی وجہ سے ہوا لیکن شکر کا مقام یہ ہے کہ گاڑی اُلٹنے کے باوجود تم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے اور اس سے بھی زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے کہ تم نے ہمت دکھائی اور اس عورت کے موبائل سے مجھے کال کر دی۔ اب تم محفوظ ہو۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تم چاہو گے تو ان لوگوں سے بھی بعد میں نمٹ لیں گے۔ ویسے گھر میں سے اقبال کی گھڑی اور میرے دس پندرہ ہزار روپے کے سوا کچھ گیا نہیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ تمہارے زخموں کو توجہ کی ضرورت ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہارا بخار بھی بڑھتا جا رہا ہے۔''

میں نے نہایت پریشانی سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں عمران! تم نے ابھی اصل بات سنی نہیں ہے۔ میں...... تمہارے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی کر چکا ہوں۔ تمہارے لیے بھی اور شاید اپنے لیے بھی۔ میں بہت بدقسمت ثابت ہوا ہوں تمہارے لیے۔''

عمران کی فراخ پیشانی پر سلوٹیں اُبھریں۔ اس نے پیار سے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''تابی یار! پلیز خود کو کمپوز کرو۔ جو کچھ بھی ہوا ہے مجھے بتاؤ۔ میں سنوں گا اور میں سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ پلیز بتاؤ۔''

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ زخمی ہونے کے بعد اپنے شدید بخار کے بارے میں بھی اور غشی کی حالت میں کی جانے والی ان باتوں کے بارے میں بھی جنہوں نے رشید، گلزار اور جیرے وغیرہ کو بے طرح چونکایا تھا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ گلزار چھوٹی اور بڑی میڈم کو جانتا ہے اور اسے یہ بھی پتا ہے کہ میڈم نادیہ گولی لگنے سے شدید زخمی ہو چکی ہے۔ میری باتیں سننے کے بعد وہ تینوں شدید شک میں پڑ گئے ہیں۔ تابندہ نے مجھے خود بتایا ہے کہ رشیدا اور گلزار بڑی میڈم سے ملنے ایئر پورٹ کی طرف گئے ہیں۔ ایئر پورٹ سے ان کا مطلب ''لال کوٹھیاں'' ہی ہے۔ یہ کوئی دو گھنٹے پہلے کی بات ہے۔

عمران گم صم میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ہمیشہ مسکراتا چہرہ گہری سنجیدگی سے ڈھک گیا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی انگلیوں میں جکڑی اور آنکھوں کی نمی نمایاں تر ہوگئی۔

میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''عمران! تم سے کہا تھا نا مجھ سے نہ چمٹو۔ مجھے دفع ہو جانے دو۔ میرا اور تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا، یہی ہونا تھا۔ اب نہیں ہوتا تو کچھ دن بعد ہو جاتا۔ تم جس طرح کی زندگی جی رہے ہو اس میں میرے جیسے معمولی اور کم فہم بندے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا کہ کسی نہ کسی موقع پر میری وجہ سے تم شدید نقصان اُٹھاؤ گے اور تم نے اُٹھا لیا ہے۔ تم نے اُٹھا لیا ہے عمران! سیٹھ سراج جیسے لوگ تو میڈم صفورا کو پہلے ہی شک میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے، اب میرے اقبالی بیان کے بعد ان کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ مجھے نہیں لگتا کہ میڈم صفورا اب چپکی بیٹھی رہے گی۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے۔ وہ تمہیں معاف نہیں کرے گی عمران۔''

عمران نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شاید ہمارے ستارے گردش میں ہیں۔ ہم سے ایک اور غلطی ہو چکی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تم مجھے راستے میں بتا دیتے تو ہم اس تکا شاپ میں نہیں آتے۔ چلو اُٹھو، جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ جلدی کرو۔'' وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ اس نے میرا بازو تھاما اور مجھے اُٹھایا۔

افراتفری کے عالم میں وہ مجھے لے کر اس ریسٹورنٹ سے باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ شاپ نادیہ کے سینئر گارڈ...... اس حرامزادے بختیار کی ہے۔'' وہ بولا۔

اس نے تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی کے عقب میں کوئی شخص سوزوکی ایف ایکس پارک کر گیا تھا۔ عمران نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور مسلسل بجاتا چلا گیا۔ ریسٹورنٹ کے اندر سے ایک ہٹا کٹا شخص سرعت سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لفافے تھے۔ اس نے ہماری طرف دیکھ کر معذرت کے انداز میں سر ہلایا۔ ''سوری'' بولا اور اپنی گاڑی کا دروازہ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے صرف ایک لفظ سوری کہہ کر اپنی جان چھڑائی تھی لیکن اس کی غلطی کی قیمت ہمیں کیا دینا تھی؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس شخص کے اندر بیٹھتے اور گاڑی اسٹارٹ کرتے کرتے وہ ہو گیا جس کا اندیشہ کم از کم میرے ذہن میں تو نہیں تھا۔ نیلی وردی والا ایک گارڈ بھاگتا ہوا ریسٹورنٹ کی بیرونی سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے تیزی سے دائیں بائیں دیکھا پھر اس نے ہماری گاڑی کی طرف اُنگلی سیدھی کی۔ اس کے عقب میں دو افراد اور تھے۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھے۔ وہ ہمیں پکارتے

ہوئے ہماری طرف دوڑے۔ ''رُکو...... رُکو......'' آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچیں۔

''کتے کے بچے۔'' عمران نے دانت پیس کر کہا اور گاڑی کو ریورس کرتا چلا گیا۔ عقب میں ایف ایکس والے نے ابھی اپنی گاڑی پوری طرح ہٹائی نہیں تھی۔ ہماری گاڑی کا پچھلا حصہ اس کی گاڑی کے عقب سے ٹکرایا اور وہ گھوم کر رہ گئی۔ عمران جیسے ایک دم ہی ہر خطرے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اس کے اندر کی مہم جو اور خطر پسند فطرت ایک انگڑائی کے ساتھ بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے مہران کار کو تیزی سے آگے بڑھایا۔ پہیوں نے رگڑ کھا کر طویل احتجاجی آواز نکالی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ریسٹورنٹ سے برآمد ہونے والے سادہ پوش افراد بڑی سرعت سے ایک جیپ میں بیٹھ رہے تھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ بختیار وغیرہ کو اطلاع پہنچ گئی ہے۔'' عمران نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

عمران کے کہنے کا مطلب یقیناً یہی تھا کہ رشید اور گلزار وغیرہ میڈم صفورا تک جا پہنچے ہیں اور انہوں نے مرچ مسالے کے ساتھ سب کچھ میڈم کے گوش گزار کر دیا ہے۔ اس کے بعد میڈم اپنے ہرکاروں کو حرکت میں لے آئی ہے۔

''اب کہاں جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔'' عمران نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔

جیپ بڑی تیزی سے پیچھے آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے ہاتھ مسلسل ہارن پر رکھا ہوا تھا۔ عمران نے برق رفتاری سے گاڑی کو دو تین سڑکوں پر موڑا مگر جیپ کسی گائیڈڈ میزائل کی طرح ہمارے عقب میں رہی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جیپ سوار اس قسم کی کارروائی کے ماہر ہیں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ کہ جیپ کی سواریوں میں بختیار یا شیرا خود بھی شامل ہوں۔

عمران کچھ دیر تک تناؤ میں رہنے کے بعد ایک دم ہلکے پھلکے موڈ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ ہر قسم کے تفکرات کے بادل یکا یک اس کے ذہن سے چھٹ گئے ہیں۔ اس کی جگہ ایک عجیب سے جوش اور توانا انداز نے لے لی تھی۔

''گھبرانا نہیں جگر۔'' اس نے میرا شانہ تھپکا۔ ''دیکھنا کیا تگنی کا ناچ نچاتا ہوں ان بندروں کو۔''

اور واقعی اگلے تین چار منٹ میں اس نے کمال کی ڈرائیونگ کی۔ اب رات [illegible] بج چکے تھے۔ سڑکوں پر زیادہ رش نہیں تھا لیکن جہاں کہیں رش تھا، وہاں سے بھی عمران گولی کی رفتار سے گزر گیا۔ وہ موت کے کنویں کا کھلاڑی تھا۔ نہایت تیز لیکن محفوظ ڈرائیونگ اس کا

خاصہ تھی۔ چار پانچ منٹ بعد گاڑی کا عقب نما آئینہ جیپ کی عدم موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ ہم آندھی کی طرح راوی روڈ کے علاقے سے داتا دربار کے ایریا میں پہنچ چکے تھے۔ اپنے عقب سے مطمئن ہونے کے بعد عمران نے گاڑی ایک چھوٹی سڑک پر کھڑی کی۔

وہ جلد از جلد اقبال سے رابطہ کر کے اسے خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اقبال کو کال ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران میں میری نگاہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھے اخبار پر پڑی۔ یہ شام کا اخبار تھا۔ ایک خبر نے میری توجہ کھینچ لی۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر یہ چھوٹی سی خبر تھی۔ ساتھ میں تصویر بھی تھی۔ دراصل یہ تصویر ہی تھی جس نے مجھے متوجہ کیا۔ یہ ایڈووکیٹ مولانا ابرار صدیقی کی تصویر تھی۔ اس نے مانگ نکالی ہوئی تھی۔ پھیلی ہوئی سیاہ ڈاڑھی کے نیچے سے سرخ ٹائی کی ناٹ بھی نظر آ رہی تھی۔ خبر میں لکھا تھا۔ ''ایڈووکیٹ صدیقی کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ پولیس کی تین ٹیمیں مصروف تفتیش ہیں۔ ڈی ایس پی جہانگیر۔''

نیچے خبر کے متن میں درج تھا۔ ''آج پانچ دن گزرنے کے باوجود ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کی پُراسرار گمشدگی کا معاملہ حل نہیں ہوا۔ جہلم میں اپنے ایک گارڈ کی ہلاکت کے بعد ابرار صدیقی اپنے فلیٹ سے غائب پائے گئے تھے۔ یاد رہے کہ ابرار صدیقی ایک معروف قانون دان ہونے کے ساتھ ساتھ نوادرات میں زبردست دلچسپی رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ انہیں ''نوادر چوروں'' نے ہی نشانہ بنایا ہے۔ پولیس نے اس سلسلے میں معروف اسٹیٹ ڈویلپر میڈم صفورا شیرازی سے پوچھ گچھ کی ہے۔ مزید تفصیلات منظرِ عام پر آنے کا امکان ہے۔

اس خبر نے مجھے حیران کیا۔ عمران نے مجھے ابھی تک اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ شاید اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ چند دن پہلے عمران نے مجھے بے فکری سے نادیہ کی عیادت کے لیے کیوں بلا لیا تھا۔ اسے یہ خطرہ محسوس کیوں نہیں ہوا تھا کہ صدیقی مجھے یا اسے وہاں پہچان سکتا ہے۔ دراصل وہاں ہسپتال میں صدیقی کے موجود ہونے کا امکان ہی نہیں تھا۔

عمران سیل فون پر اقبال سے رابطہ قائم نہیں کر سکا۔ اس نے جھنجلا کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

نہجار عورت بول رہی ہے جس نے ایک خلقت کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب نہیں مل رہا۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کریں۔ مجھے تو لگتا ہے ٹی وی چینلز کی طرح یہ موبائل نیٹ ورک والے بھی وقفہ کرنے لگے ہیں۔ ملتے ہیں ایک چھوٹے سے

وقفے کے بعد۔ کہیں جائیے گا نہیں۔ ہمارے ساتھ رہیے گا۔ بس ایک چھوٹا سا بریک...... بس ایک چھوٹا سا۔ یار! کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ہر ٹی وی چینل پر بھک منگے بیٹھے ہیں اور عوام سے ایک چھوٹے سے بریک کے لیے منتیں کرتے رہتے ہیں۔ تمہیں بتایا ہے نا کہ اپنے تایا جی نیوز چینل چلاتے ہیں۔ وہ بھی اُٹھتے بیٹھتے بس چھوٹے سے بریک کے بارے میں سوچتے ہیں۔ بریک کیسے کیا جائے؟ کہاں کیا جائے؟ اور کتنی دیر کیا جائے؟ اپنے بیٹوں کو ہر وقت اسی موضوع پر لیکچر دیتے نظر آتے ہیں۔ بقر عید پر پتا ہے کیا ہوا؟''

میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ وقت گزاری کر رہا ہے۔

وہ بولا۔ ''تایا جی نے چالیس ہزار کا بکرا لیا۔ قربانی کے وقت بیٹوں نے بکرے کو گرا کر دبوچا۔ تایا جی نے چھری گردن پر رکھی۔ ذرا سی چھری چلائی اور ایک دم رُک گئے۔ بولے۔ تو یہاں لیتے ہیں ایک چھوٹا سا بریک۔''

''وہ بکرے کو تڑپتا چھوڑ کر پرے ہٹ کر بیٹھ گئے۔ اطمینان سے چائے پینے لگے۔ بیٹے لے۔ ابا جی! بکرا تڑپ رہا ہے۔

فرمانے لگے۔ اسے تڑپنے دو۔ اس منظر کو غور سے دیکھو اور پروگرام میں ''بریک'' کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

سکون سے چائے پینے کے بعد انہوں نے دوبارہ چھری چلائی اور بکرے کی مشکل آسان ہوئی۔ بعد میں محلے کے مولوی صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے خوب لعنت ملامت کی اور تایا جی کو خوشخبری سنائی کہ ان کی قربانی ضائع ہوگئی ہے۔ اگر وہ......''

یکا یک عمران ٹھٹک کر چپ ہو گیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا اور میرے جسم میں بھی سنسنی دوڑ گئی۔

اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات
دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں